

خوبصورت کمسنیوں کا مجموعہ

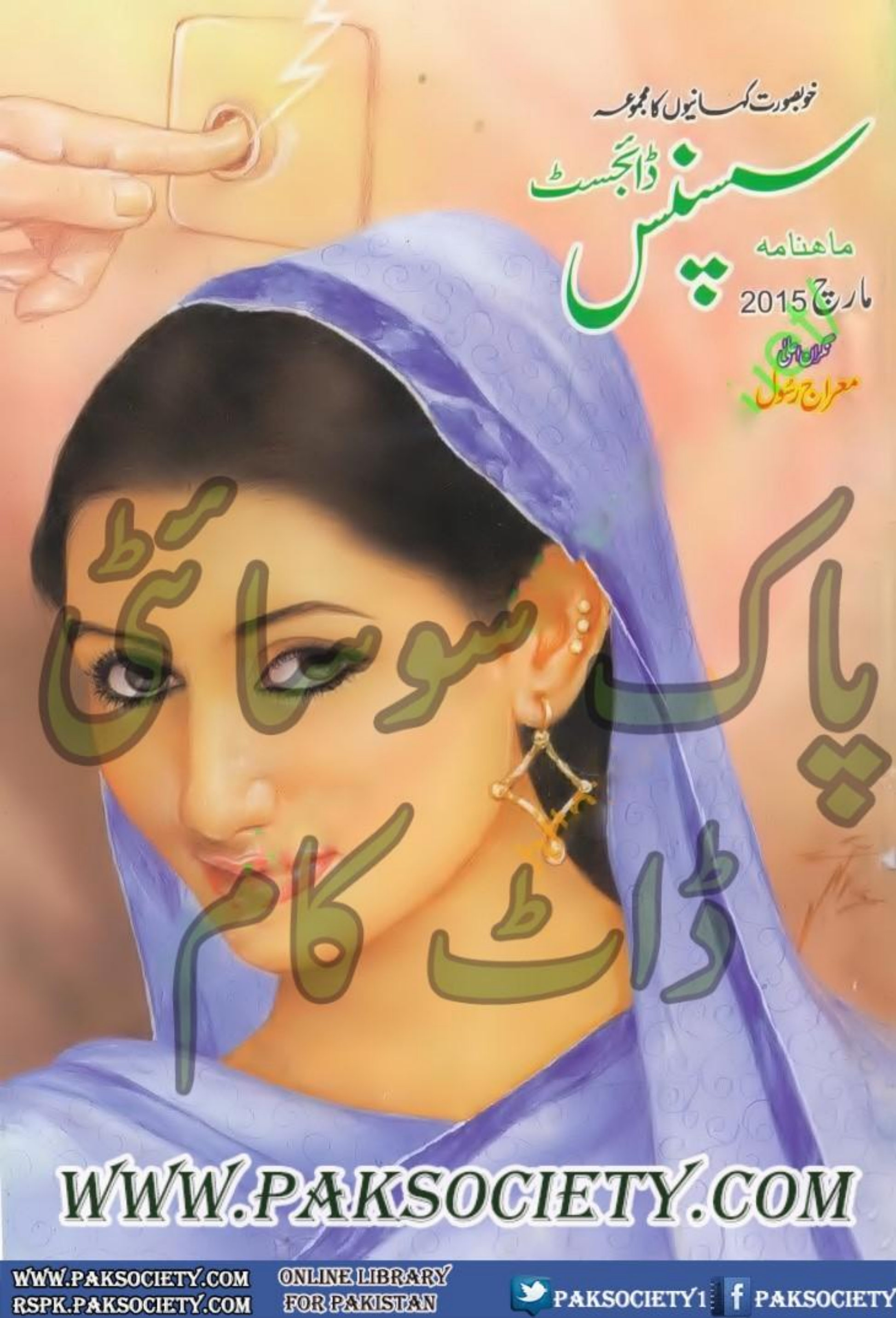
# سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

مارچ 2015

گلشن

معراج رسول



WWW.PAKSOCIETY.COM





سینس کی مجلس مشاورت دست ارٹین کی تحفہ  
شیریں باتیں گلے شکوے اور حسلوں مشورے



ماضی کا آئینہ۔ ہاؤس اور بے اختیار  
انٹرنل کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

اجنبی رنگت اور سرد و چسپروں والی  
شیطانی قوتوں کی برابریت کا لرزہ خیز منظر

آفات و حادثات کی نذر ہو جانے والوں  
کی یاد میں ایک صاحب دانش کا مرثیہ



مہذب دنیا میں خود  
غرض انسانوں کی بے باکیاں

حیرت انگیز ایمادات  
کے فوائد اور فوائد کا قصہ

دوست فساد دشمن کی محبتوں  
کا بے باق حساب کتاب



آنکھوں میں دھول جھونکنے والے  
ایک شعبہ باز کی فنکاریاں

حیرت انگیز ایمادات  
کے فوائد اور فوائد کا قصہ

صنف نازک کے شر اور  
بد اعمالیوں کا عبرت اثر ماہی

جلد 45 • شمارہ 03 مارچ 2015 • زر سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

خط کتابت گاہ: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون 021 35895313 • فیکس 021 35802551 • E-mail: jdggroup@hotmail.com





پروفیسر سعد حارثی کے  
حبر گوشوں کی عنایتوں کا احوال

170

ماروی

محی العین نواب

ڈاکٹر شہیر شاہ سید

مجموعی

162

محفل شعروں

قارئین

ایک سو چوہتر سو پچیس ہجرتوں کی  
عنايتوں رفعتوں ورقہ جتوں کا ایک نیا سلسلہ

آپ کے ہاتھوں ہی ایک انجمن رنگ رنگ  
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

229

خواباتی باللہ

صیبا نسیم بلگرامی

پندرہ سو سے در آمد شدہ ایک  
پینک ڈیسٹی کا دلچسپ ماحیرا

بلا عنوان

215

روایت

بابر معین

اللہ کے پیغام کے امین، روشنی  
کے میسرار ایک ولی کی روداد

محبوبوں کی حفاظت کیے  
خون کی ہولی کھینچنے کا عجب انداز

کترتیں

ادارہ

مختار امین

سفر سفر

241

سایہ ہمسایا

ڈاکٹر ساحد احمد

دنیا بھر سے اوھر اوھر سے لطیفے چنگے  
اقتباسات، سترائش اور تہمت سب کچھ آپ کے لیے

بد نظمی کی تمام خبیث چیز چانوں  
کا افسوس تاکہ شہام

پبلشر پروڈکشنز نیشنل رسول مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور-63 فینال ایکس ٹینشن، ایف س، مین کورنگی روڈ کراچی 75500  
حساب: مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



# تم کامل نہیں ہو!

کائنات اپنی قہاری کے ساتھ زندہ اور انسان جو وجود کا سرمایہ اور کائنات کا شرف ہے، زخم کاری کی اذیت سے سسک رہا ہے۔ تپ، بھول جیسے بچوں سے لے کر کھکشاؤں تک سب کا مقوم ہے۔ وہ ماں جس نے بے چارگی اور بے بسی کے ساتھ اپنی گود میں اپنی بیٹی کی آخری ہنگامی سنی۔ اس بیٹی کی آخری ہنگامی سنی، جس کے لب اپنی اذیت کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اسے ابھی بولنا نہیں آتا تھا۔ بس اس کی اذیت زدہ اور اذیت ناک آنکھیں یہ بتاتی تھیں کہ میں اذیت کی حدوں سے گزر رہی ہوں۔ کوئی ڈراؤنی چیز ہے جو مجھے نکلنے کے لیے میری طرف بڑھ رہی ہے۔

آہ! وہ باپ جس نے بے کسی کے ساتھ اپنی لخت جگر، اپنی مہکتی ہوئی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے تیز خاک سلا یا، جسے وہ اپنے سینے پر لٹاتا تھا تو اس کی روح معطر ہو جاتی تھی۔ وائے قسمت، وائے نصیب کہ جن ماں باپ کے دل اپنی بیٹی، اپنی معصوم خوب صورتی کو دیکھ کر مٹکتا اٹھتے تھے، وہی اب اس کے لیے لوح کناں ہیں، ان کی سوگوار آنکھیں جھپتی ہیں۔

ہائے مرا پھول لے گیا کون  
ہائے مجھے داغ دے گیا کون

وہ جن کی آنکھوں میں اس سے روشنی تھی، جن کے ہونٹوں پر اس کے معصوم اشاروں سے مسکراہٹ جاگ اٹھتی تھی، انہوں نے کہاں ان ماں باپ نے اپنی رنگ و بکھت بیٹی کا پر سالیانہ موت سے کس کو رستگاری ہے۔

رستگاری، کیسی رستگاری! زمین سے لے کر آسمانوں تک کہاں ہے رستگاری؟ کائنات کے ہر گوشے میں مرگ، ہلاکت اور فنا کا نفاذ ہوتا ہے۔ زمین اور آسمانوں کے درمیان، زندگی، الامان..... الامان پکارتی ہے مگر کہیں بھی امان نہیں ہے۔ یہاں تو عالم بنا ہوں کو بھی پتا نہیں ملتی۔ تو کیا یہ سب کچھ بے معنی ہے، زندگی اور زندگی کا عیش؟ زندگی اور زندگی کی لذتیں؟ وہ سارے دکھ جو زندگی کی خاطر جھیلے جاتے ہیں۔ وہ ساری شان و شوکت جس کو حاصل کرنے کے لیے آدمی ہر داؤ چلتا ہے۔ جب ہر چیز بے معنی تو پھر زندگی کے آخر کیا سنی ہیں؟ ہزاروں سال کی تاریخ، ہزاروں سال کی تہذیب اور ہزاروں سال کا تمدن، کیا یہ سب کچھ بے معنی ہے؟

ہاں، یہ سب کچھ بے معنی ہے۔ اس قدر بے معنی کہ اگر انسان حقیقت پر غور کرے، چیزوں کی اصلیت اور ماہیت پر سنجیدگی کے ساتھ سوچے اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرے تو وہ ہر شے میں گھانا ہی گھانا پائے گا اور صرف پشیمانی کمائے گا۔

”اگر یہ سب کچھ بے معنی ہے تو آخر معنی کے کیا معنی ہیں؟“

”بے معنی ہونا، مگر بے معنی ہونا؟“

”مگر بے معنی ہونا!“

”ہاں، مگر بے معنی ہونا... مگر ایک حقیقت ایسی ہے جو اس ساری گفتگو کے برعکس ہے، اور بس وہی سب کچھ ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہی ساری باتوں کی ایک بات ہے اور وہی رمز حیات ہے اور وہ ہے چیزوں کو با معنی بنانا۔ زندگی اور وہ سب جو زندگی کا حاصل ہے، وہ از خود بے معنی ہے۔ انسان اسے با معنی بناتا ہے۔“

یہ سب کچھ تو درست ہے مگر کیا وہ کھلونے بھی بے معنی ہیں جن سے کھیلتے کھیلتے ہماری نفسی معنی مڑ یا شامدم کے اندھیرے میں جا چھپی ہے؟

نہیں، وہ کھلونے بے معنی نہیں ہیں۔ وہ کھلونے بے معنی نہیں ہو سکتے... اس لیے کہ وہ کھلونے ہیں اور انہیں ان سے کھیلنے والی ایک معصومیت نے با معنی بنایا تھا۔ ان کھلونوں کو پھیر کر دو اور انہیں اپنے سینے سے لگا لو۔ ہم ان کھلونوں کو پیار کرتے ہیں اور انہیں اپنی شاکہ کھلونوں کو اپنے سینے سے لگا لیتے ہیں۔ اس شاکہ کھلونوں کو جو مرجھاتی ہے۔

شاکہ! ہم تمہیں آواز دیتے ہیں۔ تم ہماری آواز کا جواب دو۔ تم مرجھاتی نہیں ہو۔ تاہم ہماری یادوں کے گلہستے میں، ہمارے دل میں کھلی ہوئی ہو۔ تم بھلا کیسے مرجھا سکتی ہو، دل میں... ہمارے دل میں!

☆☆☆





# آبِ حیات

محترم قارئین  
السلام علیکم!

مارچ 2015ء کا سہ ماہی آپ کے زیر مطالعہ ہے۔ اس ماہ سے ایک تاریخی یادداشت ہے جسے مانانہ ہوئے بہت سے ایسے عہدہ داروں نے ضمیر کو چھینڑتے ہیں جو اگر پورے کر لیے جاتے تو آج ہمارے ملک کا یہ حال نہ ہوتا۔ دھڑوں، پارٹیوں اور لائٹنگ 4 بج کی افراتفری میں 23 مارچ کا حوالہ ہر بار سونے ہوئے بااختیار طبقے کو چگانے کی کوشش کرتا ہے مگر ہنوز وہی دور است کے مصداق کسی کے کان پر جوں نہیں رہتی، اگر ایسا ہوتا تو حکومت کی جانب سے چند اعلیٰ تصانیف اٹھانے کے باوجود امام اب تک ثمرات سے محروم نہ رہتے۔ حال ہی میں پٹیالہ کی قیادتوں میں ایک پارٹی کے باوجود مہنگائی کا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ ہمیں منہ چڑھا رہا ہے جبکہ دوسری جانب روشنی کے اس شہر کی گلیوں میں دن دن ہاڑے ڈکیتوں کی دلیرانہ وارداتیں اندھیر گری چہ پت راج کا اظہار کر رہی ہیں۔۔۔ چند مخصوص دراستوں سے تو گزرتے ہوئے مصوم شہری بے پناہ دہشت کا شکار ہو جاتے ہیں اور پتھر پتھر نکل جانے پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں جبکہ بعض اوقات لوٹ مار کی یہ کارروائیاں خونخوار دانتوں میں بدل جاتی ہیں۔ موسم سرما کی تعطیلات کے بعد درس گاہیں اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے کھل تو گئی ہیں لیکن والدین سامنے پٹا اور کے پس منظر میں آج بھی بچوں کو اسکول روانہ کرتے ہوئے ایک انجامتے خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف حفاظتی انتظامات کے دوڑے ہیں تو دوسری طرف دہشت گرداں جب اور جہاں موقع پاتے ہیں، کوئی نہ کوئی چھوٹی بڑی واردات کر گزرتے ہیں۔ کوئی گرفت میں نہیں آتا۔ سہر حال اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو تمام ناگہانی آفات سے محفوظ رکھے (آمین)۔ پر سچ کی تیاری کے دوران اُس مردہ ماحول سے فرار کے لیے آج کل ورلڈ کپ کے منتظر خبریں گرم ہیں۔ کرکٹ کے شہدائی بے شمار دعائیں اور اچھی امیدیں لیے پتھر ہیں اور جناب ہماری توجہ کے لیے جو انتظامات قارئین کے سامنے بھی ہیں تو پلٹے پلٹے ہیں اپنی محفل کی جانب۔

عبدالجبار رومی انصاری، لاہور سے ہمیں پتھر کے ساتھ حاضر ہیں "سخت جانے کا موسم اور آنکھوں میں لیے انتظار کے سامنے خزاں رسیدہ درختوں کے سچ لکڑی کے سب سے کاج کا پر اسرار ماحول، نیچل میں ورق ورق کھرتا تصور لٹھی ہوئی بویشہ کا پال بکھرانے اور اس چہرہ خوبصورت سرورق میں اور اسی کا قالب حضور سہنس کی بھر پور تائید کرنا تھا۔ انتہائی سبب تک قانون بنانے والے اس کا احترام نہیں کریں گے تو پھر ان بستیوں میں جنگل کے کدو سے ہی آباد ہوں گے۔ کاش کہ جن اہلیا کی یہ تحریر قانون کی دجیاں بکھرنے والوں کی نظر سے بھی گزرے تو اس ہستی کی حرمت و قراورہ جائے۔ سچی جا کر ملک کا نظام بھی درست ہوگا اور آئے روز ہونے والے خونخوار واقعات سے بھی نجات ملے گی۔ نہ کھٹ کا۔ زمین کی محفل میں ہر شہر سبب لے گئیں اور سچ کے فرائض انجام دیتے ہوئے 2015ء کے پہلے شمارے کلرٹ پوزیشن سے سوی ذبردست ہو گیا ہے اور سے نمبر پر شانہ حسن نے دھک کے رنگ بکھیر دیے۔ دلائی لاما آپ بھی سوہنی کڑیوں میں شامل ہو گئیں۔ دیکھ کر ہمیں دھک آپ کی محفل شعرو سخن کے صفحات بڑھانے پر اتفاق کرتا ہوں۔ احمد خان توحیدی 24 مضمونوں میں شہرہ ختم پھر تو بس نظر گھمانے والی بات ہوئی تیر۔ ما صاحبہ الرحمن خوش بخت الرحمن خدا آپ کو آزادی نصیب کرے۔ سچی حالات کے لیے آپ کے ساتھ دعا گو ہیں۔ طاہرہ گزرا بھی آپ جیاز کا سہارا لیتی ہیں آسو چھاننے کے لیے۔ اہل آپ کا تبصرہ بھی ایک دم جاندار ہوتا ہے۔ توصیف احمد اور محمد زریان کی انگریزی بھی خوب رہی۔ الطیر حسین یا و ماضی تو ساتھ ساتھ ہی چلتا ہے پتھر میں کہاں تک چا گئیں گے۔ آپ کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ محفل شعرو سخن میں سید نعیم الحسن، شہانہ حسن اور حنا عروج کے اشعار آپ پر تھے۔ کہا نیوں کی طرف آتے ہیں تو جرم کی جیب گود کھد مندوں اور چہرہ کڑیوں سے نکل کر سامنے آتا ہے۔ کہاں بے چارہ اور دہشت اور کہاں محتول لالی اور قاتل نکلا ڈاکو لٹھی اور کسی کہا نی میں منہ۔ نازک نہ ہو شریک جرم یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یوں زہدہ بھی نکل جا کر "کاش" کی آہ بھر کر رہ گئی اور تک صاحب کی ڈائری سے یہ پیشکش بھی نکل ہوئی۔ ناب اور سچی کی لڑائی توحید اہیت پر مبنی سچی مگر بارہو کے لیے جیت اسی کی ہوئی جو اس میں ہار تھا۔ منصف نازک کا اٹو کھا فیصلہ۔ طاہرہ چوہدری محفل کی کامیاب ممتوح کو صورت ظہور ہم اللہ تعالیٰ کے آگے کسی وقت بھی سہرہ کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ مراد نازک کے لیے اللہ کے حضور سجدہ ریز: ہونے کے بعد دعا مانگتا ہے تو اور شاہ جو محبت کا دم بہرتے اس کے ساتھ ہوتی ہے، اپنی ہی مصیبت میں گرفتار ہو جاتی ہے اور مادی مراد کو خواب میں دیکھ کے مجوم لٹتی ہے۔ یوں زبردست سنسنی خیزی کے ساتھ جاری ہے سچی الدین نواب کی "مادی" جب دل پتھر ہو جائے تو کسی کو بھی قبول نہیں کرتا۔ کار لا کو پتھن میں ماں نے چھوڑ دیا تو آج کار لانے ماں کو کون جانے ایسا گھبراؤ تم جب ملنے کوئی مرہم ہر شتوں کو چھوڑنے والی تحریر ڈاکٹر شیر شاہ سہ کے تم سے اچھی رہی۔ استاد کرنا اچھی بات ہے اور اجنبیوں کے اس سے بھی زیادہ اچھی بات ہے۔ ایسا سچا پوری کی تاریخی کہانی درمیانہ مشق ایک دم سے زبردست ہے بہت زیادہ پند آئی۔ گنار نے محمد کو اتحاد میں لے کر ہے مثال بنایا تو اپنی عزت بھروسہ کر بیٹھی اور فیروز بخت کے لیے جو سازش تیار کی تو مستحق بلے میں سدا اور اللہ تعالیٰ نے کامیاب سازش سے فیروز بخت کو بچا لیا۔ آخر میں محمد و کار کردار تو در مانہ ہوا اس نے گنار کے لیے موت کو گنگے لگا لیا۔ اس میں تو بے جا ہتھیار جس ہے گئی۔ قلم کا بے پناہ سچی سے انتظار ہے۔ طالب علمی کے دوران





میں نے بہت سے مذاہب کا مطالعہ کیا تو مجھے ان سب سے زیادہ پائیدار امن پسند اور مکمل دین..... دین اسلام ہی نظر آیا اور چاقو کی منگلاشی بازو کا سیاہ منصوبہ بندی سے حریت پسند گھن کو نکال لے گئی۔ صیہونی قوتوں اور امت مسلمہ کے درمیان معرکے کی حکیمانہ سوانحیں سنیں اپنے جنوں کے ساتھ زبردست جارہی ہے۔ مگر سے میں نہ کچھ نہ ستر ہجرت سے پہلے ہمارے غلاماں کو ختم کر کے کی لذت سے نا آشنا یا دین میں شب بیدارن تلاش نکل اور طلب علم کی عیاش میں لیے ستر کرنا یہ فیما اللہ کے پیارے بندوں کی عبادتوں کی عارفانہ سطر سطر موحیوں سے گزری گہری ولایت کی باتیں اولیاء اللہ کی زندگی کے ایمان المرور واقعات جیسے جیسے پڑھتے جائیں دل میں روشنی کی کرنیں چھوٹی جاتی ہیں۔ حیرت انگیز کہ بار بار پڑھنے کو دل کرے۔ دیری تاخیر۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ کوئی کسی کے لیے کا ڈسے اور نہیں ہے لیکن کامی اور خدا اپنی اپنی جگہ تصور کرتے اور اپنی حالت کے لئے دعا بھی... آہ وہ بھی اپنے انجام کو پہنچے اور اپنی نشتانی سبیل اور رحمت کو دے کر انہیں ملا گئے ہیں یہ امارا بچے ہم اسے پائیں گے۔ اتفاقاً سے معصوم اور ایک دوسرے کے برعکس کاشف زہیر صاحب نے تو خوب صورت تحریر دے کر کہانی کے ٹکس ملا دیے بہت اچھی رہی۔ مجبوراً یہ ہے کہ حکیم صاحب میرے ہیں اور میں ان کی بیٹی ہوں اور اس بیٹی کو تیار یا ابو بجا لائے اور دل کے سر بیٹھ چیلے کے لیے ہاتھ ہی نئے رہ گئے۔ پر کیا کہوں اپنی قسمت ہی شراب ہے۔ قطعہ کہانی میں سطر امام نے بھی مسکراہٹ سمجھ دی۔ ہاں وہ بھی چائے ہے جو میں صرف ان لوگوں کو پیش کرتی ہوں جو مجھے پسند آتے۔ ہیں اور تم بھی مجھے پسند آگئی۔ ہر مجرم کاڑھنے کے لیے زہرہ بھوت کا سوا گنگ زبردست رہا۔ بہت پسند آئی۔ جو میری پیش کی تحریر مجموعی طور پر پورا شمارہ ہی زبردست رہا۔ ہر کہانی سانس کی روایت کے مطابق اپنے اندر کرداروں کے حوالے سے بھر پور تجسس لیے ہوئی تھی۔"

✽ محمد صفدر معواویہ، سرور میں، کراچی سے محفل کی رونق دینے ہیں "فروری کا شمارہ زندگی میں پہلی مرتبہ 15 تاریخ کو سرور میں کر لی میں ملا۔ اتنی جلدی نئے کی خوشی نہ پوچھیے اور جلد ختم ہونے کا غم بھی۔ سرورق کو ایک خوب صورت دل نشین آنکھوں والی خوب صورت چہرے اور کسی قدر حیران مائل سے سجایا گیا۔ بہت ہی پر نمک سرورق تھا۔ کہانیوں کی خبرت کو بھی اعلیٰ مرتبے سے سجایا گیا۔ جون علیقا احترام بہت ہی عمدہ الفاظ میں قانون کا ٹکس بھجواتے نظر آئے کہ اعلیٰ طبقہ قانون کی پاسداری کرے تو چھوٹا طبقہ خود بخود کرے گا۔ آپ کے ادارہ کا ایک ایک خط پیش بہا اور جیتی ہوتا ہے۔ اپنی محفل میں آئے تو حیرت زدہ ہو کر زائد کہ اس تبصرے کے ساتھ کر ہی صدارت پر راجحان پایا۔ مبارک ہوئی شائستگی، یہ بے وفا کی ہات مرد اور صورت دونوں میں پائی جاتی ہے۔ محمد عامر زمان آپ کو ساگر مبارک ہو۔ اور میں احمد خان اگر ہم مسلم اکٹھے ہو جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اعجاز بھائی بھی اعلیٰ تبصرے کے ساتھ محفل کی رونق دہاتے ہوئے نظر آئے۔ تو حیدی صاحب پاکستان کے لیے کی گئی آپ کی دعا اللہ پاک قبول فرمائے۔ ناہرہ سیال میانوالی اور دویم احمد خانوہل سے اچھا تبصرہ لے کر آئے۔ مہرین ناز اور طاہرہ گلزار بہت اچھی بہترین تبصرے لے کر حاضر ہوئیں۔ عہدہ لبار روی انصاری صاحب آپ کیا تبصرہ لے کر آئے ہیں، بہت ہی عمدہ ہے۔ توصیف احمد زریان سلطان اور اطہر حسین کے تبصرے بھی اچھے لگے۔ ذوق حرام سے کھاروں کو سانس میں دیکھ کہتے ہیں۔ یعنی صاحب کی سوادے جنوں سب سے پہلے پڑھی۔ کہانی پہلے سے زیادہ عمدہ اور دل گرفتہ ہوتی جا رہی ہے۔ سید دیوں کے مظالم بڑھ گئے ہیں۔ نظر نے کہا تھا لوگ مجھے عالم کہتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ سارے سیدی اردو بتائیں کچھ اس لیے چھوڑ رہا ہوں کہ دنیا کو پتا ہے کہ یہ کتنی ظالم قوم ہے۔ انہاں سیتا چوری اور عامہ مشق لے کر آئے۔ پہلے تو کہانی پوری تھی لیکن آخر میں کچھ رنگ نمایاں ہوا۔ اگلی قسط تک انتظار میں ہیں۔ ہر بار وہی پڑھی۔ دن باہر بندے جان سے گئے۔ اس اسٹوری میں گل بہت دور ہے ہیں۔ مراد اللہ ان اتنی چکا اور اب پاکستان پہنچے گا تو کہانی کا ایڈوچر بڑھ جائے گا۔ طاہرہ جاوید محفل صاحب کی کامیاب ممتوح کیا کہانی ہے۔ بارہ نے ساری چال ہی اتنی کر دی، ناب بنتی ہوئی بازی ہار گیا۔ باہر نیم کی مہمان کہانی گزارے لائق تھی لیکن حقائق سے زیادہ دور ایسا کہ ہر چیز آپ سے چھین لی جائے۔ ملک صفدر حیات کی کاش ہنگی نے الائی کو گل کر کے ہر اکام کیا اور اللہ کی مزا کا حق دار ضمیر اور ذہد کو طلاق بھی ملی اور ساتھ میں نکل بھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ایچہ دنیا کے پیچیدہ مسائل پر اسٹوری لکھتے ہیں اور اچھا لکھتے ہیں۔ محفل شعرو سخن رنگ برنگے اشعار سے مزین تھی۔ اطہر حسین بچا کا شعر بہت پسند آیا۔ وہی کا سوال مثیل حیدر کی بہت عمدہ اور دکھ بھرا غم سے بھر پور کہانی تھی۔ شرم نیل کی تصنیف چارنی نے جس چالاک سے اپنا اور اپنے دوست کا بدلہ لیا اور قابل تحسین ہے بلکہ کچھ کہے دیکھن کا خاتمہ۔ سطر امام کی قطعہ کہانی لیوں پر مسکراہٹ سمجھ گئی۔ بلکہ کامی صاحب کی عارف حق احمد عہد حق دل کو منور کر گئی۔ سلیم انور کی ہاتھ پیر ایوں ہی تھی۔ جو میری پیش کی زہرہ بھوت میں کیا نظریق اپنا یا ڈون کو قرا کر روانے کا۔ کاشف۔ میری برعکس موجودہ حالات کی عکاسی کرتی بہترین تحریر تھی۔ والدین ہمیں اتنی محنت سے پالتے ہیں۔ ہمارا حق ہے کہ ان کو کسی موڈ پر شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ ہماری وجہ سے والدین کا بھی حق ہے کہ وہ مجھے تعلیم دیتے کریں اپنی اولاد کی باقی کڑھیں بھی بہت اعلیٰ تھیں۔" (بہت شکر ہے)

✽ محمد خواجہ کوہنگی، کراچی سے پہلے آ رہے ہیں "فروری کا شمارہ محبت کے خفا میں سینے کا شمارہ یعنی سرورق کی دہریہ محبت کی ماری تھی ہے۔ کچھ تبصروں میں ایک اس کا بیج جو امید بہاں لے لیے ہوئے۔ ہانگل ہماری قوم کی طرح۔ گزشتہ برس بہتر تھی کی اس لیے بیٹھے تھے مگر ترقی کیا ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے۔ اسے خدا سے سال میں ہماری امیدوں کی ناچ رکھتا۔ (آمین) جون علیقا نے قانون پر کیا خوب تبصرے میں یہ چہا ہدیا کہ بار پاکستان ہی غیر محفوظ ہو گیا۔ قانون تو بہت ہیں لیکن عوام دفاع کو کسی قانون کی پاسداری نہیں۔ ہم سب جانتے ہیں لیکن سب بھگت رہے ہیں۔ ایک مسلسل اور ختم ہونے والا مذاہب سے بھول جیسے مصوم بچے شہید کر دیے گئے۔ کہا اب کوئی مذاہب اور باقی ہے۔ ترقی یا مذہب قوموں نے جس میں جنہم میں دیکھیں یا۔ بس کر دو، آس تو خشک ہونے دو۔ دوستوں کی محفل میں وہ شمارہ بڑ زیادہ اس دفعہ میر کارواں ہیں مہارک ہو۔ مہرین ناز حیدر آباد سے خطوط کی محفل کی مستقر بھر ہیں۔ اشعار بھی خوب چھانت کر لکھتی ہیں اور تبصرہ بھی بہت جامع اعداد میں کرتی ہیں۔ زمین نازی ہنگی مرتبہ شامل ہوئے اور تھروں پر چھانگئے۔ عہدہ لبار روی بڑے بھر پور تبصرے کے ساتھ شامل ہیں۔ اچھا تبصرہ لگا۔ باقی محفل کے شرکانے کہیں مختصر اور کہیں تفصیل سے تجزیہ نگاری کی، بہت خوب۔ وہ عامہ مشق، ایسا سیتا چوری نے انتہائی دلچسپ اور دل کو









**فقہ محمد قدرت اللہ نیازی، محکم ہاؤس، خانوالہ سے تخریف لارہے ہیں۔** "تو اس کے بس حشر سے سافر ہوئی 2015ء کا سفر بروقت موصول ہو گیا۔ اگر اہل کی حیدر گری کے موسم کا استقبال کرتی نظر آئی۔ جون ایلیا کا انٹرویو "قانون" ایک سادہ سے اصول کی تائید کرتا نظر آیا کہ اگر حشر ان طبقہ قانون کی پاسداری کرے تو حرام کی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ قانون کی پامالی کا سوچے۔ چاہے بظاہر میں حشر کی جگہ میں فروخت کے آگے حرام کا جو حال ہے، وہ ڈسکا ہیما نہیں۔ حکم کھانا زیادہ تر خوں پر حشر اور فروخت ہو رہا ہے اور کوئی بچہ بیٹے والا نکس۔ سادہ بہترین رہا۔ ساتھ ساتھ سے سیاسی رجحان میں اتحاد کا گتہ و آہنی خوش آنکھ ہے۔ ہماری دعا ہے کہ یہ پائیدار ہوگی بات ہو۔ در شہر ہول تیرے کے ساتھ سو جہد جس مبارک قبول فرمایا۔ تاہم آپ کی توہین کا سرخ انوار کچھ کر رہی ہوئی۔ شبانہ حسن، امینی اللہ، عیسیٰ کی اصلاح کر لیں۔ جو مشہد سادہ یا قالی بیل، امیر سے تیرے کی پسندیدگی کا شکر ہے۔ خیال رہے اگر پوری کا انہرام ننگ جائے۔ محمد قاسم رحمان اور حکم ایمن یا رازدین احمد خان آپ کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے مزید کہنا چاہوں گا کہ میری فکر کے ساتھ ساتھ عمل بھی ضرور ہونا چاہیے تاکہ آئندہ ایسے واقعات سے بچا جاسکے۔ احمد خان کو یہی دینی انواب صاحب آئی جلدی مراد اور مادی کو بر گزشتہ ملائیں گے۔ ابھی تو آگ کے کئی اور پیمانہ کروائیں گے۔ صبر ناز! آپ پھر حیدر آباد آگلی ہیں؟ اور والے مکان کا کیا ہوا؟ یہ دینا تقویٰ اور رخصتیشن مبارک ہو۔ منسل تیرے کے شکر ہیں۔ عہد ارباب روئی ابھی ہم تو ہر ماہ ہی تیرہ گینے کی بھر پور کوشش کرتے ہیں کیونکہ سسٹمز سے رشتہ ہی ایسا ہے۔ توصیف اہم آپ کا تفسیر ساتھ بہت پسند آیا۔ اطہر مسین! آپ کیا اس کی باتیں کھا جاتے تھے کہ تکرر چرائی پڑیں؟ اہم کمال احادیث ایسے ہی ہوتے ہیں اور سبھی چاہتے ہی بنتے ہیں۔ وہ حکم ان سسٹمز عملی! اس بار سب سے پہلے غیر متوقع طور پر ایسا ہیسا پوری کی اور مامعہ شوق پڑ گیا۔ دلچسپ اور غیر متوقع نوکس کی حاصل تحریر رہی۔ مگر ناکامیہ کہ ازاد بنانا متعلق میں پختی ہڈی بن گیا تاہم آخر میں (حمود) کردار میں مثبت طرز عمل کی جھلک نظر آئی۔ خادم عہد استاری کا وقاری نے خوب متاثر کیا۔ مادی میں ڈاکٹر نے پلاسٹک سرجری سے مراد کو ایمان ملی بنا دیا تاہم دشمن بھی کم چالاک نہیں۔ نواب صاحب مادی کو اپنے روحانی طرز تحریر میں ڈھال کر دلچسپ بنا رہے ہیں جس سے تحریر کا دلچسپ مطالعہ بن گئی ہے۔ سوائے جنوں، میری کن باتوں کے نکلنے والوں کے جنوں کی داستان ہے جن کی جہد عہد عہد ازاد سے جاری ہے۔ ہٹا نہیں جلد کا سباب و کسرا ان کرے۔ آئین۔ ناہر جاوے مکمل عہدایت مکن معصی کی ایک اور عہدایت مکن مکن کا سباب متنازع شدہ کی نسبت نئی بارہ کے فیصلے نے دل خوش کروا دیا۔ جی اور نواب کی روٹی ابھی تیرا ان کن رہی اور آج کل تو محبت بھی "مئی ڈیڑی" تاہم ہو گئی ہے۔ چند فون کا لڑ پڑ ہی نہت جاتی ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید "گمراہ" میں مغربی معاشرے کے بہت قریبی رشتوں میں موجود خود مغربی اور سفارتنہ میں کو اجاگر کرتے دکھائی دے۔ ساتھ ساتھ پاکستانی معاشرے کی برائیوں کو دیکھنا بھی سیکھنے کے بعد از میں بیان کیا۔ شرم گیل کی تہ نشین میں چارلی آخر کار اپنا سانوں پہا حساب ہے باقی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ شکر امام کی قطعہ کہانی پیش کی طرح ہونوں پر تبسم تیسر گئی۔ تجویر و پاش کی زعمہ بیعت میں ڈون سے ہتزاز جرم کرانے کے لیے جولی اینڈ کچن نے خاصا کٹ مارا پھیلا دیا۔ بارہیم کی مہمان میں مہمان بلائے جان کا بہت ہول۔ ایئر لیر جیس عظیم کا وجود مغربی ممالک میں ہی مکن ہے۔ مشرق میں تو ایسے مہمان کے سے سب سے پہلے "گولڈ" آتی ہے۔ وہ ایسی کا سوال، منسل حیدر کی ایک سچی آموز اور مہربان اثر تحریر تھی۔ ایسی لڑکیاں جو کئی انہی کی خاطر ماں باپ کی عزت کے ساتھ خود کو بھی رول دیتی ہیں اور وہ حضرات جو خود پر سب بکھڑا جب سمجھتے ہیں، ان کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ یہ سب ان کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ آخری صفحات پر برکس کا شرف زبیر کی تحریر نے بھی اچھی قدر فراہم کی۔ کامی کے اس دنیا سے جانے کے بعد حاکم حقیقت جاننے کی خواہش نے جب رنگ دکھلائے۔ منسل شعر و سخن میں موبائل سچا زیادہ نظر آئے۔"

**فقہ محمد یوسف سانول، نور پور قتل خلیع خوشاب سے حاضر ہیں۔** ناہر روئی کا شمار اپنی تمام تر عہدوں کے ساتھ یک اسٹال کی جب نہت بنا توئی حاسد سالے سے مل گئے۔ اللہ ظہر بہ سے بچائے۔ ہمارے پیارے سسٹمز کا وہ دن کوئی رات چو گئی تھی خاطر مانے (بہت شکر ہے) سب سے پہلے محترم ایلیا صاحب کا انٹرویو قانون پڑھا۔ سچ کہہ رہے ہیں سچ کہانی کے یہ بھی حالات قانون کی حکمت ہے کہ جب قانون بنانے والے ہی قانون کا احترام نہ کریں تو حاکم اولیٰ خاک احترام کرے گا۔ جب منسل میں انگری وی تو تمام اراکین منسل ایک بار تھے۔ ساتھ ساتھ پشاور کی..... پاکستانی تاریخ کا بہت بڑا اہم ہے۔ ساتھ ساتھ وہ کیونکہ محرم بچوں کی شہادت اور بڑوں دشمن کی کاہرولی.. ایسی المناک حرکت ہے کہ دن بے اختیار رو پڑتا ہے۔ میں بوجہ کام کی کثرت فروری کے شد سے میں شرکت نہ کر سکا اس لیے اسوں سے۔ کئی عہدایت پر وہ شہاد پر زور کو بہت بہت دن مبارک۔ اچھا تیرہ لکھا۔ یہ دینا تقویٰ بکھرے تخریف لائیں جو کہ میرا پڑوی خلیع ہے، خوشی ہوئی اچھا لکھا۔ عہد ارباب روئی انصاری شیک بھوکا آپ کو میری باتیں ابھی گئی ہیں۔ سب سے پہلے سوائے جنوں ڈاکٹر عہد لرب جلی نے وہ آہی لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ ان اعلیٰ رنگت والے چہروں سے پردہ ہٹایا ہے دل بڑب جاتا ہے جب انسان حقیقت سے آڈار ہوتا ہے کہ کتنے ظالم ہیں یہ یہی جرم امت مسلمہ کا اتنا نہیں دیکھ سکتے۔ اس کے بعد ملک مشہد حیات کی کاش پڑی جو مل ملک صاحب نے ایک بار پھر محرم کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ آہی لکھتے ہیں کہ ہارنے والے سے بچانے والے کا ہاتھ تیز ہے۔ زاہد اور سچی سے تو اور جٹ کا پورا نظام کر لیا تھا مگر خدا نے اسے بچایا جسے اللہ کے اسے کون چھے۔ اس کے بعد برکس پڑ گیا۔ کاشف زبیر صاحب کی ایسا لگتا تھا کہ یہ کہانی کاشف صاحب کی لکھی ہوئی نہیں، کہانی میں کافی جھول تھے۔ وہ مامعہ شوق تاریخی کہانی پر تیرہ اگلے باہم مل پڑا کہ وہیں گئے۔ وہیں یہ حصہ اچھا تھا۔ جی اللہ میں صاحب مادی کو گنج طریقے سے آگے بڑھا رہے ہیں۔ مادی کی یادداشت وہیں آگئی۔ میرا کو صاف کر دیا، بہت اچھا لگا۔ وہ آہی محبت کرنے والوں کے دل و سچا ہوتے ہیں۔ عارف حق بنیا تشیم بگرائی بر باد ایمان کو تازہ کرنے والا جاوا تو لے کر آتے ہیں۔ خدا ان کے گم میں برکت فرمائے۔ وہ ایسی کا سوال منسل حیدر نے کیا خوب لکھا۔ وہ آہی صورت کا گج کے مانند ہوتی ہے۔ حرا اور شا کا انہام ہمارے لیے محبت کا پیش ہے اور بدکاری کے حوالے سے لکھا گیا فرماؤں خدا پڑا کہ ہر ذرہ کرے گا وہ اپنے گم کو راست دیتا ہے اور اس کی ادا گئی اس کے گمروا لے کر تے ہیں، الامان۔ باقی کھڑیں ابھی تھیں۔ شامت کہانیوں پر تیرہ محفوظ ہے۔ منسل شعر و سخن میں تمام داستانوں کا انتخاب اچھا لگا۔ آخر میں کھڑیں ابھی تھیں۔"









اپنے ہی رنگ میں لاجواب قلمی کہانی لے کر آئے اور بہت خوب دہے اسکی ہی ایک کہانی کچھ عرصہ قبل شائع ہوئی تھی۔ خود بخود نے اسے لکھا اور گتار کا کردار پھر گن رکھا انہماں اور داد کا کردار بہت نر دوست رہا۔ آگے آگے دیکھے ہوتا ہے کیا۔ ملن حسداں لیے بدترین ہے۔ گنا۔ نے اپنے آپ کو تہا کر لیا۔ آگے اس کا انہماں کس طرح سامنے آتا ہے کیا بھائی بہن کی ملاقات ہوگی مگر کس موڑ پر سب کو شدت سے انکار ہوگا۔ ملک صاحب کا کارنامہ بھی بہت نر دوست رہا۔ کھوجی کی مدد سے قائل کو جا پکڑا مگر اندر سے نکلا کون۔ یہاں بھی ایک صورت کا کردار، انتقام کی آگ میں کس طرح برہا ہوئی اور کس طرح کاش مند سے نکلا یہ کاش پہلے نکل جاتا۔ بڑی مہرت انگیز کہانی۔ اسی طرح کمرہ زخم بھی ہم پڑھنے والوں کو ذہنی کر گیا ماں اور بیٹی کا کردار اور انہماں سانس زندہ باو۔"

۱۱۱ ایم اے فاضل فریدی، نیرنگ سے چلے آ رہے ہیں "مردانہ از سے محفل یادوں میں جگہ حاصل کرنے کی اپنی ہی کوشش کر رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ تاج کو بچوس نہیں کیا جائے گا اس سے پہلے بھی دو تیرے اردنوں کر چکا ہوں مگر لگتا ہے کہ نامہ بر بھی رقبوں سے جلا تھکی کوئی بات ہوگی (ارے میں بھی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ محفل میں خوش آمدید) کچھ پرانے ساتھی گاہے گاہے محفل میں نظر آتے رہتے ہیں ساتھ ساتھ کئی نئے دوستوں کا بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ محفل کے نئے ساتھیوں کو خوش آمدید اور ہوا دم در شہوار اور زیادہ کو سندھ خاص پر براجمان پایا۔ ہماری طرف سے مبارک قبول فرمائیے۔ شبانہ حسن، اعجاز رحمدل، سیدہ بیٹا نقوی، مہرین ناز، طاہرہ گلزار، مگر کے تیرے دوسرے تمام ساتھیوں کی طرح ٹھیک ہی تھے۔ محفل یادوں سے فارغ ہونے تو سب سے پہلے ہمدوی (ازگی الدین نواب) کے حالات و واقعات سے آگاہ ہوئے۔ پتا چلا کہ مراد بھی بے مراد نہیں رہتا چاہتا تو انبیب چاہے بھی اپنی محبوبیت پر قائم ہے۔ ہمدوی بے چاری تو ان دونوں کے بیچ میں ہی رہی ہے لیکن محبوب کے اعصاب پر ہمدوی ایسی چھائی ہے کہ اسے میرے جیسی یاد کرنے والی کا کبھی احساس نہیں۔ اسی طرح میرا بھی دشمن ہی کی ہے سو جتنی ہوگی کہ شاید کوئی مجھ کو جو جائے۔ ایساں بیٹا پوری در مانعہ عشق لے کر۔ اولین صفحات پر ایک خوب صورت تاریخی تحریر لے آئے در مانعہ عشق بہت پسند آئی آخری صفحات پر کاشفہ بزرگ صاحب برعکس کے ساتھ نظر آئے مگر گستاخ صحاف ان کی تحریر کوئی بھی محفل دل دو مانعہ میں بتانے سے قاصر رہی۔ ہائی زہر مطالعہ انشاء اللہ اگلی مرتبہ ایک بھر پور تیرے کے ساتھ بھر جاسی دیں گے۔"

۱۱۲ اور بس احمد خان، باہم آباد، کراچی سے تیرہ کر رہے ہیں "سرورق کی حسین ناز میں زینس کھرانے ایک منظرہ انداز سے ادائے مستانہ لیے ہوئے خوابوں کے تانے بانے بن رہی تھی۔ بس منظر میں جملہ محبت کھمبے ہوئے ہیں۔ اندر انشاء میں حکمت کے سوتی چنے جس میں قانون کی عبادت کی ایہ بیان کیا گیا۔ سب سے بڑا ایہ بھی ہے کہ قانون موجود ہے مگر اس پر عمل نہیں ہوتا نتیجتاً ہر طرف بے گنتی اور فتنی فتناسی انسانی رویوں میں تبدیلی ہے۔ قانون بنانے والے خود ہی قانون بناتے اور خود ہی قانون توڑتے ہیں۔ اس کے برعکس عوام سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ قانون کی پابندی کریں۔ اس کے بعد اندر انداز یہ سے مستفید ہوئے۔ سرفہرست در شہوار ہیں مبارک باد۔ دیکھتے پرانے دوستوں کی حاضری بھی بھر پور تھی۔ ریح کے جھروکوں سے ایساں بیٹا پوری در مانعہ عشق لے کر آئے۔ جس کے عمر میں آخر تک محسوس ہے۔ دوسری قسط کا انتظار ہے؟ طاہرہ جاوید محفل کی کامیاب مباحثہ تھی۔ ناب جیت کر بھی ہار گیا محبت کے اعزاز نالے ہیں۔ تیسری کہانی عہد ارب بھلی کی سوداے جنوں تھی۔ جس میں فلسطینیوں کے حب الوطنی اور حریت۔ پسندی کی کہانیاں ہیں۔ اسرا نگلیوں کی متضادانہ کارروائیاں فلسطینیوں کو ان کے کاز سے پیچھے نہیں ہٹا سکتیں۔ مہمان، گہرا ڈھنگ بھی اچھی لگیں۔ وہ اپنی کا سوال 'س میں ہوں' سے محفل پر پردے ڈال دے۔ نتیجتاً بھرتے ہوئے شطوں میں دو گھرتا ہوا ہے۔ ناکام حشر میں لیے ہوئے چار جوانیاں اپنی لگائی ہوئی آگ میں جلی گئیں۔ افسوس صد افسوس کہ بتا سوچے کبھی جو بھی کام کیا جائے وہ تہا ہی پر بیچ ہوتا ہے۔ ہمدوی بھی پڑھی جاری ہے مگر وہ انداز نہیں کہ ایک ہاد تحریر شروع کر دو آخر تک تحریر سے نظر نہ اٹھے۔ کتر نہیں بھی خوب تر تھیں اور محفل شعرو سخن کے کیا کہنے کہ منتخب اشعار پڑھ کر مزہ آ جاتا ہے۔ نتیجہ میں بھی بہتر تھی۔ لاجب قلمی کہانی پانچواں اجزاں بہت اچھی لگی جس نے حسد زنی پر بھیر کر لیا۔ منظر نامہ کا منظر وی انداز ہے جن کی کہانیاں بگلی بگلی پیغام رسائی ہوتی ہیں۔ دونوں کو روحانی روشنی سے منور کرنے والی دلیوں کی کہانیاں سننی آموز ہوتی ہیں مگر اس کے لیے انہماں کو ہدایت دیتا ہے۔ اللہ ہم سب کو مہراہ مستقیم پر چلنے کی توفیق دے (آمین) یاد پیر اور زندہ بھوت بھی دلچسپی کا منظر لے ہوئے تھیں۔ کاشفہ بزرگ کی برعکس جس نے آخری صفحات کی متابعت سے بہت متاثر کیا۔ یہ آج کے معاشرے کی جی دکھائی کرنے والی کہانی تھی۔ شاید یہ ہر گھر کا مسئلہ ہے۔ دنیا کے کوئی بھی ماں باپ اپنی اولاد کے لیے برا نہیں چاہیں گے اولاد کے سلسلے میں اپنی ناز سے داری بنانے کی کوشش ہر اولاد کے لیے ماں باپ کی پہلی ترجیح ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ رخصت اور دعا کہ ہند نیا سال ہر انسان کے لیے نیک سائنس لائے" (آمین)

۱۱۳ احمد خان توحید کی، پاکستان اسٹیل، کراچی سے حاضر ہو رہے ہیں "شمارہ فردی چار دن لیٹ 20 جنوری کو ملا۔ در شہوار اور زیادہ کو تیرہ کے ساتھ گھڑ سے پر سوار نظر آئیں۔ مبارکباد۔ سسر طاہرہ گلزار، مہرین ناز، عہد ارب انصاری، شبانہ حسن، اعجاز رحمدل اور تیرے۔ بھاگ کر ہمدوی پر جاں پھینکا۔ آخر مراد کو بلا ہے جو ہمدوی مریندور صاحب ازداد اپنی عشق چاہتی ہیں۔ اسلام میں چار شادیاں چاہتے ہیں۔ کاش میں ملک صاحب منگی تک پہنچ گئے۔ زہادہ کو بے وقتی کی اچھی مزا ملی۔ زہادہ چودھری، شبانہ حسن، اسما انصاری، اعجاز رحمدل، نذر بان سلطان، امین گبھار، اقبال کوٹلی، محمد حسن عرضی اچھے اشعار ہیں۔ مشیل حیدر، وہابی کا سوال، اچھی اسٹوری لائے۔ جاگیر دار نول میں یہ عام بات ہے۔ عیاشی کرنے والوں کا انہماں شہزادہ جیسا ہی ہوتا ہے۔ اپنی بیٹی کو سانس دیکھ کر جاگیر دار نے خود کو گولی مار کر جہنم داخل کر دینا تمام تہذیبیں ساتھیوں سے اچھے کہ محترم ملی سفیان آقا قی صاحب کے لیے خصوصی ۱۱۱ ات برائے ایصال ثواب ضرور کریں۔"

۱۱۴ وسیم احمد خان، خانپور سے محفل میں شریک ہیں "نزداری کا شہدہ حسب دستور 18 تاریخ کو مل گیا، ناسل پر اپنے محبوب کی تصویریں کھرانے و راز حسینہ منگھوے دانوں کی لٹائیں کرتے ہوئے ذرا اچھی نہ تھی۔ انشاء یہ پڑھنے کے بعد اپنی محفل میں حاضری دی، جہاں پر عہدہ و ذارت سے مستفید ہوتی ہوئی در شہوار صاحب سے ملاقات ہوئی، ان کا تیرہ اچھا لگا۔ منظرہ سادہ بھائی اب آپ کی کسی طبیعت ہے۔ اللہ آپ کو صحت عطا کرے۔ ہمارے



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)





سیال صاحب اللہ تعالیٰ آپ کی اسی جان کو جنت اندروں میں اعلیٰ مقام عطا کرے آپ کو سہر دے۔ اپنا مخلوق کچھ کر اور پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے عویر و پاش کی زندہ بھوت پڑھی، اچھی کہانی تھی۔ مرید کی پٹن چائے نے واقعی کمال کر دکھایا۔ منظر امام حسب دستور قطعہ کہانی میں بھی طبیعت اراغ و بہار کر گئے، وہ ایسی کا سوال منقہ حیدر کی سبق آموز کہانی ہے مگر موضوع پر اتنا تھا۔ اہل ظاہر جاوید کی کامیاب ممتوج بہت زبردست کہانی رہی جس میں باہر نے اچھا فیصلہ کیا۔ ظاہر انگل، بس زمان اور ستاروں پر کتنے ہی نسط اور کہانیاں لے کر آئیں جلدی پلیز، محفل شعرو سخن حسب روایت خوب صورت اشعار سے مزین تھی۔ فرسٹ ایکنڈ، تھرڈ اینڈ شوہر زبردست تھے۔ منہر بیڈ منسٹر صدر صاحب، خانوہ، احمد خان توحیدی، ذریبان سلطان، کراچی، ایم ٹی اے، شہانہ حسن، در شہار کے اشعار بھی قابل ستائش ہیں۔ مگر ان اعلیٰ معراج رسول، عذر رسول کے صاحبزادے ذیشان رسول کی شادی کے بارے میں پاکیزہ میں پڑھا تھا۔ ہماری طرف سے بہت بہت مبارک ہو۔ ساقد پشاور کے بعد ساقد شکار پڑنے ایک بار بگردل نم سے پھیل کر دیا، اللہ پاک دہشت گردوں کو قاتل کرے۔ ہم سب پر اپنا رحم و کرم کرے اپنا فضل عطا کرے۔“ (آمین)

سہاگر ٹکو کر، چشمہ حیرانج سے چلے آ رہے ہیں "سپنس نے بہت انتظار کر دیا۔ سرورق میں سپنس کے مطابق تھا۔ اتنا یہ میں جون ایلیا کے تیسری سورتوں کو دل میں سمیٹا۔ ابتدا یہ میں وہ تھی درست کہا گیا ہے کہ تیسری جالوں کے نقصان کو پورا نہیں کیا جاسکے گا۔ اہل مجال کی بزم میں در شہار اول ٹھہریا مبارک ہو۔ شہانہ حسن صاحبہ اعجاز مہرین اور ڈھکو صاحب کے خطوط شہنشاہ رہے۔ ذریعہ نیازی اور ظاہر و گھڑا کے طویل محبت نامے دل کو لگے۔ کامیاب ممتوج ظاہر صاحب نے ہمیشہ کی طرح لازوال لکھی۔ سو دوائے جنوں دل کی آنکھوں سے پڑھی جانے والی کہانی ہے۔ مہرین، وہ ایسی کا سوال اور تیسری سورتوں کی کہانیاں تھیں۔ کاش کاش ہماری زندگی میں نہ ہوتا۔ مگر از غم و آہی مگر از غم تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید جیسا لکھتے ہیں وہ بیجا کوی نہیں لکھ سکتا۔ قطعہ کہانی منظر امام ایک لفظ ایک اشارے سے یا ایک سطر میں پوری داستان کچھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان کی مختصر نوکیلی کہانیاں بے کرب منظر کما لگتا ہے۔ ہر بات مفصل ہوتی ہے۔ تاثرات کی ابتدا کسی معمولی بات سے ہوتی ہے۔ جو آخر تک پہنچے ہی غیر معمولی بن جاتی ہے۔ پڑھنے والا چونک اٹھتا ہے کہ غیر اہم اور اہم اور دوسری سورتوں میں سرتاتا شکرٹ کیسے ہو گیا۔ باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔"

مار یہ خان، اسلام آباد سے شرکت کر رہی ہیں "دل و عویر تا ہے بھر وہی فرصت کے رات دن ..... سچ میں اگر ہمیں فرصت مل جائے ایسے ایسے تاریخی خطوط لکھیں کہ بس۔ ہمارا سپنس ڈائجسٹ کے لیے پہلا خطا ہے لہذا اس کو روکی کی نوکری میں ذرا ان مہرت مت بتائیے گا (ارے نہیں جی خوش آمد یہ) فردی کا سپنس ڈائجسٹ میں جنوری کو موصول ہوا، دیوانہ وار مطالعہ کیا تاکہ اگلے شمارے کے نزول سے قبل تبصرہ تحریر کیا جاسکے۔ اس بار تو سرورق کو دیکھ کر صنف کرمت ضرور ریشہ لگی بلکہ انہوں نے ڈول ہوئے ہوں گے۔ جون ایلیا کا اتنا یہ بیوان قانون پڑھا۔۔۔ ہماری ناقص محسوس مرحوم کے اتنا یہ کی معنویت تو کچھ نہیں پاتی، تاہم اتنا کچھ آتا ہے کہ نو بیوہ قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی بھر پور سعی کرتے ہیں، اولاد یہ پر ہم کوئی تبصرہ نہیں کریں گے کیونکہ ساقد پشاور ہم پر قیامت تین کرنا تھا۔ بہت سے بھلوں کے سچ ہمارے گلشن کے دو پھولوں کے جتانے سے بھی تھے، جی ہاں ہمارے دو کزن اس سلسلے میں شہید ہوئے ہیں۔ اللہ پاک شہید ہونے والے تمام بچوں کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے، آمین۔ خطوط میں پہلا خط در شہار بیڈ زادہ کا اعزاز کی قرار پایا۔ واہ کیا تعریفانہ انداز پایا ہے۔ ویڈیو ملی، ہائی تحیرہ نگاروں نے اچھا لکھا۔ ابتدا، ابتدائی صفحات کی کہانی در نامہ عشق سے کی۔ کہانی کے مندرجات پر تبصرہ کرنے کے لیے ہمارے خط بہت چھوٹے ہیں، ہمیں اپنی کم لکھی کا احساس ہے۔ تاہم اتنا کہیں گے کہ فیروز بخت، داؤد اور گلزار کی اس تاریخی داستان کے جتنے حصے کا ہمیں شدت سے انتظار ہے۔ سو دوائے جنوں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ان تحریروں میں سے ایک ہے جس نے ہمیں قطعہ سے ہی ہمیں اپنا گرویدہ کر لیا ہے۔ کوہد کے اہد یہ دوسری کہانی ہے جس میں صیہونی قوتوں کی ریشہ دوانیوں کو منظر عام پر لایا گیا۔ بہرا ننگی سازشوں کو بے نقاب کرتی یہ داستان قابل ستائش ہے، حکم مندر حینت کی کہانی کاش ہمارے سا اشرے کے ان مکروہ کرداروں کی روداد تھی جن کے روشن چہروں کے پیچھے تاریک ذہن ہوتے ہیں، زہاد و سنہنٹنی کے ساتھ ساز باز کر کے لالی کے تان میں اپنے شوہر انور جت کو چھانسانے کی کوشش کی مگر ملک صاحب کی محنت رنگ لائی۔ ظاہر جاوید مثل، جھپٹوں کی کہانیاں لکھنے والے ایسے قلم کار، جن کی تجزیہ ہندی ترجمہات میں مثال رہتی ہیں۔ ذریعہ تبصرہ کامیاب ممتوج تین دنوں کی تال پر دھوکی اس کہانی میں اسی صدی کی عورت نے۔ سب پر جی کو ترجیح دیتے ہوئے اپنے تئیں دانش مندانہ فیصلہ نیا، اعلیٰ عرصے بعد آخری صفحات پر محسوس ہونے والے قلم کار، کاشف زہیر کا نام ہی سند کا درجہ رکھتا ہے۔ جس سے۔۔۔ ہے سورتوں کی جہونی و قادری کا پرفریب عکس، مہا کی ماری کا دلخراش ماجرہ۔ کہانی پڑھنے کے بعد رحمت کے حوالے سے ہم نے بے عنوان سا جذبہ محسوس کیا، اپنے دل میں سچ کہتے ہیں کچھ لوگوں کی عارضی رفاقت واقعی یادین چھوڑ جاتی ہیں۔"

اسماء عبدالغفار انصاری، لاہور سے محفل کی زینت بنی ہیں "سرورق خیالوں سے بھر پور آواں اس سا نگ رہا تھا۔ جون ایلیا کی قانونی باتیں اور ان کا خوف ہانے اتنی گہری باتیں اور بھر اپنے پیادے ملک کے حالات بھی ایسے کہ جون ایلیا نے چھپک ہی کہا ہے۔ خیر اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو امن و آسائش کا ہوا دے۔ آمین۔ یہ میری سے اپنی محفل میں پہنچے تو اپنا مخلوق کچھ میری ساری تھکان ہی دور ہو گئی۔ کچھ تو لگے شمارے کے لیے صحت اور بڑھ گئی اور یہ خدا بھی لکھ لا۔ محفل میں سب لوگوں کے خط بہت اچھے لگے۔ آپنی در شہار تو صدائی فرانسس پورے کر کے زبردست تبصرہ پیش کر رہی تھیں۔ شہانہ حسن کا مراسلہ بھی اچھا لگا، عاتنا حبیب الرحمن اتنا آپ کی مصیبتیں دور کرے۔ آمین۔ آپنی ظاہر و گھڑا فریختی ہوئی آپ بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ امیر حسین صاحب آپ محفل میں آئی گئے ہیں تو نظر نہ کیوں چرا ہے۔ اہم کمال آپ تو بہت حساس ہیں آپ کا خط پڑھ کر تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ پہلے باروی کے دلشن لیے مرانے کریتے کچھ لکھنے کا مریش، بناوہ بھی نازل تو کئی اہل کار۔ آخر مراد سب کو فخر دے کر پاکستان نکل گیا اور نامہ عشق تو بہت پسند آئی، تاریخی کہانی ایک دوسرے کے





ساتھ سائیکس کرتے ہوئے دلچسپ پہلو نظر آئے۔ گھنار کے ساتھ تو بہت برا ہوا تھا اسے اپنے کیے کی سزا بھی ملی، میرا لحاظ سے اس کی کہانی ہے۔ کاش  
تو کاش ہی رہ جاتی زندہ بھی اپنے کیے کی سزا بھی ملتی اور لالی ہے چارے موت ہی مارا گیا۔ ملک مفرد صاحب کی یہی کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں  
جن محاشرے کے اچھے برے پہلو سے پردہ اٹھا ہوتا ہے اور فلسفین کے مسلمانوں کی جوں فرادستان سووائے جنوں بھی بہت اچھی لگی۔ ہانڈار  
مسن کا ہوشیاری سے بچ لگنا اور ہانڈا کا غیر مسلم ہونے بھی ساتھ روح آفرین، انگریز تھا۔ عارف حق میں ولی شیخ احمد کے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا۔ ان  
کے ایمان اور ذوق واقعات چڑھ کے دل روشن ہو گیا۔ اس دفعہ بہت اچھی اور پیاری کہانیاں پڑھنے کو پیش سمائی کہانیاں بھی زیر مطالعہ ہیں۔"

فلا بشر علی افضل، بہاولپور سے شریک مغل ہیں۔ 20 جنوری کو سنس ملان۔ پورے ناسکل پر صنف نازک براہون تھی۔ ایک پورے ان حوالی نظر  
آ رہی ہے۔ انشائیہ ایک نئی سرگزشت چڑھی معلومات میں اضافہ ہوا۔ اپنی مغل میں پہنچنے انگل کی باتیں دل کو تکتی ہیں۔ در شہوار سے زادہ بہاولپور سے کرسی  
صداوت پر آپ کو دیکھا ہوا آئی دل خوش ہوئی۔ کرسی صداوت مہارک ہو۔ 16 جنوری کو میری محبت کرنے والی بہن میں دارا مفارقت دے گئی۔ ان کے غیر  
زندگی اور حویلی ہی ہے ہم سے بہت محبت کرتی تھیں، جلدی چھوڑ گئیں ہمیں۔ ان نے بیحد سے معذرت کریں۔ در شہوار ہمیں یاد رکھنے کا شکر ہے۔ باقی رسالہ پر  
تیسرا لگے ماہ کروں گی۔" (اشاپ کبیر ٹیل حطافرمائے)

انکا احسان سحر، میانوالی سے حاضر ہو رہے ہیں۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ تمام مسلمان پاک کو اپنے حفظہ میں رکھے۔ آمین۔ عادتیں بھی زندگی  
کا حصہ ہوتی ہیں۔ انسان ہمیشہ اچھی عادتوں کی ہی وجہ سے بلند مقام پاتا ہے۔ حسب معمول سنس وقت پر عمل گیا۔ چہ ہو یا نہ چاہو وقت گزری جاتا ہے  
اور اسی گزرے وقت میں ہی ہم نے سنس ختم بھی کر لیا۔ چیزیں ہوتی ہی ختم کرنے کے لیے ہیں۔ پھول بکھرنے کے لیے ہی کھلتا ہے۔ سنس بھی ختم  
کری لیا۔ ناسل کو دیکھا۔ ناسل کی صنف نازک ہمیں ہی دیکھے جا رہی تھی اور اسی اور بیرون میں تھی کہ شاید ہم پہلے ہی ایک اور سے کوئل اور دیکھ چکے تھے۔  
کب یہ یاد نہیں۔ خیر آگے بڑھے کیونکہ آگے بڑھنا ہی دانش مندی ہے، جون ایلینا سے اسٹارٹ لیا۔ جون ایلینا اس وقت تو ہم میں زندہ نہیں۔ لیکن اپنی  
تقریروں میں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ قانون، جرائم کا ہونا ہے پھر یہاں کو کوئی قانون نہیں ہے، پھر کیسے پتا چلے گا کہ اندھا ہے یا بہرا۔ جس چیز کا وجود ہی نہ ہو  
اس کا رد کیا۔ آگے بڑھے، گھنڈی مورتیں ہیں۔ دل میں صدائیں ہیں، آگے ہم اپنی مغل میں۔ یہی تو ہماری روایتیں ہیں۔ غواہیں دل میں ہی پیدا  
ہو کر دل میں ہی مر جاتی ہیں۔ ہماری غواہیں بھی ہمیں ہر ادبیاں سمجھاتی ہیں اور اس بھی نہیں ہم ایسے کم ہوجاتے ہیں جیسے سورج نکلنے ہی ستارے۔ در شہوار  
کالی مرے بعد نظر آئیں اور آتے ہی سب سے آگے اور نمایاں مقام حاصل کیا۔ مہارک ہو بندہ ناچیز کی طرف سے۔ اسباب مطلق، طاہر جاوید صاحب  
مورت نما نیکی کے حوالے سے ظلم چلایا۔ نیکی تو خیر کچھ میں آ جاتی ہے۔ پر یہ عورت ذات بھلا کب کچھ میں آتی ہے۔ ممان، عجیب اور نا بکھ میں آنے والی  
صورت حال کا سامنا رہا۔ مطرب وائلوں کے اعزاز مطرب والے ہی جائیں۔ ہمارے ہاں انکی صورت حال بھی پیدا نہیں ہوتی۔ کاش، ملک صاحب اس دفعہ بھی  
ایک نئی کہانی سمجھانے میں کامیاب رہے۔ بات اور جٹ سے ہوتی ہوئی شش پر ختم ہوتی۔ نہیں بات پھر ایک عورت پر ہی ختم ہوئی جو کسی کی بھی نہ ہوتی۔  
کسی کی ہو کر بھی یہ گھر ہی رہی۔ گہرا زخم، زخم ہی رہا۔ ہے۔ فیروں کا دیا ہوا زخم تو انسان بھول جاتا ہے۔ پر انہوں نے کوئی دیکھے ہوئے زخم ہمیشہ ناز سے ہی  
رہتے ہیں۔ وہ انکی کا سوال، وہی چہ دہریوں اور ڈہریوں کی عیاشیوں اور بے عزتیوں کا احوال، انہیں کسی غریب کی عزت پر ہاتھ ڈالتے ہوئے گھر میں بیٹھی  
اپنی عزت کا خیال نہیں رہتا۔ انہیں نے کاشی چھتھی دی۔ چوت لگانے والے کو انکی ہی چوت لگائی جو بے تواس احساس ہو گا درد کا۔ زاری، لگتا ہے انشاء ہی  
جانب گھڑن ہے۔ مر او لگتا ہے صاف بچ کر نکل جائے گا انڈیا سے۔ مرینہ کے ساتھ کاشی کو کھاتا رہا۔ محبوب کی بے تازیباں مروج پر ہیں۔ شش، چاروں نے  
کاشی مہارت سے اپنا انتقام لیا۔ قصہ کہانی، اس بار بھی مختصر نام صاحب مات کھا گئے۔ انکی باتیں بھی اچھی انہوں۔ یہ بھی بیان نہیں کرتی چہ نہیں خاص کر  
یوز سے خود غیر شادی شدہ سے۔ کیا پتا کب جہان ہو جائیں اور ہماری پسندی چہری کر لیں۔ ہانڈا بھی اچھی کاوش تھا، میرا غودی پنہن گیا۔ زندہ بھرت،  
مرینہ اپنے پڑائی کی کامیاب حکمت عملی سے وہیں ٹکسٹر شکار ہو ہی گیا۔ بڑوں کو پھانسنے کا یہی طریقہ کامیاب ہے۔ انکی صفات کے لیے کاشف زبیر کی  
برکس کا مطالعہ کیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ماں بھی سمجھتی ہے بچے کو۔ پر معاشرہ بھی سمجھتا ہے۔ ماں ہمیشہ بچے کو اچھا اچھا ہی سمجھتی ہے۔ پر معاشرہ زیادہ برا ہی  
سمجھتا ہے۔ کاشی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جوانی کے جذبات کے لیے میں ماں کے دیے ہوئے سبب بہہ گئے۔ انکی دونوں ہاتھوں سے ہی جیتی ہے۔ عمار  
اور کاشی کے بھڑکیے جذبات دونوں کو ہی لے ڈا رہے۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے مغل میں شامل نہ ہو سکے۔

ابرار وارث، سندھ طیانوالی، شبان مسن، لاہور۔ محمد اسحاق، انجم، ننگن پور، قصور۔ فاروق احمد قریشی، حیدرآباد۔ محبوب منصور، سوہرہ، لاڑکانہ۔ اعجاز احمد  
راشل، میانوالی۔ بہترین تازہ حیدرآباد۔ ریاض بٹ، حسن ابدال۔

### سانحہ ارتحال

کئی معشروں سے اس ادارے سے مسلسل تھی اور قلبی و دماغی کے بعد معروف فلم ساز اور ہدایت کار جناب علی سفیان آفاقی 27 جنوری کی  
شام خالق حقیقی سے جا ملے۔ رب العالمین ان کی معذرت فرمائے اور انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ادارے کے جملہ اراکین مرحوم کے  
بہن مائگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔



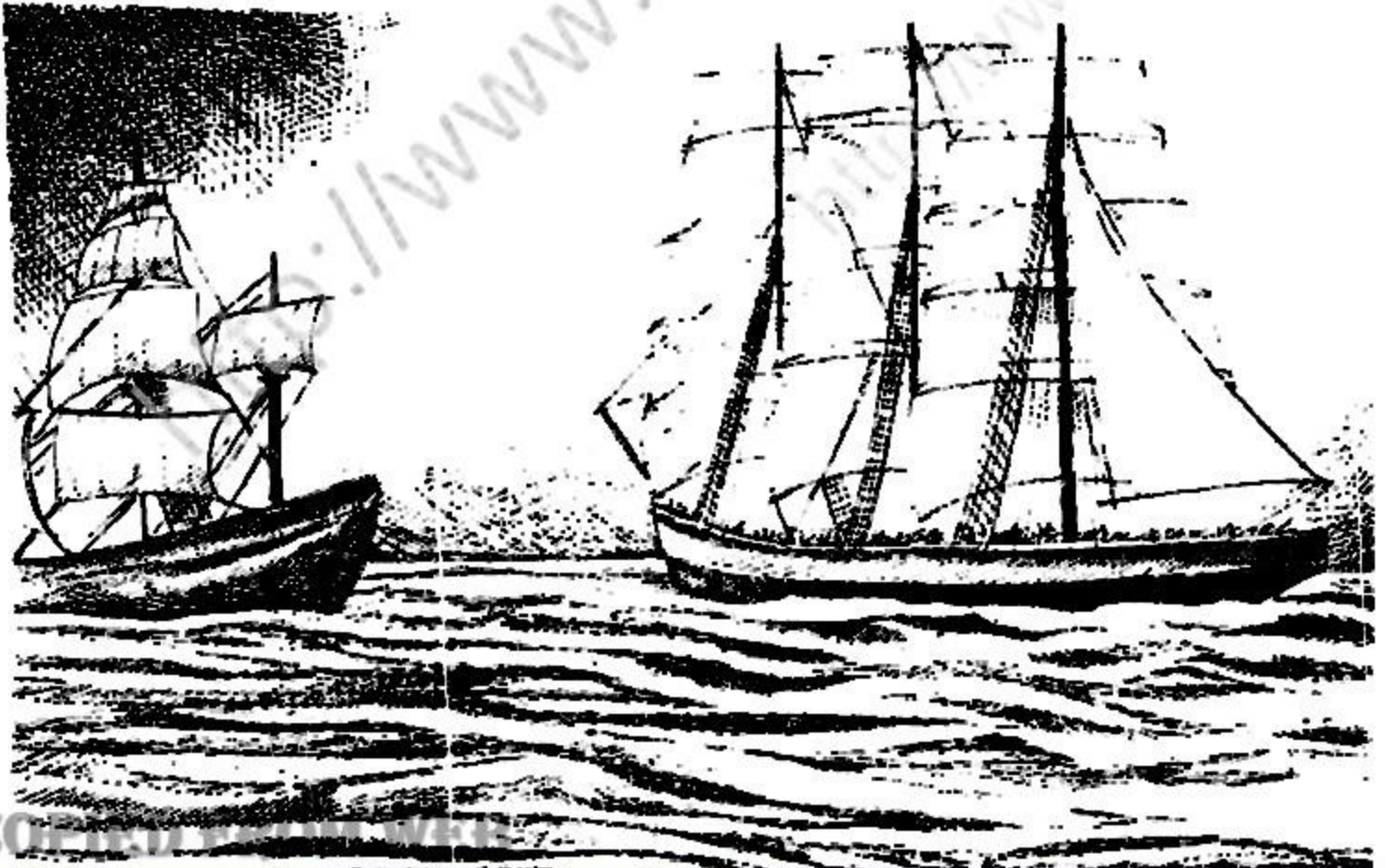
# درماندہ عشق

دو ملاحظہ

السیہ سیتا پوری

دنیا میں سب سے مضبوط اور مخلص رشتہ اللہ تعالیٰ نے  
والدین کا بنایا ہے... اس حقیقت کا ادراک ہر اس شخص کو  
ہو چو بی بننا جس کے سر پر یہ سایہ موجود نہیں، والدین...  
جو اپنی اولاد کو زمانے کی تہی دھوپ اور راہ میں بچھے کانڈوں  
سے بچا کر اپنی شفقت کی چادر میں چھپا لیتے ہیں، بس یہی دکھ  
اس کی زندگی کا سب سے بڑا روگ بنتا جا رہا تھا جو حالات کی ستم  
ظریفی کا شکار ہو کر ایسے لوگوں کے درمیان پھنس گیا تھا جنہیں اس  
پر ظلم ڈھانے وقت نہ تو انسانیت کا سبق یاد رہتا ہے اور نہ ہی عذاب الہی کا  
خوف... تاریخ گواہ ہے کہ ایسے کتنے ہی کرداروں نے اپنی تمام مافیگی  
کو اپنی ایسی طاقت بنا لیا جس سے نہ صرف زمینی مملکتیں بلکہ دل کی دنیا  
بھی بسخیر کر لی۔ وہ بھی ایک ایسی ہی داستان رقم کرنے نکلا تھا جس کا ہر  
لفظ ایک الگ ہی معنی میں ملبوس تھا۔ جس کے ہر موڑ پر تحیر و اسرار پوشیدہ  
تھے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی بھید بھری شخصیت نے ایک اور ہی روپ دھار لیا جس  
کے باعث تاریخ نے اسے اپنے دامن میں چھپا لیا کیونکہ... اس کی زندگی کے نشیب و فراز  
سب سے جدا تھے۔

پہلی کتاب کا اختیاری اور بے اختیار اساتذہ کے عبرت اثر و اقتعات







COPI





اس نے... نماز مغرب کے بعد داؤد کو اس دیکھا تو کہا۔  
 میں نے آپ کو بے حد خوش و خرم دیکھا ہے لیکن اب میں  
 اس دیکھ کر بہت غم زدہ ہوا ہوں۔ اگر میں کسی بھی طرح  
 آپ کا غم دور کر سکتا ہوں تو حاضر ہوں۔ آپ مجھے غم دے  
 کر دیکھیے۔“

داؤد نے کہا۔ ”ستا! حیرتی غم خواری کا شکر یہ۔  
 میرے دل پر جو زخم لگے، وہ ایسے نہیں ہیں جو بے آسانی  
 مندرج ہو جائیں۔ ممکن ہے احمد آباد اور سورت کی مصروفیات  
 میرا غم غلط کر دیں ورنہ بظاہر تو یہی نظر آ رہا ہے کہ یہ زخم زندگی  
 بھر ہرے رہیں گے۔“

فیروز بخت، داؤد کے سامنے کھڑا تھا۔ داؤد نے اسے  
 پاس بٹھالیا بولا۔ ”فیروز بخت! یہ سارے تماشے جنہیں تو  
 اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے، دیکھنے نہیں ہیں۔ میں نے اپنی  
 زندگی میں بہت سے تشیب و فراز دیکھے ہیں۔ میں نے  
 بڑے زخم کھائے ہیں لیکن یہ آخری دور غم ایسے طے ہیں جو  
 شاید میری جان لے کر ہی گئیں۔“

فیروز بخت تو خاموش رہا، ستار نے پوچھ لیا۔ ”دو زخم  
 کون کون سے؟“

داؤد نے نظریں نیچی کر لیں۔ جواب دیا۔ ”گلنار کا حرم  
 سرا میں زبردستی داخل اور دہلی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دینا۔“  
 دہلی چھوڑنے کی چوٹ ستار کے دل پر بھی گئی۔ سرد آہ  
 بھر کر بولا۔ ”کہتے ہیں، سول مقبول ~~مکمل~~ نے جب اپنے  
 وطن کے کوچھوڑا تھا تو دہلی کی طرف جاتے ہوئے بار بار  
 کئے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتے تھے۔“

خیمے میں داؤد نے آنکھیں بند کر لیں اور اونٹ سے منہ  
 لیت گیا۔ ستار کچھ دیر کھڑا داؤد کی اس عجیب و غریب حرکت  
 کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد آہستہ سے کہا۔ ”میں آپ کی  
 اداسی کا ایک علاج بتاتا ہوں۔ اگر آپ اس پر عمل کریں گے  
 تو سارے غم بھلا دیں گے۔“

داؤد نے پوچھا۔ ”کون سا علاج؟ اگر وہ میرے بس  
 کا ہو تو ضرور کروں گا۔“

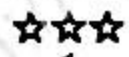
ستار کچھ دیر حائل کھڑا رہا پھر بمشکل کہہ ہی دیا۔  
 ”آپ شادی کر لیں کیونکہ بیوی یہ سارے غم بھلا دے گی۔“  
 داؤد نے جواب دیا۔ ”بیوی غم بھلائے گی تو خاک،  
 ہاں چند غم اور لگا دے گی۔“

ستار نے بے دہائی سے کہا۔ ”آپ ایسا سمجھتے ہیں ورنہ  
 حقیقت یہ ہے کہ شادی انسانی زندگی میں بڑی تبدیلیاں  
 لاتی ہے۔“

داؤد نے فیروز بخت کو ساتھ لیا اور احمد آباد روانہ  
 ہو گیا۔ احمد آباد میں بھی اس کی شاندار حویلی تھی اور اس میں  
 خدمت گاروں کی بھرمار تھی۔ راستے میں داؤد نے فیروز  
 بخت کو بار بار یہی سمجھایا۔ ”فیروز بخت! تو ایک گنہگار خاندان  
 اور نامعلوم والدین کا بیٹا ہے۔ تیرے ماں باپ سے بھی  
 واقف نہیں اور تیری یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے  
 میں نے تجھ کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔“

فیروز بخت اس کی باتیں بے دلی سے سن رہا تھا۔  
 داؤد نے کہا۔ ”تو مجھ سے پوچھ سکتا ہے کہ میں نے  
 شادی کیوں نہیں کی۔ میں نے دولت اور جائیداد کی وجہ سے  
 شادی نہیں کی۔ اگر میں شادی کر لیتا تو آج میں صاحب  
 اولاد بھی ہوتا اور اگر اولاد میں ایک آدمہ کے سوا ہاتی ساری  
 نالائق نکل جاتیں تو میری دولت اور جائیداد بھاپ  
 بن کر اڑ جاتی اور میں یہ حشر گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے  
 میں نے شادی نہیں کی۔ میں نے تجھ کو لاوارث سمجھ کر اپنا بیٹا  
 بنا لیا۔ اس طرح میں نے اپنی دولت اور کاروبار کا ایک صحیح  
 وارث تلاش کر لیا ہے۔ جو ایک تمہا انسان ہے۔ اب میں  
 تجھے یہ ہدایت اور وصیت کروں گا کہ میری طرح تو بھی  
 شادی نہیں کرے گا اور اپنی ہی طرح تو بھی کسی لاوارث  
 بچے کو پال پس کر بھی تعلیم و تربیت دلانے گا اور اس کو اپنا بیٹا  
 بنا کر میرے اس تجربے اور اس عمل کو جاری رکھے گا۔“

فیروز بخت نے وعدہ کر لیا کہ وہ داؤد کی وصیت پر  
 ضرور عمل کرے گا۔ ان کا قافلہ تیزی سے اپنی منزل کی  
 طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔



فیروز بخت کی جو عزت کی جا رہی تھی، وہ اس کے وہم  
 و گمان میں بھی نہ تھی۔ ستار خوش تھا کہ وہ اپنی وقاداری میں  
 کامیاب رہا تھا۔ داؤد بھی اس پر بہت مہربان تھا۔ دوران  
 سفر ستار کو ایک ہی تکلیف تھی۔ اس کا آبائی وطن دہلی کو سوں  
 پیچھے رہ گیا تھا۔ فیروز بخت بھی دہلی سے اُس رکھتا تھا۔ خود  
 اس کو بھی دہلی چھوٹ جانے کا گہرا ملال تھا لیکن وہ کبھی کیا  
 سکتا تھا۔

داؤد کے دل پر اپنی بہن گلنار کی جدائی کا بڑا اثر تھا۔  
 اکثر اس کی آنکھیں بھر آتیں اور آواز بھر جاتی۔ جب بیان  
 سے آگے قافلے نے قیام کیا تو سورج مغرب میں اتر رہا تھا۔  
 سرخ، نارنجی اور سرخی رنگوں سے آسمان نگار خانہ بنا ہوا تھا اور  
 دیکھنے والوں کو ان رنگوں میں مختلف شہنشاہیں نظر آ رہی تھیں۔

ستار اس دلچسپ منظر سے دیر تک لطف اندوز ہوتا رہا





اور ہمیں ان نمائندوں اور گماشتوں کے مکانات بھی تھے۔ داؤد نے قافلے کے ساتھ بڑا ڈیرہ رکنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے ایک گماشتے کے گھر چلا گیا جو کھیریل کی چھتوں والے دو کمروں کے مکان میں رہتا تھا۔ اس گماشتے کا نام نظام تھا اور یہ داؤد کے لیے ٹیل اکٹھا کرتا تھا۔ داؤد اپنے سامان اور فیروز بخت کو ساتھ لے کر نظام کے گھر چلا گیا۔ نظام، داؤد کو دیکھتے ہی خوش ہوا۔

نظام نے داؤد کی طرف دیکھ کر فیروز بخت کی طرف دیکھا اور آہستہ سے پوچھا۔ ”بزرگ محترم! ان صاحبزادے کی تعریف؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”نظام! یہ میرا بیٹا فیروز بخت ہے۔ کیوں کیا تجھے اچھا نہیں لگا؟“

نظام نے کہا۔ ”اچھا تو لگا لیکن جب آپ نے شادی نہیں کی تو یہ بیٹا۔۔۔۔۔“

داؤد زور سے ہنسا، بولا۔ ”میں نے شادی کے بغیر ہی بیٹا پالیا ہے۔“

نظام نے بات کاٹ دی، بولا۔ ”شادی کے بغیر ہی بیٹا پالیا، خوب لیکن میں آپ کو ان صاحبزادے کے سامنے ہی مشورہ دوں گا کہ آپ کو شادی ضرور کرنی چاہیے کیونکہ اپنی اولاد کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔“

نظام کے مشورے نے فیروز بخت کو پریشان کر دیا۔ اس کو ہر شخص اپنا دشمن ہی نظر آتا تھا۔ داؤد نے نظام کی بات کا کیا جواب دیا۔ وہ الجھنوں میں ٹھیک سے سن نہ سکا لیکن آخری بات سن لی تھی، داؤد کہہ رہا تھا۔ ”بہر حال اب فیروز بخت ہی میرا بیٹا ہے۔“

نظام نے اس موضوع کو ترک کر دیا اور کاروباری باتیں کرنے لگا۔

رات کو داؤد کے اعزاز میں شامدار دعوت ہوئی۔ داؤد نے فیروز بخت کو اپنے پاس ہی بٹھالیا۔ ستار کو بھی کھانے میں شریک کر لیا گیا اور ستار کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ نظام کے خاندان کی ساری عورتیں داؤد کے سامنے آئیں۔ نظام نے ان سب کا تعارف کروایا۔ ان عورتوں میں اس کی ماں کے علاوہ بیٹھیں بھی تھیں، مسعدیہ اور بکنیہ۔ دولو کے اسماعیل اور ابراہیم اور ایک لڑکی شاز یہ بھی تھی۔ اسماعیل پانچ سال کا تھا اور ابراہیم تین سال کا، شاز یہ دونوں سے بڑی تھی، وہ آٹھ سال کی تھی۔ ان عورتوں میں نظام کی سوتیلی بہن نرجس بھی تھی۔ نرجس پچیس پچیس سال کی تھی لیکن ان عورتوں میں نظام کی بیوی نہیں تھی۔ داؤد نے

داؤد نے کہا۔ ”ممکن ہے تیری بات درست ہو لیکن میں یہ تجربہ نہیں کر سکتا۔“ پھر فیروز بخت کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”میں نے شادی کے بغیر ہی بیٹا پالیا ہے اس لیے اب شادی کی کیا ضرورت ہے۔“

فیروز بخت، ستار کے مشورے سے گھبرا گیا تھا لیکن داؤد کے جواب نے اسے مطمئن کر دیا۔ رات کے ستائے میں داؤد، فیروز بخت کو ساتھ لے کر بڑا ڈیرے سے ڈیرا دور ٹھیلانے لے گیا اور ٹھیل ٹھیل کر دیر تک یہی درس دیتا رہا کہ شادی ہرگز نہ کرنا۔ اس نے از دوامی زندگی کا اتنا ہیامیاتک نقشہ کھینچا کہ فیروز بخت لرز گیا۔

دوسرے دن قافلہ روانہ ہو گیا۔

احمد آباد کے قریب تقریباً بیس پچیس میل دور قافلے نے آخری بڑا ڈیرہ کیا۔ یہاں سے احمد آباد کی جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ فیروز بخت کی نظریں احمد آباد کے آثار دور سے دیکھ رہی تھیں۔ داؤد نے کھیریل کے مکانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”فیروز بخت! تو اپنے آس پاس کھیریلوں کے مکانات دیکھ رہا تھا یہی مکانات احمد آباد میں بھی ملیں گے۔ اب ہم لوگ احمد آباد کے دروازے تک پہنچ چکے ہیں۔“

نئی جگہ دیکھنے کی خوشی میں فیروز بخت کے چہرے پر تازگی آگئی تھی، داؤد کی بات سن کر وہ پھولا نہ سکیا۔

داؤد نے مزید کہا۔ ”فیروز بخت! میں نے تیری تعلیم و تربیت پر خاص توجہ اس لیے دی ہے کہ تجھ کو میری ہی طرح کاروبار کرنا ہے۔ اب تو میرے ساتھ میرے کاروبار کی دیکھ بھال کرے گا اور یہ دیکھنے کی کوشش کرے گا کہ میں لوگوں سے کس طرح معاملات کرتا ہوں۔ اگر تو ان باتوں میں ماہر ہو گیا تو مار نہیں کھائے گا۔“

داؤد کی باتوں کا فیروز بخت پر گہرا اثر ہو رہا تھا کیونکہ داؤد اس کی نظر میں ایک مثالی انسان تھا۔ داؤد کی تعلیمات ستار کے علم میں بھی آ رہی تھیں لیکن ستاران سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ دل ہی میں دل میں داؤد کی تعلیمات کی مذمت کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ داؤد اپنی طرح فیروز بخت کو بھی تہاہ کر رہا ہے۔ اس لیے وہ کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا جب وہ فیروز بخت کو یہ سمجھائے کہ اس دنیا میں کاروبار اور دولت ہی سب کچھ نہیں ہے، دوسری چیزیں بھی ہیں لیکن اچھا موقع نہیں مل رہا تھا۔ قافلے کو اس جگہ دو دن رکنا تھا۔ احمد آباد کا قلعہ دار معلوم نہیں کیوں ان کی سخت پڑتال کر رہا تھا اور ان کے فوری داخلے کا مخالف تھا۔ یہاں کے مضامقات میں بھی داؤد کے نمائندے اور گماشتے کام میں مصروف رہتے تھے



اس پر اصرار کیوں کروں۔“  
 کھانا کھاتے کھاتے داؤد نے ہاتھ جو اٹھایا تو فوراً  
 کیفیہ اس کے پاس پہنچ گئی اور پوچھا۔ ”نصیب دشمنوں کوئی  
 خاص بات؟“

داؤد کو کیفیہ کی مترنم آواز بہت اچھی لگی، بولا۔ ”تیرا  
 کیا نام بتایا تھا تیرے بھائی نے؟“  
 اس نے جواب دیا۔ ”کیفیہ۔“

داؤد نے کیفیہ کی طرف غور سے دیکھا۔ ”جیسا نام  
 ویسا ہی سراپا۔ اگر شاعر تجھے دیکھ لیں تو سراپا پر بے شمار  
 اشعار کہہ ڈالیں اور پھر بھی سیریا نہ ہو۔“  
 کیفیہ نے شرما کر منہ پھیر لیا اور بولی۔ ”یہ کیسی باتیں  
 کر رہے ہیں آپ؟“

داؤد کو اچانک نظام کی موجودگی کا احساس ہو گیا،  
 شرمندگی سے کہا۔ ”کیفیہ! مجھے معاف کرنا، میں معلوم نہیں  
 کن خیالوں میں تھا جو دل آزاری کی باتیں کر گیا۔ بہر حال  
 میں معافی چاہتا ہوں۔“

نظام اندر چلا گیا اور اس طرح اندر گیا جیسے کچھ ستا ہی  
 نہ ہو۔ کچھ دیر بعد سدا یہ بھی اندر چلی گئی اور پھر بچے بھی لیکن  
 نرجس اور کیفیہ اب بھی وہیں موجود تھیں۔

داؤد نے نرجس کی طرف دیکھا، پوچھا۔ ”تو کیوں  
 چپ ہے؟ تیرا بھائی نظام تجھے ستاتا تو نہیں ہے؟“

نرجس نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”نہیں، نظام مجھے  
 نہیں ستاتا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتا ہے۔“

داؤد پھر کیفیہ سے مخاطب ہوا۔ ”اور کیفیہ! یہ سب  
 لوگ کہاں چلے گئے؟“

کیفیہ نے جواب دیا۔ ”اندر..... کیوں، کیا ان سے  
 کوئی کام ہے؟“

داؤد، فیروز بخت اور تارا کی موجودگی میں تکلف سے  
 کام لے رہا تھا۔ فیروز بخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے  
 کہا۔ ”یہ میرا بیٹا فیروز بخت ہے اور چونکہ اس کی کوئی ماں نہیں  
 ہے اس لیے میں اس کے لیے ایک ایسی عورت کی تلاش میں  
 ہوں جو اس کی دیکھ بھال اور نگہداشت کر سکے۔“ پھر فرانسس  
 سے کہا۔ ”مثالی عورت شاید ہی ملے۔“

نرجس نے کہا۔ ”یہ ذمے داری میں قبول کر سکتی ہوں  
 اگر آپ پسند کریں تو۔“

کیفیہ نے بھی ہامی بھری۔ ”اگر آپ چاہیں تو اس کو  
 ہمارے ہاں چھوڑ دیں۔ اللہ نے چاہا تو حکایت کا موقع نہیں  
 ملے گا۔“

بچوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”نظام! تیری بیوی کہاں ہے؟  
 کہیں خدا نخواستہ.....“

نظام نے سوال کے جواب سے بچنے کی کوشش کی۔  
 اپنے شرم کو چھپاتے ہوئے بولا۔ ”وہ بھی موجود ہے اسے بھی  
 بلا لوں گا۔“

داؤد کو شبہ گزرا کہ شاید نظام سچ نہیں بول رہا ہے۔  
 ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”وہ کہیں فوت تو نہیں.....؟“

نظام نے بات کاٹ دی، بولا۔ ”نہیں، ایسی کوئی بات  
 نہیں۔ وہ مری نہیں زندہ ہے لیکن شاید میرے لیے وہ مری  
 چکی ہے کیونکہ وہ دو سال سے اپنے والدین کے پاس ہے اور  
 میرے پاس آنے کا نام نہیں لیتی۔“ پھر ٹھٹھی سانس بھر کر  
 بولا۔ ”شاید وہ مجھ سے غرت کرنے لگی ہے کیونکہ اس کے  
 موجودہ روپے سے میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔“

داؤد کو بڑا دکھ ہوا، بولا۔ ”نظام! جب تو بیوی کا زخم  
 خوردہ ہے، تو مجھے شادی کرنے کا مشورہ کیوں دے رہا تھا؟“

نظام کے ہونٹوں پر اداس مسکراہٹ کھینچنے لگی، بولا۔  
 ”حضرت! اگر بیوی اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی ہے تو  
 اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ میری اصل کمائی تو میرے  
 پاس میرے گھر ہی میں ہے یعنی میری اولاد..... میں بیوی  
 کی عدم موجودگی محسوس ہی نہیں کرتا۔“

داؤد نے سدا یہ اور کیفیہ کی طرف سرسری نظر ڈالی۔  
 سدا یہ بیس سال کی ہوئی اور کیفیہ پانچیس تیس سال کی۔  
 داؤد کو حیرت تھی کہ نظام کی بیٹی شازیہ میں کیفیہ کی بڑی  
 مشابہت پائی جاتی تھی اور اسماعیل اور ابراہیم میں سدا یہ کی  
 جھلک موجود تھی۔ داؤد نے کہا۔ ”نظام! بچوں میں پھوپھوں  
 کی مشابہت بہت زیادہ پائی جاتی ہے، یہ کیا بات ہوئی؟“

نظام نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ یہ میرے سچے  
 ہیں اور ان پر دو خیال کا اثر غالب ہے۔“

داؤد نے نظام کی سوتیلی بہن نرجس کی طرف دیکھتے  
 ہوئے سوال کیا۔ ”تو یہ تیری سوتیلی بہن ہے؟“

نظام نے کہا۔ ”اسے سوتیلی بھی نہ کہیے کیونکہ ہم  
 دونوں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔“

داؤد نے ٹھک و شگ سے سوال کیا۔ ”کیا ابھی تک  
 ان تینوں کی شادی نہیں ہوئی؟“

نظام نے فرسودگی سے جواب دیا۔ ”نہیں، ابھی تک  
 کسی کی بھی شادی نہیں ہوئی۔ میں اپنی بہنوں کی شادیاں  
 زبردستی نہیں کرنا چاہتا۔ میرے گھر میں ہر شخص کو فیئر معولی  
 آزادیاں حاصل ہیں۔ ہمیں شادی سے گریزاں نہیں آتی۔“



آپ سے بڑی تقویت حاصل رہے گی۔ اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ فیروز بخت میری بہن زجس کی شفقت اور محبت کر مرکز بنا رہے گا جس سے زجس کو ایک گونہ سکون حاصل رہے گا۔“

داؤد نے نظام کی باتوں پر غور کیا، بولا۔ ”مجھے سوچنے کا موقع دے کیونکہ میں فوراً وئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔“

نظام نے جواب دیا۔ ”میں آپ کو سوچنے کا موقع دینے والا کون؟ محض آپ کا ایک معمولی کارندہ، میں تو درخواست ہی کر سکتا ہوں۔ آپ مجھ کو حکم دیں گے، میں تعمیل کروں گا۔“

فیروز بخت دونوں کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ان کی ساری باتیں نہیں سن سکا۔ داؤد نے کہا۔ ”اچھا نظام، اس وقت تو تو چلا جا۔ میں احمد آباد میں داخل ہونے کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔“

نظام چلا گیا۔ داؤد نے فیروز بخت سے کہا۔ ”تو یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ کہیں گھوم نہ لے، میں تنہا ہی چاہتا ہوں۔“

فیروز بخت بے چارہ و چراغ اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ستار بھی چلا لیکن ستار کو داؤد نے روک لیا۔ ”تو رک، میں تجھ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

ستار سم گیا، واہس آ رہا پاس ہی آکھڑا ہوا۔

داؤد نے پوچھا۔ ”کیا میں نظام کی درخواست قبول کر لوں؟“

ستار نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”میرے آقا! میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں آپ کو مشورے دوں پھر میں کیا کروں؟“

داؤد نے تکیسی نظروں سے ستار کو گھورا، مسکرا کر بولا۔

”خوب! میری ہی بات تجھے واہس کر دی لیکن تو یہ بھول گیا کہ میں خود تجھ سے مشورہ طلب کر رہا ہوں۔“

ستار نے کہا۔ ”میرے پاس آپ کے اس سوال کا ایک ہی جواب ہے۔“

”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ فیروز بخت بھی آپ ہی کی طرح شادی نہ کرے تو ضروری ہے کہ آپ کا کردار بھی مثالی ہو۔ آپ زجس کو حویلی میں رکھیں اور اس سے بے تعلق اور بے اثر رہ کر یہ ثابت کر دیں کہ آپ کو اپنے آپ پر کامل اعتماد ہے۔ فیروز بخت آپ کی تقلید کرے گا لیکن اگر آپ زجس یا کسی بھی عورت سے خوف زدہ رہیں اور آپ کا یہ خوف فیروز بخت بھی محسوس کر لے تو اس کا فیروز بخت پر لازمی اثر پڑے گا کہ جب اس ادھیڑ عمری میں آپ کو عورت

لیکن فیروز بخت نے ان کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا۔ داؤد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں آپ ہی کے ساتھ رہوں گا۔“

داؤد کو جیسے ایک دم ہوش آ گیا، بولا۔ ”لاحول ولا قوۃ، میں بھی کن خیالوں کا شکار ہو گیا تھا۔ الا باللہ العظیم۔“

زجس نے فیروز بخت سے کہا۔ ”بیٹے! میں ہر وقت حاضر ہوں اگر ضرورت محسوس ہوتی مجھے ضرور یاد کر لینا۔“

دوسرے دن صبح نظام داؤد کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ اس کی سوتیلی بہن زجس کی خواہش ہے کہ وہ فیروز بخت کے ساتھ رہ کر اس کی دیکھ بھال اور تربیت کے فرائض انجام دے۔ اس لیے احمد آباد کی حویلی میں اس کی رہائش کا انتظام کر دیا جائے تو بہتر ہے۔

داؤد کو درخواست قبول کرنے میں تامل تھا، بولا۔ ”جب میں خود موجود ہوں تو فیروز بخت کی تربیت اور دیکھ بھال کی ذمے داریاں مجھ سے زیادہ اچھی طرح کوئی اور نہیں انجام دے سکتا۔“

نظام نے مایوسی سے کہا۔ ”آپ کی مرضی ورنہ میری ناقص رائے میں آپ کی عظیم الشان حویلی میں کسی عورت کی موجودگی بہت ضروری ہے۔“

ستار کو زجس اچھی لگی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ داؤد اس سے شادی کر لے۔ اس نے داؤد کو رائے دی۔

”میرے آقا! آپ کا گناہتہ نظام صحیح کہتا ہے کہ حویلی میں ایک عورت کی موجودگی ضروری ہے۔“

نظام کے چہرے پر شگفتگی پیدا ہو گئی۔ امید افزا نظروں سے داؤد کی طرف دیکھا۔

داؤد نے جواب دیا۔ ”ستار! تیرا یہ کام نہیں ہے کہ تو مجھے مشورے دے۔ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں شادی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا اس لیے میں عورتوں کی قربت سے خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔“

نظام نے کان کے قریب منہ لے جا کر آہستہ سے کہا۔ ”تو یہ نعوذ باللہ میں نے آپ سے یہ تو نہیں کہا کہ آپ میری بہن زجس سے شادی کر لیں اور میں یہ بات کیونکر کہہ سکتا ہوں۔ زجس کو آپ کی حویلی میں داخل کرنے سے دو مقصد پورے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ زجس کی طبیعت عبادت و ریاضت پر مائل رہتی ہے۔ اسی لیے اس نے شادی سے مستقل انکار کر رکھا ہے۔ آپ کی حویلی میں اس کو یک سوئی سے عبادت کرنے کا موقع ملے گا اور چونکہ آپ خود مجرد زندگی گزارنے کا عہد کر چکے ہیں اس لیے زجس کو



لیکن داؤد رکھنا نہیں، وہ پیدھا قلعہ دار کے پاس پہنچا اور اس سے داخلے کی اجازت چاہی۔ قلعہ دار نے معذرت کی کہ داخلے کی اجازت عام تو نہیں ہے لیکن آپ کے لیے بطور خاص فیصل کا دروازہ کھولا جاسکتا ہے۔

داؤد نے جواب دیا: "آج ہی میرا داخلہ بہت ضروری ہے۔ میں احمد آباد ہی کا نہیں پورے ملک کا بہت بڑا تاجر ہوں۔ اس لیے یہ رعایت تو ملنی ہی چاہیے۔"

قلعہ دار نے اجازت دے دی۔ "آپ اندر جاسکتے ہیں۔" لیکن داؤد چند ساعتوں کی مہلت لے کر نظام کے گھر واپس آ گیا۔ وہاں فیروز بخت اور ستار کھانے سے فارغ ہو کر داؤد کا انتظار کر رہے تھے۔

داؤد نے دونوں کو حکم دیا: "میں نے قلعہ دار سے بات کر لی ہے۔ ہمیں اسی وقت احمد آباد میں داخل ہو جانا ہے۔ اس لیے اپنا سامان سمیٹ لو۔"

دونوں اپنا اپنا سامان سمیٹنے لگے۔ نظام چوروں کی طرح داؤد کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ آہستہ سے پوچھا: "کیا آپ برامان گئے؟"

داؤد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی وقت پہلو کا دروازہ کھلا اور اس سے نرجس نمودار ہوئی اور بڑی ملاحت سے پوچھا: "کیا آپ جا رہے ہیں؟"

داؤد نے نرجس کی طرف دیکھا، اس کے بعد نظام کی طرف لیکن نظام کہیں جا چکا تھا۔

نرجس، داؤد کے سامنے بالکل پاس آگئی۔ ریشمی لباس پر طبل کا باریک دوپٹا قیمت ڈھارہا تھا۔ داؤد نے نرجس کی طرف بے تکلفی سے دیکھا تو نرجس کھڑا گیا، بولا: "مجھ سے کوئی کام؟"

نرجس نے پوچھا: "کیا آپ جا رہے ہیں؟" داؤد نے گم گم ہو کر جواب دیا: "ہاں، میں جا رہا ہوں۔" "ناراض ہو کر؟" "نہیں، ہنسی خوشی۔"

نرجس نے کہا: "نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ آپ دروغ بیانی سے کام لے رہے ہیں۔"

داؤد نے نرجس کے مقابل کھڑے ہو کر کہا: "نرجس! میں اس ملک کا اور احمد آباد کا بہت بڑا تاجر ہوں پھر میں یہ کس طرح برداشت کروں گا کہ میرے معمولی گماشتے اور کتر در سچ کے کارندے میری بے عزتی کریں، میری توہین کریں۔"

نرجس نے کہا: "میں کچھ نہیں جانتی، اگر آپ جا رہے

کے معاملے میں خود پر اعتماد نہیں تو کل نو جوانی میں قدم رکھنے والے فیروز بخت کو خود پر اعتماد کیوں ہونے لگا۔"

داؤد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے نرجس کو جوہلی میں رہنے کی اجازت دے دینی چاہیے۔" ستار نے جواب دیا: "یہ فیصلہ آپ کریں گے، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

داؤد نے جواب دیا: "اچھا اب تو جا، میں مزید غور کروں گا۔"

ستار چلا گیا اور داؤد غور و فکر میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

دوپہر کو کھانے سے تھوڑی دیر پہلے نظام نے حاضری دی اور پوچھا: "کیا کھانا حاضر کیا جائے؟"

داؤد نے جواب دیا: "نظام! کھانا تو میں بعد میں کھاؤں گا، پہلے میں اس مسئلے پر چند باتیں کروں گا جو نرجس سے تعلق رکھتا ہے۔"

نظام نے جواب دیا: "اب اس ذکر کو ختم کر دیجیے کیونکہ میں بے عزتی محسوس کرنے لگا ہوں۔"

داؤد نے کوئی پروا کیے بغیر کہا: "میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ نرجس کو اپنی جوہلی میں رہنے کی اجازت دے دوں۔"

نظام نے دوپہر کا کھانا لگوا دیا۔ سفید چاندنی پر دسترخوان بچھادیا گیا۔ کئی قسم کے کھانوں کی قابیں بیچ میں رکھ دی گئیں۔ نظام نے ازراہ مہمان نوازی سچی میں داؤد کے ہاتھ دھووائے، فیروز بخت اور ستار کا کہیں پتا نہ تھا۔ داؤد نے پوچھا: "کیا میں تمہارا کھانا کھاؤں گا؟"

نظام نے جواب دیا: "آپ کے ساتھ میں بھی کھاؤں گا۔"

داؤد نے کہا: "اور وہ نرجس، سعدیہ، کیفیہ وغیرہ؟" نظام نے سکوت اختیار کیا، داؤد کو غصہ آ گیا بولا: "نظام! میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

اس کے بعد وہ کھڑا ہو گیا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔ جاتے جاتے کہتا گیا: "نظام! میں آج ہی احمد آباد چلا جاؤں گا، قلعہ دار مجھے نہیں روکے گا اور جاتے جاتے میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ اب تو میرا گماشتہ نہیں رہے گا۔ تیری جگہ میں کسی اور کو مقرر کروں گا۔"

نظام کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ داؤد کے پیچھے دوڑا: "جناب! سنیے تو، میری بات تو سنیے۔ یہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"





جاسوسی ڈائجسٹ میں

# انگائے



ایک نیا شاہکار سلسلہ  
آپ کے محبوب مصنف کے قلم سے

زندگی کی رعنائیاں اور ہولناک سچائیاں  
اپنے دامن میں سمیٹے  
ایسی طویل، سنسنی خیز اور تھیرانگیز کہانی

جسے قارئین ایک ہی نشست میں پڑھنے پر خود کو مجبور پائیں گے

اس دلچسپ داستان کے مصنف کا صحیح نام

بھیجنے والے قارئین کے نام اگلے شمارے میں شائع

کیے جائیں گے۔ قرعہ اندازی کے ذریعے

دس کامیاب قارئین کو مئی 15 کا شمارہ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک مفت ارسال کیا جائے گا

COPIED FROM WEB



داؤد نے کہا۔ ”نظام کو بتا دیجیے کہ وہ اپنی سابقہ خدمات پر بحال کر دیا گیا ہے اور اپنے ساتھ چلنے کی خبر بھی سنا دیجیے۔“

نرجس خوش خوش اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد سہیل اور کیفیہ بھی آئیں۔ ان کے ساتھ ہی نظام بھی آ گیا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے داؤد کے سامنے آتے ہی اس کا شکریہ ادا کیا بولا۔ ”میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ نرجس کو آپ اپنے ساتھ لے جائیے۔“

دو گھنٹے بعد یہ مختصر قافلہ احمد آباد میں داخل ہو گیا۔ شہر کے وسط میں داؤد کی شاندار حویلی تھی۔ اس حویلی کے چھانک کے دونوں طرف دو خوب صورت موروں کی مورتیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ ٹانگ مورتیوں کے درمیان سے گزر کر پھانک تک پہنچ گئے۔ پھانک پر دو دربان پہلے سے ہی تعینات تھے۔ انہوں نے سر قند کھڑے ہو کر داؤد کو سلام کیا۔ داؤد نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور پھانک میں داخل ہو گیا۔

اندر حویلی کے آخری سرے کا کمران نرجس کو دے دیا گیا۔ اس سے ملحق دو کمرے فیروز بخت کے حصے میں آئے۔ تار کو خدام کی کوشھیوں میں سے ایک کوشھی دے دی گئی۔ حویلی کو خوب اچھی طرح صاف کیا گیا۔ داؤد کا کمر حویلی کے اگلے حصے میں تھا اور اس حویلی میں چوہدی کی دیواروں سے متصل گودام تھا جس میں داؤد کا سامان تجارت بھرا ہوا تھا۔ داؤد نے فیروز بخت سے کہا۔ ”میں نرجس کو محض تیری خاطر یہاں لایا ہوں۔ اب یہ تیرا کام ہے کہ تو اس سے کچھ نہ کچھ حاصل کرے۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا لیکن میری بی خواہش یہ ہے کہ میں کاروبار کو سنبھالوں اور اس سلسلے میں آپ سے خاص تربیت حاصل کروں اور ہاں نرجس کا مسئلہ تو میں ان سے.....“

داؤد نے قطع کلام کیا بولا۔ ”محض نرجس نہیں، میں۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”جیسا آپ کا حکم۔“

رات کا کھانا سب نے مل کر ایک ساتھ کھایا۔ نرجس بہت چپ چاپ ہو گئی تھی۔ کھانا کھانے کے فوراً بعد اپنے کمرے میں چلی گئی اور کسی سے بھی کوئی بات نہیں کی۔ داؤد کے دل میں کتنی سی چپ ہو گئی تھی۔ اس نے نرجس کو جاتے ہوئے دیکھا مگر روکا نہیں۔ فیروز بخت سے کہا۔ ”فیروز بخت! دیکھ میں کتنے نیر اور برداشت سے کام لے رہا ہوں۔ نرجس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی حالانکہ اسے مجھ

پر تو شوق سے جائیں لیکن میں آپ کو تنہا نہیں جانے دوں گی۔ میں بھی آپ کے ساتھ ہی چلوں گی۔“

داؤد نے جواب دیا۔ ”آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میں نے نظام کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا ہے، اب وہ میرا کارندہ نہیں رہا۔“

نرجس نے کہا۔ ”میں نے یہ بھی سن لیا اور میں بھی آپ پر یہ واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ میں آپ کے ساتھ نظام کی بہن کی حیثیت سے نہیں جاؤں گی۔ اس وقت تو میں محض نرجس ہوں اور اس حیثیت سے ساتھ بھی جاؤں گی۔“

داؤد نے پوچھا۔ ”لیکن آپ کی اس حیثیت کا مجھ پر کوئی رعب بھی نہ پڑے گا۔“

نرجس اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی، بولی۔ ”میں اس وقت تک آپ کو جانے نہیں دوں گی جب تک آپ میرے بھائی کو بحال نہیں کروں گے۔“

داؤد نے نرجس کے تہرہ دیکھ کر اسے اپنے سامنے بٹھالیا، بولا۔ ”اگر میں اس کو بحال کروں تو کیا آپ میرے ساتھ چلیں گی؟“

نرجس نے جواب دیا۔ ”ساتھ چلنے کی درخواست تو خود میں نے کی تھی۔“

داؤد پر اضطرابی کیفیت طاری تھی، نہایت محتاط ہو کر بولا۔ ”لیکن آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں گی؟“

نرجس نے پوچھا۔ ”کیسا وعدہ؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”نرجس! آپ کو معلوم ہو گا کہ میں عورتوں سے دور رہتا ہوں۔ آپ حویلی میں رہیں لیکن ہمیشہ اس بات کا خیال رکھیں کہ مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کریں گی۔“

نرجس نے کہا۔ ”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں خود آپ سے یہ درخواست کروں گی کہ آپ مجھ سے دور دور اور نظروں سے اوجھل رہیں۔“

داؤد نے بے خیالی میں نرجس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”تب پھر آپ میری حویلی میں میرے ساتھ ہی چلیں۔“

نرجس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی، شرارت آمیز لہجے میں بولی۔ ”آپ نے میرا ہاتھ پکڑ کر معاہدے کی خلاف ورزی کر دی ہے۔“

داؤد نے فوراً ہاتھ چھوڑ دیا، بولا۔ ”میں اپنی اس حرکت پر معذرت خواہ ہوں بلکہ بہت زیادہ شرمندہ بھی۔“

نرجس نے ہنس کر کہا۔ ”کوئی بات نہیں، آئندہ خیال رکھیے گا۔“



سے بات کرنی چاہیے تھی۔“

خدا م باہر چلے گئے۔ داؤد نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”خوب، ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔“  
فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”آپ نے پوچھا تھا کہ کاروبار میں بنیادی چیزیں کیا ہوتی ہیں؟“  
داؤد نے کہا۔ ”تو تمہارے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں؟“

فیروز بخت نے کہا۔ ”نہیں میں تو شاگرد ہوں اور یہی سب سیکھنا چاہتا ہوں۔“

داؤد نے جواب دیا۔ ”مردم شناسی، موقع شناسی، بہترین منصوبہ بندی، کام کرنے اور کام لینے کی صلاحیت، دوسروں پر اعتماد اور اعتبار نہ کرنا، یہ بنیادی باتیں ہیں۔ اگر تم نے اپنی زندگی میں ان باتوں کا خیال رکھا تو کہیں بھی مار نہ کھاؤ گے۔ امانت اور دیانت کے ساتھ ساتھ دولت کو سنبھالنا قائم رکھنا مشکل کام ہے کیونکہ... دولت کی بربادی بے جا اسراف سے ہوتی ہے۔ بے جا اسراف کی حدیں کیا ہوتی ہیں، جانتے ہو؟“

فیروز بخت نے کہا۔ ”نہیں، مجھے نہیں معلوم۔“

داؤد نے جواب دیا۔ ”جوا، لہو و لعب اور عورت جو سب سے خطرناک بلا ہے جس سے مفر کی کوئی راہ نہیں۔ جوان ہوتے ہوتے اور بڑھاپے تک پہنچنے پہنچنے عورت ہی وہ شے ہے جس کے خطرے جاری رہیں گے۔ جس کی گھاتیں باقی رہیں گی۔“

فیروز بخت نے کہا۔ ”میں زندگی بھر یوں بچوں گا جس طرح کوئی مریض مضر چیزوں سے بچتا ہے۔“

داؤد نے کہا۔ ”میں نے آج جو درس دیا ہے اسے خوب اچھی طرح ذہن میں بٹھالو۔ بقیہ باتیں پھر بتاؤں گا۔“

اس کے بعد داؤد نے فیروز بخت کو گودام دکھائے جن میں کاروباری مال اٹا پڑا تھا۔ اس دوران جب فیروز بخت نے یہ سوچا کہ یہ جو کچھ بھی ہے، اس کا اپنا ہے اور اس پر اسے مالکانہ حق تصرف اور اختیار حاصل ہے تو یوں بے ہی نشہ چڑھ گیا۔

کئی دن بعد رات کو داؤد، فیروز بخت اور نرجس ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھانے بیٹھے تو داؤد کی نظریں بار بار غیر ارادی طور پر نرجس پر پڑتی رہیں۔ نرجس حسب سابق خاموش رہی۔ کھانا کھا چکنے کے بعد جب نرجس جانے لگی تو کچھ دیر داؤد نرجس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ کافی دور نکل گئی تو داؤد نے مسکرا کر اسے آواز دی۔ ”نرجس! ادھر آؤ۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”نرجس بہن نے مجھ سے یہ کہہ رکھا ہے کہ اس حویلی میں بڑا سکون ہے اور انہیں عبادت اور ریاضت کے لیے بڑی طہانیت حاصل رہتی ہے۔“

داؤد نے کہا۔ ”لیکن میں یہ کب کہتا ہوں کہ وہ عبادت و ریاضت نہ کرے یا اپنے سکون اور طہانیت کو تباہ و برباد کر دے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جب وہ اس حویلی میں آئی ہے تو کچھ مصروف بھی رہے۔ ورنہ خالی ذہن پر شیطان اپنا قبضہ جمالیتا ہے۔“

فیروز بخت نے داؤد کا ایما یا کردار دریافت کیا۔ ”کیا میں نرجس بہن کو بلواؤں؟ آپ یہ باتیں انہی سے کر لیجیے۔“  
”نہیں، اس وقت نہیں میں پھر کروں گا باتیں۔ اس وقت تو میرے ساتھ چل۔ میں اپنے کاروباری گماشتوں اور کارکنوں سے تیری ملاقاتیں کرواؤں گا اور کاروبار کے تشیب و فراز پر درس دوں گا۔“

وہ فیروز بخت کو ساتھ لے کر شہر کے مغربی حصے میں گیا۔ یہاں بھی ایک حویلی تھی اور یہ اس سے بھی بڑی تھی جس میں یہ لوگ سکونت رکھتے تھے۔ اس حویلی میں گودام زیادہ تھے جن میں ٹیل اور کپڑوں کے تھان بھرے ہوئے تھے۔ اس حویلی میں ہال نما ایک کرا تھا۔ اس کمرے میں کاروباری دستاویزات اور کاغذات تھے اور یہیں وہ ساری چیزیں تھیں جو آلات کاروبار کہلاتی ہیں اور دفتری سازو سامان بھی اسی کمرے میں تھا۔ اس نے فیروز بخت کو اپنے سامنے بٹھا کر درس دیا۔ ”جانتے ہو کاروبار میں بنیادی چیزیں کیا ہوتی ہیں؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”نہیں۔“

داؤد کے سامنے چند خادم ہاتھ باندھے ادب سے، حکم کے منتظر کھڑے تھے۔ داؤد نے فیروز بخت کی طرف اشارہ کر کے خادم سے کہا۔ ”یہ فیروز بخت میرا بیٹا اور تم سب کا مالک ہے۔ تم لوگ اس کے ہر حکم کی اس طرح تعمیل کرو گے، جس طرح میرے احکام کی کرتے ہو۔“

خدا م سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکے اور پھر سیدھے ہو کر عرض کیا۔ ”بہت خوب! ہم آپ دونوں کے تابعدار ہیں۔“  
داؤد نے فیروز بخت سے کہا۔ ”فیروز بخت! تو انہیں حکم دے کہ کمرے سے باہر نکل جائیں اور دروازے پر موجود ہیں پھر جب طلب کیا جائے تو حاضر ہوں۔“  
فیروز بخت نے انہیں حکم دیا۔ ”تم سب باہر کے در پر موجود رہو اور جب بلا یا جائے تو حاضر ہو جانا۔“



زرجس نے کہا۔ ”پھر مجھے کیا کرنا چاہیے کیونکہ یہاں آنے سے پہلے میں نے یہ سوچا تھا کہ فیروز بخت کو اپنے پاس رکھ کر بہت زیادہ مصروف رہ سکوں گی لیکن فیروز بخت بھی آپ ہی کے ساتھ چلا جاتا ہے۔“

داؤد نے کہا۔ ”اس حویلی کا کھانا باور چمی پکاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں تم اس کی نگرانی کرو اور دونوں وقت پکنے والا کھانا تمہارے حکم اور مرضی سے پکے اور یہ کہ گھرداری کے جملہ امور بھی تمہاری نگرانی میں سرانجام پانا چاہئیں۔“

زرجس نے کہا۔ ”بہتر ہے، میں دوسرے امور بھی دیکھنے اور انجام دینے پر غور کروں گی۔“

داؤد نے کہا۔ ”اور بھی کئی کئی مجھ سے بھی صلاح و مشورہ کر لیا کرو۔“

زرجس نے کراہیت سے کہا۔ ”یہ ضروری ہے؟“

”ہاں یہ ضروری ہے۔ میں اس حویلی کا مالک ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ اس کا نظم و نسق کس طرح چلنا چاہیے۔“

زرجس نے کہا۔ ”میں اس پر بھی عمل کروں گی۔“

داؤد نے کہا۔ ”تم نے شادی کیوں نہیں کی حالانکہ اگر تم چاہو تو تمہاری شادی ہو سکتی ہے۔“

زرجس نے گھبرائے ہوئے انداز میں داؤد کو دیکھا اور بولی۔ ”دوسری باتیں کیجیے۔“

داؤد نے کہا۔ ”میں دوسری باتیں بھی کر سکتا ہوں لیکن اس وقت میں یہی باتیں کروں گا۔“

زرجس نے ناگواری سے کہا۔ ”میں چلی جاؤں گی، میں آپ کے پاس بیٹھوں گی نہیں۔“

داؤد نے کہا۔ ”یہ حویلی میری ہے اور یہ مت بھولو کہ جہاں تم جاؤ گی، میں بھی وہیں آتی جاؤں گا۔“

زرجس نے پوچھا۔ ”لیکن ان باتوں سے آپ کا مقصد کیا ہے؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”صرف یہ کہ میں نے شادی نہیں کی اور شادی نہ کرنے کا مقصد ارادہ کر رکھا ہے۔ اس کا ایک خاص مقصد اور ایک خاص پس منظر ہے لیکن تمہارے شادی نہ کرنے کا کیا مطلب ہے؟ میں یہ جانتا چاہتا ہوں؟“

زرجس نے سر جھکا لیا، بولی۔ ”خدا کے لیے مجھے ان سوال جواب سے تنگ نہ کیجیے۔ میں یوں بھی کیا کم پریشان ہوں۔“

داؤد نے کہا۔ ”جب تک تم اپنی پریشانیاں نہیں بتاؤ گی ان کا علاج بھی نہیں ہو سکتا۔“

زرجس نے ایک دم گھڑے ہو کر پوچھا۔ ”کیا اب

زرجس واپس آگئی، بولی۔ ”فرمائیے؟“

داؤد نے مونڈھے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس پر بیٹھ جاؤ۔ ابھی کرتا ہوں باتیں۔“

زرجس مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ داؤد دکھانا کھا چکنے کے بعد ہاتھ منہ صاف کرنے چلا گیا پھر واپس آ کر زرجس کے مقابل دوسرے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ فیروز بخت جانے لگا تو داؤد نے کہا۔ ”فیروز بخت! تو کہیں جانے گا نہیں یہیں ہم دونوں کے پاس بیٹھ کیونکہ ان باتوں سے تجھے بہت کچھ معلوم ہوگا۔“

فیروز بخت تیسرے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

داؤد نے زرجس سے پوچھا۔ ”زرجس! اس حویلی میں آپ کو آئے ہوئے کتنے دن گزر گئے؟“

زرجس نے جواب دیا۔ ”یاد نہیں، دو یا تین بیٹھے تو گزر رہے ہوں گے۔“

داؤد نے کہا۔ ”اگر میں تم سے ان دو تین ہفتوں کی کارکردگی پوچھوں تو شاید تم کوئی جواب نہ دے سکو۔“

زرجس نے گھبرا کر کہا۔ ”کارکردگی..... میں آپ کا مطلب نہیں سمجھتی؟“

داؤد نے کہا۔ ”ہاں کارکردگی، تم مجھ سے یہی سوال کرو تو میں اس کا شاندار جواب دے سکتا ہوں۔“

زرجس نے جواب دیا۔ ”لیکن آپ نے میرے ذمے کوئی کام تو نہیں کیا پھر میں اپنی کارکردگی کیا بتاؤں گی؟“

داؤد نے کہا۔ ”کارکردگی سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ تم سے اس کام یا کاموں کی بابت دریافت کر رہا ہوں جو میں نے تمہارے ذمے کیے ہیں۔“

زرجس نے کہا۔ ”پھر کون سی کارکردگی؟“

داؤد نے کہا۔ ”پھر وہ کام جو ان دو تین ہفتوں میں تم نے کیا ہو، وہ کارکردگی میں شمار ہوگا۔“

زرجس نے جواب دیا۔ ”میں نے نمازیں پڑھیں، عبادت کی اور دو دو کا تک پڑھے۔“

داؤد نے کہا۔ ”اور خوب خوب سوئیں، خوب خوب سو جتی رہیں، خواب دیکھے، جاگتے میں بھی اور سوتے میں بھی۔“

زرجس شرمندہ ہو گئی۔ ”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

”میں کہتا ہوں کہ انسان کو کچھ نہ کچھ کر کے خود کو مصروف اور مشغول رکھنا چاہیے ورنہ یکسانیت اسے غیر معمولی سنجیدہ اور بوڑھا کر دے گی اور بڑھاپے کا مطلب میرے نزدیک موت جیسا محمود ہے۔“



مرا جاسکتی ہوں؟

”نہیں، ابھی تم نہیں جاسکتیں۔ پہلے میری بات کا جواب دو۔ اس کے بعد چلی جانا۔“

نرجس نے اتکا کر کہا۔ ”کیا جواب دوں آپ کی باتوں کا۔“

داؤد نے کہا۔ ”نرجس! تیرا بھائی نظام ممکن ہے مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو لیکن اب تو میرے پاس رہ رہی ہے اور اگر میں چاہوں تو تیری شادی کہیں اچھی جگہ کروا سکتا ہوں۔ ابھی تیری شادی کی عمر ہے۔ اشارہ کر، میں کہیں نہ کہیں انتظام کر دوں گا۔“

نرجس نے بیزاری سے کہا۔ ”میں شادی نہیں کروں گی۔ ایک بار نہیں ہزار بار یہی کہوں گی۔ آپ مجھے پریشان نہ کیجیے۔“

داؤد نے بھی کچھ سوچ کر کہا۔ ”اچھا اس وقت تو تم جاسکتی ہو۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر اچھی طرح سوچ لو پھر بات کروں گا۔ اور ہاں ایک بات اور.....“ نرجس سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

داؤد نے کہا۔ ”میں تمہیں تم اور تو سے مخاطب کرتا ہوں، تم اس کا برائے نام جانا۔“

نرجس کوئی جواب دیے بغیر چلی گئی۔ فیروز بخت ان دونوں کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ داؤد نے نرجس سے اس قسم کی باتیں کیوں کہیں، اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ شاید داؤد کو بھی فیروز بخت کی ذہنی نگہ کش کا اندازہ ہو گیا تھا۔ مسکرا کر پوچھا۔ ”تو نے میری باتیں سنیں؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”ہاں سیں۔“

داؤد نے کہا۔ ”میں کافی دنوں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ نرجس پر قنوطیت اور پابیت کیوں ملاری ہے۔ آج میں نے اپنی اس بے چینی کو سوال و جواب سے دور کرنا چاہا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی ذات پر صبر و ضبط اور برداشت کا زبردست نمونہ چڑھا رکھا ہے۔ بڑی مشکلوں اور بڑی کوششوں سے باہر نکلے گی۔“

فیروز بخت ہوں، ہاں کے سوا کہہ بھی کیا سکتا تھا لیکن اس نے اس طرح داؤد کو دیکھا گویا یہ ساری باتیں اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ داؤد نے ہنس کر کہا۔ ”فیروز بخت! جتنو بہت ضروری ہے۔“

فیروز بخت نے گردن ہلائی۔ ”ہاں جتنو واقعی بڑی اہم چیز ہے۔“

داؤد، فیروز بخت کو نادان سمجھ کر کھرا ہو گیا۔ ”یہ

باتیں ابھی تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“

اس کے بعد داؤد کئی دن خاموش اور کھویا کھویا رہا پھر کئی ماہ کے لیے اس کو سورت جانا پڑ گیا کیونکہ سورت کی بندرگاہ پر اس کا مال جہاز پر چڑھایا جا رہا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں فیروز بخت کو نیابت ملی اور وہ اپنی سمجھ اور عمل کے مطابق چھوٹے موٹے فیصلے کرتا رہا۔ سارے ملازمین اس کے اشاروں پر حرکت کرتے رہے۔ ستار کو سب سے زیادہ قرب حاصل تھا۔ نرجس اس سے بہت زیادہ بے تکلف ہو چکی تھی وہ بڑی۔ بہن کی محبت دے رہی تھی۔

فیروز بخت کو داؤد کی عدم موجودگی میں داؤد کی چند ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن سے اس کی عزت اور عظمت کا احساس کچھ زیادہ ہی شدید ہو گیا۔ داؤد بیواؤں، یتیموں اور دوسرے حاجت مندوں کی ماہانہ امداد کیا کرتا تھا۔

کئی ماہ بعد جب داؤد گھر واپس آیا تو وہ اپنے کاروبار اور گھر بار کے نظم و نسق کو دیکھ کر فیروز بخت سے بہت خوش ہوا۔ داؤد کو پھر واپس جانا تھا کیونکہ اس کو چھینٹ اور لٹھے کے کئی سوتھان باہر روانہ کرنا تھے اور اس لڑکائی کی تھیل اس وقت تک صحیح طرح نہیں ہو سکتی تھی جب تک خود داؤد دوزخ دھوپ نہ کرتا۔

اس کے واپس آنے پر نرجس اس کے سامنے نہیں گئی۔ معلوم نہیں کیوں وہ داؤد سے دور دور رہنے لگی تھی۔

داؤد نے جب یہ دیکھا کہ نرجس کسی طور سامنے نہیں آ رہی تو فیروز بخت سے پوچھا۔ ”فیروز بخت! کیا بات ہے؟ نرجس منہ کیوں چھپا رہی ہے؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ وہ یہاں کچھ بیزاری ہی نظر آتی ہیں۔“

”اچھا۔“ داؤد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”تو میری عدم موجودگی میں پریشان تو نہیں ہوا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میں بہت خوش رہا کیونکہ ملازمین اور خدام نے میرا سہارا لیا۔“

داؤد نے کہا۔ ”اچھا، پھر تو ہی کاروبار کی دیکھ بھال کر۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ چند دن آرام کرنا چاہتا ہوں تو اپنے دستور العمل کا پابند رہوں۔“

چنانچہ فیروز بخت دوسری سوئی میں چلا گیا۔ داؤد اقامتی سوئی میں ہی رہا اور اس نے کمرے کے دروازے اندر سے بند کر لیے اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ دیر تک سونے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ آخر ٹھاٹھا اور سوئی کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ وہ سیدھا نرجس کے کمرے میں



پہنچا۔ کمر خالی تھا اور نرجس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کمرے سے ملحق حمام تھا، وہاں سے پانی کے گرنے کی آواز آرہی تھی۔ داؤد سمجھ گیا کہ نرجس نہار ہی ہے۔ وہ بیچوں کے بل چل کر حمام کے دروازے پر پہنچا اور کچھ دیر کھڑے رہ کر اندر کی آہٹ سننے کی کوشش کرتا رہا پھر دروازے کی جھری سے آنکھ لگا دی۔ اندر اندھیرا تھا اس لیے اندر کی چیزیں صاف نظر نہیں آرہی تھیں۔ وہ دھندلا دھندلا اس کا جسم دیکھنے کی ناکام کوشش کرتا رہا لیکن ناکام رہا۔ کچھ دیر بعد جب اس کو پوری طرح یہ اندازہ ہو گیا کہ نرجس نکلنے ہی والی ہے تو وہاں سے ہٹ کر نرجس کے کمرے میں جا کر دروازے کی اوٹ میں چھپ گیا۔

نرجس اپنے کمرے میں چلی گئی اور خلاف توقع وہ ابھی صبح طرح سے بیٹھی بھی نہ تھی کہ ایک دم داؤد سامنے آ گیا۔ نرجس لپٹی، شرمیلی اور پوچھا۔ "آپ کہاں تھے؟ یہاں کیسے آ گئے؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "نرجس! میں یہاں نہ آتا لیکن جب میں نے پید کیا کہ تم مجھ سے نہیں ملیں تو میں خود یہاں آ گیا۔ کیا یہاں آ کر میں نے غلطی کی ہے؟"

نرجس نے کہا۔ "ہاں، غلطی کی ہے اور محض غلطی ہی نہیں زیادتی کی ہے۔"

داؤد نے کہا۔ "اگر میں نے غلطی یا زیادتی کی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔"

نرجس نے منہ بنا کر کہا۔ "مانا کہ یہ حویلی آپ کی ہے لیکن میں آپ کے لیے....."

داؤد نے غمی سے کہا۔ "بس بس، میں یہ فضول باتیں سنتا نہیں چاہتا۔ اس وقت میں خاص کر اس لیے آیا ہوں کہ میری نظر میں ایک رشتہ ہے۔ اگر تم پسند کرو تو اس سے تمہاری شادی ہوسکتی ہے۔"

نرجس نے سختی سے کہا۔ "میں نہیں کروں گی شادی۔ اگر آپ نے دو ایک بار پھر یہی بات کی تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

داؤد نرجس کی برہمی سے ڈر گیا، بولا۔ "نرجس! زیادہ برہم ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

اس کے بعد وہ جانے لگا تو نرجس نے کہا۔ "سنئے تو۔" داؤد رک گیا۔ نرجس نے نظریں نیچی رکھیں اور پوچھا۔ "فیروز بخت کہاں ہے؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "وہ کاروباری حویلی میں گیا"

ہوا ہے اور شام تک واپس ہوگی۔"

نرجس نے اطمینان کی سانس لی، بولی۔ "میں تو فیروز بخت سے ڈرتی ہوں۔ کہیں اس کے سامنے کوئی ایسی ویسی حرکت کر دی تو ہم دونوں ویڑی شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔" داؤد نے جواب دیا۔ "نرجس! میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔"

نرجس خاموش ہو گئی پھر بولی۔ "آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

داؤد نے کہا۔ "میں تم سے کچھ بھی نہیں چاہتا۔ بس تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

نرجس نے چڑ کر کہا۔ "ہاتوں میں کیا رکھا ہے سبھی باتیں کر لیتے ہیں۔"

داؤد نرجس کے ہنرے سے اس کی اندرونی کیفیات کا اندازہ لگانے لگا۔

نرجس نے خلاف توقع کہا۔ "یہ آپ مجھ سے شادی کی بات کیوں کرتے رہتے ہیں آخر؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری عمر شادی کی ہے۔ تمہیں شادی کر لینا چاہیے۔"

نرجس نے طنزاً پوچھا۔ "اور آپ کی عمر؟ کیا ابھی تک شادی کی عمر نہیں ہوئی آپ کی؟"

داؤد چکرا گیا۔ "واہ، یہ کیا بات ہوئی۔ تم ابھی طرح جانتی ہو کہ میں نے ایک خاص مقصد سے شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔"

نرجس نے کہا۔ "پھر میں نے بھی شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا ہے اور کم زکم آپ تو مجھے شادی پر نہیں مجبور کر سکتے۔"

داؤد نے کہا۔ "اچھا تم شادی کرو یا نہ کرو لیکن مجھ سے باتیں ضرور کر لیا کرو۔ اس طرح میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ میں خود پر کتنا بھروسہ کر سکتا ہوں اور اس میں تمہارا کوئی حرج بھی نہیں۔"

نرجس نے جواب دیا۔ "حرج تو کوئی نہیں مگر آپ یہ خطرناک کام کریں ہی کیوں؟"

داؤد اس کے قریب جا بیٹھا۔ "یہ خطرناک کام نہیں ہے۔ میں خود کو آزمائش میں ڈالنا چاہتا ہوں اور یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنے نفس پر کتنا قابو حاصل ہے۔"

نرجس نے جواب دیا۔ "اس طرح آپ خود کو تجا آزمائش میں نہیں ڈالیں گے۔ ساتھ میں مجھے بھی پریشان کریں گے اور میں پریشانی میں نہیں پڑنا چاہتی۔"



خدمت گار نے مطلع کیا کہ نظام آیا ہوا ہے اور آپ دونوں سے ملنا چاہتا ہے۔  
 نرجس اور داؤد نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر داؤد نے خدمت گار سے کہا۔ ”نظام کو دارالضیافت میں ٹھہراؤ، میں ابھی آتا ہوں۔“  
 خدمت گار چلا گیا تو نرجس نے داؤد سے کہا۔ ”اگر بھائی نظام کو یہ بات معلوم ہوئی کہ ہم دونوں جھپٹے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو معلوم نہیں کیا کیا سوچیں گے۔“  
 داؤد نے جواب دیا۔ ”اس کو یہ بات معلوم کیوں ہونے لگی؟“

داؤد باہر جانے لگا تو نرجس نے پوچھا۔ ”بھائی نظام یہیں آ جائیں گے یا مجھے ان کے پاس جانا پڑے گا؟“  
 داؤد نے جواب دیا۔ ”یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے کہ تم کہاں ملنا پسند کرو گی۔“  
 نرجس نے کہا۔ ”اگر یہیں بھیج دیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔“  
 داؤد ”بہتر ہے“ کہہ کر باہر چلا گیا۔ نظام دارالضیافت میں اس کا انتظار کر رہا تھا اور داؤد کو دیکھتے ہی احتراماً کھڑا ہو گیا اور نہایت ادب سے سلام کیا۔ داؤد نے پوچھا۔ ”کہو کیسے آتا ہوا؟“

نظام نے جواب دیا۔ ”میں ٹیل کا بہت بڑا ذخیرہ لایا ہوں۔“

داؤد نے پوچھا۔ ”وہ کہاں ہے؟“  
 نظام نے جواب دیا۔ ”گودام میں رکھوا دیا ہے۔“  
 داؤد نے کہا۔ ”اچھا، اب تجھے فیروز بخت کے ساتھ سورت کی بندرگاہ پہنچانا ہے۔ تو ٹیل کا جو ذخیرہ لایا ہے وہ اور اس کے علاوہ جو میرے پاس پہلے سے موجود ہے، وہ دونوں سورت کی بندرگاہ پر لے جا کر جہاز پر بار کر داتا ہے۔“  
 نظام نے جواب دیا۔ ”میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔“ پھر اپنی درخواست پیش کر دی۔ ”اگر میں سورت چلا جاؤں گا تو میرے گھر کی دیکھ بھال کون کرے گا؟“  
 ”کیا مطلب؟ میں تیری بات نہیں سمجھا؟“

نظام نے جواب دیا۔ ”میرے علاوہ کوئی اور مرد نہیں ہے پھر سہ یہ اور کیفیتیں تھا کس طرح رہیں گی؟“  
 داؤد نے کہا۔ ”تو اپنی عدم موجودگی میں اپنی بہنوں اور بچوں کو میری حویلی میں رکھ سکتا ہے۔“ پھر سوچ کر سوال کیا۔ ”میں نے ایک سوال تو تجھ سے آج تک نہیں کیا شاید۔“  
 نظام نے عاجزی سے کہا۔ ”آپ جو سوال چاہیں

کریں، میں جواب دوں گا۔“  
 داؤد نے پوچھا۔ ”تیرے دونوں بہنوئی کہاں ہیں اور تو نے اپنی بہنوں کو اپنے گھر میں کیوں بٹھا رکھا ہے؟“  
 نظام نے دکھ سے کہا۔ ”اگر آپ یہ سوال نہ کریں تو اچھا ہوگا۔“  
 داؤد نے کہا۔ ”اگر کوئی ایسی ہی نامگفتنی بات ہے تو میں سوال نہیں کروں گا۔“  
 نظام نے اچانک دل سے پوچھا۔ ”کیا میں نرجس بہن سے مل سکتا ہوں؟“  
 ”بالکل جب چاہوں سکتے ہو۔ تمہیں کس نے منع کیا ہے۔“

”میں بہن نرجس سے اسی وقت ملنا چاہتا ہوں۔“  
 ”اس وقت..... ابھی مل لوں گے۔“  
 داؤد، نظام کو اندر لے کر چلا گیا۔ وہاں نرجس اپنے بھائی کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ بھائی کو دیکھتے ہی دوڑی اور دونوں ایک دوسرے سے چٹ گئے۔ داؤد یہ رقت انگیز منظر دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کر بھائی بہن کو تھلیہ میں باتیں کرنے کے لیے چھوڑ دی۔

داؤد نے نظام اور فیروز بخت کو سورت بھیج دیا تاکہ وہ ٹیل کا ذخیرہ جہاز پر بار کرادیں۔ یہ ٹیل فلج فارس کے راستے مشرق وسطیٰ، عرب اور ایران وغیرہ بھیجا جا رہا تھا۔ نظام نے سہارن، کینیڈا اور ان کے بچوں کو حویلی میں چھوڑ دیا تھا۔ ان کی آمد سے نرجس کا دل بٹھنے لگا۔ داؤد کو ان کی آمد سے خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ وہ عورتوں سے دور رہتا چاہتا تھا مگر ان سے دور رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کو افسوس اس بات کا تھا کہ کہیں وہ بہک نہ جائے لیکن پھر وہ یہ سوچتا کہ وہ ان سے ڈرے کیوں۔ ڈر نے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے دل میں چور ہے۔ ان کی وجہ سے وہ نرجس سے دور اور بے خبر ہو گیا تھا۔ لیکن ایک دن مہر و ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ رات کے ستارے میں نرجس کے پاس چل دیا۔ ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ یہ سوچ کر رک گیا کہ کہیں اس کا یہ کھل بدنامی کا باعث نہ بن جائے۔ وہ اپنے کمرے کی طرف واپس آ گیا لیکن جب وہ اس کے قریب پہنچا تو اس نے کمرے کے اندر سے ایک سایہ سا نکلتے دیکھا۔ داؤد ٹھنکا لیکن پھر دوڑ کر اس کا راستہ روک لیا اور پوچھا۔

”تو کون ہے اور میرے کمرے میں کیا لینے گیا تھا؟“  
 دوسری طرف سے نرم و نہیف آواز میں جواب



ملا۔" میں ہوں نرجس۔ آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہیں۔"

داؤد نے حیرت سے پوچھا۔ "لیکن تم آئیں کدھر سے؟ میں نے تو تمہیں آنے دیکھا نہیں؟"

"میں جیتی چھپاتی آئی تھی آپ کے پاس۔" نرجس بوکھلا گئی، بدحواس ہو گئی، گھبراہٹ میں وہ اپنا ہاتھ بھی نہیں

چھڑا سکی۔ داؤد نے اس کے ہاتھوں کو ہونٹوں سے لگا لیا۔ نرجس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ ناگواری سے پوچھا۔ "یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

داؤد نے راستہ روک لیا بولا۔ "یہاں سے یوں نہ جانا کیونکہ میرے دروازے پر خدام پہرا دے رہے ہیں۔ وہ تمہیں دیکھ لیں گے۔"

نرجس ٹھنک گئی، بولی۔ "پھر آپ مجھ سے دور رہیں۔" لیکن داؤد بے قابو ہو چکا تھا۔ اس نے دوبارہ ہاتھ پکڑ لیا اور مسکرا کر بولا۔ "تمہیں اپنی طاقت پر ناز ہے

شاید..... اب چھڑاؤ اپنا ہاتھ۔" نرجس نے چھڑانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی، بولی۔ "آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

داؤد نے کہا۔ "تم اتنی رات گئے میرے پاس کیا لینے آئی تھیں؟ تم کیا چاہتی ہو؟"

نرجس نے جواب دیا۔ "میں کچھ نہیں چاہتی، میں صرف بات کرنے آئی تھی۔"

داؤد نے کہا۔ "اور میں خود کو آزمائش میں ڈال کر یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ میں ضبط و برداشت میں کیا مقام رکھتا ہوں۔"

نرجس نے کہا۔ "آپ بہک رہے ہیں۔" داؤد نے جواب دیا۔ "یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ میں بہک نہیں رہا ہوں۔"

نرجس نے کہا۔ "اگر واقعی ایسا ہے تو میں آپ سے درخواست کروں گی کہ خدا را سنبھل جائیں۔"

داؤد نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ "اب تم یہ بتاؤ کہ اس وقت تم پوری طرح میرے قابو میں ہو یا نہیں؟"

داؤد اس حد تک اس کے چہرے پر جھکا کہ دونوں ایک دوسرے کی گرم سانسیں اپنے اپنے چہرے پر محسوس کرنے لگے۔ داؤد بڑی محبت اور دلچسپی سے نرجس کی صورت دیکھتا رہا اور نرجس بڑی کسمپرسی اور بے بسی سے

داؤد کو کھتی رہی۔ داؤد نے پس و پیش سے کہا۔ "تو چلو میرے کمرے

میں، وہاں باتیں بھی ہو جائیں گی۔"

نرجس کچھ بھیجی مگر دوسرے ہی لمحے داؤد کے کمرے میں چلی گئی۔ داؤد نے کمرے میں داخلے کے بعد پوچھا۔ "کیا خیال ہے کیا کمرے کو اندر سے بند کر لیا جائے؟"

نرجس نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "نہیں، دروازہ بند نہ کیجیے گا۔"

داؤد نے کہا۔ "اگر دروازہ کھلا رہے گا تو اندیشہ ہے کہ کہیں کوئی خدمت گزار کسی کام کے بہانے اندر نہ آجائے۔"

نرجس نے ڈر کر کہا۔ "پھر بند کرو بیٹھے۔"

داؤد نے دروازہ بند کر دیا۔ نرجس ابھی تک کھڑی ہوئی تھی۔ داؤد نے اپنی مسہری کی طرف اشارہ کیا۔ "کھڑی کیوں ہو؟ اس پر بیٹھ کیوں نہیں جاتیں..... کیا اس کی بھی اجازت دینا پڑے گی؟"

نرجس مسہری کی بیٹی پر بیٹھ گئی۔ داؤد نے ہنس کر کہا۔ "تکلف سے اس طرح بیٹھی ہو گویا بھانجے والی ہو۔"

نرجس قہقہہ ہنسنے سے بیٹھ گئی۔ داؤد نے تھائی کھینچ کر اس کے قریب کر لی اور اس پر بیٹھ گیا۔

داؤد نے پوچھا۔ "ہاں، اب بتاؤ بات کیا ہے؟"

نرجس نے کہا۔ "سہہ یہ اور کینیہ یہ پوچھ رہی تھیں کہ بھائی نظام کب تک واپس آئیں گے؟"

داؤد نے پوچھا۔ "پھر تم نے کیا جواب دیا؟"

نرجس نے جواب دیا۔ "میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔"

داؤد نے کہا۔ "ان سے کہہ دینا نظام کی واپسی میں تین ماہ تو لگ ہی جائیں گے۔"

نرجس نے انک ایک ایک کر پوچھا۔ "اور یہ کہ سہہ یہ اور کینیہ یہ پوچھ رہی تھیں کہ کیا آپ ہم سب سے ناراض ہیں؟"

داؤد نے کہا۔ "میں کیوں ناراض ہونے لگا۔ ان دونوں کے دل میں یہ خیال کیوں آیا؟"

نرجس نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ بھائی نظام کی عدم موجودگی میں آپ نے ایک دن بھی ہماری خیریت نہیں معلوم کی۔"

داؤد نے کہا۔ "نرجس! بات دراصل یہ ہے کہ میں عورتوں اور بچوں سے ذرا گھبراتا ہوں۔"

نرجس نے نیکی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کیوں گھبراتے ہیں؟"

داؤد نے صاف صاف کہہ دیا۔ "اس لیے کہ کہیں میں بہک نہ جاؤں۔"



داؤد نے کہا۔ ”میں کسی اور عورت کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو تجھ سے پوچھ رہا ہوں کہ تو مجھ سے کرے گی شادی؟“  
 زوجہ نے کہا۔ ”اگر بھائی نظام نے مجھے مجبور کیا تو میں کیا کروں گی؟“

داؤد نے سہل انگاری میں کہا۔ ”تو اس کی فکر کیوں کرے، یہ تو میرا مسئلہ ہے۔ میں ہی اس مسئلے کو حل بھی کروں گا۔“

زوجہ نے کہا۔ ”میں کس طرح اطمینان کروں؟“  
 داؤد نے جواب دیا۔ ”میں جو کہہ رہا ہوں، کیا میری بات کا بھی تو اعتبار نہیں کرے گی؟“

زوجہ نے داؤد کو باتوں میں لگا کر اچانک اس کو دھکا جو دیا تو وہ ایک طرف پھسل گیا۔ زوجہ اٹھی اور بھاگنے کی کوشش کی لیکن داؤد نے اسے پکڑ لیا۔ زوجہ زمین ہی پر بیٹھ گئی۔

داؤد نے کہا۔ ”اچھا زوجہ یہ تو بتا کہ تو کس طرح راضی ہوگی؟“

زوجہ نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتی، اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو میرے بھائی نظام کو آ لینے دو۔ وہی تم سے اس رشتے کی بات کریں گے۔“

داؤد نے حقارت سے کہا۔ ”وہ میری مخالفت کر سکتا ہے بھلا؟“

زوجہ نے جواب دیا۔ ”تم یہ مت کہو کہ وہ میری مخالفت کر سکتا ہے بھلا۔ میں جانتی ہوں وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ یہ تو میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں شادی کروں گی تو تم سے ورنہ میں شادی کروں گی تو نہیں۔“

داؤد نے اسے دوبارہ پکڑنا چاہا لیکن وہ چھلاوے کی طرح ادھر پھر لگتی رہی۔ داؤد کو ایک دم غصہ آ گیا۔ وہ تیزی سے زوجہ پر جھپٹا اور پکڑ لیا، بولا۔ ”زوجہ! بولو اب کیا کرو گی؟“

زوجہ نے جواب دیا۔ ”میں کچھ بھی نہیں کروں گی بلکہ میں کوشش کروں گی کہ بھائی نظام شادی کی بات مان لیں پھر.....“

داؤد نے کہا۔ ”دیکھو زوجہ! مجھے پھسلانے کی کوشش نہ کرو، ورنہ میں زیادت ہو جاؤں گا۔“

زوجہ نے ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کی لیکن داؤد بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا، بولا۔ ”دیکھو زوجہ! تم بلاوجہ ذلیل و خوار ہو جاؤ گی۔“

داؤد نے ایک بار پھر زوجہ کو پکڑ لیا اور بڑے جوش

زوجہ نے مسکرا کر کہا۔ ”خوب، بہک کیوں جا میں گے؟“  
 داؤد نے کہا۔ ”زوجہ! میں ایک بہت بڑا تاجر ہوں اور جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا اس لیے میں ابھی تک عورتوں سے ڈراؤر دور رہا ہوں۔“

زوجہ نے تنگ مزاجی سے جواب دیا۔ ”اگر آپ عورتوں سے دور دور رہنا چاہتے ہیں اور شادی نہیں کرنا چاہتے تو آپ غلط فہمی یا خوش فہمی سے یہ کیوں سمجھ بیٹھے ہیں کہ ”تو میں زبردستی آپ سے شادی کر لیں گی؟“

داؤد نے کھسیا کر کہا۔ ”یہ بات نہیں ہے زوجہ بلکہ میں احتیاط کرتا ہوں۔ میرا مطلب احتیاط سے ہے۔“

داؤد کے دل میں عجیب عجیب خیالات آرہے تھے۔ رات کا سناٹا، تنہائی، حوصلی پر مالکانہ اختیار، بے اندازہ مال و دولت ہونے کا احساس، زوجہ کی قربت..... کئی بار بے اختیار جی چاہا کہ زوجہ کا ہاتھ پکڑ لے لیکن ہر بار سنبھل گیا۔ بے اختیار غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکل گیا۔ ”اچھا زوجہ! سچ بتاؤ میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟“

زوجہ نے جواب دیا۔ ”آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ مصوم..... کسی بچے کی طرح۔“

داؤد نے کہا۔ ”لیکن میں بچہ تو نہیں ہوں۔“  
 زوجہ نے کہا۔ ”میں نے یہ نہیں کہا کہ آپ بچے ہیں، میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ آپ کسی بچے کی طرح مصوم نظر آتے ہیں۔“

داؤد نے بے اختیار زوجہ کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ ”لیکن میں بچے کی طرح مصوم کیوں نظر آتا ہوں جبکہ میں بچہ نہیں ہوں۔ میرے سینے میں ایک مرد کا دل دھڑک رہا ہے، اس دل میں جذبات ہیں، احساسات ہیں.....“

☆☆☆

پھر زوجہ نے داؤد کا منہ نوچ لیا۔ اس کے ماتن داؤد کی ناک اور رخسار کو زخمی کر گئے۔ اس نے اپنا چہرہ پیچھے ہٹا کر دونوں ہاتھوں کو کھٹنوں کے نیچے دبا لیا اور خود جبر اور سختی پر اتر آیا۔

زوجہ نے یکا یک مسکرا کر شوخی سے داؤد کی طرف دیکھا، بولی۔ ”تمہیں شادی کر لینا چاہیے۔“

داؤد نے پوچھا۔ ”کس سے کروں شادی؟“

زوجہ نے جواب دیا۔ ”کسی سے بھی کرو شادی۔“

داؤد نے پوچھا۔ ”تو کرے گی مجھ سے شادی؟“

زوجہ نے جواب دیا۔ ”تم سے ہر عورت کر سکتی ہے شادی۔“



نرجس نے بلک کر کہا۔ ”میں اپنے دل کو کس طرح تسلی دوں؟“

داؤد نے نرجس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، بولا۔ ”میں اس کی سلفانی کے لیے تیار ہوں تو بلاوجہ پریشان ہو رہی ہے۔“

نرجس نے ڈبڈبائی آنکھیں اوپر اٹھائیں پوچھا۔ ”تم اس کی کس طرح سلفانی کرو گے؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”تو جس طرح چاہے گی۔“  
نرجس نے داؤد کو حیرت طلب نظروں سے دیکھا اور ایک دم چٹ گئی، بولی۔ ”واہ! مجھ سے شادی کر لو۔“

داؤد نے اس کے بالوں کو بوسہ دیا اور پشت چھتھپاتے ہوئے بولا۔ ”مت گھبرائو نرجس! میں تم سے شادی بھی کر لوں گا۔ تو جو کیے کی میں وہی کروں گا۔“

نرجس نے کہا۔ ”یقین میں اس پر کس طرح یقین کروں؟“  
داؤد نے پوچھا۔ ”یقین نہ کرنے کی وجہ؟“

نرجس نے کہا۔ ”یقین نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ تم نے شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔“

داؤد ہنسنے لگا۔ ”ہاں، بے شک میں نے شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا تھا لیکن یہ عہد میں نے جب کیا تھا تو حالات کچھ اور تھے اور اب وہ حالات نہیں رہے۔ اس لیے میں تم سے شادی ضرور کروں گا۔“

نرجس کی نظروں میں بڑی بے بسی تھی، اچھا تھی۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

داؤد نے برجستہ کہا۔ ”تمہیں یقین آ جانا چاہیے۔“  
نرجس ایک بار پھر چٹ گئی، بولی۔ ”داؤد! مجھے جدا نہ کرو۔ خدا کے لیے مجھے اپنی دلہن بنا لو۔“

داؤد نے پھر تسلی دی۔ ”میں کہہ چکا ہوں کہ تم سے شادی کر لوں گا، تجھے اپنی دلہن بنا لوں گا۔“

نرجس کسی حد تک مطمئن ہو گئی اور داؤد کے جسم میں ایک بار پھر سنسناہٹ دوڑنے لگی۔ رات کے پچھلے پہر نرجس نے اپنے کمرے میں دلہن جانے کی درخواست کی۔ داؤد نے پوچھا۔ ”سہیادہ کیفیہ کو کیا جواب دو گی؟“

نرجس نے جواب دیا۔ ”اول تو وہ کمرے میں پڑی سو رہی ہوں گی۔ انہیں کچھ بتائی نہ ہوگا کہ رات بھر میں کہاں رہی۔“

”اگر انہیں کسی طرح یہ معلوم ہو گیا کہ تم رات بھر اپنے کمرے میں نہیں رہیں اور انہوں نے اس سلسلے میں سوالات کے تو کیا جواب دو گی؟“

دخوش میں کہا۔ ”اب تو کہیں جائے گی بھاگ کر۔ اب میں تیرے اور اپنے پندار کو ایک ساتھ خاک میں ملا دوں گا۔ میں اس جھوٹے پندار سے نکل آ چکا ہوں۔“  
نرجس بلک بلک کر رونے لگی۔ ”مجھے معاف کر دو داؤد خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔“

☆☆☆

کچھ دیر بعد پورے کمرے میں سناٹا طاری ہو گیا۔ نرجس مسہری پر اداس آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔ داؤد نے دوسری طرف کروٹ لے لی اور کسی سوچ میں پڑ گیا۔ کمرے میں بیچ شاخہ فانوس روشن تھا اور داؤد کی نظریں اس فانوس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی حرکت پر نادم تھا، اپنے پندار کی شکست کا بڑا اقلق تھا۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ سوچتا اے کاش لمحات گزشتہ واپس مل جائیں۔

دوسری طرف نرجس زار و قطار رو رہی تھی۔ اسے اپنے پندار کے خاتمے کا داؤد سے زیادہ ملال تھا۔ اس کی آنکھوں سے جھڑی لگ گئی تھی۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اس نے ایک دم داؤد کی طرف کروٹ بدلی اور شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ ”یہ تم نے کیا کر دیا داؤد..... بولو یہ تم نے کیا کر دیا؟“

داؤد دم سادھے پڑا رہا۔ نرجس کی سسکیاں اس کا دل دھلائے دے رہی تھیں۔

نرجس اٹھ کر بیٹھ گئی اور دیوانگی میں داؤد کے چنگیاں کاٹنے لگی۔ ”اب میں کیا کروں داؤد..... یولو اب میں کیا کروں؟ میں تو کہیں کی بھی نہ رہی۔ میں برباد ہو گئی۔ تم نے مجھے تباہ و برباد کر دیا۔ مجھے کہیں کا بھی نہ رکھا۔“

داؤد بھی بیٹھ گیا۔ نرجس کے سامنے چہرہ کر لیا اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر دل جوئی کرنے لگا۔ ”تو خودخواہ پریشان ہو رہی ہے۔ جو کچھ ہوا ہے، اس پر میں خود بھی نادم ہوں کیا مجھے اپنے پندار کی شکست کا کوئی دکھ نہ ہوگا۔“

نرجس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں ہوگا دکھ لیکن یہ تو میرے سوال کا جواب نہیں ہے، میں تو کہیں کی بھی نہ رہی۔“

داؤد نے اس کی زلفوں کی لٹکی ہوئی لٹ کو بوسہ دیا، بولا۔ ”جو کچھ ہوا ہے، اس کا ہم دونوں میں سے کوئی ذمے دار نہیں۔ اس کے ذمے دار وہ خاص حالات تھے جن میں ہم دونوں رہ رہے تھے۔ میرا خیال ہے، اب ہمیں لمحات گزشتہ کا ملال نہیں کرنا چاہیے۔“



زجس نے جواب دیا۔ ”جب سوال کیے جائیں گے تو میں ان کے جواب بھی دے لوں گی، آپ پریشان نہ ہوں۔“  
”اچھا۔“ داؤد کھڑا ہو گیا۔ ”تم ذرا رکو، میں باہر نکل کر بیٹھ کر لوں کہ کہیں کوئی خدمت گار جاگ تو نہیں رہا کیونکہ اگر کسی نے تمہیں اتنی رات گئے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تو بڑی شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔ تمہیں تم مجھے زیادہ۔“

”واہ یہ کیا بات ہوئی؟ تمہیں زیادہ اور مجھے کم کیوں؟ کیا میری عزت آبرو نہیں ہے؟“

”نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ میں اس حویلی کا مالک ہوں اور اس وقت میرا شمار ملک کے بہت بڑے تاجروں میں ہوتا ہے۔ ہم دونوں کی عزت و آبرو میں بڑا فرق ہے۔“  
زجس نے کہا۔ ”اچھا ذرا باہر نکل کر دیکھو کوئی خدمت گار کہیں ٹھہل تو نہیں رہا جو مجھے جاتے ہوئے دیکھ لے اور ملک اتھار کی عزت و آبرو خطرے میں پڑ جائے۔“

زجس کے جلوں میں چھپا ہوا خطرہ داؤد نے محسوس کر لیا لیکن برداشت کر گیا اور چپ چاپ کمرے سے نکل گیا۔ کمرے کے باہر پوری حویلی رات کے سکوت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہر طرف سے اطمینان کر کے داؤد زجس کے پاس واپس آ گیا اور سرگوشی میں کہا۔ ”زجس! آ جاؤ راستہ صاف ہے۔ چلو میں تمہیں تمہارے کمرے تک چھوڑ آؤں۔“

زجس، داؤد کے ساتھ ہوئی اور دونوں دبے قدموں حویلی کے چھٹی حصے کی طرف چل پڑے۔ ابھی یہ دونوں کچھ ہی دور پہنچے ہوں گے کہ حویلی کا پہرے دار ان دونوں کے سر پر پہنچ گیا اور ڈپٹ کر حکم دیا۔ ”ٹھہر جاؤ، کون ہو تم دونوں؟ اور کہاں جا رہے ہو؟“

داؤد کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ داؤد نے گرج دار آواز میں کہا۔ ”یہ میں ہوں، پیچھے ہٹو۔“

گرچہ ہوا پہرے دار پالتو کتے کی طرح خوشامد پر اتر آیا، بولا۔ ”حضور والا! غیریت تو ہے، میرے لائق کوئی خدمت؟“

داؤد نے حکم دیا۔ ”یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔“

پہرے دار بھاگ گیا۔ داؤد اس کو اس کے کمرے تک چھوڑ آیا۔

رات کے پچھلے پہر جب داؤد اپنے بستر پر سونے کے لیے لیٹا تو اس کی نیند اڑ چکی تھی۔ اس کمرے میں اس شب کچھ دیر پہلے جو کچھ ہو چکا تھا، داؤد اس کے اچھے برے پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔ اس نے یک سوئی سے اپنے دل کو ٹھولا کیا اسے زجس سے شادی کر لینا چاہیے؟ اس سوال کا

سیدھا سا جواب تھا۔ ”ہاں یا نہیں۔“ لیکن اس سے ہاں اور نہیں کے نتائج سے وہ مطمئن نہیں تھا۔ اگر وہ نہیں کہتے تو فوراً ہی اس کے تصور میں زجس کا اداس اور فکر مند چہرہ آجاتا اور یہ چہرہ اس سے گلہ کرنے لگتا تھا۔ ”داؤد! مجھے دھوکا نہ دو، مجھ سے فریب نہ کرو۔ میں تو کہیں کی بھی نہ رہوں گی۔“

اور اگر ہاں کرتا تو اندر سے کئی اسے سرزنش کرنے لگتا۔ کوئی ملامت کرتا تھا۔ ”کہتا تھا شادی نہیں کروں گا۔ ایک تجربہ کروں گا اور فیروز بخت کو وصیت کر جاؤں گا کہ اگر وہ شادی کرے گا تو اس کے کاروبار اور جائیداد سے محروم ہو جائے گا اور شادی نہیں کرے گا تو ان سب کا مالک رہے گا اور اب اگر وہ خود شادی کرے گا تو فیروز بخت کو کس منہ سے وصیت کرے گا اور پھر یہ کہ اگر وہ شادی کرے گا تو

زجس بھی کاروبار اور جائیداد میں حصے دار ہو جائے گی۔“

یہ ساری فکریں بڑی پریشان کن تھیں اور انہوں نے اسے تجربہ تک ہلکان اور پریشان رکھا۔

☆☆☆

اس واقعے کے کئی دن بعد تک زجس اور داؤد کا سامنا نہیں ہوا۔ داؤد خود بھی کھنچا کھنچا رہا کیونکہ دوسرے دن بیداری کے بعد وہ اپنے رات کے اقدام پر بہت شرمندہ ہوا تھا۔ اس کا ضمیر بار بار کچھ کے لگانا رہا۔ اسے یہ فکر بھی

پریشان کر رہی تھی کہ اس نے زجس سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ اس نے شیطان پر بار بار لاجواں پڑھی جس نے اس کو کہیں کا بھی نہیں رکھا تھا۔

دوسری طرف زجس بھی بہت پریشان تھی کہ داؤد اس سے ملاقات کیوں نہیں کر رہا۔ وہ اس سے منہ کیوں چھپا رہا ہے؟ وہ موقع کی تاک میں تھی کہ داؤد کو پکڑے اور اس سے بات کرے۔ اس نے داؤد میں یہ نیرت انگیز تہدیلی دیکھی کہ اب وہ باقاعدگی سے نمازیں پڑھنے لگا تھا۔ پانچوں

وقت کی نمازیں، رات کو تہجد بھی داکرتا تھا۔ داؤد نے خدمت گاروں اور پہرے داروں کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ اس کمرے میں کسی عورت کو نہ داخل ہونے دیا جائے۔

زجس نے ایک دو بار داؤد سے ملنے کی کوشش کی لیکن خدمت گار نے اسے روک دیا اور۔ ملنے سے باز رکھا۔ زجس کو کھسر تو بہت آیا لیکن پی گئی۔

ایک دن زجس نے بہت زیادہ جرأت سے کام لیا اور خلاف توقع داؤد کی کادر باری حویلی میں پہنچ گئی۔ اس وقت داؤد کے آس پاس خشیوں اور دوسرے کارندوں کا مجمع لگا ہوا



تھا۔ نرجس سر سے پاؤں تک چادر سے لپٹی ہوئی تھی۔ نشیوں اور پھرے داروں کو ہٹائی ہوئی داؤد کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اپنے سامنے اچانک نرجس کو دیکھ کر داؤد کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ بے اختیار پوچھا۔ "نرجس! تم..... خیریت تو ہے..... یہاں کیسے آئیں؟"

نرجس نے داؤد کو اوپر سے نیچے تک دیکھا، بگڑ کر بولی۔ "یہ تم، مجھ سے منہ کیوں چھپاتے ہو، آنکھیں کیوں چراتے ہو؟"

موجود ہیں۔"

نرجس نے داؤد کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "میں جیوں کی کیونکہ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے، مجھ سے فریب کیا ہے۔"

داؤد نے ہاتھ ہٹا لیا، بولا۔ "جینو! خوب جینو! اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ جینے چلانے۔ سے تمہارا کام بن جائے گا تو تمہیں جینے چلانے کی آزادی ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ نرمی اور آہستگی میں جو قائم رہے ہیں جینے کا اور جوش و جھجھلاہٹ میں اتنے ہی نقصان ہیں۔ میں تمہیں اچھی طرح سمجھے بغیر تم سے شادی نہیں کر سکتا۔"

داؤد نے زیر دہتی مسکرا کر کہا۔ "میں آنکھیں نہیں چراتا، یہ کس نے کہہ دیا تم سے؟"

نرجس نے جواب دیا۔ "میں کسی کے کہنے سننے میں نہیں آتی۔ یہ بات میں نے خود محسوس کی ہے۔"

داؤد نے کہا۔ "اگر یہ بات تم نے خود محسوس کی ہے تو فلا محسوس کی ہے۔"

نرجس نے کہا۔ "اس وقت میں تم سے فیصلہ کن باتیں کرنے آئی ہوں۔"

داؤد کو محسوس ہوا کہ کمرے کے در پر کچھ لوگ جمع ہو چکے ہیں۔ وہ تیزی سے باہر نکلا۔ وہاں نین نٹھی اور دو کارندے کھڑے تھے۔ داؤد نے انہیں ڈانٹا۔ "تم لوگ یہاں کیوں کھڑے ہو؟"

وہ سب گھبرا گئے۔ ایک نے کہا۔ "ہم لوگ اپنے کاموں میں لگ جانا چاہتے ہیں، رکھیں یا جائیں؟"

داؤد نے کہا۔ "ہم ڈ جاؤ، خدا کے لیے یہاں سے جاؤ۔ سب کو منع کر دو کہ جب تک میں خود نہ بلاؤں یہاں نہ آنا۔"

داؤد نے اپنے نشیوں اور دوسرے کارندوں کی طرف دیکھا اور سر کے اشارے سے چلے جانے کا حکم دیا۔ وہ لوگ چلے گئے تو داؤد نرجس کو ساتھ لے کر برابر والے چوڑے کمرے میں چلا گیا، پوچھا۔ "تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

نرجس نے گرمی سے جواب دیا۔ "میں یہاں اس لیے آئی ہوں کہ تم نے رات کے پچھلے پہر غیر اخلاقی حالات میں مجھ سے جو وعدہ کیا تھا، اس پر عمل درآمد کب ہوگا؟"

داؤد نے پوچھا۔ "کون سا وعدہ، کیسا وعدہ؟"

نرجس مختصر ہوئی۔ "تو تمہیں اپنا وعدہ بھی یاد نہیں رہا؟"

داؤد نے کہا۔ "یہ باتیں یہاں نہیں، گھر پر ہوں گی۔ یہاں سے واپس چلی جاؤ۔"

وہ لوگ چلے گئے، داؤد پھر اندر چلا گیا اور جاتے ہی نرجس سے کہا۔ "نرجس! میں اب بھی اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ میں چند دن دور دورہ کر رہا ہوں کہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم پر اس کا رد عمل کیا ہوتا ہے اور مجھے محسوس ہے یہ بات کہنا پڑ رہی ہے کہ تم نے یہاں آ کر جس قسم کی باتیں کی ہیں، ان سے میں بہت مایوس ہوا ہوں۔"

نرجس نے کہا۔ "میں تو یہ جاننے آئی ہوں کہ تم اپنے عہد پر کس حد تک قائم ہو؟"

نرجس نے جواب دیا۔ "میں یہاں سے بات کیے بغیر واپس جانے کے لیے نہیں آئی۔"

داؤد نے کہا۔ "دیکھو نرجس! تم میری حویلی میں نظام کی امانت ہو۔ نظام میرا گماشتہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھے نظام کی نظر میں شرمندگی اٹھانا پڑے۔"

نرجس جھٹی۔ "لیکن تم شرمندگی سے نہیں بچ سکتے کیونکہ تم خوب جانتے ہو کہ اپنی شرمندگی کا تم نے خود ہی انتقام کر لیا ہے۔"

داؤد نے جواب دیا۔ "میں اپنے عہد پر قائم ہوں اور تفصیل سے باتیں گھر پر ہی کروں گا۔"

نرجس نے نرمی اختیار کر لی۔ "گھر میں کس وقت اور کب بات کرو گے؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "تمہارے پاس میں خود آ جاؤں گا۔"

نرجس نے اور نرمی اختیار کی، بولی۔ "یہ سمجھ لو فیصلہ جلدی ہی کرنا ہے کیونکہ ہر بات نظام بھائی کے آنے سے پہلے طے پا جانی چاہیے۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے حکم میں تمہاری جو امانت آٹھو، ہے، اس کے لیے بھائی نظام کو کچھ بتانا پڑے۔"

داؤد نے جواب دیا۔ "خیر، تمہارے بھائی نظام



تھا۔ انہوں نے برآمدے میں پاؤں رکھتے ہی کمبلوں کی چھتری اتار دی اور اس نے فوراً ہی ان دونوں کو پہچان لیا۔ ان میں ایک تو نرجس تھی اور دوسری کو ٹھیک سے ٹھیک پہچان سکا تھا۔ داؤد نے اسے پہچانتے ہی غائب کیا۔

”ارے نرجس! یہ تم اور دوسرا کون ہے تمہارے ساتھ؟“  
نرجس نے جواب دیا۔ ”یہ کیفیہ ہے میرے ساتھ، بڑی ضد کر کے آئی ہے۔“

داؤد برآمدے سے اپنے کمرے میں جانے لگا۔ دونوں سے کہا۔ ”آپ دونوں اندر آ جائیں، یہاں بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔“

نرجس اور کیفیہ، داؤد کے ساتھ ہی کمرے میں داخل ہو گئیں۔ داؤد نے ان دونوں کو کرسیوں پر بٹھا کر خود مسمری پر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ ٹھوڑی پر رکھ کر وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ اس بار نرجس کے بجائے کیفیہ نے زبان کھولی۔

داؤد بھائی! مجھے بہن نرجس کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا، وہ بہت ہی شرمناک ہے۔“

داؤد نے شرارتا پوچھا۔ ”نہیں کیا معلوم ہوا جو تم شرمندہ ہو رہی ہو؟“

کیفیہ نے نرجس کی طرف دیکھا۔ نرجس ہلکے ہلکے رونے لگی۔ ”میں بھائی نظام سے کیا کہوں گی، وہ تو مجھے زندہ دفن کر دیں گے۔“

داؤد نے جواب دیا۔ ”وہ زندہ کیوں دفن کر دیں گے اور پھر اس کا مل ہے میرے پاس۔“

کیفیہ نے جواب دیا۔ ”وہ کون سا مل ہے آپ کے پاس، میں بھی تو سنوں۔“

داؤد نے نرجس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔ ”دیکھو نرجس! میں نے جب تم سے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ شادی نہ کروں گا تو تم اس کا حق چاہیں گے؟“

کیفیہ نے نرجس کی طرف دیکھا اور نرجس نے داؤد کو مخاطب کیا۔ ”داؤد! تم میری سمجھ میں نہیں آ رہے ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے، بھائی نظام کی آمد سے پہلے ہی ہو جائے۔“

داؤد نے فالوئس کی روشنی میں کیفیہ اور نرجس کو بڑی گہری نظر سے دیکھا۔ اس وقت کیفیہ زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ نرجس بھی بری نہیں لگی، لیکن کیفیہ میں واقعی کیف سا محسوس ہو رہا تھا۔ داؤد نے پوچھا۔ ”اچھا چلو، میں ایک شرط پر شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر وہ منظور ہے تو میں

بہتے نئے اندر اندر شادی کروں گا۔“

سے تو میں ڈرتا نہیں۔ اسے تو میں نے پہلے ہی نکال دیا تھا اور تمہارے کہنے سے میں نے اسے دو بارہ رکھ لیا ہے۔ میں اگر چاہوں تو اسے پھر نکال باہر کر دوں۔“

نرجس نے کہا۔ ”اور اپنی امانت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”نرجس! میں تاجر ہوں بلکہ ملک التجار..... حالات اور مواقع سے فائدہ اٹھانا میری فطرت میں پڑا ہے۔ جسے تم میری امانت کہہ رہی ہو، مجھے کیا پتا کہ وہ کس کی امانت ہے۔ جو عورت میری حویلی سے یہاں تک آسکتی ہے، وہ یہ امانت کہیں سے بھی لاسکتی ہے۔“ نرجس کے پاؤں تلے سے زمین سرکنے لگی۔

داؤد نے کہا۔ ”نرجس! اب حویلی واپس جاؤ، وہیں ساری باتیں ہوں گی۔“ نرجس چپ چاپ واپس چلی گئی۔

☆☆☆

داؤد نے پھر محافل اختیار کیا اور نرجس سے کوئی بات نہیں کی۔ نرجس سچ دتا ب کھاتی رہی۔ اس نے کئی دن انتظار کیا کہ داؤد اسے بلوائے یا اس کے کمرے میں خود آئے لیکن نہ تو وہ ٹھوڈا آیا اور نہ ہی نرجس کو بلوایا۔ داؤد کی یہ

روش دس بارہ دن قائم رہی۔ اس کے بعد اسے نرجس کی ضرورت پھر محسوس ہونے لگی۔ وہ رات کو بستر پر جاتا تو تنہائی کا احساس شدید ہو جاتا۔ عورت کے بغیر زندگی بے کیف اور

بے رنگ محسوس ہونے لگتی۔ وہ نرجس کا بڑی بے چینی سے منتظر تھا۔ اس نے خدمت گاروں اور پہرے داروں کو ہدایت کر دی تھی کہ اگر نرجس اس سے ملنا چاہے تو اسے نہ

روکا جائے۔

وہ بستر پر دراز کرو نہیں بدلی رہا تھا۔ اس روز نضا اپرا آلود تھی اور بادلوں کے گز گز آنے کی آواز پس آ رہی تھی۔ نصف رات کے بعد یوندا باندی شروع ہوئی اور پھر

موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ داؤد نے بستر چھوڑ دیا اور برآمدے سے بارش کا نظارہ کرنے لگا۔ ہوا کے ساتھ بارش کے جھونکے اسے بھی بھگور رہے تھے۔ سردی کی ہلکی سی لہر

چہرے جسم میں دوڑ رہی تھی۔ ایسی دھواں دھار بارش میں اس نے دو سیاہوں کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔

اندھیرے میں صحیح نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب وہ دونوں قریب آ گئے تو داؤد نے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

لیکن جواب سے پہلے ہی دونوں داؤد کے بائبل قریب پہنچ چکے تھے۔ ان کے سروں پر سبل پڑے ہوئے تھے جس سے بارش کا وہ اثر نہیں ہوا تھا جو ہونا چاہیے

تھا۔

تھے جس سے بارش کا وہ اثر نہیں ہوا تھا جو ہونا چاہیے

تھے جس سے بارش کا وہ اثر نہیں ہوا تھا جو ہونا چاہیے

تھے جس سے بارش کا وہ اثر نہیں ہوا تھا جو ہونا چاہیے



کیفیہ نے جواب دیا۔ "وہ شرط تاؤ، کون سی اور کیسی شرط؟"  
 داؤد نے کہا۔ "یہ بات ساری دینا جاتی ہے کہ میں  
 شادی کیوں نہیں کرنا چاہتا۔"

کیفیہ نے کہا۔ "یہ بات ساری دینا جاتی ہوگی لیکن کم  
 از کم میں تو نہیں جانتی کہ تم شادی کیوں نہیں کرنا چاہتے؟"  
 داؤد نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ میں نہیں چاہتا کہ  
 میرے بعد میری جائداد اور کاروبار کے حصے بخرے ہوں۔  
 اگر نرجس مجھے یہ یقین دلا دے کہ وہ بیوی بن جانے کے بعد  
 بھی میری جائداد اور کاروبار سے اپنا حصہ نہیں مانگے گی تو کل  
 ہی شادی کر لوں گا اس سے۔"

کیفیہ نے نرجس کی طرف دیکھا۔ نرجس نے کہا۔  
 "میں اس شرط کو مانتی ہوں۔"

داؤد نے کہا۔ "دیکھو، خوب اچھی طرح سوچ لو۔"  
 نرجس نے جواب دیا۔ "اس میں سوچنے کی کوئی بات  
 نہیں، میں اپنی عزت اور آبرو بچانا چاہتی ہوں، دولت  
 جائداد نہیں چاہتی۔"

داؤد نے کہا۔ "پھر میں بھی شادی کے لیے تیار ہوں۔"  
 نرجس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ کمرے کے باہر نضا  
 میں نکلی اور بادل کا شور برپا تھا۔

داؤد نے کیفیہ سے کہا۔ "اگر تم پسند کرو تو کچھ دیر کے  
 لیے یہاں سے چلی جاؤ۔ میں نرجس سے چند باتیں اور  
 کروں گا۔"

کیفیہ نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔ "میں کہاں  
 جاؤں؟ کوئی اور جگہ ہے میرے بیٹھنے کے لیے؟"  
 داؤد نے جواب دیا۔ "اپنے کمرے میں چلی جاؤ پھر  
 آ جانا۔"

کیفیہ نے بے دلی سے کبل سنبھالا، کہا۔ "اچھا پھر میں  
 چلتی ہوں۔ بہن نرجس کا کام ہر قیمت پر ہو جانا چاہیے۔"

داؤد نے کہا۔ "تم بے فکر ہو کیفیہ... کل تم بھی  
 آ جانا۔ تم سے بھی کچھ باتیں ہو جائیں گی۔"

کیفیہ نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ "ہاں ہاں،  
 میں بھی کر لوں گی باتیں۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔"

اس نے کبل اپنے سر پر ڈالا اور جہاں سے آئی تھی  
 اسی طرف واپس چلی گئی۔

نرجس اور داؤد ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے تھے  
 لیکن دونوں میں سے کوئی بھی بے تکلفی سے دیکھ نہیں رہا تھا۔  
 داؤد ایک دم اٹھا اور اس کے برابر آ بیٹھا۔ ایک ہاتھ اس کے  
 شانے پر رکھ دیا۔ "نرجس! بارش کا پانی اور نشے کیف میں

ڈوبی ہوا گیس کچھ کہہ رہی ہیں۔"  
 نرجس نے بات کاٹی۔ "بھئی کہ شادی میں بھی کاروبار  
 سے نہیں چو کے اور ہونے والا بیوی کو جائداد اور دولت سے  
 محروم رکھا۔ کیوں ہے نا یہی بات؟"

داؤد نے کھسکا کر جواب دیا۔ "نرجس! نہ تم...  
 بے وقوف ہو اور نہ ہی میں احمق ہوں۔ کوئی شوہر اگر اپنی بیوی کو  
 اس کا حق نہ دینا چاہے تو اس سے اس کا حق سلب نہیں  
 ہو جاتا۔"

"کیا پتا، میں تو اس کو سچ سمجھتی ہوں جو تم کہتے ہو۔"  
 نرجس نے ایک بار پھر خود کو داؤد کے رحم و کرم پر چھوڑ  
 دیا۔ بجلی کی کڑک چمک، بادلوں کی گھن گرج اور بارش کے  
 شور میں داؤد، نرجس کو اپنی ضرورت محسوس کر رہا تھا، زندگی  
 اور جوانی کی اہم ترین ضرورت جس کے بغیر مال و زر،  
 دولت، کاروبار، املاک، جو کچھ سب کچھ فضول اور بے کار  
 ہے۔ نرجس بھی داؤد کے پاس دہلی، سہلی اپنی اس غلطی اور  
 زیادتی کی معافی مانگ رہی تھی جو چند دن پہلے اضطراری  
 حالت میں کاروباری حویلی میں سرزد ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

نرجس مطمئن تھی کہ اب داؤد سے شادی ہو کر رہے گی  
 اور وہ ملک التجار کے مال و دولت اور کاروبار میں حق دار  
 ہو جائے گی لیکن خود داؤد، جھجھکی اور ہی سوچ رہا تھا۔ اب اس کا  
 بیاد مکمل چکا تھا، ضمیر کی آواز بھی کمزور پڑ چکی تھی۔ وہ بڑی  
 دلیری اور بے تکلفی سے نرجس، کیفیہ اور سعدیہ کے پاس پہنچ  
 گیا۔ داؤد کی آمد سے تینوں کو خوشی ہوئی۔ داؤد نے تینوں  
 سے کہا۔ "یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم تینوں ایک ہی جگہ  
 مل گئیں ورنہ مجھے باری باری تینوں کے پاس پہنچنا پڑتا۔  
 اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں ہر روز تم تینوں کی خدمت  
 ضرور معلوم کر لیا کروں گا۔"

نرجس نے زیر اب مسکراہٹ سے جواب دیا۔  
 "نہ سے نصیب، شکریہ۔"

کیفیہ ہنس دی۔ "بڑی جلدی خیال آیا آپ کو۔ میں  
 کس زبان سے آپ کا شکر یہ ادا کروں۔"

سعدیہ نے ہمت کی۔ "میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ حویلی  
 میں جہاں اور بہت سے خدمت گار رہتے ہیں، ہم بھی رہ  
 رہے ہیں۔"

داؤد نے جواب دیا۔ "نہیں بھئی، ایسی کوئی بات  
 نہیں۔ اس طرح تو آپ لوگوں کو سوچنا بھی نہیں چاہیے۔"  
 پھر نرجس سے کہا۔ "آج میں تمہارے ہاتھ کی پکی ہوئی کوئی



تمہارے پاس کہ میں تم سے چندا ہم باتیں کر لوں۔“  
 ”ابھی تک تو آپ نے کوئی اہم بات کی نہیں۔“  
 ”اہم بات یہ ہے کہ تم اپنے شوہر سے طلاق کیوں نہیں لیتیں؟“  
 کیفیہ نے ایک دم چوتھ کر داؤد کی طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب، طلاق..... طلاق کیوں لے لوں؟“  
 داؤد نے جواب دیا۔ ”جو شوہر اپنی بیوی سے دور دور اور لاپتہ رہتا ہو، اس سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پالینا ہی مناسب ہے۔“

کیفیہ نے کہا۔ ”آپ تاجر ہیں ملک التجار..... آپ ہر معاملے میں ہر شے کو تجارت کی سوتلی پرکتے پرکتے ہیں لیکن میں تو تاجر نہیں ہوں۔“  
 داؤد نے کہا۔ ”میں یہ نہیں کہتا کہ تم تاجر بن جاؤ۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ تم اپنے شوہر سے بلاوجہ زیادتی کرو۔ میں تو بس یہ کہتا ہوں کہ تم اپنے نفع و نقصان پر نظر رکھو، اپنی بھلائی کا خیال ضرور کرو۔ اگر ایسا آج نہیں کرو گی تو کل یہ ضرور کرنا پڑے گا۔ تو جو کل کرنا ہے، عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اسے آج ہی کر ڈالو۔“

”چلیے اگر میں اپنے شوہر سے طلاق لے لوں تو اس کے بعد مجھے کیا کرنا ہوگا؟“  
 ”اس کے بعد تیرے لیے ایک ایسا شوہر تلاش کیا جائے گا جو تم سے دور نہ رہے اور دولت مند بھی ہو۔“  
 کیفیہ نے کہا۔ ”بھائی نظام کی مرضی کے خلاف میں اپنے شوہر سے کس طرح طلاق لے سکتی ہوں؟“  
 داؤد نے جواب دیا۔ ”جب پھر نظام کی واپسی پر میں خود اس سے بات کر لوں گا۔“  
 کیفیہ نے کہا۔ ”میرا خیال ہے بھائی نظام آپ کی بات کا برامان جائیں گے۔“

داؤد نے کہا۔ ”اس وقت تو میں اس سے زیادہ بات نہیں کروں گا لیکن اگر تو وقت نکال کر چوری سے میرے پاس آگئی کسی وقت تو میں ضرور بات کر دوں گا۔“  
 کیفیہ نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میں آج ہی رات کو آپ سے مل لوں گی۔“  
 داؤد نے ہنس کر جواب دیا۔ ”میں اس ملاقات کا شکی شکریہ ادا کرتا ہوں۔“

کیفیہ نے کہا۔ ”اس میں شکریہ کی کوئی بات ہے ہی نہیں پھر یہ شکریہ کس بات کا؟“  
 داؤد نے منگھلو بند کر دی کیونکہ سامنے سے نرجس

چیز کھانا چاہتا ہوں۔“  
 نرجس نے خوشی سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ضرور، ضرور..... ابھی لو۔“ وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔  
 اب داؤد نے سہدیہ کو مخاطب کیا۔ ”آپ بھی کچھ پکالتی ہیں؟“  
 ”کیوں نہیں، میں کھانے پکانے میں نرجس کو شکست دے سکتی ہوں۔“

داؤد نے کہا۔ ”پھر آپ بھی باورچی خانے میں تشریف لے جائیں اور اپنی پسند کی کوئی اچھی سی چیز پکالائیں۔“  
 سہدیہ کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا کہ ملک التجار داؤد اس سے کچھ کھانے کی فرمائش کر رہا تھا۔ وہ بھی اٹھی اور نرجس کے پاس باورچی خانے میں چلی گئی۔

اب کیفیہ اور داؤد تیار رہ گئے تھے۔ کیفیہ نے سر جھکالیا تھا۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ داؤد گلنگل بانہ سے دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ”کیفیہ! یہ سچے کہاں چلے گئے؟“  
 کیفیہ نے جواب دیا۔ ”بارش کے پانی سے کھیل رہے ہیں۔“

داؤد نے لہہ بھر کے لیے سکوت اختیار کیا پھر آہستہ سے پوچھا۔ ”کیفیہ! تم آئی نہیں میرے پاس؟“  
 کیفیہ نے اجنبی انداز میں جواب دیا۔ ”کیا کرتی آکر؟ کوئی خاص کام تھا مجھ سے آپ کا؟“  
 داؤد نے کہا۔ ”تم آؤ تو کسی میرے پاس، میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

کیفیہ نے جواب دیا۔ ”میں بیٹھی تو ہوں آپ کے سامنے۔ وہ باتیں کیا یہاں نہیں ہو سکتیں؟“  
 داؤد نے کہا۔ ”ہاں، وہ باتیں یہاں نہیں ہو سکتیں۔“  
 کیفیہ نے بے رخی سے کہا۔ ”جب پھر مجبوری ہے۔ یہیں کیوں نہیں کر لیتے باتیں؟“  
 داؤد نے کہا۔ ”تم اپنے شوہر سے ملاؤ تو کسی اس کا پتا تو بتاؤ؟“

کیفیہ سوچ میں پڑ گئی کچھ تامل سے پوچھا۔ ”آپ اس سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“  
 داؤد نے جواب دیا۔ ”میں اس بے حس نوجوان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ کب سے تمہارے پاس نہیں آیا؟“  
 کیفیہ نے آہستہ سے کہا۔ ”ان فضول باتوں سے حاصل؟“  
 داؤد نے کہا۔ ”اس وقت میں اس لیے آیا تھا



منہ ستنا حاصل ہوگا؟ تقریباً بارہ ہزار کا قاعدہ ہو رہا تھا۔ چند ہفتوں کے سودے میں بارہ ہزار کا منافع۔ اس خوشی میں وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ سینیہ اور نرجس میں سے کون بخت آور ہے؟ ان میں کوئی ایک خوش قسمت تھا ضرور کیونکہ ان کے پاس سے آنے کے بعد ہی اتنے بڑا معاملہ ہوا تھا۔

اس نے اس دن ایک برکارہ سورت بندر روانہ کروایا اور نجام اور فیروز بخت کو یہ ہدایت کی کہ وہیں رکے رہو کیونکہ ابھی لٹھے اور چھینٹوں کے تھان ایک دوسرے جہاز پر بار کرنے ہیں۔ وہ نشیوں سے بڑی دیر تک کاروباری کاغذات کی تکمیل کرواتا رہا۔ مغرب کے بعد فرصت ملی تو سیدھا گھر پہنچا۔ اپنے کمرے میں جا کر لباس بدلنا اور ہاتھ منہ دھو کر کھانا طلب کیا۔ کھانا کھانے کے بعد کمرے سے باہر آیا اور چہل قدمی کرنے لگا۔ اس دوران اس نے خدام اور داروں کو ہدایت کر دی کہ رات کو صدر پھانگ پر موجود رہو لیکن اس کے سامنے پہرے دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ عشا کے بعد تمام خدمت گار اور پہرے دار پھانگ کی طرف چلے گئے۔

چہل قدمی کے بعد وہ کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر بستر پر دراز ہو گیا اور مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ اس مطالعے کے دوران ایک مترجم آواز سنائی دی۔ "کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟"

داؤد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ کہنیہ کی آواز تھی۔ داؤد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "کہنیہ! آ جا..... اس میں اجازت لینے کی کیا بات تھی۔"

کہنیہ نے جواب دیا۔ "میں تمہاری بات میں آپ کے پاس آتے ہوئے خوف زدہ تھی معلوم نہیں کس طرح یہاں تک آ گئی۔"

داؤد تیزی سے اٹھا اور کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ کہنیہ نے گھوم کر یہ منظر دیکھا اور پریشان کن لہجے میں پوچھا۔ "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "میں تیری عزت آبرو کو محفوظ کر رہا ہوں۔ اب تو اطمینان سے میری مسبری پر بیٹھ جا اور مجھ سے باتیں کر۔"

کہنیہ مسبری پر اُبھرتی اور خود داؤد ایک سوئڈھے پر بیٹھ کر کہنیہ سے پوچھا۔ "ہاں اب بتا، تیرا آنا کیوں ہوا؟" کہنیہ نے براہِ دل جواب دیا۔ "یہ عجیب مہل سوال کر رہے ہیں آپ؟ تو آپ کا حافظہ اتنا کمزور ہے کہ کبھی کی باتیں رات کو بھول جائیں۔ اس لیے کہ آپ ہی نے مجھے

آ رہی تھی۔ داؤد نے نرجس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "وہ آ رہی ہے بقیہ باتیں پھر کروں گا تمہ سے۔ اس وقت تو تو خاموش ہو جا۔"

دونوں ہی خاموش ہو گئے۔ نرجس کھانے کا تازہ تازہ پکا ہوا سامان لے کر آ رہی تھی۔ قریب آ کر کھانے کی چیزیں دسترخوان پر بچھا دین۔ پتھو دیر بعد سہ یہ بھی آ گئی۔ وہ بھی کھانے کا سامان لے کر آئی تھی۔ چاروں دسترخوان پر بیٹھ کر کھانے لگے۔ داؤد ان کے کھانوں کی دل بھر کر تعریفیں کر رہا تھا۔ کبھی وہ نرجس کے کھانوں کی تعریفیں کر کے اس کا دل بڑھاتا اور کبھی سہ یہ کی تعریفیں کر دیتا اور نرجس چل جاتی۔ کھانا کھا چکنے کے بعد داؤد نے کہا۔ "اتنا مزے دار کھانا کھا کر بھی جی چاہتا ہے، کھانا پکانے والیوں کے ہاتھ کاٹ لیے جائیں۔"

نرجس نے جواب دیا۔ "ہمارے ہاتھ کاٹ لینے سے آپ کو فائدہ کیا پہنچے گا؟" داؤد نے جواب دیا۔ "یہ کہ میرے بعد کوئی اور ایسی لذیذ چیزیں نہیں کھا سکے گا۔"

نرجس نے کہا۔ "لیکن ایک ایسی ترکیب بھی ہے کہ آپ یہ لذیذ کھانے مستفلاً کھاتے رہیں اور دوسرے لوگوں کو محض آپ کے طفیل یہ کھانے مل جایا کریں۔ جس کو چاہیں کھلائیں اور جس کو نہ چاہیں نہ کھلائیں۔" داؤد دیکھ گیا کہ نرجس اپنی شادی کی بات کر رہی ہے۔ وہ اس موضوع کو گول کر گیا۔

کہنیہ نے پوچھا۔ "یہ آپ چپ کیوں ہو گئے؟ بولے کیوں نہیں، کیا سوچنے لگے؟" داؤد نے جواب دیا۔ "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تم لوگوں میں اپنا بخت کتنی ہے۔"

کہنیہ نے کہا۔ "اپنا بخت ہم میں نہیں، آپ میں ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج ہم لوگ اس حویلی میں نہ ہوتے۔" داؤد نے کہا۔ "ممکن ہے ایسا ہی ہو۔"

داؤد کافی وقت گزار کر اپنی دوسری حویلی میں چلا گیا۔ وہاں احمد آباد کے مصافحات سے آئے ہوئے چند بیج پاری انتظار کرتے ہوئے تھے۔ یہ لوگ نئے اور چھینٹ سے نمونے لے کر آئے تھے اور اس سے کاروباری معاملہ کرنا چاہتے تھے۔ کافی دیر تک باتیں کرنے کے بعد سودا پت کیا اور داؤد نے ان سے کئی ہزار تھانوں کا معاملہ طے کر لیا۔ بیج پاریوں کو حویلی کے دارنہیہ منت میں ٹھہرا دیا گیا۔ ان سے جاننے کے بعد داؤد نے حساب لگایا کہ اس پر متوقع



# کیا آپ

## لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوا لیں۔

### المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دبئی طبری یونانی دواخانہ)  
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061  
0301-6690383

فون 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

بلا یا تھا یہاں میں اپنے آپ سے ہرگز نہیں آتی۔“  
داؤد مسکرانے لگا۔ ”چلو یہی سہی، میں نے ہی بلا یا تھا تجھے۔“ پھر پتھر رک کر پوچھا۔ ”کیا تجھے مضموم ہے کہ میں نے تجھے یہاں کیوں بلا یا تھا؟“

کیفیہ نے جواب دیا۔ ”مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔“  
داؤد نے کہا۔ ”کیفیہ! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تیرا نام کیفیہ کس نے رکھا تھا؟“

کیفیہ نے جواب دیا۔ ”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، مجھے یہ نام میری دادی نے دیا تھا کیونکہ وہ فرمایا کرتی تھیں کہ تیرے چہرے اور تیری آنکھوں میں ایک خاص قسم کا نشہ مایا جاتا ہے۔ دادی کے اس قول کی تقریباً سبھی نے تائید کی تھی۔“

داؤد نے کہا۔ ”میرا خیال ہے تیری دادی کو شاعری ضرور آتی ہوگی کیونکہ تیرے چہرے کو دیکھ لینے کے بعد انہوں نے تجھے شاندار نام عطا کر دیا۔ تو واقعی سرتاپا کیفیہ ہے۔“

کیفیہ کے چہرے پر خوشی اور شرم سے سرخی دوڑ گئی۔  
داؤد نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔ ”میں تیرا زاوہ وقت برباد نہیں کروں گا۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تجھے طلاق دلو اور تجھ سے شادی کر لوں گا۔“

کیفیہ نے چونک کر داؤد کو دیکھا، بولی۔ ”شادی کا وعدہ آپ نے بہن نرجس سے بھی کر رکھا ہے۔“  
داؤد نے جواب دیا۔ ”نہیں، اس سے میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ یہ اس کی خوش فہمی ہوگی۔“

کیفیہ نے کہا۔ ”اور اس وقت میں آپ کے پاس محض اس لیے آئی تھی کہ نرجس بہن کے معاملے میں آپ سے کوئی فیصلہ کن بات کر لوں۔“  
داؤد نے پوچھا۔ ”کیا فیصلہ کن بات کرے گی تو؟ جتنا میں تیار ہوں۔“

کیفیہ نے کہا۔ ”آپ نے اس کے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے، اس کی سلامتی شادی کر کے ہی ہو سکتی ہے۔ آپ کو یہ کام فوراً کر ڈالنا چاہیے۔“

داؤد نے کہا۔ ”میں اس سے شادی تو کر سکتا ہوں لیکن وہ زیادہ میری بات کرے گی اور مال و زر کی جیسے دار بھی بنتا چاہے گی اور میں یہ دونوں باتیں ناپسند کرتا ہوں۔“  
کیفیہ نے کہا۔ ”جیسا کہ میں پہلے بھی یہ یقین دلا چکی ہوں کہ نرجس بہن ان دونوں پر اصرار نہیں کریں گی۔ اگر وہ اصرار نہ کریں تو کیا آپ اس سے شادی کریں گے؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”اب تو مجھے سہ جیتا ہے گا۔“



کینیڈے نے جواب دیا۔ "آپ کے پاس جو کچھ بھی ہے، وہ میری اولاد کا اور میرا ہوگا۔"

داؤد نے کہا۔ "مجھے اس سے انکار ہی کب سے۔" کینیڈے نے کہا۔ "آپ کو ہمیشہ اس سے انکار ہی رہا ہے۔ آج معلوم نہیں کیوں آپ اتنے خوش مزاج اور ہشاش بشاش انسان نظر آ رہے ہیں۔"

داؤد نے پہلو میں گدگدنی کر دی۔ "میں ہمیشہ کا خوش مزاج اور ہشاش بشاش انسان ہوں کیونکہ میں اس نکتے سے اچھی طرح واقف ہوں کہ وہی نکتہ کشمکش کا میاب تاجر ہے جو خوش اخلاق ہو اور مسکراتا جانتا ہو۔"

زرجس اور کینیڈے کے بند سجدہ باقی رہ گئی تھی۔ اب داؤد کی نظر میں اس پر تھیں۔ زرجس کھپائی ہوئی تھی اور کینیڈے مصرحی کہ اس نے جو وعدہ کیے ہیں انہیں پورا کرے لیکن داؤد یہ کہتا تھا کہ کینیڈے پہلے اپنے شوہر سے طلاق تو لے لے، اس کے بعد وہ شادی کر لے گا۔ زرجس کو کینیڈے سے نفرت ہو گئی تھی کیونکہ اس کے خیال میں وہ شکار اس کا تھا مگر کینیڈے نے ہتھیار لیا تھا اور داؤد کا یہ حال تھا کہ وہ دونوں ہی کو خوش رکھ کر کام نکالنا چاہتا تھا اور دونوں ہی سے الگ الگ شادی کا وعدہ کر رکھا تھا اور دونوں ہی کو منع کر دیا تھا کہ اس راز کو وہ محفوظ رکھیں اور کسی پر کھلے نہ دیں لیکن زرجس مایوس تھی اور کینیڈے پر امید۔

دوسری طرف نظام اور فیروز بخت سورت بندرگاہ میں رکے ہوئے تھے۔ فیروز بخت کو سورت میں بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑیں وہاں نظام کا رویہ ظالمانہ ہو گیا اور اس نے فیروز بخت سے نوکر کی طرح سوک کیا۔ خود تو اچھے اچھے کھانا کھاتا اور فیروز بخت کو معمولی کھانے پر رخصت کر دیتا۔ فیروز بخت نے کئی بار احتجاج کیا لیکن اس کا نظام پر کوئی اثر نہ ہوا۔

نظام طاہوں سے مل کر کھیلے بھی کر رہا تھا اور زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی فکر میں تھا۔ فیروز بخت کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ آخر اس نے تین ماہ بعد بمشکل داؤد کے ہم خط لکھ کر اس میں نظام کی زیادتیوں کا تفصیلی ذکر کیا اور درخواست کی کہ اسے جلد از جلد واپس بلا لیا جائے۔

داؤد کو یہ خط ملتا تو کافی پریشان ہو گیا اور نظام کی جگہ کام کرنے کے لیے دو آدمی روانہ کر دیے اور نظام کے نام خط لکھ دیا کہ وہ ان دونوں کو اپنی ذمے داریاں سپرد کر کے فیروز بخت کے ساتھ واپس آ جائے۔

خط بھیجنے کے ساتھ ہی اس نے زرجس اور کینیڈے کو بھیج دیا۔

کیونکہ تو مجھے نہ ملی ہوتی تو میں زرجس سے شادی کر لیتا۔" کینیڈے نے کہا۔ "لیکن میں آپ کو کہاں ملی ہوں، میں ایک شادی شدہ لڑکی ہوں۔" داؤد اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ کینیڈے کھڑی ہو گئی۔ "ذرا دور رہیے مجھ سے۔"

داؤد نے اسے دھکا دے کر مسہری پر ترا دیا۔ توری چڑھا کر بولا۔ "تڑکی! یہ مت بھولو کہ میں ایک تاجر بھی ہوں، میں نے اس حویلی میں تم سب کو جگہ دی ہے۔ تمہارا خرچ برداشت کیا ہے۔ اس کے عوض میں تم تینوں سے اتر کچھ طلب کروں تو کیا میرا یہ مطالبہ غلط ہوگا؟"

کینیڈے ہم گئی، خوشامد سے بولی۔ "مجھ پر رحم کیجیے۔" داؤد نے مزاحمت ترک کر دی۔ "اچھا چل، میں تم پر رحم کر رہا ہوں۔ اب تو مجھ پر رحم کرو۔"

کینیڈے نے پوچھا۔ "میں آپ پر کیا رحم کروں؟" داؤد نے جواب دیا۔ "میں تم سے عشق کر بیٹھا ہوں۔ ایک عاشق جو کچھ چاہتا ہے تو اس سے اچھی طرح واقف ہے۔"

کینیڈے نے آہستہ سے کہا۔ "میں آپ کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔" داؤد نے جواب دیا۔ "اور میں بھی تمہیں کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ جیسے کو تیرا۔"

کینیڈے نے کہا۔ "اچھا اس وقت تو مجھ کو جانے دیجیے، مجھے سوچنے کا موقع دیجیے۔" داؤد نے جواب دیا۔ "میں تجھے یہیں سوچنے کا موقع دے سکتا ہوں۔"

"یہاں تو میں نہیں سوچ سکتی گی۔"

"پھر مجبوری ہے تو بھی مجبور رہے میں بھی مجبور ہوں۔" کینیڈے نے بے بسی سے کہا۔ "آپ تو میری مجبوری سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن میں کس طرح فائدہ اٹھاؤں؟" داؤد نے جواب دیا۔ "تو یہ فائدہ اٹھا سکتی ہے کہ مجھ سے شادی کا اقرار کر لے اور مجھ سے لے چوڑے مہر کا مطالبہ کر۔ اس کے علاوہ میرے مال و زر میں جسے دار بننے کی خواہش کر۔"

شاید کینیڈے کے منہ میں پانی بھر آیا، بولی۔ "اگر میں شادی کا وعدہ کر لوں تو آپ مجھے کتنا مہر ادا کریں گے؟" داؤد نے جواب دیا۔ "جتنا تو کہے گی، اتنا ہی مہر مقرر کر دیا جائے گا۔"

کینیڈے نے کہا۔ "میں پچاس ہزار کی بات کروں گی۔" داؤد نے پوچھا۔ "اور مال و زر میں سے تیرے حصے میں کیا آئے گا؟"



داؤد نے جواب دیا۔ "وہ ایسا ضرور ہوں گے۔"  
 کیفیہ نے پوچھا۔ "ایسا کب ہوں گے؟"  
 داؤد نے کہا۔ "جب تک تو اپنے شوہر سے طلاق نہیں  
 لے لی، میں تجھ سے شادی کی طرح کر لوں گا۔"  
 کیفیہ نے اپنا شبہ ظاہر کیا۔ "لیکن مجھے اس کی صداقت  
 پر شبہ ہے اور یوں لگتا ہے گویا آپ مجھے بہلا رہے ہیں۔"  
 داؤد نے ہنس کر جواب دیا۔ "نہیں، ایسی کوئی بات  
 نہیں۔ یہ تیرا شبہ ہے۔"

کیفیہ نے کہا۔ "کیا میرا یہ شبہ غلط ہے کہ اب آپ  
 سہیہ سے بھی وہی سلوک کریں گے جو ہم دونوں سے  
 کر چکے ہیں اور اس سے بھی اسی قسم کا وعدہ کریں گے جو ہم  
 دونوں سے کر چکے ہیں؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "یہ محض واہے ہیں تم دونوں  
 کے۔ سیدھی سچی بات تو یہ ہے کہ میں تیرے سوا کسی سے  
 شادی کروں گا ہی نہیں۔ میں، تجھ سے جو وعدے کیے  
 ہیں، ان پر پوری دیانت داری سے قائم رہوں گا۔"  
 کیفیہ نے داؤد کی باتوں پر کچھ کچھ پھر یقین کر لیا۔

داؤد نے پوچھا۔ "نرجس آیا کر رہی ہے؟"  
 کیفیہ نے جواب دیا۔ "شاید نرجس بہن بھی آپ  
 سے ملنے آئیں گی۔"

داؤد نے بے زاری سے کہا۔ "لیکن اس وقت میں  
 اس سے نہیں ملنا چاہتا۔"

"اگر نرجس بہن آپ سے ملنے آئیں گی تو انہیں  
 روکے گا کون؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "آج کی رات میں اپنا کمر  
 ہی بدل دوں گا۔ ایک دوسری خواب گاہ میں بسر کروں گا۔  
 نرجس آئے گی اور دیکھ کر چلی جائے گی۔"

کیفیہ خاموش ہو گئی۔ داؤد نے ایک لمحہ ضائع کیے  
 بغیر اپنا کمر چھوڑ دیا اور صدر پھاٹک کے قریب والے  
 کمرے کو خواب گاہ کے طور پر استعمال کیا۔ کیفیہ کے خیال  
 کے مطابق نرجس، داؤد سے ملنے گئی لیکن کمرے کو خالی دیکھ  
 کر واپس چلی گئی۔

رات کے پچھلے پہر کیفیہ نے اپنے کمرے میں جانے  
 سے پہلے داؤد کو قسم دلائی کہ وہ اپنا وعدہ پورا ضرور کرے  
 ورنہ وہ اپنی جان دے دے گی کیونکہ کالی کا صدر مدوہ نہیں  
 برداشت کر سکتے گی۔ داؤد نے اس کو آغوش میں لے کر یقین  
 دلانے کی کوشش کی کہ وہ مطمئن رہے۔ وہ داؤد کی دلہن بن  
 کر رہے گی۔

کیا کہ وہ دونوں چند دنوں کے لیے اپنے آبائی مکان چلی  
 جائیں کیونکہ نظام نے بطور خاص یہ ہدایت کی ہے کہ اس کی  
 واپسی سے پہلے نرجس اور کیفیہ کو ان کے اپنے مکان پر پہنچا  
 دیا جائے تاکہ وہ دونوں مکان کی صفائی سہرائی کر لیں۔  
 نرجس اور کیفیہ کو اس تجویز سے اختلاف ہوا۔ نرجس  
 نے کہا۔ "اگر ہم اپنے آبائی مکان میں جائیں گے تو تینوں  
 ساتھ جائیں گے ورنہ دو بھی نہیں جائیں گے۔"

داؤد نے جواب دیا۔ "میں نے اپنی طرف سے کچھ  
 بھی نہیں کہا نظام نے جو کچھ لکھا ہے، وہ میں نے بتا دیا ہے۔  
 تم دونوں کو اس پر عمل کرنا پڑے گا۔ میرے آدمی تم دونوں کو  
 تمہارے گھر چھوڑ آئیں گے۔"

سہیہ نے کہا۔ "لیکن میں تمہارا حویلی میں نہیں رہ  
 سکتی۔ میں دونوں کے ساتھ جاؤں گی۔"

داؤد نے کہا۔ "سہیہ! تو نہیں جائے گی کیونکہ نظام  
 نے تجھے اسی حویلی میں رکھنے کا حکم دیا ہے۔"

نرجس نے شک و شبہ سے پوچھا۔ "کیا آپ سچ بول  
 رہے ہیں؟"

کیفیہ نے سوال کیا۔ "بھائی نظام کا خط کہاں ہے؟"  
 داؤد نے دونوں کو جواب دیا۔ "تم دونوں کو یہ ناقص  
 سوال مجھ سے نہیں کرنا چاہیے۔"

سہیہ نے کہا۔ "تم دونوں کے ساتھ میں بھی  
 چلوں گی۔"

داؤد نے تینوں کو ڈانٹ دیا۔ "میں زیادہ بحث میں  
 نہیں پڑوں گا۔ سہیہ کے علاوہ دونوں کو اپنے مکان  
 میں جانا پڑے گا۔"

اور جاتے جاتے کہتا گیا۔ "کل صبح تم دونوں کو یہ  
 حویلی خالی کر دیتا ہے۔ میرے دو آدمی تمہارے ساتھ  
 جائیں گے۔"

وہ چلا گیا اور تینوں عورتیں آپس میں بحث مباحثہ  
 کرنے لگیں۔

رات کو کیفیہ داؤد کے پاس چوری سے پہنچی۔ داؤد  
 جانتا تھا کہ اس وقت اس کے پاس کیفیہ اور نرجس میں سے  
 کسی ایک کو پہنچنا ضرور چاہیے چنانچہ کیفیہ کو اپنے سامنے دیکھ  
 کر حیرت کا اظہار نہیں کیا، بولا۔ "کیفیہ! تم آئیں؟"

کیفیہ نے جواب دیا۔ "ہاں میں آئی۔"

داؤد نے طنزاً کہا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تو ضرور آئے گی۔"  
 کیفیہ نے کہا۔ "میں یہ معلوم کرنے آئی ہوں کہ آپ نے  
 مجھ سے جو وعدے کر رکھے ہیں، وہ ایسا بھی ہوں گے یا نہیں؟"



کے بعد وہ دونوں اور خاموش رہی لیکن پھر صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور مغرب کے بعد دونوں بچوں کو ساتھ لے کر داؤد کے پاس پہنچ گئی۔ داؤد نے اس کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا نظر کوئی خاص توجہ نہ دیا۔ سہد یہ کو دیکھ کر مسکرایا اور رومال سے منہ پونچھنے لگا۔ سہد یہ کا خیال تھا کہ داؤد اسے دیکھتے ہی گھبرا کر کھڑا ہو جائے گا اور خیریت پوچھے گا لیکن اس نے سرد مہری سے کام لیا تو سہد یہ کے دل کو چوٹ لگی۔ وہ داؤد کے قریب پہنچ کر کھڑی ہوئی۔ داؤد نے بے رخی سے پوچھا۔ "سہد یہ! خیریت تو ہے، کیسے آنا ہوا؟"

سہد یہ پھری ہوئی مٹی، بولی۔ "یہ مجھے کس بات کی سزا دی جا رہی ہے آخر؟"

داؤد نے حیرت سے پوچھا۔ "کیسی سزا..... کون دے رہا ہے تمہیں سزا؟"

سہد یہ نے کہا۔ "اتنی بڑی حویلی میں، میں تمہا نہیں رہ سکتی۔" داؤد نے اس کا مذاق اڑایا۔ "تو تم تمہا ہو کب اتنی بڑی حویلی میں؟"

سہد یہ نے بگڑ کر کہا۔ "میں بالکل تمہا ہوں، میرے کمرے میں ان دو بچوں کے علاوہ کوئی بھی نہیں اور میرے کمرے کے آس پاس دو دروازے خاموشی کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

داؤد نے جواب دیا۔ "ہاں، یہ تو ہے اور میں اس کے لیے محذرت خواہ ہوں، کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ یہ کر سکتے ہیں کہ مجھے بھی زنجس اور کیفیہ کے پاس بھیج دیجیے۔"

"لیکن میں تو وہی کروں گا جو نظام تمہارے بارے میں لکھے گا۔ اس نے تمہاری بابت یہی لکھا تھا کہ تمہیں حویلی میں روک رکھوں چنانچہ میں اس پر عمل کر رہا ہوں۔"

سہد یہ نے بلبلا کر کہا۔ "لیکن میں تو احساس تمہائی اور خوف سے مر جاؤں گی۔"

داؤد نے جواب دیا۔ "ہاں، اس کا علاج الیٹہ سے میرے پاس اگر تم پسند کرو تو یہاں میرے کمرے سے پیش دوسرے کمرے میں منتقل ہو جاؤ۔ اس طرح احساس تمہائی بھی دور ہو جائے گا۔" اور خوف بھی مٹ جائے گا۔"

سہد یہ نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ سوچنے لگی۔ کچھ دیر بعد بولی۔ "میں ایک شرط پر آپ کے قریب آ سکتی ہوں۔"

"کون سی شرط؟ کیسی شرط؟"

"یہ کہ آپ مجھے پریشان نہیں کریں گے۔"

"یہ عجیب شرط ہے تمہاری۔ میں نے تمہیں کتنی بار

دوسرے دن علی الصباح کیفیہ اور زنجس کو ان کے آبائی مکان روانہ کر دیا گیا۔ کیفیہ کے ساتھ ہی آٹھ سالہ شازیہ بھی چلی گئی تھی۔ اب حویلی میں سہد یہ اور دو بچے رہ گئے تھے۔ پانچ سال کا اسماعیل اور تین سال کا ابراہیم۔ زنجس جاتے جاتے داؤد کو دھمکی دیتی گئی تھی کہ اگر اسے دھوکا دیا گیا تو اس کا نتیجہ برا نکلے گا لیکن اس دھمکی کا داؤد پر کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ داؤد ایک عورت سے ڈرنے والا انسان نہیں تھا۔

دونوں کے جانے کے بعد کئی دن تک داؤد نے سہد یہ سے کوئی خاص ملاقات نہیں کی۔ کھڑے کھڑے گیا اور مزاج پرسی کر کے چلا آیا۔ اس دوران اس نے سہد یہ کو بہت اداس محسوس کیا۔ وہ سہد یہ سے اتنا لاطعلق بن چکا تھا کہ سہد یہ کو شدید احساس تمہائی ستانے لگا۔ پہرے داروں اور خدمت گاروں کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ سہد یہ کے کمرے کے قریب بھی نہ جائیں۔ اس طرح وہ سہد یہ کے دل میں تمہائی کا شہ یہ احساس اور خوف پیدا کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ جب سہد یہ تنگ آ جائے گی تو اس کے پاس ضرور آئے گی چنانچہ دو چار سرسری ملاقاتوں کے بعد داؤد نے سہد یہ کے پاس جانا ہی چھوڑ دیا۔ اتنی بڑی حویلی میں سہد یہ کو یوں محسوس ہونے لگا گویا وہ تمہا رہ رہی ہو۔ اس کو دونوں وقت کا کھانا پہنچا دیا جاتا اور اس کے بعد کسی کی شکل تک نہ دکھائی دیتی۔

اس طرح ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ ایک دن، شام کو جب کھانا پہنچایا گیا تو سہد یہ نے بوڑھے خدمت گار کو روک لیا۔ پوچھا۔ "بابا! کیا بات ہے، کیا داؤد کہیں گئے ہوئے ہیں؟"

بابا نے جواب دیا۔ "گئے تو کہیں بھی نہیں، ہاں مصروفیت بہت زیادہ ہے۔"

سہد یہ نے پوچھا۔ "وہ واپس کب آتے ہیں؟"

بابا نے جواب دیا۔ "تقریباً عشا کے وقت۔" پھر پوچھا۔ "کیا کوئی خاص بات ہے؟"

سہد یہ نے کہا۔ "خاص بات تو کوئی بھی نہیں، وہ میرے پاس مزاج پرسی کو ایک ہفتے سے نہیں آئے۔"

بابا نے پوچھا۔ "کیا نہیں بھیج دوں آپ کے پاس؟"

سہد یہ نے جواب دیا۔ "نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

بابا واپس چلا گیا اور سہد یہ کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ وہ بڑے شش و پنج میں تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس کو حویلی کے ستانے میں ڈر گھسنے لگا تھا۔ بابا سے بات کرنے



تنگ کیا ہے آخر؟

خوف تو نہیں لگ رہا؟

سعدیہ نے نظریں ملاتے بغیر جواب دیا۔ ”شاید اس کمرے میں، میں خوش رہوں گی۔ یہاں ڈرنے نہیں لگے گا۔“  
داؤد نے واپس جاسے ہوئے کہا۔ ”چلو بڑی خوشی کی بات ہے۔ میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں، اگر کوئی ضرورت ہو تو مجھے بے تکلفی سے یاد کر لینا۔“  
سعدیہ نے داؤد کو جاتے ہوئے دیکھا اور اس کے چلے جانے کے بعد کمرے کو اندر سے بند کر کے بیٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

داؤد کو نظام اور فیروز بخت کی واپسی کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔ رات کے سنے میں انتظار کی شدت کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی تھی۔ اس کو رہ کر خیال سنا رہا تھا۔ اسے نظام پر غصہ بھی بہت آ رہا تھا اور بار بار جی میں یہی آ رہا تھا کہ نظام جیسے ہی سرنے آئے اس کو ڈیکل و خوار کر کے نکال باہر کیا جائے۔ ابھی وہ ان خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ سعدیہ کے کمرے سے رونے کی آواز سنائی دی۔ سعدیہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ داؤد بے چینی سے اٹھا اور سعدیہ کی آواز آئی۔

”کون ہے؟ کیا بات ہے؟“

داؤد نے کہا۔ ”دروازہ کھولو، کیا بات ہے۔ تم رو کیوں رہی ہو؟“  
سعدیہ نے دروازہ کھول دیا اور اپنے پتنگ پر کنارے دیکھ گئی۔  
داؤد نے کمرے کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ”سعدیہ! بات کیا تھی؟ تم رو کیوں رہی تھیں؟“

سعدیہ نے جواب دیا۔ ”میں نے آپ کی بابت بڑا بھیا تک خواب دیکھا ہے۔ کچھ میں نہیں آتا کہ بیان کروں یا نہ کروں؟“

داؤد نے کہا۔ ”اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے، اپنا خواب بیان کرو۔“

سعدیہ نے داؤد کو کھڑا دیکھ کر بیٹھنے کی درخواست کی۔  
داؤد، سعدیہ کے سامنے ہی بیٹھ گیا اور کہا۔ ”ہاں تو وہ خواب بیان کرو جو ابھی ابھی تم دیکھ چکی ہو۔“

سعدیہ نے رک رک کر کہا۔ ”میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی عورت آپ کے ٹھکانے میں زہر طار رہی ہے اور وہ زہر آلود ٹھکانا آپ نے کھ یا تو آپ کی حالت غیر ہونے

سعدیہ نے شرمندگی سے جواب دیا۔ ”تنگ تو ایک بار بھی نہیں کیا لیکن مجھے معلوم نہیں کیوں خدشہ ضرور محسوس ہوتا ہے۔“

داؤد نے طنزاً کہا۔ ”خدشہ تو میں بھی محسوس کرتا ہوں۔“

سعدیہ نے پوچھا۔ ”آپ کس قسم کا خدشہ محسوس کرتے ہیں؟“

”یہی کہ میرے قریب آ کر کہیں تم مجھے تنگ کرنے لگو۔“

سعدیہ کو ہنسی آگئی۔ ”یعنی میں آپ کو تنگ کروں گی..... یعنی میں اور آپ کو؟“

داؤد بھی ہنس دیا، بولا۔ ”کیوں، اس میں توجہ کی کیا بات ہے؟“

سعدیہ نے کہا۔ ”آپ نے تو باتوں کا حرہ ہی کر کر کر دیا۔ میں آپ کو تنگ کروں گی، یہ عجیب بات کہی آپ نے؟“

”اور میں تم کو تنگ کروں گا۔ میری بات سے زیادہ عجیب یہ بات ہے۔“

”تب پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیا میں اپنا کمرہ چھوڑ کر آپ کے محققہ کمرے میں چلی آؤں؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”بس یہی ایک حل ہے تمہاری تنہائی کے احساس اور خوف کو دور کرنے کا۔“

سعدیہ نے کہا۔ ”میں آج ہی برابر والے کمرے میں چلی آؤں گی۔“

داؤد نے کہا۔ ”آج ہی نہیں، اسی وقت ابھی.... آخر دیر کس بات کی؟“

سعدیہ نے درخواست کی۔ ”تب پھر دو ایک خدمت گار میرے ساتھ کر دیجیے تاکہ میں اپنا سامان یہاں لے آؤں۔“

داؤد نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں یہ کام کروں گا، ابھی لو۔“

داؤد باہر گیا اور دو خدمت گاروں کو بلا لیا۔ انہیں حکم دیا کہ سعدیہ اور دونوں بچوں کا سامان ملحقہ کمرے میں لے آیا جائے۔ حکم کی فوری تعمیل ہوئی اور ذرا سی دیر میں سعدیہ برابر والے کمرے میں آگئی۔ خدمت گاروں کے چلے جانے کے بعد ذرا سی دیر کے لیے داؤد سعدیہ کے پاس گیا اور پوچھا۔ ”سعدیہ! کہو کیا حال ہے؟ اب تو خوش ہو، ڈر



جن سے تم خوف زدہ ہو؟“  
سعدیہ، داؤد کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی،  
بولی۔ ”چلیے چلتی ہوں لیکن تعبیر ذرا جلدی بتا دیجیے گا تاکہ  
میں فوراً واپس آ جاؤں۔“

داؤد اور سعدیہ ایک ساتھ باہر نکلے اور ایک ساتھ ہی  
داؤد کے کمرے میں داخل ہوئے۔ داؤد نے اپنی مسمری کی  
طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم وہاں مسمری پر بیٹھ جاؤ۔“  
سعدیہ نے پوچھا۔ ”اور آپ کہاں بیٹھیں گے؟“  
داؤد نے جواب دیا۔ ”میں تپائی پر بیٹھ جاؤں گا۔“  
اور وہ فوراً ہی تپائی پر بیٹھ گیا۔ سعدیہ مسمری پر بیٹھ  
گئی۔ اپنی عزت افزائی پر وہ بے حد خوش تھی۔

سعدیہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اب کیسے۔“  
داؤد نے کہا۔ ”اچھا تو سنو اور میری باتوں پر غور کرو۔“  
سعدیہ نے کہا۔ ”ارشاد، میں ہمتن گوش ہوں۔“  
داؤد نے کہا۔ ”تو سنو، تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ  
آدمی کی فطرت ہے کہ اس کو جس کام سے روکا جاتا ہے، وہ  
دہی کرتا ہے۔ آدم کو خدا نے منع کیا تھا کہ گندم کے قریب  
مت جانا لیکن آدم نے اس حکم کے خلاف کیا اور یہ گناہ  
کر کے چھوڑا۔“

سعدیہ پریشان تھی کہ داؤد کہنا کیا چاہتا ہے، بولی۔  
”ہاں یہ بات تو ہے لیکن اس طرح آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“  
داؤد نے جواب دیا۔ ”اگر میں اپنا مطلب کسی تمہید  
کے بغیر بیان کروں تو شاید تم ناراض ہو جاؤ گی؟“  
سعدیہ نے اطمینان دلایا۔ ”نہیں، میں ناراض نہیں  
ہوں گی۔ آپ کو جو کہنا ہے فوراً کہہ ڈالیے۔“  
داؤد نے کہا۔ ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ نرجس اور کینیرہ  
مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟“

سعدیہ نے جواب دیا۔ ”جانتی ہوں۔ وہ دونوں  
آپ سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔“  
داؤد نے کہا۔ ”اگر تمہیں یہ معلوم ہے تو یہ بات بھی  
جانتی ہوگی کہ میں اس معاملے میں کس حد تک سنجیدہ ہوں۔“  
سعدیہ نے جواب دیا۔ ”شاید آپ نال مشول سے  
کام لے رہے ہیں۔“

”بے شک، بے شک۔ تم نے صحیح اندازہ لگایا۔ میں  
ان سے شادی نہیں کروں گا کیونکہ وہ دونوں میرے معیار پر  
پوری نہیں اتریں۔“

سعدیہ خاموش ہو گئی، داؤد نے کچھ دیر تو سعدیہ  
سے بولنے کا انتظار کیا پھر یوں۔ ”اور سعدیہ! تم ایک بات

گئی۔ آپ چمکا کر ڈھیر ہو گئے اور میں نے آپ کو سہارا  
دے کر اٹھایا تو خود بھی لڑھک گئی۔ اس کے بعد میں نے کئی  
عورتوں کو بلا کر دریافت کیا کہ یہ معاملہ کیا ہے تو ان میں سے  
ایک عورت نے جواب دیا کہ بکواس بند کرو ہماری جو کچھ میں  
آئے گا وہ کریں گے۔“

سعدیہ چپ ہو گئی، داؤد نے پوچھا۔ ”بس یا تمہ اور؟“  
”بس اتنا ہی دیکھا خواب میں نے۔“  
داؤد ہنسا۔ ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو میری بابت بہت  
کچھ سوچتی رہی ہے۔“

سعدیہ نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”نہیں، انسی کوئی  
بات نہیں۔ میں آپ کی بابت کیوں سوچتی تھی؟“  
داؤد نے سوئے ہوئے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے  
کہا۔ ”نیند ہو تو انسی ہو کہ تمہاری سچی پکار سے بھی بچوں کی  
آنکھ نہیں کھلی۔“

سعدیہ چپ رہی۔ داؤد نے کہا۔ ”کیا تم اپنے خواب  
کی تعبیر جانتا چاہتی ہو؟“

سعدیہ نے پوچھا۔ ”کیا آپ اس کی تعبیر  
بتا سکیں گے؟“  
”کیوں نہیں، بتا کیوں نہیں سکوں گا۔“

”تب پھر بتائیے۔“  
داؤد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”یہاں نہیں، سنبھ جاگ  
جائیں گے۔ میرے کمرے میں چلو، وہاں تعبیر بتاؤں گا۔“  
سعدیہ نے کہا۔ ”نہیں، میں آپ کے کمرے میں  
نہیں جاؤں گی۔ جو کچھ بتانا ہے یہیں بتا دیجیے۔“  
داؤد نے ذرا ترش لہجے میں کہا۔ ”سعدیہ! اتنی بے  
اعتباری بھی کس کام کی؟“

سعدیہ نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”بے اعتباری کی  
بات نہیں، میں تو احتیاط کر رہی ہوں۔“  
داؤد نے سختی سے کہا۔ ”یہی احتیاط، کہاں کی  
احتیاط؟ تم میرے کمرے میں آؤ یا میں تمہارے کمرے  
میں چلا آؤں، بات ایک ہی ہے۔“

سعدیہ کھڑی ہو گئی، بولی۔ ”بس ذرا سی دیر کے لیے  
آپ کے کمرے میں چل سکتی ہوں۔ چلیے، میں چلتی ہوں۔“  
داؤد نے جوا۔ ”یہ ذرا سی دیر کے لیے بھی کیوں؟“  
سعدیہ نے کہا۔ ”آپ میری بات کا برا مان گئے  
شاید بے اعتباری ہمارے درمیان اس لیے موجود ہے کہ  
لوگوں کی زبان سے ڈر لگتا ہے۔“

”یہ کن لوگوں کی بات۔۔۔ ہوتی یہاں کون لوگ ہیں



نہیں ہے کہ میں بڑی مستحق عورت ہوں، میں حریص یا طالع ہرگز نہیں۔“

داؤد نے جواب دیا۔ ”ہائے سعد یہ! یہ تم کس چکر میں پڑی ہوئی ہو۔ حریص اور طالع ہونا کوئی بری بات تو نہیں۔ میں نے کہا نا کہ میں تمہیں خوش و غرم دیکھنا چاہتا ہوں اور ایک شادی شدہ عورت اسی وقت خوش رہ سکتی ہے جب اس کا شوہر اس کے پاس ہو اور اللہ نے مال و زر سے بھی نوازا رکھا ہو۔“

یہ کہتے کہتے داؤد نے سعدیہ کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ ”ذرا دیر بیٹھو تو سہی، بھاگ کیوں رہی ہو مجھ سے؟“

سعدیہ نے کہا۔ ”لیکن میں شادی شدہ عورت ہوں۔“  
”مت کھراؤ سعدیہ، مت بھراؤ..... کوئی پروا نہیں۔“  
”میرے اللہ، آپ کس قسم کے انسان ہیں آخر؟“  
داؤد نے کہا۔ ”میں تاجر ہوں، زندگی کے جملہ معاملات پر تاجرانہ نظریں رکھتا ہوں۔“ اب سعدیہ بالکل بے بس ہو چکی تھی۔

کافی دیر بعد مضمحل سعدیہ نے داؤد سے شوخ لہجے میں کہا۔ ”اور جناب کمال تو یہ ہے کہ آپ نے شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ اگر آپ کو اپنے نفس پر قابو نہیں ہے تو شادی ضرور کر لیجیے۔ اب تاجر آپ کے بس کا نہیں رہا۔“

داؤد نے جواب دیا۔ ”اپنے شوہر سے طلاق لے لو، اس کے بعد اپنے تاجر کا کوئی مستقل علاج بھی تلاش کر لوں گا۔“

سعدیہ نے او بری دل سے جو کچھ بھی کہا، وہ اس کے دل کی آواز نہیں تھی۔ جس ماحول میں آدی پلتا بڑھتا اور زندہ رہتا ہے، اس کے مطابق اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ وہ داؤد کی بے کلفی اور اس کے ردعمل سے اچھی طرح واقف تھی چنانچہ سعدیہ نے اس رات کے بعد داؤد سے تعاون کرنا شروع کر دیا اور زنجس اور کیفیہ کی طرح شادی کی آس لگا بیٹھی۔

☆☆☆

دو ہفتے بعد داؤد نے زنجس اور کیفیہ کو حویلی میں واپس بلا لیا۔ اب تینوں اس امید میں نہیں کہ داؤد ان سے شادی کر لے گا اور وہ ملک اتجار کی بی بی بن کر پیش کریں گی۔ یہ داؤد کا کمال تھا۔ اس نے ان تینوں کو الگ الگ کچھ اس طرح یقین دلایا تھا کہ ہر ایک کو اپنی جگہ یہ یقین تھا کہ داؤد اس سے شادی کرے گا۔

تو بتاؤ مجھے۔“

”پوچھیے، ایک بات تو کیا، دس باتیں بتاؤں گی۔“  
”تمہارا شوہر کہاں ہے؟ اسے تو میں نے بھی دیکھا تک نہیں؟“

سعدیہ نے جواب دیا۔ ”اگر میں آپ کے سوال کا جواب نہ دوں تو؟“

”تو یہ تم نے مجھے تنگ کرنے سے منع کیا ہے لیکن میں تمہیں تنگ کرنا شروع کر دوں گا۔“

سعدیہ کھڑی ہو گئی۔ ”تو یہ ارادے ہیں آپ کے۔ اب میں سمجھی آپ کی باتوں کا اصل مطلب۔“

”اگر میری باتوں کا مطلب تمہاری سمجھ میں آ گیا تو جلدی سمجھ میں آ گیا۔ ہاں تو میں تم سے یہ پوچھ رہا تھا کہ تمہارا شوہر کہاں ہے؟ اس کی کچھ خبر ہے یا نہیں؟“

سعدیہ نے جواب دیا۔ ”میرا شوہر بھی آپ ہی کی طرح کے ایک تاجر کا گناشتہ ہے اور عرصے سے پردیس گیا ہوا ہے۔“

”میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ زندہ بھی ہے یا غربت ہی میں کتنے مرکھپ گیا۔“

”نہیں، وہ زندہ ہے اور ایک نہ ایک دن واپس ضرور آئے گا مگر آپ یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”سعدیہ! میں زیادہ ہیر پھیر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

ذرا دیر رک کر اس نے سعدیہ کے تاثرات کا اس کے چہرے سے اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

سعدیہ کوئی جواب دیے بغیر دروازے کی طرف بڑھی لیکن داؤد نے دروازے کو اندر سے مقفل کر رکھا تھا۔ سعدیہ تالا دیکھ کر غصے میں داؤد کی طرف مڑی اور سختی سے داؤد کو حکم دیا۔ ”تالا کھول دیجیے ورنہ اس کا نتیجہ بہت برا نکلے گا۔“

داؤد نے سمجھنا یا۔ ”دیکھو سعدیہ! جذبات سے کام نہ لو اور میری پیشکش پر اچھی طرح غور کر لو۔ اس کے بعد تمہیں اختیار ہوگا کہ میری بات مانو یا نہ مانو۔“ اور پھر اس کی پروا کیے بغیر کہ سعدیہ اس کی بات سن بھی رہی ہے یا نہیں وہ بولتا رہا۔ ”میں تم سے شادی کر کے مہر مہل کے پچاس ہزار فوراً ہی دے دوں گا۔ اس کے علاوہ اپنا پورا کاروبار اور املاک بھی نصف تمہیں دے دوں گا۔“

سعدیہ بھی پھسل گئی، متذبذب لہجے میں بولی۔ ”یہ کیسی پیشکش فرما رہے ہیں آپ؟ شاید آپ کو یہ بات معلوم



نہیں۔ آپ کی بات ہی نہ سمجھ سکتوں۔“  
 داؤد نے تیردی پریش ڈال کر پوچھا۔ ”یعنی تمہارے  
 خیال میں، تم سے فریب کر رہا ہوں؟“  
 ”بالکل بھدنی صدفرب۔۔۔ کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔“  
 داؤد نے پوچھا۔ ”اور اگر میں نے تم سے شادی کرنی  
 تو کیا کرو گی تم؟“

نرجس نے جواب دیا۔ ”سو رکعت نماز شکرانہ ادا  
 کروں گی اور کیا کروں گی۔“  
 داؤد نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ”جب پھر نماز شکرانہ  
 کی تیاری کرو کیونکہ میں تم سے شادی کر کے ہی رہوں گا۔“  
 اب داؤد کو نظام کا انتقال تھا۔ وہ مغرب کے بعد حویلی  
 میں داخل ہوا۔ داؤد نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ فیروز  
 بخت کو نظام سے چند قدم دور لے گیا اور سمجھایا۔ ”فیروز  
 بخت! اب تو نظام کی شکایتیں نہیں کرے گا کیونکہ میں نہیں  
 چاہتا کہ نظام میری کسی بات سے ناراض ہو کر مجھے نقصان  
 پہنچانے کی کوشش کرے۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں کسی کو بھی ناراض  
 نہیں کر سکتا، آپ مطمئن رہیں۔“  
 نظام نے کچھ دیر تو داؤد سے باتیں کیں، اس کے  
 بعد نرجس، سعدیہ اور کیفیہ کے پاس جانے لگا تو داؤد نے  
 اسے روک لیا اور کہا۔ ”نظام! جب تم اپنی بہنوں سے باتیں  
 کر چکے تو چند باتیں مجھ سے بھی کر لیتا۔“  
 نظام نے کہا۔ ”میرا، آپ سے باتیں ضرور کروں گا  
 لیکن آپ سردست مجھے یہ بتائیں کہ لڑکیوں نے آپ کو  
 پریشان تو نہیں کیا؟“

داؤد نے کہا۔ ”انہوں نے مجھے ذرا بھی پریشان نہیں  
 کیا لیکن ان کی وجہ سے میں واقعی پریشان ہو گیا ہوں۔“  
 نظام نے بے چینی سے کہا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟“  
 داؤد نے جواب دیا۔ ”میرا مطلب یہ ہے کہ میں  
 نے آج تک سعدیہ اور کیفیہ کو خوش نہیں دیکھا اور نہ ان  
 دونوں کے شوہروں کو دیکھا کہ ایک آدھ بار آ کر اپنی شکل  
 ہی دکھا جاتے لیکن دونوں میں سے ایک کو بھی نہیں  
 دیکھا۔۔۔ معلوم نہیں کیوں؟“

نظام نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”میں آپ کا تم سمجھ  
 گیا۔ میرے آقا میں بھی اس بات سے ذرا خوش نہیں کہ  
 شادیوں تو دونوں ہی کر دیں لیکن دونوں ہی بیوی جیسی  
 زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔“  
 داؤد نے کہا۔ ”میں نے اس کا حل تلاش کر لیا ہے۔“

پچیس پچیس دن کے بعد نظام اور فیروز بخت بھی  
 احمد آباد پہنچ گئے۔ فیروز بخت کا خیال تھا کہ احمد آباد پہنچتے ہی  
 نظام کی خبر لے لی جائے گی لیکن داؤد نے خوش اخلاقی سے  
 نظام کو خوش آمدید کہا۔ فیروز بخت کو حویلی میں چھوڑا اور نظام  
 کو فوراً ہی دوسری حویلی میں لے گیا اور اس کی سورت بندر  
 کی کارکردگی کا جائزہ لینے لگا۔ چند گھنٹے بعد اس نے نظام کو  
 اپنے دوستیوں کے حوالے کر دیا اور خود حویلی میں واپس  
 آ گیا۔ یہاں فیروز بخت سے اس کی روداد سنی۔ اس نے  
 بڑی آرزو کی اور افسوس سے نظام کے ظالمانہ سلوک کی  
 داستان سنا ڈالی۔ فیروز بخت کو یقین تھا کہ اس کی داستان کا  
 داؤد پر اثر ضرور ہوگا لیکن داؤد نے یہ کہہ کر فیروز بخت کو  
 بہت مایوس کیا کہ سورت میں اس کے ساتھ جو کچھ پیش آیا،  
 بہت ضروری تھا کیونکہ فیروز بخت کو ایک نہ ایک دن ملک  
 التجار بننا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے ہر قسم کے  
 تجربوں سے گزار دیا جائے۔

اس کے بعد داؤد کیفیہ، سعدیہ اور نرجس کے پاس  
 پہنچا اور انہیں نظام کے آجانے کی خبر سنائی۔ اس خبر سے  
 سعدیہ اور کیفیہ تو بہت خوش ہوئیں لیکن نرجس غمگین اور  
 پڑ گئی۔ یہاں داؤد نے نہایت ہوشیاری اور جالاکئی سے  
 تینوں کو الگ الگ یہ درس دیا کہ خبردار جو نظام کو داؤد کی  
 حرکات کے بارے میں کچھ بتایا۔ اس نے تینوں سے یہی کہا  
 کہ وہ ان سے شادی ضرور کرے گا لیکن نہایت عزت اور  
 وقار کے ساتھ۔ سعدیہ اور کیفیہ سے بات کرنے کے بعد  
 داؤد نے نرجس سے آٹھ سے آٹھ سے آٹھ سے آٹھ سے آٹھ سے آٹھ سے  
 کو اپنے پاس بلا دیا اور پوچھا۔ ”نرجس! تیرا بھائی نظام آچکا  
 ہے، اب بتا تیرا کیا منصوبہ ہے؟“

نرجس نے کسی قدر مایوسی سے کہا۔ ”میرا کوئی منصوبہ  
 نہیں۔ منصوبہ تو آپ کا ہوگا اور آپ مجھے اپنے منصوبے سے  
 مطلع کریں۔“

داؤد نے جواب دیا۔ ”میرا منصوبہ یہ ہے کہ میں اپنا  
 پیغام دوں اور نظام کو مجبور کر دوں کہ وہ تمہاری شادی مجھ  
 سے کر دے۔“

نرجس کے ہونٹوں پر طنز پر مسکراہٹ ابھری،  
 بولی۔ ”آپ مجھ سے اتنا تعین مذاق کیوں کر رہے ہیں؟“  
 داؤد نے حیرت سے کہا۔ ”میں مذاق کر رہا ہوں  
 تم سے؟“

نرجس نے جواب دیا۔ ”ہاں، آپ مجھ سے مذاق  
 کر رہے ہیں، تعین مذاق۔۔۔ میں اتنی نادان اور کم عقل بھی



تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ نظام نے نیسے میں آ کر حملہ کر دیا ہے اور اس کے تینوں کارندے اسے نظام کے رحم و کرم پر چھوڑ کر فرار ہو گئے ہیں۔ خوف سے داؤد کی چیخ نکلی اور جب آگہ کھلی تو تینوں کارندوں کو اپنے پاس کھڑے دیکھ کر خوف سے در یافت کیا۔ ”نظام کہاں گیا؟“

نظام اپنا نام سن کر سانسے پھینچی گیا اور بولا۔ ”میں حاضر ہوں۔“

داؤد نے نیم مڑھوٹی میں نغم دیا۔ ”نظام کو مارو، یہ جانے نہ پائے۔“

تینوں کارندے اس حکم پر آپس میں صورتیں دیکھنے لگے۔ اتنی دیر میں داؤد پوری طرح ہوش میں آچکا تھا۔ ہوش میں آتے ہی وہ شرمندہ سا ہو گیا اور لا حول پڑت ہوئے بولا۔ ”توہ تو بہ کیسا بھیانک خواب دیکھا ہے میں نے۔“

اس کے بعد منہ ہاتھ دھویا، ناشا کیا اور ناشتے میں نظام کو بھی شریک کر لیا۔ وہ داخلی طور پر اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح نظام کے اندر کی کیفیت کا اندازہ لگالے لیکن ناکام رہا۔ وہ حسب معمول غیر بدبانی اور عام دونوں جیسا تھا۔ داؤد کے تینوں کارندے اب بھی قریب ہی موجود تھے۔ نظام نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ نے انہیں کیوں روک رکھا ہے؟“

داؤد کا دل دھڑکنے لگا، بولا۔ ”ان سے مجھے چند ضروری کام لینا ہیں بس اسی لیے انہیں روک رکھا ہے۔“

نظام نے کسی پرس ویش سے کہا۔ ”اس وقت میں آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں، ضروری اور نہایت نازک جنہیں میں ان کارندوں کی موجودگی میں نہیں کروں گا۔“

داؤد خطرے کی بو محسوس کیے جا رہا تھا، بولا۔ ”لیکن یہ کارندے یہاں موجود رہیں گے۔ تاہم تم اگر پسند کرو تو اپنی ضروری اور نازک باتیں سرگوشی میں کر سکتے ہو کیونکہ تینوں کارندے ہم سے اتنی دور ضرور رہیں کہ وہ ہماری سرگوشی نہ سن سکیں۔“

نظام نے آہستہ سے کہا۔ ”بہتر ہے، مجھے آپ کی یہ تجویز منظور ہے۔“ پھر ایک لمبے کے لیے داؤد کو ذرا غور سے دیکھ کر سر جھکا لیا، بولا۔ ”میرے آقا! رات کو جب میں اپنی بہنوں سے ملا تو ان تینوں سے مجھ پر غریب باتیں معلوم ہوئیں اور میں ذہنی طور پر اتنا پریشان ہوا کہ رات بھر سو بھی نہیں سکا۔ فسوس کہ اگر مجھے ان باتوں کا پہلے ہی سے ذرا سا بھی اندازہ ہو جاتا تو ان تینوں کو اس حویلی میں نہ

نظام نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”وہ سن مجھے بھی بتائیے تاکہ میں ان دونوں کو کرب و اذیت سے نجات دلا دوں۔“

داؤد نے جواب دیا۔ ”تم ان دونوں کو حلاق دلا دو۔“

نظام چونک پڑا۔ ”میں انہیں طلاق دلا دوں؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

داؤد نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ طلاق کے بعد میں ان دونوں کی شادیاں ایسی جگہ کروادوں گا کہ دونوں تاحیات مزے کریں گی، ہمیشہ کریں گی۔“

نظام نے کہا۔ ”اچھا، پہلے میں اپنی بہنوں سے مل لوں اس کے بعد اس موضوع پر آپ سے اطمینان سے باتیں کروں گا۔“

داؤد نے بھی اجازت دے دی۔ ”اچھا جاؤ، پہلے اپنی بہنوں سے باتیں کر آؤ، بقیہ باتیں بعد میں ہو جائیں گی۔“

نظام کے اندر جاتے ہی داؤد نے ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کی تیاری کر لی۔ وہ اس کے لیے پوری طرح تیار تھا کہ اگر نظام اندر سے مشتعل نکلا تو اس کا مقابلہ کس طرح کیا جائے گا۔ اس نے اپنے تین طاقتور کارندوں کو اپنے کمرے میں چھپا دیا اور انہیں ہدایت کر دی کہ وہ جیسے ہی تالی کی آواز سنیں، باہر نکل آئیں اور داؤد جس کی طرف اشارہ کرے، بے خوف و خطر اس کا کام تمام کر دیں۔ اس نے فیروز بخت کو اپنی کاروباری حویلی روانہ کر دیا اور کہا۔ ”مجھے چند راتیں وہیں گزارنا ہوں گی۔“

داؤد نے کئی گھنٹے بڑی بے چینی میں گزار دیے۔ نظام کا کہیں پتہ نہ تھا۔ آخر نصف شب کو وہ آیا اور داؤد سے کہا۔ ”میرے آقا! اب آرام کریں، میں بھی آرام کرنا چاہتا ہوں۔ یوں مجھے بہت سی باتیں معلوم ہو گئی ہیں اور میں ان سب پر سچ تفصیلی بات کروں گا۔“

داؤد نے بھی اسے نہیں روکا اور یوں محسوس کیا تو یا نظام اسے دھمکی دے گیا ہے۔ اس نے اپنے کارندوں کو دروازے کے قریب بلا لیا اور انہیں ہدایت کر دی کہ رات بھر جاتے رہیں اور جو شخص بھی چوری جیسے اندر داخل ہونے کی کوشش کرے اسے ہلاک کر دیا جائے۔

نظام نے کارندوں سے کہا۔ ”مانک ہو جاؤ، ہاں تاکہ میں ان سے چند ضروری باتیں کر لوں۔“

بہن داؤد کو چکا یا گیا تو وہ بڑا بھیانک خواب دیکھ رہا



لاتا اور اگر حویلی میں لایا بھی تھا تو میں انہیں یہاں چھوڑ کر سورت نہ جاتا لیکن اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب اس کا تدارک کس طرح ہو۔ بس اس پر غور کرنا ہے اور کوئی نہ کوئی حل نکالنا ہے۔“

داؤد شرم اور عداوت سے گڑا جا رہا تھا، اسے حیرت تھی کہ سب کچھ جان لینے کے بعد نظام مشتعل کیوں نہیں ہوا۔ اسے غصہ کیوں نہیں آ رہا؟ مردہ سی آواز میں پوچھا۔  
”کیا... ہوا کیا؟ آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

نظام نے جواب دیا۔ ”میرے آقا! میری عدم موجودگی میں آپ نے معلوم نہیں کون سا جادو کروا دیا ہے کہ تینوں ہی آپ کے حسن سلوک اور لطف و کرم کے قصیدے پڑھ رہی ہیں۔ تینوں آپ کی تعریف و توصیف میں ہر ایک پر سبقت لے جانا چاہتی ہیں۔“

داؤد کی جان میں جان آئی لیکن پوری بات سنے بغیر خاموش رہا۔ نظام کہتا رہا۔ ”اور میں سب سے زیادہ پریشان اس بات سے ہوا کہ سعدیہ اور کیفیہ اپنے شوہروں سے خلع لینے پر مصر ہیں۔ وہ آپ سے والہانہ عشق کرنے لگی ہیں۔“

یہ کہتے کہتے نظام شرمندہ ہو گیا اور نظریں جھکا لیں۔  
”ابھی ابھی میں نے جو کچھ کہا، مجھے اندازہ ہے کہ مجھے یہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا لیکن سعدیہ اور کیفیہ کی باتوں میں سرکشی اور بغاوت پائی جاتی ہے۔ حالانکہ میں نے ہر طرح سے انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ آپ شادی نہیں کریں گے۔ آپ نے تازہ زندگی مجرد بننے کا عہد کر رکھا ہے لیکن وہ نہیں مانتیں۔“

داؤد اپنی قسمت اور مردانہ دجاہت اور دلکشی پر ناز کرنے لگا۔ بولا۔ ”نظام! بالفرض محال اگر میں تمہاری بہنوں کے جذبات کا پاس کروں بھی اور اپنے عہد تجرد کو توڑنے پر مائل بھی ہو جاؤں گا تو شرعاً میں کسی ایک ہی بہن سے شادی کر سکتا ہوں۔“

نظام نے کسی قدر زبردستی لہجے میں کہا۔ ”آپ کا فرمانا بجا ہے لیکن جب آپ نے ہمیشہ مجرد رہنے کا عہد ہی کر لیا ہے تو شرع اور فقہ کا ذکر ہی فضول ہے۔“  
داؤد نے پوچھا۔ ”اگر میرا سوال گراں نہ گزرے تو میں تجھ سے کچھ معلوم کروں؟“

نظام نے جواب دیا۔ ”آپ کے حسن اخلاق اور جود و سخا کا جو نقشہ میری بہنوں نے کھینچا ہے، اس کے بعد اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں آپ کی کسی بات کا برا

مانوں۔ آپ مجھ سے دس سوال کیجیے، میں خندہ پیشانی سے ان کے جواب دوں گا۔“

داؤد نے کہا۔ ”نظام! سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بھی تیری بہنوں کی شرافت اور طور، طریقوں نے بہت متاثر کیا ہے اور جب میں ان کی شرافت اور نیک کسی کو دیکھتے ہوئے ان کی الٹا نگہ زندگی پر غور کرتا ہوں تو بڑا دکھ ہوتا ہے۔ تو نے سعدیہ اور کیفیہ کی شادیوں کر دیں لیکن بد قسمتی سے دونوں کے شوہران سے دور کہیں پر دیس میں ہیں۔ آخر اس شادی کا فائدہ؟ اس سے تو بہتر ہوتا جس کی طرح وہ بھی غیر شادی شدہ رہیں۔“

نظام نے جواب دیا۔ ”آپ جو کچھ فرما رہے ہیں حرف بہ حرف درست ہے لیکن آپ، چونکہ میرے خاندانی پس منظر سے واقف نہیں ہیں اس لیے ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ ابھی تک تو میری یہی کوشش تھی کہ میں اپنے گھر کی باتیں آپ کے علم میں نہ لاؤں لیکن اب ان کا چھپانا فضول ہے۔“

داؤد ہمہ تن گوش حیرت سے نظام کی باتیں سن رہا تھا۔ نظام سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں چنانچہ ہچکچاہٹ اور بعد جب سراپا اٹھایا اور داؤد کی طرف دیکھا تو اس کی دونوں آنکھیں بڑبڑائی ہوئی تھیں اور چہرے پر اندوہ و ملال کے سائے سونہرے۔

داؤد نے اذرا ہوا ہر روی کہا۔ ”نظام! میں چاہتا ہوں کہ تو اپنی ہر بات مجھے بتا دے۔ میں دل کا بوجھ اتارنے کی کوشش کروں گا۔“

نظام نے جواب دیا۔ ”میرے آقا! میں زبان کھولنے سے پہلے اس سے پریشان ہو رہا ہوں کہ میں نے اپنی بہنوں کے متعلق آپ کو جو کچھ بتا رکھا ہے اس میں کسی قدر دروغ بھی شامل ہے، لیکن اب میں جو کچھ آپ کو بتاؤں گا وہ سب کچھ سچ ہوگا اور اس سچ کی وجہ سے میرے پچھلے جھوٹ سے میری حیثیت پر کیا اثر پڑے گا، میں نہیں جانتا۔“

داؤد نے جواب دیا۔ ”میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ میری نظر میں تیری وقعت پہلے سے زیادہ بڑھ جائے گی۔“  
نظام نے کہا۔ ”یہ آپ کی عظمت ہے۔ بہر حال میں شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔“

داؤد نے جواب دیا۔ ”تجھے شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تجھے تیری بہنوں سمیت شریف سمجھتا ہوں۔“  
نظام نے اٹک اٹک کر کہا شروع کیا۔ ”میرے آقا! بات دراصل یہ ہے کہ میرے باپ کو شادیوں کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے سات شادیاں کیں۔ تین بیویوں کا تو



میں نہیں آتا کہ میں انہیں کس طرح سمجھاؤں؟“  
 داؤد نے جواب دیا۔ ”انہیں تم مت سمجھانا۔ میں خود  
 سمجھا لوں گا، بشرطیکہ تم مجھے اس کی اجازت دے دو۔“  
 نظام نے بڑی انکساری سے کہا۔ ”آپ محسن ہیں،  
 ہمارے آقا ہیں۔ آپ جب اور جس طرح چاہیں انہیں  
 سمجھائیں۔ میں ان کے معاملات کو آپ کے سپرد کرتا ہوں۔  
 میں توکل ہی سے احتکاف میں بیٹھ جاؤں گا اور ٹھیک ساتویں  
 دن احتکاف سے باہر نکلوں گا، براہے وقتیں کا اثر دیکھوں گا۔“  
 لیکن داؤد نے اسے نبھور کر دیا کہ وہ اسی وقت سے  
 احتکاف میں بیٹھ جائے اور داؤد سات دن تک اس کی  
 ضروریات زندگی احتکاف کی کوٹھری میں بھیجا رہے گا۔  
 نظام نے اس کا حکم، ن لیا۔ حویلی کے بیرونی حصے کی  
 ایک کوٹھری میں نظام کو محکب کر دیا گیا۔ احتکاف کے لیے  
 بیرونی حصے کا انتخاب یوں عمل میں آیا کہ اس طرح داؤد کو  
 آزادی مل گئی تھی اور وہ بے دھڑک کسی روک ٹوک کے بغیر  
 نرجس، کیفیہ اور سعد یہ تہل کر چکے تھے اسکا سکا تھا۔

☆☆☆

نظام احتکاف میں بیٹھ گیا اور داؤد نے ایک خدمت  
 گار کو اس پر متعین کر دیا کہ وہ نظام کی ضروریات کا خیال  
 رکھے۔ خود داؤد عجیب کی اویٹرن میں بیٹھا تھا۔ نظام کی  
 زبانی معاملات جس طرح مکمل کر سامنے آگئے تھے، ان کی  
 روشنی میں وہ تینوں سے شادی کر سکتا تھا لیکن اسے کیفیہ  
 زیادہ پسند تھی۔ کیفیہ کے بعد سعد یہ اور سعد یہ کے بعد  
 نرجس۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس نے ان تینوں میں سے جسے  
 بھی نظر انداز کیا، وہی ایک ہنگامہ کھڑا کر دے گی اور اگر وہ  
 کسی طرح تینوں سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے تو کیا  
 نظام بھی اس بات کو گوارا کرے گا؟ شاید نہیں... پھر وہ کس  
 سے شادی کرے؟ یہ بڑا پریشان کن سوال تھا۔

اس نے باری باری تینوں سے ملاقات کی اور سوال  
 و جواب سے انہیں نشوونما تو پتا چلا کہ تینوں ہی کسی کے حق میں  
 دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ یہاں یہ معاملات زیر بحث تھے  
 اور دوسری طرف فیروز بخت کو کاروباری حویلی میں روک دینا  
 گیا تھا تا کہ اسے ان باتوں کا غم نہ ہو۔ فیروز بخت کو اس  
 بات کا دکھ تھا کہ جس نظام نے سورت بند میں اس سے  
 انتہائی ناروا اور اذیت ناک سلوک روا رکھا تھا، وہ تو داؤد  
 کے ساتھ حویلی میں مزے کر رہا تھا اور فیروز بخت جو مظلوم  
 تھا، کاروباری حویلی میں خشیوں اور کارندوں کے ساتھ رہ رہا  
 تھا۔ داؤد ہر روز سنا کاروباری حویلی میں آدھے دن کے

انتقال ہو گیا۔ ان کی اولادیں بھی زندہ نہیں ہیں۔ بقیہ چار  
 شادیاں جو انہوں نے کیں تو ان میں سے تین بیوہ تھیں اور  
 ان تینوں سے تین اولادیں بھی تھیں۔ نرجس، سعد یہ اور  
 کیفیہ۔ ان کے باپ بھی الگ الگ تھے اور میری سوتیلی  
 مائیں انہیں اپنے ساتھ لے کر میرے گھر میں آئی تھیں۔  
 میں اپنے باپ کی چوتھی بیوی سے ہوں اور میں اپنے باپ کی  
 سات بیویوں سے ایک کی تہا اولاد ہوں لیکن میرے باپ  
 نے اپنی سوتیلی اولاد کا اسی طرح خیال رکھا جس طرح میرا  
 رکھا تھا۔ چنانچہ اپنے باپ کے انتقال کے بعد میں نے بھی  
 سوتیلی بہنوں کا حقیقی بہنوں کی طرح خیال رکھا اور کیفیہ اور  
 سعد یہ کی شادیاں بھی کرویں۔ نرجس شادی کے لیے تیار  
 نہیں تھی اس لیے اس کی شادی نہیں ہوئی۔ یہ میری اور میری  
 دونوں بہنوں کی بد قسمتی کہ دونوں کو ایسے شوہر ملے کہ کچھ  
 عرصہ ساتھ رہ کر تلاش معاش میں ادھر ادھر نکل گئے اور  
 پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔ اپنی بہنوں کے ساتھ ہی میں خود بھی  
 ان دونوں کی مفقود الخبری سے سخت پریشان ہوں اور ان کی  
 خاموشی سے دو نتیجے اخذ کیے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یا تو ان  
 دونوں کا غربت میں انتقال ہو گیا ہے اور اگر انتقال نہیں ہوا  
 تو یہ دونوں کہیں دوسری شادیاں کر چکے ہیں اور اپنے بال  
 بچوں میں گن زندگی گزار رہے ہیں۔“ یہ کہتے کہتے وہ رو دیا  
 اور بھرائی ہوئی آواز میں مزید کہا۔ ”میری تو یہ دعا ہے کہ وہ  
 دونوں جہاں کہیں بھی ہوں خوش ہوں اور خدا انہیں ہدایت  
 دے کہ یا تو میری بہنوں کو طلاق دے دیں اور اگر طلاق  
 نہیں دیتے تو خود واپس آ جائیں۔“

داؤد ان انکشافات سے بہت خوش ہوا، پوچھا۔ ”وہ  
 دونوں گھر سے ایک ساتھ نکلے تھے؟“

نظام نے جواب دیا۔ ”ہاں دونوں فکر معاش میں  
 ایک ساتھ ہی گھر سے نکلے تھے۔ مجھے ایک بزرگ نے ایک  
 وظیفہ بتایا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اگر اس وظیفے کو ایک ہفتہ  
 پڑھا جائے تو انہی سات دنوں کے اندر ہی مفقود الخبری یا تو  
 واپس آ جائے گا ورنہ اس کی اطلاع ضرور مل جائے گی۔ اللہ  
 نے چاہا تو میں پرسوں اس وظیفے کو شروع کروں گا۔“  
 داؤد نے زور دیا۔ ”اس وظیفے کو فوراً شروع کر دے  
 اور پرسوں کا ست انتظار کر۔ اگر دونوں کو گلو خلاصی حاصل  
 ہو جائے تو میں ان کی بابت کچھ سوچ کر دوں۔“

نظام نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ”میرے آقا! یہ بات  
 ہے تو بڑی بے شرمی کی لیکن واقعے سے روگردانی بھی ممکن نہیں۔  
 میری تینوں بہنیں آپ پر بری طرح والہ و شیدا ہیں۔ میری کچھ



لے پہنچ جاتا اور فیروز بخت کو تسلیاں دے کر واپس آجاتا۔  
آخر ایک دن فیروز بخت نے پوچھ لیا۔ ”مجھے کب تک یہاں رہنا ہوگا؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”بس چند ماہ اور کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ تو کاروباری معاملات کو اچھی طرح سمجھ لے تاکہ تجھے میرے بعد کسی قسم کی پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔“  
لیکن فیروز بخت اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔  
داؤد کاروباری حویلی سے اٹھ کر جیسے ہی اپنی رہائشی حویلی میں داخل ہوا، کیفیہ اس کے پیچھے پیچھے آن موجود ہوئی اور اس نے سختی سے کہا۔ ”دیکھیے جناب! میں آپ کو متنبہ کرتی ہوں کہ اگر آپ نے مجھے دھوکا دیا تو میں آپ سے اپنی امانت کا سخت ترین انتقام لوں گی۔ میں معاف نہیں کروں گی اور شادی کے بعد اس حویلی میں بھی نہیں رہوں گی۔ ایک کٹھی الگ سے میرے نام کریں گے۔“  
”اچھا ٹھیک ہے میں حویلی تیرے نام کر دوں گا، تو مت پریشان ہو۔“

اس کے بعد اسی دن، رات لوگوں سے چھٹی چھپاتی سہد یہ بھی داؤد کے پاس پہنچ گئی اور کہا۔  
”آپ کیفیہ سے شادی کر کے ایک حویلی اس کے نام کر دیں گے۔ میں پوچھتی ہوں، میرا کیا بنے گا؟ میرے لیے آپ نے کیا سوچا ہے؟“

داؤد نے کہا۔ ”میں نے جب ایک بار تجھ سے کہہ دیا ہے کہ میں تجھ سے شادی کروں گا تو، تو یہ مایوسی کی باتیں کیوں کر رہی سے؟ اور رہی حویلی کی بات تو میں ایک حویلی خرید کر تیرے نام کر دوں گا۔“

سہد یہ نے کہا۔ ”اگر آپ نے یہ سب نہ کیا اور مجھے دھوکا دیا تو یاد رہے کہ میں آپ کے خلاف ایک ایسا قدم اٹھاؤں گی کہ آپ کا سب کچھ خاک میں مل جائے گا کیونکہ میں نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر میں محروم رہی تو ہر کوئی محروم رہے گا۔“

داؤد اس کی دھمکی سے پھرا گیا مگر پریشانی چھپاتے ہوئے بولا۔ ”تو مت پریشان ہو سہد یہ، میں تجھے مایوس نہیں کروں گا۔“

اس رات داؤد نے سہد یہ کو بڑی مشکل سے اپنے کمرے سے رخصت کیا۔ وہ سہد یہ کے چلے جانے کے بعد بڑی دیر تک اسی الجھن میں جھلا رہا کہ اس نے تینوں سے یکساں وعدے کر کے جو غلطیاں کی ہیں، اب ان سے عہدہ برآں کس طرح ہو؟ اس نے اپنے کاروبار کی وجہیہ ترین

## معلومات

☆ قرآن پاک کی پہلی سورۃ کجور کے بتوں پر لکھی گئی۔

☆ قرآن پاک میں صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید بن حارثہ کا نام آیا ہے۔

☆ قرآن پاک میں سب سے کم حروف ظاہر ہے۔

☆ کلمہ طیبہ میں کوئی نقطہ نہیں۔

☆ قرآن پاک میں لفظ اللہ 6701 بار آیا ہے۔

☆ سورۃ فلق اور سورۃ الناس ایک ساتھ نازل ہوئے۔

☆ سورۃ فلق اور سورۃ الناس ایک ساتھ نازل ہوئے۔

☆ قرآن پاک میں سب سے کم حروف ظاہر ہے۔

☆ کلمہ طیبہ میں کوئی نقطہ نہیں۔

☆ قرآن پاک میں لفظ اللہ 6701 بار آیا ہے۔

☆ سورۃ فلق اور سورۃ الناس ایک ساتھ نازل ہوئے۔

☆ سورۃ فلق اور سورۃ الناس ایک ساتھ نازل ہوئے۔

☆ قرآن پاک میں سب سے کم حروف ظاہر ہے۔

☆ کلمہ طیبہ میں کوئی نقطہ نہیں۔

☆ قرآن پاک میں لفظ اللہ 6701 بار آیا ہے۔

☆ سورۃ فلق اور سورۃ الناس ایک ساتھ نازل ہوئے۔

☆ سورۃ فلق اور سورۃ الناس ایک ساتھ نازل ہوئے۔

گھٹیاں چکیاں بھاتے سلجھائی تھیں لیکن یہ معاملہ اتنی وجہیہ کی اختیار کر گیا تھا کہ کوئی حل سمجھ میں آتا ہی نہ تھا۔ سوچتے سوچتے معلوم نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی۔  
مرغان حمر نے صبح ہونے کا اعلان کیا اور مسجدوں سے اصلوٰۃ خیر من النوم (نماز نیند سے بہتر ہے) کی سحر انگیز صدائیں گونجنے لگیں۔ داؤد کی آنکھ کھل گئی۔ وہ وضو کے لیے کمرے سے نکلا تو نرجس مل گئی اور کہا کہ اس نے نیند کی تار پھاڑ دی۔

داؤد نے کسی قدر تذبذب سے جواب دیا۔ ”لیکن کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس وقت تو تم اپنے کمرے میں چلی جاؤ کیونکہ میں نماز فجر ادا کرنے جا رہا ہوں، واپسی میں باتیں بھی ہو جائیں گی۔“

نرجس نے کسی چٹکے کے بغیر کہا۔ ”نہیں، میں اپنے کمرے میں واپس نہیں جاؤں گی۔ آپ نماز پڑھ آئیں، میں اسی کمرے میں آپ کو موجود لوں گی۔“

داؤد نے سمجھایا کہ بدنامی ہوگی لیکن وہ نہ مانی۔ نرجس نے اکر کر جواب دیا۔ ”میں بدنامی اور رسوائی سے نہیں ڈرتی اور جب ہم دونوں میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ شادی کریں گے تو ایسی رسوائی اور کہاں کی بدنامی؟“

داؤد عاجز آ گیا، بولا۔ ”اگر نظام نے تمہیں اس کمرے میں دیکھ لیا تو؟“

نرجس نے جواب دیا۔ ”اول تو بھائی نظام یہاں



آنے سے رہے کیونکہ وہ احتکاف میں ہیں۔ دوسرے اگر وہ یہاں آجھی گئے تو میں ان سے بالکل خوفزدہ نہیں کیونکہ وہ ہم دونوں کے عہد و پیمان سے خوش ہی ہوں گے، ناراض نہیں ہوں گے۔“

داؤد نے جب یہ محسوس کیا کہ نرجس کسی طرح بھی ماننے کو تیار نہیں تو مجبوراً نماز پڑھنے چلا گیا اور نرجس کمرے کا دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی اور اس کا انتظار کرنے لگی۔

داؤد نے فجر کی چار رکعت بڑی مشکل سے ادا کیں۔ واپس آ کر عاجزی سے پوچھا۔ ”اس طرح میرے انتظار کا مقصد؟“

نرجس نے جواب دیا۔ ”آپ نے کیفیہ اور سجدہ سے جس قسم کے وعدے کر رکھے ہیں، ان سے میں خوفزدہ ہو گئی ہوں۔ کیا آپ اپنے شادی والے وعدے پر اب بھی قائم ہیں؟“

داؤد نے بڑی آسانی سے ہاسی بھری۔ ”نرجس! تو کیوں پریشان ہو رہی ہے؟ میں نے تجھ سے سنا دنا کا وعدہ کیا ہے تو اسے ضرور پورا کروں گا۔ تو گھبرا کیوں رہی ہے؟“

نرجس نے ہنس کر طنز کیا۔ ”میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ ہم تینوں سے کس طرح شادی کریں گے؟“

داؤد نے حند بذب لہجے میں کہا۔ ”اگر تو رازداری کا وعدہ کرے تو میں تجھ سے چند ایسی باتیں کر لوں کہ تو مطمئن ہو جائے۔“

نرجس نے جواب دیا۔ ”جناب والا! میں پیٹ کی ہلکی نہیں، آپ مطمئن نہیں مجھے کیا سمجھتے ہیں؟“

داؤد نے ہنس کر جواب دیا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میرا فیصلہ بھی نہ ہے۔ میں صرف تجھ سے شادی کروں گا اور اس شرط پر کہ تو مجھ سے مال و زر کا مطالبہ نہیں کرے گی اور یہ کہ میرے کاروبار اور جائیداد کی حصے دار نہیں بنے گی۔“

نرجس نے جواب دیا۔ ”میں صرف بیوی بننا چاہتی ہوں، آپ کی بیوی، ملک و تجارت کی بیوی۔“

داؤد نے نہایت خوشی سے کہا۔ ”تب پھر تو مطمئن رہ کہ تو میری بیوی ضرور بنے گی۔“

نرجس نے ہنس کر طنز کیا۔ ”شاید بالکل اسی طرح مطمئن ہو جاؤں جس طرح سجدہ یہ اور کیفیہ مطمئن ہو گئی ہیں؟“

داؤد نے دولت مندی کو چمکا لگا، ناگواری سے کہا۔ ”نرجس! ادب سے بات کر ملک و تجارت سے۔ میں جو چاہوں گا کروں گا تو یا کوئی اور مجھے کسی بات پر مجبور نہیں کر سکتا۔“

میں تجھ سے شادی کروں یا کیفیہ اور سجدہ سے، تم سب میرے نرم و نرم پر ہو۔ میں اگر چاہوں تو تم تینوں سے شادی

نہ کروں۔ کسی چوتھی لڑکی سے شادی کر لوں۔“

نرجس نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔ ”بے شک، آپ اپنی مرضی کے مالک ہیں لیکن ہم تینوں سانپ کے منہ میں پھپھوند کی طرح اٹک جائیں گی اور آپ اتنی آسانی سے من مانی نہیں کر سکیں گے، یہ بات ذہن نشین رہے۔“

داؤد نے سختی سے کہا۔ ”اچھا، اب اس وقت تو یہاں سے چل جا پہلے اپنے بھائی نظام کو احتکاف سے نکل آنے دے۔“

نرجس نے کہا۔ ”اگر مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہیں تو اس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ مجھ سے معاملہ کر لیں۔“

داؤد نے اپنی پیشانی پکڑ لی۔ ”نرجس! خدا کے لیے اس وقت تو میرا پیچھا چھوڑ دے، میں بہت تھکا ہوا ہوں۔“

نرجس نے جواب دیا۔ ”میں نے بھی اپنے شب دروز بڑے کرب میں گزارے ہیں، تب مجھ میں اتنی اہم آئی ہے کہ آپ سے دو بدو صاف صاف باتیں کر لوں۔“

داؤد نے کہا۔ ”صاف صاف باتیں کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ میں ایک بار پھر تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں شادی بھی سے کروں گا۔“

نرجس جاتے ہوئے بولی۔ ”بہر حال آپ میرے ہونے والے شوہر ہیں، میں آپ کا حکم نہیں مانوں گی تو کس کا مانوں گی۔“

نرجس دل شکستہ آئی تھی لیکن فاتحانہ شان سے واپس گئی کیونکہ اسے اپنی کامیابی کا یقین تھا لیکن داؤد نرجس کے جانے کے بعد اور زیادہ لکرمند ہو گیا۔ اب نرجس اسے بلا محسوس ہو رہی تھی۔

کئی دن بعد نظام احتکاف سے باہر آ گیا۔ اس دن وہ بہت خوش تھا اور چیخ چیخ کر اعلان کر رہا تھا۔ ”لوگو! دیکھو، میرے احتکاف کا اثر دیکھو۔ میں نے اپنا مقصد پالیا، میں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ خدا کے کلام میں بڑی طاقت ہے۔“

داؤد نے بھی اس کا شور مٹا، بھاگا بھاگا نظام کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ ”کیا ہوا..... کون سا مقصد پورا ہو گیا؟“

نظام نے جواب دیا۔ ”مجھے اپنے دونوں بہنوئیوں کا پتا چل گیا ہے۔“

داؤد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، پوچھا۔ ”کیا وہ دونوں آگے؟ وہ کہاں ہیں؟“

نظام نے جواب دیا۔ ”وہ دونوں گوانیار میں تھے۔ گوانیار سے ایک آدمی آ رہا ہے اور اپنے ساتھ سجدہ کے شوہر سعادت علی کا خط لایا ہے۔“ اس نے ایک خط داؤد کی طرف بڑھا دیا، پورا۔ ”آپ خود پڑھیں اس میں کیا لکھا ہے۔“



نظام اپنے کرتے کے دائیں سے آنسو پونچھتا جا رہا تھا اور سرد آہیں بھر رہا تھا، بولا۔ "مستقبل کی فکر کس طرح کروں؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "س طرح کہ کیفیہ اور سعدیہ کے مستقبل کے بارے میں کچھ غور کرو۔ اللہ نے چاہا تو ساری مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔"

نظام نے آنکھیں موند لیں۔ گویا سر اور پیشانی میں سخت درد ہو رہا ہو، بولا۔ "میرے آقا! میں تو تباہ و برباد ہو گیا۔ میری عقل کام نہیں کر رہی۔ میں کیفیہ اور سعدیہ کی طرف سے مطمئن تھا اور اب صرف اپنی اور نرجس کی شادی باقی رہ گئی تھی لیکن اب کیفیہ اور سعدیہ کی شادی کا مسئلہ بھی اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اگر آپ یا کوئی بھی میری جگہ ہوتا تو میری ہی طرح اس کا صدمے سے بہت برا حال ہو جاتا۔"

نظام نے فرط جذبات میں داؤد کے ہاتھ پکڑ لیے، بولا۔ "میرے آقا! جو کچھ ہو چکا ہے، مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں ان روح فرسا واقعات سے اپنی بہنوں کو مطلع کروں۔ یہ کام آپ کو کرنا ہوگا کہ نہایت ہوشیاری سے آپ سب کچھ انہیں بتانگی دیکھیں اور انہیں زیادہ غمزدہ اور نگر مند نہ ہونے دیجیے۔"

داؤد نے فوراً ہائی بھری۔ "ہاں، میں تیرا یہ کام کروں گا اور تو مردست اعکاف میں رہ۔"

نظام کچھ دیر بعد پھر اپنے حجرے میں چلا گیا۔ داؤد بڑی دیر تک یہی سوچتا رہا کہ وہ یہ منحوس خبر کس طرح نظام کی بہنوں تک پہنچائے۔ ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ فیروز بخت بھی آ گیا۔ داؤد اسے دیکھتے ہی مسکرایا اور پوچھا۔ "فیروز بخت! خیر بت تو ہے؟ تو بغیر اجازت یہاں یوں آ گیا؟"

فیروز بخت نے جواب دیا۔ "میرا کاروباری حوالی میں رہتے رہتے دل صبرایا گیا تھا اس لیے میں آپ کے پاس واپس آ گیا۔ سارا اب بھی وہی ہے اور بہت پریشان ہے۔ بہت دہلی بہت یاد آتی ہے۔"

داؤد نے اسے غور سے سر سے پاؤں تک دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ "تجھے ہر حال میں وہیں رہنا تھا لیکن اب اگر وہاں آ گیا ہے تو چپ چاپ میرے کمرے میں پڑا رہ اور کسی بھی معاملے میں....."

فیروز بخت نے بات کوٹ دی، بولا۔ "اگر آپ کو میری آمد گران مگر رہی ہے تو میں اسی وقت واپس چلا جاؤں گا۔ میں آپ کی ناراضی اور ناخوشی مول نہیں لے سکتا۔"

داؤد نے کپکپاتے ہاتھ سے مذکورہ خط لے لیا۔ اس میں لکھا تھا۔

"بھائی نظام کو بعد از سلام، معلوم ہو کہ میں سعادت علی، شوہر سعدیہ گوالیار میں مقیم ہوں۔ کیفیہ کا شوہر شجاع الدین بھی میرے ساتھ ہی رہ رہا تھا۔ ہم دونوں یہاں تلاش معاش میں آئے تھے۔ ایک صاحب نے ہم دونوں پر بڑی مہربانیاں کیں اور گوالیار کے قلعہ دار سے ہمارا تعارف کروا دیا۔ اس نے ہم دونوں کو نہ صرف ملازمتیں دیں بلکہ اس نے ہم دونوں کی اپنی بیٹیوں سے شادی بھی کر دی۔ وہ ہم دونوں کو اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھا۔ ہم دونوں نے اس خوف سے کہ قلعہ دار ہمیں اپنے گھر اور ملازمت سے نکال نہ دے اپنی پہلی شادیوں کا راز مخفی رکھا۔ ہمارا ارادہ یہ تھا کہ خوب اچھی طرح کما چکنے کے بعد ایک دن یہاں سے چپ چاپ فرار ہو جائیں گے اور اپنی بیویوں اور بچوں سے آپس میں ملنے لیکن اب مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہو کچھ جاتا ہے۔ ایک ماہ قبل شجاع الدین، شوہر کیفیہ کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم نے اپنے پیچھے ایک بیوہ اور دو بچے چھوڑے ہیں۔ شجاع الدین کی ناگہانی موت نے میری ہمت توڑ دی ہے اور اب میں گوالیار نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ یہاں مجھے بڑی آسودگی حاصل ہے اور میرے اپنے بھی دو بچے ہیں۔ ایک لڑکی دوسرا لڑکا۔ میں انہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ کیفیہ بیوہ ہو چکی ہے، سعدیہ کو میں طلاق دے رہا ہوں تاکہ وہ زحمت انتظار سے بچ جائے۔ اب میں نہیں واپس آؤں گا اس لیے سعدیہ کو کیوں پریشان کروں، سعدیہ دوسری شادی کر سکتی ہے۔"

اس خط کے ساتھ سعادت علی کا طلاق نامہ بھی منسلک تھا، داؤد نے طلاق نامہ دیکھا اور سنانے میں آ گیا۔

نظام، سینہ کوئی کرنے لگا۔ "لوگو! دیکھو، مجھ پر کیا ستم توئے ہیں۔ ایک بہن بیوہ ہو گئی، دوسری طلاق پائی۔ اب میں کیا کروں؟ ہائے ہائے، اب میں کیا کروں؟"

داؤد اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گیا اور بڑی محبت سے سمجھانا شروع کیا لیکن نظام کو کسی پہلو قرار ہی نہ تھا۔ داؤد نے کہا۔ "نظام! جو کچھ ہو چکا ہے اس پر کسی انسان کا کوئی اختیار نہ تھا۔ کیفیہ کا شوہر شجاع الدین چل بسا۔ اس لیے اس کا ماتم فصول ہے۔ رہا سعدیہ اور سعادت علی کا مسئلہ تو ان حالات میں یہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ قلعہ دار کا تقاضا ہے کہ جو کچھ ہو چکا ہے، اس کا ماتم نہ لیا جائے اور مستقبل کی فکر کی جائے۔"



داؤد کو اس پر نرم آگیا۔ "نہیں جب تو آئی گیا ہے تو رہ۔" داؤد نے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔  
 فیروز بخت، داؤد کے سر سے اس بند بوجھ کر پھیرا۔  
 داؤد حوش کے ایک گوشے میں بیٹھ کر بہنے لگا۔ اس کے لیے تو یہاں تک سوچا گیا تھا کہ اگر وہ اپنے شوہر سے طلاق لے لے گی تو وہ اس سے شادی کرنے کا اور ایک نئی طرح فریہ کر سیکھتا تو اس میں منتقل کر دے گا لیکن اب جبکہ کینیڈا چھوڑا اور سحر سے مطلق ہو چکی تھی، معاملات نے زیادہ پیچیدگی اختیار کر لی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بسبب وہ کینیڈا اور سحر سے کوئی منگوا خط پڑھ کر سٹائے گا اور وہ دونوں وقتی رنج و ملال سے فرصت پا کر شادی پر مہر ہوں گی تو وہ ہم از کم سحر سے کیا ہے گا؟



داؤد نے بڑے غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے کینیڈا کو یہ خط پڑھ کر سنایا جائے اور اسے اجازت میں لے کر مشورہ کیا جائے کہ اب وہ کیا کرے۔ چنانچہ جب اس نے کینیڈا کو خط پڑھ کر سنایا تو وہ سکتے میں رہ گئی اور چھوڑ کر ہم رہنے کے بعد خوشی کا اظہار کیا۔ "چلو یہ تو اچھا ہی ہوا کہ طلاق نہیں لیتا پڑی۔ اب میں کچھ نہیں سنوں گی۔ بس حدت گزارتے ہی شادی کر لینا چاہتی ہوں۔"  
 داؤد نے کہا۔ "کینیڈا! تو اچھی طرح واقف ہے کہ میں صرف تجھ سے محبت کرتا ہوں اور میں بھی سے شادی بھی کرنا چاہتا ہوں۔"  
 کینیڈا نے مسکرا کر جواب دیا۔ "جو تجھ آپ نے کہا، اس کی صداقت مشتبہ ہے۔"  
 داؤد نے کہا۔ "اب میرے لیے مشکل مسئلہ یہ ہے کہ سحر یہ اور نرس جس بھی مجھ پر مائل ہیں اور مجھ سے شادی کرتا چاہتی ہیں۔ انہیں میں کس طرح باز رکھوں، ان دونوں سے میں کیا کہوں؟"  
 کینیڈا نے شکایتاً کہا۔ "آپ نے ان دونوں پہ نوازشیں کر کے اچھا نہیں کیا۔ اس سلسلے میں، میں خیر چاہتا ہوں اور خاموش رہنا چاہتی ہوں کیونکہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں جو مشورہ دونوں کی وہ آپ کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا۔"  
 داؤد نے جواب دیا۔ "نہیں، اسکی جونی بات نہیں۔ میں نے تجھ سے مشورہ مانگا ہی اس لیے ہے کہ میں اس پہ مائل بھی کر سکتا ہوں۔"

کینیڈا نے رُک رُک کر کہا۔ "دنیا میں بہت کم ایسی مثالیں ہیں کہ کسی عورت نے اپنی خوشی اپنی اہانت پر سوت کو وار کر لیا ہو لیکن میں اس کے لیے تیار ہوں۔ میری رائے تو یہ ہے کہ آپ سحر پر اور نرس سے بھی شادی کر لیں کیونکہ ہم تینوں سے شادیوں کرنے میں کوئی شرعی رکاوٹ بھی نہیں ہے۔"  
 داؤد سنے میں آگیا، کینیڈا کی بات پر یقین نہیں آیا، پوچھا۔ "کینیڈا! جو کچھ تو کہہ رہی ہے ایسا بہ قلمی ہوش و حواس میں کہہ رہی ہے؟"  
 کینیڈا نے جواب دیا۔ "ہاں اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ آپ اس بات پر سششور رہ جائیں گے لیکن آپ مجھ سے یہ بھی تو پوچھیے کہ میں نے آپ کو یہ مشورہ کیوں دیا؟"  
 داؤد نے دے دے لکھے میں پوچھا۔ "ہاں، اب بتا کہ تو نے یہ مشورہ کیوں دیا؟"

کینیڈا نے جواب دیا۔ "مجھے سحر یہ کی بہ قسمتی اور نرس بہن کی ویران زندگی پر رونا آتا ہے۔ کسی بھی رشتے سے کسی، یہ دونوں میری بہنیں ہیں اور میں اپنی بہنوں کو پریشان نہیں دیکھنا چاہتی۔ میں چاہتی ہوں کہ جہاں میں رہوں، وہیں میری دونوں بہنیں بھی رہیں۔ میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ اگر میں شادی کروں تو میری دونوں بہنیں بھی شادی کریں۔"  
 داؤد نے تجر تجر ہو کر کہا۔ "لیکن یہ کس طرح ممکن ہے؟ میں تم تینوں سے کس طرح شادی کر سکتا ہوں؟ کینیڈا! یہ بھی تو سوچ۔"  
 کینیڈا نے جواب دیا۔ "میں اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں سوچ سکتی کہ میری دونوں بہنیں بہت دگنی ہیں اور میں ان دونوں کو خوش و خرم دیکھنا چاہتی ہوں۔"  
 داؤد کو اپنے کاررو، راور اور جادو کی فکر تھی ہوئی تھی، بولا۔ "دیکھ کینیڈا! شادیوں تو میں چاہ کر سکتا ہوں اور اپنی بہنوں کا مالک و مقرر بھی ہوں لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ تجھے کسی قسم کا دکھ پہنچوں اور سحر بھی ایسی بات تو یہ ہے کہ میں اپنے کاررو پار اور ماں و نرس کی وجہ سے شادی سے بچتا رہا ہوں۔ ایک ہی شادی پر میں فخر مند ہو رہا ہوں، نہ کہ تین شادیاں کر کے اپنے ان نرس اور کاررو پار کو تھوڑا بہتر کروں۔"  
 کینیڈا نے تڑی سے کہا۔ "اپنے ماں و نرس اور کاررو پار میں نہیں شادی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اگر آپ نہیں تو میں اس موضوع پر ان دونوں سے بات بھی کر لوں گی۔ خیال ہے کہ وہ دونوں میری یہ بات مان میں گی۔"





مرنے کے سوا ان سے عاجز اور پریشان کرنے تھیں۔ وہ معصوم نہیں کیا سوچتا۔ ہاں ٹیکہ چھ ہی دیر بعد اسے اپنے کمرے میں آہستہ سی محسوس ہوئی۔ داؤد نے نظریں اٹھا لیں اور اپنے سامنے نرجس کو کھڑے دیکھا۔ داؤد ہبہ راہ ہوا ہو گیا، بولا۔ "نرجس! تم یہاں کب آئیں؟ خیریت تو ہے؟" نرجس نے کمرے کے کونے میں جواب دیا۔ "اس وقت میں آپ کے پاس اس سہیبہ کے ساتھ آئی ہوں کہ آپ مجھ سے جلد از حد شادی کر لیں۔ کیونکہ اگر آپ نے اب بھی لیت لطف سے کام لیا تو شاید ہم دونوں ہی کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑ جائے۔"

داؤد نے کہا۔ "نرجس! تم سے صاف صاف باتیں کر۔" نرجس نے بیزارگی سے کہا۔ "یہ کتنے شرم کی بات ہے کہ میں آپ کی امانت دار ہو گئی ہوں۔ بھائی نظام سنیں گے تو کیا کہیں گے؟ دنیا سے گی تو کیا کہیں گی؟ میں شادی کر کے یہاں سے کہیں اور چلی جاؤں گی تاکہ اس پر پردہ پڑا ہے۔"

داؤد ذہن اور پریشانی سے دوچار ہو گیا، بولا۔ "اگر میں اس سے انکار کروں تو؟ اس کا کیا ثبوت کہ اس امانت کا میں ہی ذمے دار ہوں۔"

نرجس تیزی بدل کر کھڑی ہو گئی۔ "میں کہہ رہی ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں کہ یہ آپ ہی کی امانت ہے۔ آپ اپنے ضمیر کو ٹولیں اور پھر سمجھئے، بتائیں کہ اس سلسلے میں اس نے کیا کہا؟ اگر آپ نے کرنے کی کوشش کی اور مجھ سے جان چھڑانا چاہی تو میں نے جوابی کارروائی کے لیے پہلے ہی سے ایک ایسا منصوبہ بنا رکھا ہے کہ اس سے آپ کی کونہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔"

داؤد نے سر پکڑ لیا۔ "نرجس! میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے تمہارا چھوڑ دے تاکہ میں خوب سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کروں۔"

نرجس واہس جاتے ہوئے بولی۔ "آپ آزاد ہیں جو چاہتے سوچیں، میں جارہی ہوں لیکن بہر حال یہ ضرور سوچیں کہ فرار کے سارے راستے بند ہیں۔ آپ کو شادی کا وعدہ بہر حال میں نبھانا پڑے گا۔"

نرجس چلی گئی اور داؤد نیم پاگل سا ہو گیا۔ وہ کنبلیہ، نرجس اور سعد یہ کی محبت میں ٹھہر چکا تھا۔ داؤد کو انہوں نے اتنی پریشان کیا کہ وہ چند دنوں کے لیے احمد آباد سے باہر چلا گیا اور جب چند روز بعد واہس آیا تو نرجس، کنبلیہ اور سعد یہ کے تعلق سے چند اسکا باتیں مشہور ہو چکی تھیں کہ داؤد

داؤد نے جواب دیا۔ "تو اپنے صبر پر ان دونوں سے یہ باتیں کر سکتی ہے ورنہ اس میں میری مرضی کو کوئی دخل نہیں کیونکہ میں اتنے بڑے پکڑ میں نہیں پڑتا چاہتا۔"

کنبلیہ نے اچانک خاموشی اختیار کر لی اور کسی سوچ میں پڑ گئی۔ داؤد اسے کمر بند چھوڑ کر چلا گیا۔ اس وقت وہ جس حیرت سے دوچار تھا پوری زندگی میں اسے جیسی حیرت سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو فیروز بخت کا سامن ہو گیا۔ داؤد کو غصہ آ گیا، پیشانی پر ٹھکنیں ڈال کر بولا۔ "فیروز بخت! تو اسی وقت کاروباری حویلی میں چلا جا۔ میں بہت کمر بند ہوں، تنہائی چاہتا ہوں۔"

فیروز بخت نے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔ "میں اسی وقت چلا جاؤں گا لیکن کاروباری حویلی سے یہاں چلے آنے کا ایک ایسا سبب بھی ہے جو میں بیان کرنا نہیں چاہتا تھا۔"

داؤد نے اس کا داہنا شانہ پکڑ لیا۔ "یعنی..... کیا سبب؟" فیروز بخت نے سر جھکا کر عرض کیا۔ "میں جو ہاتھ بتا دینے پر مجبور ہو گیا ہوں، غام حالات میں شاید نہ بتاتا لیکن آپ نے مجھ پر احسانا کیے ہیں اور آپ کے ایک خاص منصوبے اور مقصد کے تحت تربیت حاصل کر رہا ہوں اس لیے میں اپنی زندگی کے اس گوشے میں کوئی شکاف نہیں ہونے دوں گا....."

داؤد نے اکتا کر کہا۔ "تو کہتا کیا چاہتا ہے، صاف صاف کہ۔"

فیروز بخت نے جواب دیا۔ "احمد آباد کا ایک تاجر وحی احمد مجھ پر بہت مہربان ہے اور اس نے اپنی لڑکی ساڑھ سے میرا تعارف کروایا ہے اور مجھے اس تعارف کے پیچھے اس کا کوئی خاص مقصد کارفرما نظر آتا ہے۔"

داؤد ہنسنے لگا۔ "تو نے بالکل صحیح اندازہ لگایا لیکن تو خوفزدہ مت ہو۔ وحی کی لڑکی ساڑھ سے دوستی کرنے میں کوئی حرج نہیں اور اب میں اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ ایک آدھ شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن شادی سے پہلے یہ یقین کر لیتا جاوے کہ اس سے مال و زر اور کاروبار کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچتی رہا۔"

فیروز بخت، داؤد کی اس حیرت انگیز تبدیلی پر بہت حیران ہوا۔ گفتگو نے زیادہ طویل نہیں پکڑا۔ فیروز بخت کنبلیہ سے ہوئے اسی وقت کاروباری حویلی چلا گیا۔ داؤد اپنے کمرے میں اپنے ہاتھ پر دراز ہو گیا۔ اس کے پردہ کھیلنے پر کنبلیہ، سعد یہ اور نرجس ایک ساتھ نمودار ہوئیں اور اسے طرہ



بہت پریشان ہو گیا۔ لوگ اس کا احترام کرتے اور اس کے لیے راستہ چھوڑ دیتے لیکن اب داؤد کو ہر وقت یہ شبہ رہتا کہ کہیں یہ سب اس کے پند اور وقار کو لے کر نہ چلا جائے۔ یہ باتیں کون مشہور کر رہا تھا پتا نہ تھا لیکن ایک آدمی جہد نظام کا نام لیا گیا اور جب داؤد نے اس سلسلے میں نظام سے پوچھا تو وہ مکر گیا اور کہا۔ "اگر ایسی کوئی بات ہے تو وہ کیوں ہے؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آپ نے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھایا، ہم لوگ غریب سکی لینیں اپنی عزت و آبرو رکھتے ہیں۔ اب اس کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکالنا چاہیے ورنہ میں زنجس کو مل کر کے اور معلوم نہیں کیا کچھ کر گزروں۔"

داؤد نے جواب دیا۔ "میں زنجس سے ایک شرط پر شادی کر سکتا ہوں۔"

نظام نے جواب دیا۔ "میرے آقا! میں نے آپ کی شرط نہیں سنی لیکن میں جس رسوائی اور بدنامی کے بھیا تک خواب سے دوچار ہوں اس کے پیش نظر میں آپ کی ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔"

داؤد نے پس و پیش سے کہا۔ "میں زنجس سے شادی کر لوں گا لیکن زنجس کو اپنے مال و زر کا سا بھی نہیں بناؤں گا۔ دوسری بات یہ ہے۔ میں کیفیت سے شادی کرتا چاہتا ہوں یعنی کیفیت میری دوسری بیوی ہوگی۔"

نظام نے جواب دیا۔ "کیفیت اپنے بارے میں خود ہی کوئی فیصلہ کرے، اس کے معاملے میں، میں خاموش رہوں گا۔ مجھ سے تو بس زنجس کی بات کیجیے اور چھ نہیں۔"

داؤد نے کہا۔ "میں نے کیفیت کا ذکر جوں ہی اطلاعاً کر دیا ہے، رہا زنجس کا مسئلہ تو میں اس سے شادی کرنے پر تیار ہوں۔ کیفیت کی بات کیفیت سے کر لوں گا۔ زنجس شادی کے بعد اپنے گھر چلی جائے گی، میں اس کی ساری ذمے داری اپنے سر لے لوں گا لیکن کیفیت میرے ساتھ رہے گی۔"

نظام نے جواب دیا۔ "میں نے بہ جو دیا۔ کیفیت کی بات کیفیت سے کیجیے، میں تو زنجس کی شادی تک خود کو محدود رکھوں گا۔ شادی کے بعد زنجس کو اپنے پاس رکھیے یا نہیں اور بیچ دیجیے، مجھے اس سے ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ وہ آپ کی بیوی ہوگی اور آپ کو اس پر پورا اختیار ہوگا۔"

داؤد نے جواب دیا۔ "تب پھر ایک ہفتے کے اندر اندر یہ شادی ہو جائے گی۔ تو اس شادی کا چرچا نہیں کرے گا۔ ہاں، کیفیت کی شادی کا چرچا بھی کر سکتا ہے۔"

نظام نے تردد سے پوچھا۔ "زنجس کی شادی کا چرچا کیوں نہ کیا جائے کوئی خاص وجہ؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس میں تو ذلیل و خوار ہو جائے گا۔ کیفیت اور زنجس سے شادیاں کر لینے کا چرچا ہوگا تو لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگیں گے۔ تیری دو بہنوں کی مجھ سے شادیاں کرنا عجیب رسوا کن بات ہوگی۔ لوگ معلوم نہیں کیا کیا سوچیں گے۔ اس لیے کیا ایک شادی کی خبر کو چھپائے رکھنا بہت ضروری ہوگا۔ ہاں اگر میں زنجس کی شادی کا ذکر کرنا ضروری ہی ہو جائے تو اس کے اظہار اور ذکر میں کوئی حرج نہیں۔"

نظام نے عاجزی سے کہا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، ٹھیک ہے۔"

شادی سے پہلے زنجس کو نظام اپنے گھر لے گیا اور وہاں خاموشی سے شادی کی تیاریاں کرنے لگا۔

ادھر جب کیفیت کو زنجس سے شادی کرنے کا حال معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئی اور اس نے داؤد پر زور دیا کہ سعد یہ کو بھی مایوس نہ کرے۔ داؤد نے جواب دیا۔ "کیفیت! اب میں تجھ سے شادی کروں گا۔ سعد یہ کے لیے مجبور نہ کر۔ زنجس سے میں مجبوراً شادی کر رہا ہوں، شاید وہ میری امانت لیے پھر رہی ہے۔"

کیفیت نے مایوسی سے کہا۔ "آپ کی مرضی لیکن میں سعد یہ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ آپ سے بہ آسانی قسمت نہیں کھائے گی۔"

داؤد نے پیش میں کہا۔ "کیفیت! میرے ساتھ یہ کتنا بڑا المیہ پیش آ رہا ہے کہ کہنا میں سرے سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا اور کہاں مجھے تین تین شادیوں پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ ذرا سوچ تو سہی کہ جب لوگ یہ پیش گئے کہ میں نے اپنے ٹھانٹے نظام کی تین بہنوں سے شادیاں کرنی ہیں تو وہ میرا کتنا مذاق اڑائیں گے؟ کتنا نہیں گے؟"

کیفیت نے جواب دیا۔ "میں کسی بھی معاملے میں اتنی گہرائی تک نہیں جاتی اور نہ لوگوں کی ہنسی یا داد و تحسین کو خاطر میں لاتی ہوں۔ میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ آپ کو ہم تینوں بہنوں سے وہ سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا جو کر چکے ہیں اور پھر جب سب کچھ کر بیٹے ہیں تو پھر ان سے آپ نے جو وعدے کیے ہیں، انہیں پورا کیجیے۔"

لیکن داؤد کو بس ایک ہی بات معلوم تھی، وہ سعد یہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا، یوں۔ "کیفیت! تو کچھ بھی کہہ۔ میں سعد یہ سے شادی نہیں کروں گا۔"

حسب نکتہ ایک ہفتے کے اندر اندر زنجس سے شادی



تقریباً ایک ماہ بعد داؤد اور کیفیہ اپنی حویلی میں واپس پہنچے۔ داؤد اور کیفیہ حویلی میں اترے تو ان دونوں کا سامنا سعدیہ سے ہو گیا۔

سعدیہ نے زبردستی منکرانے کی کوشش کی۔ "خوش آمدید، تم دونوں کا کیا حال ہے؟"

داؤد نے فحش سے جواب دیا۔ "حرے ہی حرے ہیں۔"

سعدیہ نے منہ پھیر کر کیفیہ سے پوچھا۔ "کیسا رہا سفر؟" کیفیہ نے جواب دیا۔ "بہت اچھا لیکن افسوس کہ اس سفر میں تم میرے ساتھ نہیں تھیں۔"

سعدیہ ان دونوں کے سامنے سے ہٹ گئی۔ داؤد کے دل پر سعدیہ کی افسردگی کا خاصا اثر ہوا اور اس نے دل میں اعتراف کیا کہ سعدیہ پر واقعی بڑا ظلم ہوا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ داؤد کا ضمیر اس پر لعنت ملامت کرنے لگا۔ وہ

کچھ دن حویلی میں رہ کر زجر جس کے پاس چلا گیا اور وہاں داد پیش دینے لگا۔ اس دوران وہ فیروز بخت سے بھی بے تعلق سا رہا۔ ستار اپنے آقا کی اس حیرت انگیز تبدیلی پر حیران بھی تھا اور پریشان بھی۔ اس نے فیروز بخت کو مشورہ دیا۔ "اب چونکہ حالات بدل چکے ہیں اور داؤد نے دو شادیاں کرنی

ہیں۔ اس لیے جب دونوں بیویوں سے اولاد ہو جائے گی تو اولاد اور دونوں بیویوں کی موجودگی میں اس کی کوئی حیثیت نہ رہ جائے گی۔ چنانچہ فیروز بخت کو چاہیے کہ کسی بھی مناسب موقع پر اپنی حیثیت مضبوط اور واضح کر لے۔"

فیروز بخت کو بھی بڑی تشویش تھی۔ اسے اپنی بد قسمتی پر سوچ سوچ کر رونا آتا تھا کیونکہ حالات اور زمانہ قدم قدم پر اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ فیروز بخت کے تردد اور تشویش کو داؤد بھی محسوس کر رہا تھا اور کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ مایوس افسردہ اور دل شکستہ فیروز بخت کو یہ

بتا کر چونکا دینے کا خواہش مند تھا کہ اس کا حق کسی طرح بھی نہیں مارا جائے گا اور ہر حال میں کاروبار، جائیداد اور نقدی کا وہ تہائی اس کو ملے گا اور وہ اپنے اس فیصلے کو اپنے وصیت نامے سے مضبوط اور مستحکم کر جائے گا۔ اپنے اس فیصلے کے

علاوہ داؤد نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ وہ فیروز بخت کو ہدایت کرے گا کہ وہ احمد آباد کے مشہور تاجروسی احمد کی بیٹی سارہ سے اتنے تعینات بڑھائے کہ وہ ان کی شادی ہو جائے۔

داؤد نے اس کام کے لیے ستار کو استعمال کیا اور ستار نے وعدہ کر لیا کہ وہ یہ کام ضرور کرے گا۔

داؤد انہی الجھنوں میں پھنسا ہوا تھا اور اس کے بعض

ہو گئی اور چند ماہ بعد کیفیہ دہن بن گئی۔ زجر جس سے شادی نظام کے آبائی گھر میں نہایت رازداری سے ہوئی لیکن کیفیہ سے بڑی محوم و حام سے ہوئی۔ اس شادی نے پورے

احمد آباد کو رطہ حیرت میں ڈال دیا۔ فیروز بخت اور ستار بھی حیرت زدہ تھے۔ شادی کے بعد دس دن تک تو داؤد کی کسی سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ وہ کیفیہ کو لے کر احمد آباد سے

تقریباً پچاس میل دور دریائے ساہرمتی کے ساحل پر آباد ایک غیر معروف بستی میں چلا گیا اور وہاں داد پیش دیتا رہا۔ وہاں کیفیہ کے ناز و انداز اور عشوہ و ادانے داؤد کو ایسا

گردیدہ کر لیا کہ کیفیہ کی موجودگی میں داؤد کی قوت فیصلہ کند ہو کر رہ گئی۔ یہاں بھی کیفیہ اکثر پیشتر گم صم ہو کر بیٹھ جاتی۔ داؤد کو اس کی خاموشی اور گشادگی بہت کھلنے لگتی اور وہ اسے

مجھوڑ کر پوچھتا۔ "کیفیہ! کیا بات ہے؟ کیا تو اس شادی سے خوش نہیں ہے؟"

کیفیہ کچھ دیر تک داؤد کی صورت دیکھتی رہی پھر بولی۔ "یہاں میں بتا دوں وہ بات؟"

"ضرور بتا دو، آخر یہ تامل کیوں؟ تذبذب کیسا؟" کیفیہ نے جواب دیا۔ "یہاں کے پیش و پشت میں مجھے سعدیہ بہن کی یاد اکثر ستانے لگتی ہے۔ میں لاکھ کوشش کرتی ہوں کہ یہ خیال نہ آئے لیکن میں مجبور ہو جاتی ہوں۔"

داؤد نے چڑ کر کہا۔ "کیفیہ! تم بہت سادہ لوح ہو۔ میں پھر یہی ہوں گا کہ اس معاملے کو زجر جس ہی تک رہے دو۔ اگر میں نے تیرے سبب سے سعدیہ سے شادی کرنی تو ہو سکتا ہے کہ کسی بھی دن میں سعدیہ کی طرف زیادہ جھک جاؤں اور

میرے دل سے تیری یاد، تیری محبت دور ہو جائے۔ کیا تو پسند کرے گی کہ میں سعدیہ کو تجھ پر ترجیح دوں؟"

کیفیہ نے جواب دیا۔ "داؤد! میں متنی بار تمہیں سمجھاؤں کہ میں اپنی بہنوں کو خوش و خرم دیکھنا چاہتی ہوں۔"

داؤد نے کہا۔ "عجیب بات ہے لیکن اگر تو یہی چاہتی ہے کہ میں سعدیہ سے شادی کر لوں تو اب میں اس مسئلے پر ذرا سنجیدگی سے غور کروں گا۔"

کیفیہ نے کہا۔ "آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں صحیح معنی میں اسی دن خوش و خرم دکھائی دوں گی جس دن میری بہن سعدیہ کا بھی کوئی بندہ بست ہو جائے گا۔"

داؤد بہت بے مزہ ہو رہا تھا۔ کیفیہ جس موضوع پر باتیں کرنا چاہتی تھی، داؤد اس سے گریز اختیار کرتا چاہتا تھا، اس سے بچتا چاہتا تھا۔



کارندوں نے نظام کی شکایت کی۔ ”وہ کام صحیح طرح نہیں کر رہا ہے۔“ وہ نظام کو بلوا کر باز پرس کرنے والا تھا کہ کینیڈا نے یہ کہہ کر داؤد کی توجہ اپنی طرف مبذول کر دالی کہ وہ حسب وعدہ اس کے لیے کسی نئی حویلی کا انتظام کر دے کیونکہ وہ طویل اور غزودہ سجدیہ کے ساتھ رہ کر خود کو پریشان نہیں رکھنا چاہتی۔

داؤد نے کینیڈا کے لیے دریائے ساہتی کے کنارے ایک شاندار حویلی خرید کر، کینیڈا کو اس میں منتقل کر دیا اور خود بھی اس کے ساتھ ہی رہنے لگا۔ نظام، سجدیہ کے پاس رہ رہا تھا۔ داؤد اپنی پرانی حویلی میں آتے ہوئے خوف سا محسوس کرنے لگا تھا۔ اس لیے وہاں بہت کم آتا تھا۔ بالآخر کینیڈا کی سفارش اور سجدیہ کی خواہش پر پرانی حویلی سجدیہ کو دے دی گئی کیونکہ داؤد نے اس سے شادی نہ کر کے اس کا تادان حویلی کی صورت میں ادا کر دیا تھا۔ اب نظام کے مزے ہی مزے تھے۔ داؤد کی خواہش تھی کہ اب نظام بھی شادی کر لے لیکن نظام شادی نہیں کرنا چاہتا تھا، اس نے انکار کر دیا۔

ان واقعات کو تین سال گزر گئے اور داؤد کا شمار اترنے لگا۔ اس دوران کینیڈا اور نرجس سے ایک ایک بچہ بھی پیدا ہو گیا۔ ان تین سالوں میں داؤد نے ان سب میں بڑی تبدیلیاں دیکھیں۔ اب نظام اور سجدیہ ایک ہو کر داؤد اور کینیڈا اور نرجس سے بچھڑنے لگے تھے اور نظام یہ مطالبہ کرنے لگا تھا کہ داؤد رشتے اور قرابتوں کے پیش نظر اسے اپنا جزوی حصے دار بنائے لیکن داؤد اس پر ہرگز تیار نہ تھا۔

پھر ایک نظام میں ایک غیر معمولی تبدیلی آگئی۔ اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ سجدیہ، داؤد کے سامنے جائے۔ وہ سجدیہ کو داؤد سے چھپانے لگا تھا لیکن سجدیہ، داؤد سے ملنے کے لیے بے چین رہتی۔ نظام نے داؤد کے خدمت گاروں کو نکال باہر کیا تھا اور بھری پری حویلی کو سنان کر کے رکھ دیا تھا۔ دوسری طرف کینیڈا اور نرجس، سجدیہ سے ہٹنے سے کتراتے تھی تھیں۔ داؤد ان دونوں کو طواغیت چاہتا تو وہ جیلے بہانے کرنے لگتیں۔ یہاں تک کہ ان دونوں نے داؤد سے درخواست کی کہ انہیں نکال رکھا جائے اور نظام کو ان دونوں سے نہ ملایا جائے۔ داؤد نے نرجس کو کینیڈا کے پاس چھوڑ دیا لیکن وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ نرجس اور کینیڈا، نظام سے خوفزدہ کیوں ہیں؟

اس دوران میں نظام کئی بار کینیڈا اور نرجس کے پاس پہنچا لیکن داؤد کے خدمت گاروں نے اسے حویلی کے

پھانک پر سے ہی دایس کر دیا۔ آخر نظام نے داؤد سے رجوع کیا اور دھمکی آمیز جبرائے میں کہا۔ ”میرے آقا! آپ نرجس اور کینیڈا کو میری طرف سے خبردار کر دیجیے کہ اگر ان دونوں نے اپنے موجودہ رویے میں کوئی تبدیلی نہ کی تو میں اس کا بڑا بھیانک انتقام لوں گا اور میری وجہ سے ان دونوں کو جویش و آرام میسر آ گیا ہے، انہیں ذرا سی دیر میں تباہ و برباد کر کے رکھ دوں گا۔“

داؤد نے جواب دیا۔ ”جبرائے پیغام میں ان دونوں تک پہنچا دوں گا لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ تیری دونوں بہنوں نے تجھ سے ایک دم ترک تعلق کیوں کر لیا؟“ نظام نے حویلی کے پھانک پر لگے ہوئے ایک خزاں رسیدہ درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے آقا! وہ بات میں ابھی نہیں بتاؤں گا لیکن اس خزاں رسیدہ درخت کو دکھا کر آپ ان دونوں سے کہہ دیجیے گا کہ میں ان دونوں کو اس درخت کی طرح خنڈا کر سکتا ہوں۔“

نظام واپس چلا گیا اور داؤد طرح طرح کے خیالات لیے اندر چلا گیا۔ اس نے نرجس اور کینیڈا کو طلب کیا اور نظام کا پیغام ان دونوں کے گوش گزار کر کے دریافت کیا۔ ”میں تم دونوں سے یہ معلوم کر کے رہوں گا کہ نظام سے تم دونوں کیوں نہیں ملنا چاہتیں اور اس کی اس دھمکی کا آخر مطلب کیا ہے؟“

نرجس اور کینیڈا نے خوفزدہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کینیڈا نے جواب دیا۔ ”یہ سارا فساد سجدیہ سے شادی نہ کرنے کا ہے۔ اگر آپ سجدیہ سے بھی شادی کر لیتے تو یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی۔“

داؤد نے جھنجھلا کر کہا۔ ”معلوم نہیں تو کیا کہہ رہی ہے۔ سجدیہ سے شادی کرنا آخر ضروری کیوں تھا؟“

کینیڈا نے جواب دیا۔ ”وہ اپنی ناکامی کا ہم سے بدلہ لے گی۔ وہ ہمارے خلاف سازشیں کر رہی ہے۔“

داؤد نے کہا۔ ”تم دونوں کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔ شادی میں نے سجدیہ سے نہیں کی اور نظام

دھمکی تم دونوں کو دے رہا ہے، آخر اس کا مطلب کیا ہے؟“

نرجس نے کہا۔ ”بھائی نظام مجھ سے کئی بار کہہ چکے ہیں کہ میں انہیں آپ کے کاروبار کا جزوی حصے دار بنوادوں

لیکن میں نے ہمیشہ یہ سوچ کر ان کی یہ بات آپ سے نہیں کہی کہ آپ اس پر کسی طور تیار نہیں ہوں گے۔ بس اس بات نے بھائی نظام کو ہم دونوں کے خلاف کر دیا ہے اور وہ ہماری

بربادی کے درپے ہو گئے ہیں۔“



وہ کون سی بات ہے جس سے تم دونوں نظام سے خوفزدہ ہو رہی ہو۔“

کینیہ نے جواب دیا۔ ”مجھے دو دن سوچنے کا موقع دیجیے، میں سب کچھ سچ بتا دوں گی۔“

داؤد نے کہا۔ ”دو دن نہیں، تم مجھ سے تین دن لے لو لیکن تم مجھ سے چھپانا کچھ بھی نہیں کیونکہ اگر نظام کسی طرح ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے تو وہ بات ہمیں معلوم ہونا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر میں نظام کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا۔“

یہ کہہ کر داؤد چلا گیا اور کینیہ اور نرجس آپس میں صلاح مشورے کرنے لگیں۔

☆☆☆

سعدیہ نے سیاہ لباس زیب تن کیا اور بند گاڑی میں سوار ہو کر داؤد کی کاروباری حویلی میں پہنچ گئی۔ وہاں نظام صدر دروازے پر اس کا منتظر تھا۔ سعدیہ نے پردے سے جھانک کر نظام کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کہا۔

”داؤد سے کہہ دو، میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“

نظام تاجدار بن کر اندر آیا اور داؤد کو سعدیہ کا پیغام پہنچا دیا۔ داؤد کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں پڑ گئیں اور کراہیت سے کہا۔ ”نظام! تم سب جانتے ہو کہ میں اپنی کاروباری حویلی میں گھروالوں سے نہیں ملتا۔ سعدیہ سے کہو واپس جائے میں خود اس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

نظام نے سعدیہ کی دکالت کی۔ ”میرے آقا! سعدیہ بڑی سرش اور ضدی ہے۔ طے بغیر ہرگز واپس نہ جائے گی۔“

داؤد نے سختی سے کہا۔ ”لیکن میں یہاں نہیں ملوں گا۔“

نظام نے مایوسی سے کہا۔ ”آپ کی مرضی میرے آقا..... میں آپ کو مجبور تو نہیں کر سکتا۔“

وہ واپس چلا گیا، ذرا دیر بعد سعدیہ کے ساتھ پھر واپس آ گیا۔ سعدیہ کی مترنم آواز دور ہی سے سنائی دی۔ ”میں نے سوچا آپ کو کیا تکلیف دوں، اس لیے میں خود ہی چلی آئی۔“

داؤد نے حلقی سے کہا۔ ”سعدیہ! تو نے تو کمال ہی کر دیا۔ آخر وہ کون سی خاص بات ہے جس نے تجھے میرے پاس آنے پر مجبور کر دیا؟“

سعدیہ نے جواب دیا۔ ”میں آپ کو وہ دن نہیں یاد دلاؤں گی جب مجھے بھی آپ کی بارگاہ ناز میں کوئی مقام حاصل تھا۔ میں تو اس وقت آپ سے درخواست کرنے آئی ہوں کہ کبھی کبھی آپ میرے پاس بھی تشریف لے آیا کریں۔“

داؤد ان کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوا۔

کینیہ نے اچانک نرجس کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف لے گئی۔ دونوں میں کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ داؤد ان دونوں کے چہروں کے تاثرات سے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نرجس اور کینیہ دونوں ہی کے چہروں پر خوف اور پریشانی تھی۔ کچھ دیر بعد دونوں واپس آئیں۔

نرجس نے کینیہ سے کہا۔ ”تم ان سے وہ بات کہہ دو۔“

کینیہ نے جواب دیا۔ ”میں نہیں کہوں گی، تم کہہ دو۔“

نرجس نے پس و پیش سے جواب دیا۔ ”تم ہی کہہ دو، میں نہیں کہہ سکتی۔“

کینیہ نے لمحہ بھر کے لیے سکوت اختیار کر لیا۔ داؤد الجھن محسوس کر رہا تھا، دونوں سے کہا۔ ”تم دونوں ایک ذرا سی بات کو بلاوجہ طول دے رہی ہو۔ جب یہ بات طے ہے کہ میں نظام کو جسے دار نہیں بنا سکتا تو کسی کا اس موضوع پر بات کرنا ہی فضول ہے۔ تم دونوں میں سے جو بھی مجھ سے بات کرے، اپنے ذہن میں یہ بات ضرور بٹھالے کہ میں نظام تو کیا کسی کو بھی اپنا جسے دار نہیں بنا سکتا۔“

کینیہ نے کہا۔ ”ہم دونوں، بھائی نظام کی جسے داری کی بات نہیں کریں گے بلکہ ہم نے اس پر اتفاق کر لیا ہے کہ اگر آپ کے بس میں ہو اور بات راز میں رہے تو کسی بھی طرح بھائی نظام کو ہلاک کروادیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ ہمارا سکہ چمن بر باد کیے بغیر نہ رہے گا۔“

داؤد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ”کینیہ! تو نے کیا کہا؟ جو کچھ کہا ہے اس کے مفہوم سے بھی واقف ہے؟“

نرجس نے کینیہ کے بھانے جواب دیا۔ ”کینیہ نے جو کچھ کہا، میں بھی وہی کہوں گی کیونکہ اگر ایسا نہ ہو، اور آپ نے تسامیل سے کام لیا تو بھائی نظام پہل کر جائیں گے اور اس کا خمیازہ ہم سب کو بھگتنا پڑے گا۔“

داؤد پر سکتے طاری تھا، پوچھا۔ ”وہ کیا پہل کرے گا؟“

کینیہ نے خوشامد کی۔ ”میں آپ سے خوشامد نہ کہوں گی کہ بھائی نظام کے شر سے ہم سب کو نقصان پہنچ جائے گا۔ خدا کے لیے آپ کوئی ایسا بندوبست ضرور کر دیں کہ بھائی نظام کا کام تمام ہو جائے۔“

داؤد نے کہا۔ ”تم دونوں جب تک ہر بات تفصیل سے نہیں بتاؤ گی، میں کوئی قدم بھی نہ اٹھا سکتی۔“

کینیہ اور نرجس نے ایک بار پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں صلاح مشورے کرنے لگیں۔

داؤد نے کہا۔ ”آج تو میں حیران ہو رہا ہوں کہ آخر



ذکورہ خطرے کا صاف صاف ذکر نہیں کرے گی، میں تیری کوئی بات بھی نہیں مانوں گا۔"

کینیڈے نے کہا۔ "آپ نے سعدیہ سے شادی نہ کر کے اس کی دشمنی سول لے لی ہے۔ اسی طرح بھائی نظام کو اپنے کاروبار میں جزوی حصے دار نہ بنا کر اسے دشمن بتا لیا ہے۔ چنانچہ آپ کے یہ دونوں دشمن کسی موقع کی تلاش میں ہیں۔ جیسے ہی موقع ملے گا آپ پر حملہ کر دیں گے۔"

داؤد نے ہنس کر جواب دیا۔ "مجھ پر حملہ کرنا اتنا آسان بھی نہیں اور بالفرض ہمال اگر کسی نے مجھ پر کوئی حملہ کیا بھی تو اس سے فائدہ نہیں پہنچے گا کیونکہ میں نے ابھی سے اپنے کاروبار، جائداد اور زندگی کا ایسا انتظام کر دیا ہے کہ میرے دشمنوں کو اس میں آپ جب بھی نہیں ملے گا۔"

کینیڈے چب ہوئی لیکن اس کی بے چینی اس کے چہرے سے عیاں تھی اور یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کینیڈے، داؤد کو ہر قیمت پر دعوت سے روکنا چاہتی ہے۔ داؤد کو یہ غصہ تھا کہ نرجس اور کینیڈے معلوم نہیں کیوں کوئی خاص بات چھپا رہی ہیں۔

نرجس نے اپنے طور پر کہا۔ "اگر آپ نے یہ فیصلہ کر ہی لیا ہے کہ سعدیہ اور نظام بھائی کی دعوت میں جائیں تو میرا ایک مشورہ ضرور مان لیں۔ اس سے آپ خطرے سے بچ سکتے ہیں۔"

داؤد نے سنی ان سنی کر دی۔

کینیڈے نے کہا۔ "میں آپ کو مشورہ دوں گی کہ آپ ان کے ہاں کھانا ہرگز نہ کھائیں اور اگر کھانا ہی سے تو ایک کتنا اپنے ساتھ لے جائیں اور جو کچھ کھائیں پہلے کتے کو کھلائیں اور اگر کتے پر اس کھانے کا کوئی اثر نہ ہو تو خود بھی کھائیں۔"

داؤد ہنسنے لگا۔ "خوب خوب، کیا ترکیب بتائی ہے کہ دعوت میں جائیں تو ایک کتنا بھی اپنے ساتھ لیتے جائیں۔"

نرجس اور کینیڈے نے داؤد کی باتوں سے یقین کر لیا کہ وہ ان کی باتوں کو مستحکم فہم سمجھتا ہے اور ان کی کسی بات پر بھی عمل نہیں کرنا چاہتا۔ دوسرے دن علی الصباح وہ کچھ چلا گیا اور کافی دیر بعد واپس آیا اور فیروز بخت کو بولا کہ بطور خاص اس کو سمجھایا کہ اگر وہ ہمیں تم ہو جائے تو اس کا پتا نہ چلے یا ناگہانی موت آجائے تو وہ اپنی اولین فرصت میں قاضی شہر سے ضرور ملے۔

فیروز بخت، داؤد کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ داؤد کی ساری باتیں بے سرو پا اور بذیان زدہ تھیں۔

شام سے ذرا پہلے داؤد نے کینیڈے اور نرجس کو مطلع کیا

داؤد نے نظام سے کہا۔ "نظام! تو حویلی میں جا، میں سعدیہ سے چند باتیں کر کے تجھے واپس بلا لوں گا۔"

نظام نے سعدیہ پر نظر ڈالی اور حویلی میں چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی داؤد نے راز داری سے کہا۔ "سعدیہ! تجھے نظام تک تو نہیں کر رہا؟"

سعدیہ نے جواب دیا۔ "نہیں، بھائی نظام مجھے نہیں ٹھکرتے بلکہ ہم دونوں کی یہ خواہش ہے کہ ہم آپ کی ایک شاندار دعوت کریں۔ اس طرح آپ کے اس کھنڈاؤ کو دور کریں جو بد قسمتی سے ان دنوں معلوم نہیں کیوں پیدا ہو گیا ہے۔"

داؤد نے کہا۔ "میں دعوت میں ہر وقت آنے کو تیار ہوں، بولیں کس دن اور کب کر رہی ہے تو میری دعوت؟"

سعدیہ نے جواب دیا۔ "آپ کل رات کا کھانا ہم دونوں کے ساتھ کھائیں۔"

داؤد نے کہا۔ "بہتر ہے..... کیا نرجس اور کینیڈے کو بھی اپنے ساتھ لے آؤں؟"

سعدیہ نے رک رک کر تلفظ سے جواب دیا۔ چاہے تو لے آئیں، ان دونوں کو بھی..... ورنہ اگر نہ لائیں اور تنہا آئیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ میں نے اس کا اختیار آپ کو دیا۔"

داؤد کچھ اور باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ سوچ کر رک گیا، بولا۔ "میں تجھ سے جو چند خاص باتیں کرنا چاہتا تھا، اس وقت نہیں کروں گا، دعوت کے بعد کروں گا۔"

سعدیہ نے فریاد دہی سے کہا۔ "میں آپ کو آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گی۔"

داؤد نے کہا۔ "تو کل رات میں تنہا آؤں گا۔ نرجس اور کینیڈے نہیں آئیں گی۔"

سعدیہ نے جواب دیا۔ "میں بھی یہی چاہتی ہوں کیونکہ بھائی نظام کے ان دونوں سے خوشگوار تعلقات نہیں رہے۔"

داؤد، سعدیہ سے الگ ہوا اور نظام کو اس کے پاس بھیج دیا۔

اس رات داؤد نے نرجس اور کینیڈے کو بلایا اور غیر ارادی طور پر سعدیہ کی دعوت کا ذکر کر دیا۔ کینیڈے اور نرجس دعوت کے ذکر پر پریشان ہوئیں۔ کینیڈے نے کہا۔ "میں آپ سے درخواست کروں گی کہ آپ سعدیہ یا بھائی نظام پر اعتبار نہ کریں۔ ان دونوں کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔"

داؤد نے دونوں کو جواب دیا۔ "کینیڈے! جب تک تو



کہ وہ سعد یہی دعوت میں جا رہا ہے۔ تمہیں نے پھر اصرار کیا۔ ”آپ ایک کتابچے ساتھ لیتے جائیے۔“  
داؤد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رات کو حویلی سے نکل کر وہ نظام کی طرف چل پڑا اور ستاروں پر بطور خاص غور کیا کہ وہ ایک کتاب فراہم کر دے۔

داؤد کے ہر کارے پالتو کتے کی تلاش میں نکل گئے اور بہت جلد ایک کتاب لے آئے۔ داؤد نے کتے کی ذورنی پکڑی اور چار چھاتی کارکنوں کو اپنے ساتھ لیا اور ڈیڑھ چار گیا۔ حویلی کے پھانک پر نظام اس کا منتظر تھا۔ دیکھتے ہی فرط ادب سے سلام کیا اور بولا۔ ”میرے آقا! آپ نے بڑی دیر کر دی؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”بہر حال میں آ گیا، اب تو تمہیں گلہ نہیں کرنا چاہیے۔“  
نظام نے داؤد کے کتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”میرے آقا! یہ کیا ہے؟ آپ اسے اپنے ساتھ کیوں لائے ہیں؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”ارے بھائی! میں اسے اپنے ساتھ اس لیے لایا ہوں کہ اس کی رفاقت غیر مشتبہ ہے۔ آدی، آدی کو دعو کا دے دیتا ہے لیکن یہ دعو کا نہیں دیتا۔“  
نظام نے منہ بنا کر کہا۔ ”گویا آپ کو اپنے نظام پر اعتبار نہیں ہے۔“

داؤد نے جواب دیا۔ ”مجھے تم پر پورا اعتماد ہے لیکن کتے کو اپنے ساتھ لانے میں حرج بھی کوئی نہیں۔“  
داؤد کے ساتھ چار اور آدمیوں کو دیکھ کر نظام اور زیادہ گھبرا گیا، پوچھا۔ ”کیا یہ بھی کتے کی طرح وفاداری میں یہاں آگئے ہیں؟“

داؤد نے جواب دیا۔ ”ان باتوں سے حاصل کچھ بھی نہیں۔ تیرے جملہ سوالات کا میرے پاس ایک ہی معقول جواب ہے، وہ یہ کہ میں اپنی مرضی کا نالک ہوں، جو چاہوں کروں، کسی اور کو دخل اندازی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

نظام نے داؤد کو رہم محسوس کیا تو خاموشی اختیار کی۔ اندر چلتے ہی سعد یہ واری ہو گئی اور بڑی دیر تک داؤد کے کندھے پر سر ٹکا کر آنسو بہاتی رہی۔ اس موقع پر نظام وہاں سے ہٹ گیا۔ سعد یہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ ”آپ کا آنا مشتبہ تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ واقعی آجائیں گے۔“

داؤد نے پوچھا۔ ”تجھے یقین کیوں نہیں تھا؟ اس کی

کوئی خاص وجہ؟“

سعد یہ نے جواب دیا۔ ”آپ نے اب تک مجھ سے جتنے بھی وعدے کیے ہیں، ان میں سے ایک بھی پورا نہیں کیا۔ اس لیے میں یہ سوچنے میں حق بجانب تھی کہ شاید آپ تمہیں آئیں گے۔“

داؤد نے مسکرا کر کہا۔ ”غلط، بالکل غلط۔ میں نے صرف ایک وعدہ نہیں چھرا کیا۔ وہ وعدہ تھا تجھ سے شادی کرنے کا۔“

سعد یہ رو ہنسی ہوئی۔ ”خدا سے ایسے مجھے وہ باتیں نہ یاد دلائیے ورنہ میں زور زور سے رونے لگوں گی۔“

داؤد نے جاہرانہ انداز میں کہا۔ ”سعد یہ! تجھے اختیار ہے چاہے آہستہ رویا زور زور سے رونا شروع کر دے لیکن تجھی بات تو یہ ہے کہ اب میں خود بھی بہت بچھتا ہوں کہ تجھ سے شادی کیوں نہیں کر لی۔“

سعد یہ نے بات کاٹ دی۔ ”اگر آپ ذرا بھی بچھتائے ہوتے تو آج میں آپ کی بیوی ہوتی۔“  
داؤد نے کہا۔ ”تیرا کیا خیال ہے، میں تجھ سے شادی کر لوں؟“

سعد یہ نے جواب دیا۔ ”اس سے اچھی کوئی اور بات ہوئی نہیں سکتی۔“

داؤد نے اپنا ہاتھ سعد یہ کی طرف بڑھا دیا۔ ”تو لا، اپنا ہاتھ دے دے میرے ہاتھ میں، کرو وعدہ۔“

سعد یہ نے اپنا ہاتھ داؤد کے ہاتھ میں دے دیا پھر ذرا آنکھ دبا کر پوچھا۔ ”سعد یہ! کیا خیال ہے، کیا آج کی رات میں تیرے پاس ہی رہ جاؤں؟“

سعد یہ نے جواب دیا۔ ”کوئی مضائقہ نہیں، حویلی آپ کی، میں آپ کی، یہاں کی ہر چیز آپ کی۔“  
داؤد نے کہا۔ ”اور تیرا بھائی نظام کیا کہے گا؟ وہ تو میری اچھی طرح مخالفت کرے گا۔“

سعد یہ نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ بھائی نظام بہت اچھے آدمی ہیں۔ انہوں نے آج تک میرے کسی بھی معاملے میں میری مخالفت نہیں کی۔“  
داؤد کے چہرے پر آنسو کے قطرے اس کے جسم کے منتظر تھے۔

کچھ دیر بعد نظام دوبارہ آ گیا۔ سعد یہ نے مسکرا کر کہا۔ ”بھائی نظام! یہ کہتے ہیں کہ میں تجھ سے شادی کر لوں گا۔ یہ اتنے جذباتی ہو رہے ہیں کہ میں نے ان کے چہرے پر اذیت اور کرب کے نشان اور آثار بہت واضح محسوس



کرئیے۔"

نظام نے تو یہ سعدیہ کی بات سنی ہی نہیں بولا۔ "اٹھنا تھی دیر میں کھلا رہی ہے تو؟ میرا خیال ہے اب شروں کر دیا جائے۔"

سعدیہ نے جواب دیا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے۔" کچھ ہی دیر بعد اعلان ہوا کہ ٹھانا لگایا جا چکا ہے، لوگ دسترخوان پر پہنچ جائیں۔

کھانے کا کمرہ بہت شاندار اور سجا ہوا تھا۔ داؤد نے کتے کو اپنے ساتھ لیا اور اپنے آرمیوں کو خاموشی سے حکم دیا کہ وہ جیسے ہی تالیوں کی آواز سنیں، اس کے پاس پہنچ جائیں۔

نظام نے ایک بار پھر کتے پر اعتراض کیا۔ "میرے آقا! کتا نجس النجس ہے، اسے دفنان کر دیجیے۔"

داؤد نے جواب دیا۔ "نہیں آج اس نجس النجس کو میں اسے ساتھ ہی رکھوں گا، تو پریشان نہ ہو کیونکہ اس نے آج تک کسی کو بھی نہیں کاٹا۔"

نظام نے توریوں پر چڑھا کر کہا۔ "لیکن میرے آقا! میں اس ناپاک جانور کو دسترخوان کے آس پاس بھی نہیں آکر ہونے دوں گا۔"

داؤد نے جواب دیا۔ "نظام! کوئی ایسا ارادہ نہ کر جس پر تو قادر نہ ہو۔"

اس کے بعد داؤد نے ایک لقمہ کتے کے آگے پھینک دیا۔ کتے نے بڑی بے مہربانی سے لقمہ کھالیا اور دوسرے کا انتظار کرنے لگا۔ داؤد نے کتے کو کئی نوالے کھلائے مگر کوئی خاص بات نہیں ظاہر ہوئی۔ آخر مطمئن ہو کر خود بھی کھانے لگا۔ نظام اچھی جا چلا گیا۔ سعدیہ نے ساتھ دیا لیکن وہ نہایت تلفظ سے ہماری بھی نوالہ چباتے ہوئے بولی۔ "اگر یہی نظام بد تیزی سے چلے نہ چاتے تو وہ کھانے میں آپ کا ساتھ دیتے۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کا فرض میں انجام دے رہی ہوں۔"

داؤد کھانا کھاتا رہا، لیکن کتہ ہی نے یہ دیکھا اس نے کھانے میں کوئی غیر معمولی بات محسوس کی۔ مٹی یا تیل کی جہ کسی اور ہی چیز کی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سعدیہ سے پوچھا۔ "کھانے میں کیا مٹی استعمال کیا ہے تو نے؟"۔

سعدیہ مسکرائی، یوں۔ "مٹی میں مضموم نہیں ہے، ذرا سی بو پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے یوں ہی پروا نہیں کی اور اب چچھتار ہی ہوں کہ مجھے اس مٹی میں سائن نہیں پکاتا۔"

چاہیے تھا۔"

داؤد نے خوب میر ہو کر کھانا کھلایا۔ فارغ ہونے کے بعد کچھ سستی اور جسم میں سنسنابست محسوس کرنے لگا۔ داؤد نے خود کو سنبھالنے رکھا اور سعدیہ سے کہا۔ "سعدیہ! آج رات میں سیکس رہوں گا، نظام کو یہ بات بتادی ہے؟"

سعدیہ نے جواب دینے کے بجائے نظام کو آواز دی۔ "نظام! کہاں بیٹھ گئے.. اب آ جاؤ، کام ختم ہو گیا۔ اب یہ ٹھنڈا انتظار اپنے قابو میں ہے، ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

جواب میں نظام مسکراتا ہو کر سرے میں داخل ہوا اور آتے ہی داؤد کو ایک زمانے دار ہاتھ رسید کر دیا، بولا۔ "تو بڑی مشکل سے قابو میں آیا ہے۔ واٹنڈا اتنوں پسینا آ گیا۔"

داؤد کا سر چمکانے لگا۔ اس نے اپنے کتے کو تلاش کیا لیکن اس کا ٹھکانا نہ تھا۔ اس کے پورے جسم میں جھنجھٹا ہتھی دوزر ہی مگی۔ سر ہنسا سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ داؤد نے بڑی بے بسی سے کہا۔ "مجھے کیا ہو رہا ہے؟ میرا پورا جسم سن ہو رہا ہے، کیا تم دونوں نے مجھے زہر کھلا دیا ہے؟"

نظام نے جواب دیا۔ "نہیں، زہر دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور میں یہ بھی ہوں گا کہ میں نے تجھے کچھ نہیں دیا۔ میں نے سعدیہ کے مشورے سے تجھے چند ایسی چیزیں کھلا دی ہیں جس سے تو چند ساعتوں میں فالج کا شکار ہو جائے گا اور فالج گرنے کا مطلب ہوگا کہ یہ مرض کسی انسان نے نہیں لگایا، آپ ہی لگ گیا ہے۔"

داؤد بڑی بے بسی سے رونا لیا۔ "آہ ظالمو! یہ تم نے کیا کر دیا؟"

سعدیہ نے سفائی سے کہا۔ "ہم دونوں نے کچھ بھی نہیں کیا سب تیرے کرتوتوں کی مزا ہے۔ اب بھگت اور اللہ سے توبہ استغفار کرتا رہ۔ ممکن ہے دوسری دنیا میں تیری یہ توبہ استغفار کام آجائے کیونکہ اس دنیا میں توبہ توبہ استغفار تیرے کام آنے سے رہی۔"

نظام نے داؤد سے سختی سے کہا۔ "داؤد! مجھے معاف کرنا، تو مجھے اپنے کاروبار میں جیڑوی حصے دار بھی نہیں بنا رہا تھا حالانکہ تیرے بعد اب سب کچھ میرے ہی تصرف اور اختیار میں ہوگا۔"

داؤد نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ خود کو مشغول محسوس کر رہا تھا۔ اس نے نظام پر واضح کر دیا۔

نظام اذیتل انسان! مجھے میرے اندر کا ہمزاد برابر یہ بتا رہا



تھا کہ سعد یہ اور نظام میرے خلاف ہیں اور کسی وقت بھی کوئی انتہائی اقدام کر سکتے ہیں۔“

نظام قبضہ مار کر ہنس دیا۔ ”یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، جب گر پڑے تو بری لنگا۔ اب میں تیرے کاروبار کا پورا پورا مالک بنوں گا۔ تیری جائداد، تیرا کاروبار اور تیری نقدی۔ یہ سب میرے تصرف اور اختیار میں ہوگی۔“

داؤد کی حالت تیزی سے بگڑ رہی تھی لیکن اسے اس حال میں بھی اپنی شکست منظور نہیں تھی۔ پورے وقار سے بولا۔ ”نظام! ذلیل، کمین اور محسن کش انسان! میری دو بیویوں کی موجودگی میں تو کیا پائے گا؟ کچھ بھی نہیں اور اس حال میں کہ وہ دونوں ہی تجھ سے نفرت کرتی ہیں اور اگر ان کا بس چل جاتا تو وہ دونوں تجھے اپنی راہ سے ضرور ہٹا دیتیں۔“

نظام اور زور سے بولا۔ ”اور کچھ؟ اور کچھ فرمائیے تاکہ میں ایک ہی سانس میں تیری ساری بیویوں کو اڑا دوں اور یہ بتا دوں کہ تیرے مقابلے میں، میں زیادہ شاطر ہوں۔“

داؤد کی قوت گویائی بھی جواب دے رہی تھی، بشکل جواب دیا۔ ”فیروز بخت اور میری بیویوں کی اولاد میرے کاروبار، جائداد اور نقدی کی مالک ہوگی۔ ان کی موجودگی میں تو کچھ بھی نہیں۔“

نظام نے داؤد کے پاس بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے آہستہ آہستہ پا کر کہنا شروع کیا۔ ”داؤد! اس وقت میں جو کچھ کہنے جا رہا ہوں، اسے غور سے سن۔ تو ملک التجار تھا اور میں تیرا دونی گمشدہ۔ تو ملک التجار اس لیے بن گیا کہ تیرے ہم پیشہ حضرات میں ایک بھی تیرا ہم پند نہیں تھا۔ میں تیرا معمولی گمشدہ ہونے کی حیثیت سے تجھ سے اپنا موازنہ کرتا رہتا تھا اور ہمیشہ ہی خود کو تجھ سے اعلیٰ اور افضل پاتا تھا۔ پھر جب میں نے یہ سنا کہ تو شادی سے نفور ہے تو میرے ذہن میں طرح طرح کے منصوبے کلپانے اور سر اٹھانے لگے۔ آخر حجت میں، میں نے ایک نادر تجویز سوچی اور اس پر نہایت ہوشیاری سے عمل بھی کر ڈالا اور اللہ سے بفضل سے اس وقت میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں نے اس میدان اور اس مقابلے میں تجھے شکست دے دی ہے۔“

اب داؤد سے بولنا بھی نہیں جا رہا تھا۔ نظام نے سعد کی طرف دیکھا تو سعد یہ نے کہا۔ ”نظام! یہ شخص چند ساتوں کا مہمان ہے۔ اگر یہ زندہ بھی رہا تو قانع اسے ہمیشہ کے لیے معطل اور محذور کر دے گا اس لیے اسے شرمسار اور

فجس کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ساری باتیں بتا دی جائیں جن سے اس کی حماقت کا علم خود اسے بھی ہو جائے۔“

نظام ہنسا اور داؤد کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”چچا جان! خوش فہمی سے آج تک جن عورتوں کو آپ میری بہنیں سمجھتے رہے ہیں وہ میری بہنیں نہیں بیویاں تھیں۔ انہیں میں نے ہی آپ سے قریب کر دیا تھا۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ ان دونوں کو اپنا آلہ کار بنا۔ آپ کی ہر چیز پر قبضہ کر لوں۔

چنانچہ انہیں جو کچھ بھی ملے گا، ان سے میں وصول کر لوں گا۔ میرے پورے منصوبے میں چند باتیں میری مرضی کے خلاف ہوئیں۔ میں یہ چاہتا تھا کہ اپنی بیویوں کو آلہ کار بنا کر تیری تجارت، جائداد اور نقدی پر قبضہ کروں لیکن کیفیت اور نرجس نے مجھے سمجھایا کہ اس طرح کام بگڑ جائے گا اس لیے ان دونوں کا تیری بیویاں بن جانا بہت ضروری ہے

چنانچہ وہ دونوں میری اجازت اور مرضی سے تیری بیویاں بن گئیں۔ بعد میں تیری خوش قسمتی نے زور کیا اور نرجس اور کیفیت اپنی اس موجودہ زندگی سے مطمئن اور آسودہ نظر آنے لگیں اور میرے بار بار کے اصرار کے باوجود انہوں نے

میرے آلہ کار بننے نہ بننے سے صاف انکار کر دیا اور مجھے یہ دھمکی دی کہ اگر میں نے انہیں زیادہ مجبور کیا تو تجھے ساری باتیں بتا دیتی۔ میں ڈر کر خاموش ہو گیا لیکن میں یہ بات بھی جانتا تھا کہ نرجس اور کیفیت مجھے دھمکی تو دے سکتی ہیں لیکن اس دھمکی پر عمل نہیں کر سکتیں کیونکہ میرے اس فریب اور جھٹل میں وہ دونوں خود بھی شریک تھیں اور اس کا انکشاف

خود انہیں تیری نظر سے نہ آتا۔“

داؤد، نظام کی باتیں بڑی بے چینی سے سن رہا تھا۔ اس کے پورے جسم میں ایک آگ سی لگ رہی تھی، آہستہ سے بولا۔ ”قریب! ہوگا۔“

نظام نے سعد کی طرف دیکھا۔ ”اگر تو سعد سے بھی شادی کر لیتا تو میں نہیں کا بھی نہ رہ جاتا لیکن جب کسی انسان پر قسمت مہربان ہوتی ہے تو اس کا ہر کام ہو کر ہی رہتا ہے چنانچہ سعد یہ تیرا ذہن نہیں بن سکی اور میرا دوسرا قدم یہ ہوگا کہ میں تیرے منظور ہوتے ہی نرجس اور کیفیت کو ان کے موجودہ منصب سے معزول کر دوں کیونکہ اب وہ میرے لیے قابل اختیار نہیں رہیں۔ اب سعد یہ میری بیوی رہے گی اور میں تیری دولت، جائداد اور رقم سے اسے نہیں کروادوں گا۔ یہ بھی کیا یاد کرے گی۔ رہا فیروز بخت کا مسئلہ تو اسے اپنی راہ سے ہٹا دینا اتنا مشکل کام تو نہیں۔ پھر اس پر بھی دستِ شفقت بھیر کر حسب مرضی کام نکالا جاسکتا ہے۔“



ان دونوں کے پاس چھوڑا اور خود آوارہواری حویلی میں پہنچ کر رونے لگا۔ داؤد کا عملہ سنانے میں آگیا اور کچھ دیر بعد یہ سارے ہی لوگ مفلوج داؤد کو دیکھنے پہنچ گئے۔ انہوں نے بے ہوش داؤد کو دیکھا اور اس کی دونوں بیویوں کو تسلیاں دینے لگے۔ ستار اور فیروز بخت بچا داؤد کے پاس کھڑے آنسو بہاتے رہے۔

ستار نے کہنیہ سے پوچھا۔ ”میری معزز مالک! میرے آقا کی بیماری میں کوئی سازش تو کارفرما نہیں ہے؟“ کہنیہ نے رندگی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”یہ وقت ان فضول باتوں کا نہیں ہے۔“

سعد یہ ان کی باتیں پوری توجہ سے سن رہی تھی۔ زحس نے سعد یہ کے کان میں بڑی درد مندی سے کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ تو داؤد سے شاکہ کی رہی ہے اور یہ سچتی ہے کہ اس نے تجھ پر ظلم کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب اس کی سلامتی نہیں ہو سکتی۔ میرا خیال ہے اس سازش میں تو خود بھی شریک تھی۔ اگر میرا یہ خیال درست ہے تو ایک بات بتائے بغیر میرے سنبھلاؤ کہ نظام پر لے درہنہ کا حریص اور دولت پرست ہے۔ یہ شخص اپنے مفاد پر ہر شخص کو قربان کر سکتا ہے۔ اس نے داؤد کے خلاف کوئی سازش کی ہے تو میں تجھے یہ مشورہ دوں گی کہ تو نظام سے کنارہ کشی اختیار کرنے اور ہم دونوں کے ساتھ ہو جا۔“

سعد یہ نے حقارت سے جواب دیا۔ ”بہت بہت شکر ہے۔ اول تو یہ ہم دونوں پر تہمت ہے کہ اپنے حسن داؤد کو ہم دونوں نے اس حال کو پہنچایا۔ دوسرے یہ کہ میں نظام کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ اس نے میرا ساتھ دیا ہے پھر میں اس کا ساتھ کیوں چھوڑ دوں۔“

کہنیہ نے غصے میں کہا۔ ”سعد یہ! تیری باتیں اس بات کی غمازی ہیں کہ ہمارے خدشات درست ہیں۔ اب تک نظام نے جو کچھ بھی کیا ہے بہت ہی نیک ہے۔ اگر تو اس پر اعتبار کرتی ہے تو کرنی رہے گی۔ ہم اس پر کسی قسم کا بھی اعتبار نہیں کر سکتے۔ اگر نظام نے ہم دونوں سے چھل کیا تو یہاں سے اسے وہ جواب ملے گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔“ سعد یہ نے طنزاً کہا۔ ”چھل فریب میں تم دونوں خود بھی شریک ہو پھر تم کس منہ سے اپنی باتیں کر رہی ہو۔ نظام کو جو کچھ کرنا ہے وہ کرے گا اور دیکھنا یہ ہے کہ اسے اس کے ارادوں سے واپس پازر رکھتا ہے۔“

ان کی باتیں فیروز بخت اور ستار نے بھی سنیں۔ کہنیہ نے پرجوش سبب میں فیروز بخت کو آواز دی۔

ایک تو کھانے کا اثر داؤد کو پریشان کر رہا تھا، دوسرے یہ ساری باتیں اس کے دل و دماغ کو تھل اور معطل کیے دے رہی تھیں۔ نظام نے مزید کہا۔ ”میرے منصوبے میں آپ کو زبردستی شامل نہیں تھا کیونکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ آپ نہایت چالاک اور ہوشیار آدمی ہیں۔ آسانی سے قابو میں نہیں آئیں گے اور زبردستی میں ہر وقت یہ احتمال رہتا کہ آپ کسی نہ کسی وقت زبردستی کو پکڑ لیں گے اور اس طرح ساری کوششوں پر پانی بھر جائے گا۔ چنانچہ کئی اہلہا کو رشوتیں دے کر ایک ایسا مخلول حاصل کر لیا کہ اگر اسے کھانے میں شامل کر دیا جائے تو اسے کھانے والا مفلوج ہو کر رہ جائے گا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ اب آپ بھی ایسے نہیں ہوں گے اور یوں ہی سسک سسک کر اپنی جان دے دیں گے۔“

اب داؤد اپنے ہوش و حواس بھی کھو چکا تھا، سعد یہ نے کہا۔ ”نظام! میرا خیال ہے اسے کمرے میں بند کر دیا جائے۔ وہاں اس کا کام تمام کر دیا جائے گا اور جیسے ہی اس کا کام تمام ہوگا، نہایت ہوشیار اور چالاک سے اس کی ساری چیزوں پر قبضہ کر لیا جائے گا اور اگر کسی نے مجھ سے کھانا بھی چاہا تو میں اسے پھینک دوں گا اور اس کی۔“ داؤد نے محسوس کیا کہ کسی نے اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ لی ہیں اور پھر ان ٹانگوں کے ذریعے سچھ کر اسے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔

☆☆☆

صبح ہوتے ہی نظام کے ذریعے یہ خبر عام ہو چکی تھی کہ داؤد پر قلعہ گر گیا۔ نظام اور سعد یہ نے داؤد کو کہنیہ اور زحس کے پاس پہنچا دیا اور طنزاً کہا۔ ”اپنے شوہر کو سنبھالو، رات کھاتے کھاتے قلعہ کے حملے میں ڈھیر ہو گئے۔“

کہنیہ اور زحس کی چٹخیں نکل گئیں، زحس نے کہا۔ ”بھلا! میں دعوے سے کہوں گی کہ تم دونوں نے داؤد کو ادا اس حال کو پہنچایا ہے۔“

کہنیہ بولی۔ ”میں اس کی گواہی دوں گی۔“ نظام نے غصے میں کہا۔ ”خبردار! جو تم دونوں میں سے کسی نے بھی ایسی ویسی بات کی۔ اگر ایسی غلطی کی گئی تو اس کا انجام پہلے ضرور سوچ لیتا کیونکہ مجھے تم دونوں سے زیادہ کوئی بھی نہیں جانتا۔“

سعد یہ نے کہا۔ ”اور یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ ہمارے ہاتھ کتنے لیے ہیں۔“

حویلی میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ نظام نے سعد یہ کو



سعدیہ نے کہا۔ میں وہ تدبیریں بتا تو سکتی ہوں لیکن ڈر یہ ہے کہ تم مجھے دھوکا دے دو گے۔  
نظام نے تھلا کر کہا۔ ایسا نہیں ہوگا سعدیہ... تو مجھ سے جھکی چاہے قسم لے لے، میں تجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔  
سعدیہ کوئی جواب دے کر بغیر سامنے سے ہٹ گئی۔  
نظام نے اس کا پیچھا کیا اور دوسرے کمرے میں پہنچ گیا، بولا۔ سعدیہ! تو میری بات کا یقین کر، میں تجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔

سعدیہ نے جواب دیا۔ میں نرجس اور کیفیہ سے ملوں گی اور انہیں اعتماد میں لینے کی کوشش کروں گی۔ ان میں سے ایک بھی اگر قابو میں آگئی تو میں تجھ پر راہ درم کروادوں گی۔ آگے کا کام تمہارا، دوگا۔ ایک سے شادی کر کے دوسری کو اپنی راہ سے ہٹا دیتا۔ تمہاری دوسری بیوی میں رہوں گی اور داؤد کی ہر چیز پر قبضہ کر لینے کے بعد اپنی اس بیوی کا بھی کام تمام کر دیتا ہوگا پھر ہم دونوں رہ جائیں گے اور اللہ نے چاہا تو خوب عیش کریں گے۔  
نظام نے تشویش سے پوچھا۔ اور فیروز بخت کا کیا ہوگا؟

اسے میں قابو کر لوں گی۔

ایک ہفتے بعد داؤد کا انتقال ہو گیا اور اسے نہایت شاندار طریقے سے دفن کر دیا گیا۔ جنازے میں تاجدار کے علاوہ قلعے دار، حاکم شہر، امرا اور بعض دوسرے عہدے داروں نے بھی شرکت کی۔ اس موقع پر قاضی نے داؤد کی وصیت کا اعلان کر دیا جس کی رو سے دو تہائی کا حق دار فیروز بخت قرار پایا تھا اور بقیہ ایک تہائی میں دونوں بیویاں اور ان کی اولاد شامل تھی۔ سعدیہ کو حویلی مل گئی تھی۔ نظام کو کچھ بھی نہیں ملا تھا، اس وصیت نامے کے اعلان نے نظام کی ہمت تو زوی اور اسے داؤد کی فتح مندی اور اپنی شکست فاش کا احساس شرمسار کرنے لگا۔ احمد آباد کے دوسرے مشہور تاجر وصی احمد نے فیروز بخت کو اپنی سرپرستی میں لے لیا اور اپنے قول اور فعل سے نظام کو متنبہ کر دیا کہ اب فیروز بخت سے کسی قسم کی پیچھے ہٹاؤ کا مطلب وصی احمد کے خلاف اعلان جنگ ہوگا اور نظام میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وصی احمد سے مقابلہ کرے۔

جاری ہے

فیروز بخت کیفیہ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ کیفیہ نے اسے شانوں سے پکڑ کر سعدیہ کے روبرو کھڑا کر دیا۔ سعدیہ! اسے دیکھ اور خوب غور سے دیکھ لے۔ یہ دوسرا داؤد ہے جو مفلوج داؤد کے کاروبار، جائیداد اور نقدی کو سنبھالے گا۔ ہم دونوں اور داؤد کا پورا کاروبار ہاری عیال اس کی مدد کرے گا۔  
سعدیہ نے فیروز بخت کو گھور کر دیکھا اور منہ پھیرا۔  
اطہانے سر توڑ کوششیں کی کہ داؤد کو اچھا کر لیں لیکن ناکام رہے۔ ملک اتھار داؤد کا مفلوج ہو جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ یہ خبر ہر طرف پھیل گئی اور عیادت کرنے والوں کا تاختا بندھ گیا۔ اب ہر شخص کو داؤد اور اس کی دونوں بیویوں، ان کی اولاد اور فیروز بخت سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ چالاک نظام نے ہوا کا رخ دیکھتے ہی نرجس اور کیفیہ کی خوشامد میں شروع کر دیں۔ ان دو سے علاوہ تیسرا فیروز بخت تھا جس کی خوشامد میں لگا رہتا۔

سعدیہ کو یہ باتیں ناگوار گزر رہی تھیں اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ نرجس اور کیفیہ سے خوش اخلاقی یا محبت سے ملا جائے لیکن موقع پرست اور ابن الوقت نظام ان تینوں کو رام کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ان میں سب سے بھولا فیروز بخت تھا۔ نظام نے سوچا کہ پہلے اسے قابو میں کیا جائے، اس کے بعد کسی اور کو بے بس کیا جائے۔

لیکن کیفیہ اور نرجس اپنے طور پر فیروز بخت کو نظام کے خلاف کرنے میں مشغول تھیں۔ سعدیہ اور نظام نے کھیل بڑتے جو دیکھا تو خاصے پریشان ہو گئے۔ کیفیہ اور نرجس نے ان دونوں کے خلاف معاندانہ روش اختیار کی اور ان دونوں کا اپنی حویلی میں داخلہ تک بند کر دیا۔ تاجدار کی نظر میں نظام کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ وہ سعدیہ سے کہتا۔  
"سعدیہ! یہ تو معاملہ الٹا ہو گیا۔"

سعدیہ نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ جو کام کسی اپنی منصوبہ بندی کے بغیر کیا جائے گا، اس کا یہی انجام ہوگا۔  
نظام نے پوچھا۔ لیکن اب میں کیا کروں؟ میں تو کہیں کا بھی نہیں رہا۔

سعدیہ نے جواب دیا۔ اب بھی چند ایسی تدبیریں موجود ہیں جن کو کھیل کر پانسا پلٹا جاسکتا ہے۔  
نظام نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ کون سی

شہانی کھنڈی بخشی صاحبہ

سیدتیہ شہ	سیدتیہ شہ	سیدتیہ شہ	سیدتیہ شہ	سیدتیہ شہ	سیدتیہ شہ	سیدتیہ شہ	سیدتیہ شہ
سیدتیہ شہ	سیدتیہ شہ	سیدتیہ شہ	سیدتیہ شہ	سیدتیہ شہ	سیدتیہ شہ	سیدتیہ شہ	سیدتیہ شہ





## مقابلہ

کاشف زبیر

کبھی کبھی ایسے حالات و واقعات پیش آتے ہیں کہ انسان اپنے مزاج اور ماحول سے یکسر مختلف روپ دھارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی بدلائو اس کی زندگی میں بھی آیا اور ہوا کی سوسراپٹ سے بھی سہم جانے والا بلا خوف و خطر موت سے معرکہ آرائی میں مصروف ہو گیا... بالآخر پریم حالات میں بھی قدرت نے اس کا بہرہ رکھ لیا۔

دوست نرادمسن کی محبتوں کا بے باق حساب کتاب

وہ مشکل سے ہارہ سال کا لڑکا تھا۔ بے پناہ سردی سے بچنے کے لیے اس نے فرکا بنا ہوا بھاری کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں سنگل بیرل بائیس بور کی رائفل تھی۔ کڑوی کا دستہ اس کے شانے سے نکلا ہوا تھا۔ دور برف سے ڈھکے میدان میں برف کی طرح براق سفید گھوڑا ایک کھونٹے سے بندھا ہوا تھا۔ شدید برف باری نے پورا ماحول سفید کر دیا تھا۔ لڑکے کے عقب میں اس کا باپ موجود تھا۔ ہاتھ میں رائفل ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر



نشانے بازی آزمائے او۔ وہ اس خیال سے پریشان تھا۔ باپ سے ڈرتا تھا اس لیے صاف انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے وہے لفظوں میں کہا کہ وہ شاید ایسا نہ کر سکے مگر رومولوف نے توجہ نہیں دی۔

باقی ماندہ بھیڑیوں کے لیے رومولوف نے ایک ناکارہ ہو جانے والے گھوڑے کو چارہ بنایا تھا۔ اس کے کمر میں چوٹ آئی تھی جس سے کمر کا نصف حصہ گل گیا تھا۔ اب وہ گھڑسواری کے لیے بیمار تھا۔ اگرچہ دیکھنے میں وہ بہت خوب صورت اور صحت مند جانور لگتا تھا۔ وہ سر سے ہاؤں تک اس طرح سفید تھا کہ اگر ساکت ہوتا تو برف کے پس منظر میں مشکل سے ہی نظر آتا۔ رومولوف اور ایلکس ایک جگہ گھات لگائے بیٹھے تھے۔ یہاں سے گھوڑا کوئی ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر تھا اور اب انہیں بھیڑیوں کا انتظار تھا۔ اچانک رومولوف نے آہستہ سے کہا۔ "ایک بھیڑیا آگیا ہے۔"

"کس طرف ہے؟" ایلکس نے سر ہلائے بغیر پوچھا۔ وہ بدستور رائفل پکڑے ساکت تھا۔ گھوڑے نے بھیڑیے کی آمد محسوس کر لی تھی اور وہ مضطرب تھا۔

"دائیں طرف سے۔" رومولوف نے جواب دیا۔ "اس نے ہاڈ بھلا ٹنگ لی ہے۔ جب میں کھوں تو رائفل کو ہلکا سا اس طرف کرتا۔"

ایلکس نے سر ہلایا مگر اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔ اس کی انگلی لیٹی پر تھی۔ اچانک رومولوف نے سرگوشی میں کہا۔ "آگیا ہے، اسے نشانہ بناؤ۔"

ایلکس نے رائفل کا رخ ہلکا سا بدلا اور اس نغمہ مند بھیڑیے کا نشانہ لینے لگا جو اب تیز قدموں سے گھوڑے کی طرف لپک رہا تھا اور گھوڑا آنے والے خطرے سے بچنے کے لیے اچھل کود کر رہا تھا مگر وہ خود کوری سے آزاد نہیں کر سکتا تھا۔ رومولوف چٹایا۔ "گولی چلاؤ۔"

ایلکس کی انگلی ابلی پر کانپ رہی تھی اور وہ کوشش کے باوجود بروقت فائر نہیں کر سکا۔ بھیڑیے نے گھوڑے پر چھلانگ لگائی اور اس کی گردن پر دانت گاڑ دیے تھے۔ ایلکس نے گولی چلائی مگر نشانہ نہیں لگا۔ رومولوف نے غصے میں اپنے بڑی سیخروالی ٹوپی اتار کر نیچے ڈال دی اور اپنی رائفل سے بھیڑیے کا نشانہ لیا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی بھیڑیے کے سر میں اتر گئی اور وہ مردہ ہو کر نیچے گرا مگر اتنی دیر میں وہ گھوڑے کا شہرگ ادھیڑ چکا تھا۔ جب وہ میدان میں پہنچے تو گھوڑا اور بھیڑیا زندگی کی بازی ہار چکے تھے۔ ان

تذبذب کے آثار تھے۔ اس نے بے بسی سے باپ کی طرف دیکھا۔ "بابا! میں نہیں کر سکتا گا۔"

"ایلکس! تم کرو گے۔" رومولوف نے سخت لہجے میں کہا۔ وہ سخت حراج کھینچا تھا اور اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے بھی اس کے اندر نرمی نہیں تھی۔ رومولوف وکٹر سابق آرمی آفیسر تھا۔ فوج چھوڑنے کے بعد وہ گھوڑے پالنے لگا تھا جو فوج کو فراہم کیے جاتے تھے۔ سائبریا کے اس دور المادہ علاقے میں آبادی بہت کم تھی اور یہاں خاص طور سے مشرقی کریمیا سے لوگ لا کر بسائے گئے تھے۔ ان میں ایک وکٹر خاندان بھی تھا۔ یہ لوگ مویشی پروری کے ساتھ ساتھ فوجی ملازمت بھی کرتے تھے۔ رومولوف صرف چودہ سال کی عمر میں فوج میں بھرتی ہو گیا تھا تیس سال کی عمر میں وہ ریٹائرڈ ہو گیا اور اب آبائی کام کر رہا تھا۔ سوویت یونین میں فوجی چھپنے کی اجازت نہیں تھی مگر رومولوف کو خاص طور سے گھوڑے پالنے اور فوج کو سپلائی کرنے کی اجازت ملی ہوئی تھی۔ ایلکس وکٹر اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ایلکس کے علاوہ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔

گزشتہ کچھ عرصے سے بھیڑیوں نے رومولوف کے فارم کو اپنے نشانے پر رکھ لیا تھا اور وہ اب تک اس کے دو گھوڑے ہلاک کر چکے تھے۔ اس کے بعد رومولوف بھیڑیوں کے خلاف جنگ پر اتر آیا۔ اس نے گھات لگا کر نصف درجن بھیڑیے ہلاک کر دیے۔ مگر اب بھی اس گروہ کے کچھ بھیڑیے باقی تھے جو اس کے گھوڑوں کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ خاص طور سے بھیڑیوں کا سربراہ جو ایک عظیم الجثہ بھیڑیا تھا، رومولوف ہر قیمت پر اسے نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایک بار اس نے سربراہ کو ہلاک کر دیا تو اس کے بعد بھیڑیے اس کے فارم کا رخ نہیں کریں گے۔

دس سال کی عمر میں رومولوف نے ایلکس کو نشانے بازی کی تربیت دینا شروع کر دی تھی۔ ایلکس خاموش فطرت اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا لڑکا تھا، اسے جانوروں اور اٹھیاروں سے زیادہ پھول اور پودوں میں دلچسپی تھی مگر ساتھ ہی وہ ہر کام پوری دلجمعی سے کرنے کا عادی تھا، چاہے وہ اسے پسند ہو یا نہ ہو۔ دو سال میں وہ ماہر نشانہ ہازین بن گیا تھا۔ وہ سو گز دور رکھی بیڑ کی بول اڑا دیتا تھا مگر اس نے آج تک کسی جاندار کو نشانہ نہیں بنایا تھا۔ جب بھیڑیوں نے رومولوف کے فارم پر حملے کیے تو اس نے فیصلہ کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ایلکس کسی جاندار پر اپنی



اسٹیریٹیوی سے جنگ والے حصے کی طرف بڑھ رہا تھا اور سارجنٹ سپاہیوں کو بتا رہا تھا کہ انہیں جرمنوں کی ایک مشین گن چیک پوسٹ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کرنا تھا مگر سارجنٹ نے یہ نہیں بتایا کہ اس اہم پوسٹ پر سوویت فوج کے ایک درجن حملے ناکام ہو چکے تھے اور ان حملوں میں ہزار سے زیادہ سپاہی مارے گئے تھے۔ یہ سپاہی ابھی ٹریننگ مکمل کر کے آئے تھے اور انہیں عملی جنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس لیے جیسے جیسے کنارہ نزدیک آ رہا تھا ان کے خوف میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اچانک ایک نوجوان نے کھڑے ہو کر سارجنٹ سے کہا۔ ”میں موت کے منہ میں بھیج رہے ہوں۔ ہمارا لیڈر کون ہے اور ہمیں اس محاذ کے بارے میں کچھ نہیں پتا ہے۔“

”خاموش ہو کر بیٹھو۔“ سارجنٹ نے غرا کر کہا مگر نوجوان نہیں بیٹھا بلکہ اس نے اہانک پلٹ کر دریا میں چھلانگ لگائی اور سب سے تیرے ہوئے اسٹیر سے دور جانے کی کوشش کرنے لگا مگر اسے زیادہ دور جانا نصیب نہیں ہوا۔ سارجنٹ نے اپنا پستول نکال کر عقب سے اس پر گولی چلائی اور وہ ساکت ہو گیا۔ سرخ ہوتا پانی اس کی لاش بہا کر لے گیا تھا۔ سارجنٹ نے پستول واپس رکھا اور سرد لہجے میں بولا۔ ”جس نے فرار کی کوشش کی اس کا سبب انجام ہوگا۔“

ایلیکس دم بہ خود بیٹھا ہوا تھا۔ پچھلے پہلے اسے جبری بھرتی پر دو گرام کے تخت فوج میں بھرتی کر لیا گیا تھا اور اب تربیت دے کر براہ راست گرم ہماڈ پر بھیجا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ وہی سب نوجوان تھے جنہوں نے تربیت حاصل کی تھی۔ اسٹیر کنارے لگا تو انہیں ہانک کر اتارا جانے لگا اور کنارے پر موجود مسلح فوجی انہیں ایک کیپ میں لے آئے۔ وہاں انہیں محاذ کے بارے میں مختصر سی بریفنگ دی گئی۔ نقشے سے وضاحت کی گئی کہ جرمن مشین گن پوسٹ کہاں تھی۔ یہ سارا علاقہ میدانی تھا مگر مشین گن پوسٹ ذرا بلندی پر تھی اور وہاں سے جرمن، روسی مورچوں پر فائرنگ کرتے تھے۔ ایلیکس سوچ رہا تھا کہ وہ کس طرح حملہ کریں گے، ان کے پاس تو اسلحہ ہی نہیں تھا۔ اس کے برابر میں موجود نوجوان نے کہا۔

”ہمارے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ ہم لڑیں گے کیسے؟“

”یہ ہمیں اسلحہ دیں گے۔“ ایلیکس نے امید کے ساتھ

کہا۔ ”بغیر ہتھیار کے ہم کیسے لڑتے ہیں؟“

اس مختصر بریفنگ کے بعد انہیں بتایا گیا کہ اسلحہ

کا خون سفید برف پر نمایاں تھا۔ روموٹوف نے بیٹھے کی طرف دیکھا اور موسم سے زیادہ سرد لہجے میں بولا۔ ”تم بھی جیسے نشانے باز نہیں بن سکتے۔“

☆☆☆

دخانی اسٹیر دریائی بندرگاہ پر رکھا ہوا تھا اور دور اٹھتے جھومکے کے پس منظر میں شعلے چمک رہے تھے۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور گولوں کے دھماکے یہاں تک سنائی دے رہے تھے مگر بندرگاہ پر موجود افراد ان کا ٹوکس لیے بغیر اپنے کاموں میں لگے تھے۔ یہ ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ گزشتہ تین مہینے سے اسی قسم کے مناظر دیکھ رہے تھے۔ ڈاک سے نوجوان سپاہیوں کا ایک جھٹا اسٹیر میں سوار ہو رہا تھا اور ان کے چہروں پر خوف کا عالم تھا۔ ان سب نے نئی وردی پر نئے گرم کوٹ پہن رکھے تھے مگر ان میں سے کسی کے پاس ہتھیار نہیں تھے اور انہیں محاذ جنگ پر بھیجا جا رہا تھا۔ ایک سارجنٹ میگافون پر چلا چلا کر انہیں اسٹیر میں سوار ہونے کو کہہ رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ انہیں بتا رہا تھا کہ انہیں بہادری سے مادر وطن پر چڑھ دوڑنے والے نازی جرمن دشمنوں سے لڑنا ہے۔ بزدلی دکھانے اور فرار کی سزا صرف موت تھی۔ تقریباً اسی نوجوان سپاہیوں پر مشتمل دستہ اسٹیر میں سوار ہوا اور وہ ڈاک سے نکل کر تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ دریا میں بے شمار کشتیاں اور اسٹیر تھے۔ یہ سب اس وقت سوویت فوج کے لیے کام کر رہے تھے۔

اسٹالن گراڈ تین مہینے سے جرمنوں کے محاصرے میں تھا۔ سوویت یونین پر چڑھ آنے والے جرمن بہت تیزی سے پیش قدمی کرتے ہوئے اس اہم ترین صنعتی شہر تک آن پہنچے تھے۔ اس وقت یہ روس کا صنعتی حب تھا مگر جرمن... یہ ہتھیار جتنی قوت اور کوشش کے باوجود اسٹالن گراڈ پر قابض نہیں ہو سکے تھے۔ نازیوں کی نظر یہاں تیل صاف کرنے والے کارخانوں پر تھی۔ وہ ان پر قبضہ کر کے اپنی جنگی مشینری کو قوت فراہم کر سکتے تھے۔ وہ اکتوبر میں یہاں آئے تھے اور اب جنوری کا آخر تھا۔ سردی اور برف باری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ روسی فوج جرمنوں کے مقابلے میں نہ تو تربیت یافتہ تھی اور نہ ہی اچھے ہتھیاروں سے مسلح تھی۔ اسے بس ایک ہی فائدہ تھا کہ اس میں لڑنے اور مرنے کے لیے سپاہیوں کی کمی نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ تین مہینے کے مختصر عرصے میں اس محاذ پر ایک بلین افراد مارے جا چکے تھے۔ ان میں سے اکثریت روسیوں کی تھی مگر جرمنوں کا جانی نقصان بھی کم نہیں تھا اور انہوں نے اس محاذ پر اپنی پھٹی آری کھودی تھی۔



سے تعفن اٹھ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں کافی دن پرانی لاشیں بھی تھیں کیونکہ ادھر موجود لاشیں تازہ تھیں اور بعض کے زخموں سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ اچانک ایک طرف سے چند ٹینک اور دو گاڑیاں نمودار ہوئیں۔ ایکس جلدی سے حوض میں گھس گیا۔ آنے والے جرمن تھے۔ دو گاڑیوں میں سے ایک اسٹاف کار بھی تھی اور اس سے ایک اعلیٰ جرمن آفسر اترتا۔ اس نے قاتحانہ نظروں سے اس ویران ہو جانے والے قصبے کو دیکھا اور حمام کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے ساتھ آنے والے چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ انہیں یہاں بیچ بچہ نے والے روسیوں کی تلاش تھی۔ ان میں سے دو حوض کی طرف آنے لگے تو ایکس جلدی سے لاشوں کے درمیان لیٹ گیا اور اس نے کچھ لاشوں سے خون لے کر اپنے چہرے اور کونٹ پر مل لیا۔ مگر آنے والے... بے وقوف نہیں تھے انہیں معلوم تھا کہ لاشوں میں زندہ افراد بھی ہو سکتے ہیں، اس لیے انہوں نے حوض کے کنارے کھڑے ہو کر لاشوں پر اپنی ہلکی مشین گنوں سے قاترنگ شروع کر دی، انہوں نے اس طرح دو طرف سے قاترنگ کی کہ کوئی فرد بچنے نہ پائے۔ ایکس آنکھیں بند کیے لیٹا تھا اور منتظر تھا کہ کب اس کا جسم چھلنی ہوتا ہے مگر مجرا نہ طور پر وہ محفوظ رہا۔ جرمن سپاہی اپنا کام کر کے رخصت ہوئے اور وہ اٹھا تو ذرا دور ایک عینک والے نوجوان کود کچھ کر حیران ہوا۔ وہ بھی خود کٹھول رہا تھا۔ اس نے ایکس سے پوچھا۔

”تم کون ہو؟“  
 ”ایکس وکٹر ساتویں رجمنٹ سے، میں ابھی تربیت حاصل کر کے آیا ہوں۔“  
 ”میں بھی۔“ دوسرے نے ٹھٹھی سانس لی۔ ”میکس لائونف، میں ایک صحافی ہوں اور مجھے بھی جبری بھرتی کر لیا گیا۔“

ایکس دیوار کے سوراخوں سے دیکھ رہا تھا۔ جرمن اسر حمام کی نصف ٹوٹی دیوار کے دوسری طرف دیوار کی ٹنگی کے نیچے کھڑا ہوا غسل کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے اپنی وردی اتار کر دیوار پر بٹکا دی تھی اور اب اس کا ہتھکڑا کھائی دے رہا تھا جس پر وہ صابن مل رہا تھا۔ حمام کے باہر دو سچ سپاہی مستعد کھڑے تھے۔ نزدیک ہی کہیں جرمن توپیں تواتر سے گولہ باری کر رہی تھیں کیونکہ وہ کہہ کر گولے کی پرواز کی سنسناتی آواز آتی اور پھر اس کے گرنے کا دھماکا۔ سناتی دیتا تھا۔ جرمن اسر کے ساتھ کل آٹھ افراد تھے۔ ان

انہیں آگے دیا جائے گا اور اب انہیں یہاں سے محاذ کی طرف جانا تھا۔ وہ کیپ سے نقل کر اس جنگل کی طرف روانہ ہو گئے جس کے پار جرمن پوسٹ تھی۔ جنگل کے آغاز میں انہیں اسلحہ دیا گیا مگر اس طرح کہ کسی کو رائفل دی جا رہی تھی اور کسی کو اس کی گولیاں جو چھ چھ کے بیک میں تھیں۔ ایکس حیران تھا کہ وہ ان معمولی رائفٹوں سے جرمنوں کی محفوظ مشین گن پوسٹ کیسے فتح کریں گے جس میں بھاری والے مشین گن لگی ہوئی تھی اور عام جرمن سپاہی بھی مشین گن سے مسلح تھا مگر سوال کرنے یا ہانپھانے کا وقت نہیں تھا کیونکہ ایک خوفناک سارجنٹ یہاں بھی میگا فون لے لے انہیں لڑنے اور مرنے پر اکسار رہا تھا اس کا زیادہ زور دھمکیوں پر تھا کہ کسی نے فرار کی کوشش کی یا واپس آیا تو اسے شوٹ کر دیا جائے گا۔ اس کی باتوں سے ایکس کو لگا کہ جتنا خطرہ آگے سے تھا، انہیں اتنا ہی خطرہ پیچھے سے بھی تھا۔ ایکس کے حصے میں ایک خالی رائفل آئی۔ رائفل اور کارتوس الگ الگ دینے کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی تھی کہ خود روسیوں کو خطرہ تھا کہ ان میں سے کوئی نوجوان اپنی رائفل کا رخ ان کی طرف نہ پھیر دے۔

چند منٹ بعد وہ درختوں کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور عقب سے میگا فون پر چنگھاڑتے سارجنٹ کی آواز یہاں تک آرہی تھی اور لازمی بات تھی کہ جرمنوں نے بھی یہ بیچ و بیکار سن لی تھی۔ ابھی وہ نصف جنگل میں تھے کہ بھاری مشین گن گرجنے لگی۔ جنگ نے جنگل کا حلیہ پہلے ہی بگاڑ دیا تھا۔ گولیاں اتنی خطرناک تھیں کہ جتنے کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔ انسانوں کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ مشکل سے چند منٹ آگے بڑھنے والے نصف نوجوان خاک و خون میں قفلاں ہو چکے تھے اور باقی افراد تقری میں اپنی جان بھانے کے لیے دائیں بائیں بھاگ رہے تھے۔ کیونکہ واپس آنے کا انجام انہیں پہلے ہی بتا دیا گیا تھا۔ ایکس بھی اندھا دھند بھاگنے والوں میں شامل تھا۔ چند منٹ بعد اس کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا تھا؟

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ ایک ویران قصبے میں جا نکلا۔ یہ جگہ اسٹالن گراڈ کے نواح میں تھی۔ بیشتر مکانات تباہ ہو گئے تھے اور باقی بھی بری طرح متاثر تھے۔ صرف چند ایک سالم مکانات کھڑے تھے۔ قصبے کے وسطی چوک کے نوارے کے حوض میں روسی سپاہیوں کی لاشیں پڑی تھیں اور یہ اتنی زیادہ تھیں کہ حوض اوپر تک بھر گیا تھا۔ لاشوں



ایکس نے پوزیشن بدل کر اس سپاہی کو دیکھا جو اپنی مشین گن سنبالے ان کی طرف آرہا تھا۔ اس نے اگلے گولے کے ساتھ اسے نشانہ بنایا۔ گاڑیوں میں موجود سپاہیوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی کہ ان کے اسرار دوسرے ساتھیوں پر کیا گزری تھی۔ اب راستہ صاف تھا۔ وہ اور میکس وہاں سے اٹھ کر نکل گئے۔

☆☆☆

میکس نے ایکس کا تعارف کرایا۔ "جنرل سراہے ایکس وکٹر ہے ساتویں رجمنٹ۔ ہے۔"

جنرل ٹریگ فورسکی اس سے جس طرح ملا، ایکس کو اندازہ ہوا کہ اس کے کارنامے کی گونج فیملی ہیڈ کوارٹر تک پہنچ گئی تھی۔ کرنل ریف جرمن فوج کا داغ تھا اور اس نے اسٹالن گراڈ کے محاذ پر روسی افواج کو شدید نقصان سے دوچار کیا تھا۔ ایکس نے اس کا خاتمہ کر کے جرمنوں کو بڑا دھچکا پہنچایا تھا۔ خاص طور سے ایسے وقت جب کہ جرمن اسٹالن گراڈ پر فیصلہ کن حملے کی تیاری کر رہے تھے اور حملے کی بڑی ذمہ داری کرنل ریف کے سپرد تھی۔ جنرل ٹریگ نے نئے نئے الفاظ میں ایکس کی تعریف کی اور مطلب کی بات پر آگیا۔ "جرمن اسٹیج ہمارے لیے دوسرے بن گئے ہیں۔ روزانہ ہمارے درجنوں "دی ان کا نشانہ بن رہے ہیں اور اب ہمیں ان کا خاتمہ کرنا ہے۔"

یورپ میں ابتدائی فتوحات کے بعد جب جرمنوں کو دوسرے محاذوں پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تو ہٹلر کے حکم پر اسٹالن گراڈ کا شعبہ تشکیل دیا گیا۔ اس میں صرف ان افراد کو شامل کیا جاتا تھا جو اعلیٰ درجے کے نشانے ہاز ہوتے تھے اور ان کے لیے فوجی خدمات کی باقی شرائط معاف تھیں جیسے عمر کی حد یا پھر مکمل صحت وغیرہ۔ ان میں پندرہ سال کے لڑکوں سے لے کر ستر سال تک کے افراد شامل تھے اور بعض جسمانی معذور یوں کا بھی شکار تھے۔ ان افراد کو سرگرم محاذ پر بھیجا جاتا تھا جہاں یہ مورچے بنا کر فوج اور عام افراد کو نشانہ بناتے تھے۔ جنرل ٹریگ کا جوابی پلان یہ تھا کہ روسی نشانچوں کا ایک دستہ تیار کیا جائے جو جرمن نشانچوں کا خاتمہ کرے۔ اس نے دستہ تشکیل دے دیا تھا اور ایکس کیونکہ اعلیٰ درجے کا نشانے ہاز تھا اس لیے اسے اس گروپ میں خاص طور سے شامل کیا گیا تھا۔ اس نے نقشے پر اسٹالن گراڈ کے ایک نواحی صحتی علاقے کا بتایا۔ "یہاں وہ خاص طور سے سرگرم ہیں اور یہ جگہ محاذ جنگ سے دور نہیں ہے۔ باقی تفصیلات تمہیں میجر مہس بتائے گا۔"

میں سے پانچ گاڑیوں سے اتر آئے تھے۔ اچانک ایکس کو خیال آیا اور وہ مردہ سپاہیوں کی جھینٹوں ٹولنے لگا۔ میکس نے پوچھا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"میرے پاس رائفل ہے، مجھے گولیوں کی تلاش ہے۔"

"گولیاں میرے پاس ہیں۔" میکس نے کپس نکال کر دکھائے۔ "مگر تم ان سے کیا کر لو گے؟"

"میں اس جرمن کو نشانہ بناؤں گا۔" ایکس نے حمام میں غسل کرنے والے جرمن اسرار کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہارا داغ خراب ہے۔ وہ مارا جائے گا لیکن اس کے بعد اس کے آدمی ہمیں پتھریں گے؟"

"تم گولہ کرنے کی آواز سن رہے ہو، ہمیں پہلے سے پتا چل جاتا ہے کہ گولہ کرنے والا ہے۔ میں اسی حساب سے فائر کروں گا۔ گولی کی آواز دھماکے میں دب جائے گی۔"

"ایسا تو میں بھی کر سکتا ہوں۔" میکس نے کہا۔ "رائفل مجھے دو۔"

ایکس نے سوچا اور رائفل اس کی طرف اچھال دی۔ "اسرار کو نشانہ بنانا ہے۔"

میکس نے کارتوس پیک فٹ کر کے ایک سو داغ سے رائفل کی نال نکالی اور نشانہ لینے لگا۔ چند سیکنڈ بعد گولے کا دھماکا ہوا مگر اس نے فائر نہیں کیا۔ اس نے شرمندگی سے ایکس کی طرف دیکھا۔ "مجھے اپنے نشانے پر اعتماد نہیں ہے۔"

"رائفل مجھے دو۔" ایکس نے کہا تو میکس نے رائفل اس کی طرف اچھال دی۔ ایکس نے سو داغ سے رائفل نکالی اور سب سے پہلے اسرار کے پاس کھڑے سپاہی کا نشانہ لیا۔ وہ ایسی جگہ تھا کہ گولہ تو کسی کو پتا نہیں چلتا۔ گولے کی سستاہٹ کے ساتھ اس نے سانس روک لی اور دھماکا ہوتے ہی فائر کر دیا۔ سپاہی گر گیا۔ اس نے تیزی سے رائفل لوڈ کی اور دوسرے سپاہی کا نشانہ لیا اور اس بار بھی اس کا نشانہ درست بیٹھا۔ میکس سو داغ سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔

اس نے بے ساختہ داودی۔ "واہ، اتنا اچھا نشانہ۔"

ایکس نے تیسرا نشانہ جرمن اسرار کو بنایا۔ اس کا سر دیوار سے اوپر تھا اور گولی اسی پر لگی۔ اسی لمحے میکس نے اسرار کی لہجے میں کہا۔ "ایک سپاہی اس طرف آرہا ہے، اس نے شاید دیکھ لیا ہے۔"

"کس طرف ہے؟"

"دائیں طرف۔" میکس نے کہا اور جلدی سے دیوار کے ساتھ ہو کر لیٹ گیا۔ وہ خود کو مردہ ظاہر کر رہا تھا۔



کارخانوں اور گوداموں پر مشتمل ہے اور جنگ نے یہاں سب تباہ کر دیا ہے۔ بلندی پر ہونے کی وجہ سے یہ اسٹائیز کے لیے آئیڈیل ہے۔ اتفاق سے یہ جرمنوں اور ہمارے درمیان میں ہے۔“

”جرمن اسٹائیز کتنے ہیں؟“

”اوپر والے سمجھتے ہیں کہ وہ بہت زیادہ ہیں مگر مجھے معلوم ہے ان کی تعداد نصف درجن بھی نہیں ہے مگر وہ سب بہت ماہر اور چالاک ہیں۔ وہ ہم سے پہلے کام کر رہے ہیں اس لیے انہوں نے یہاں آمد و رفت کے ٹھکانے اور مورچے بنا رکھے ہیں۔ اب ہمیں یہ کام کرنا ہوگا۔“

”ان کے پاس ہتھیار بھی بہتر ہیں۔“ رونی نے اپنی رائفل کی طرف دیکھا۔ ”میں اس قسم کے ہتھیار استعمال کرنا پڑتے ہیں۔“

”یہ زیادہ برے نہیں ہیں۔“ ایلکس نے اپنی رائفل کو سہلایا۔ ”بشرطیکہ ہم اچھے طریقے سے استعمال کریں۔“

”ان کی حد زیادہ نہیں ہے۔“ جوزف نے خبردار کیا۔

”جرمن رائفلوں کی حد زیادہ ہے اور ہمیں ان کا نشانہ لینے کے لیے زیادہ نزدیک جانا ہوگا۔“

”یہ ہماری مجبوری ہے۔“ نتالیہ نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ ”اب میری دوسری ڈیوٹی کا وقت ہو گیا ہے۔“

”دوسری ڈیوٹی؟“ ایلکس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”میں نرس بھی ہوں۔“ نتالیہ بولی۔ ”شام کے وقت کچھ دیر فیلڈ اسپتال میں ہوتی ہوں۔“

”میں بھی چلتا ہوں، میرے پاؤں میں چوٹ لگی ہے۔“

”آؤ میں ڈاکٹر کو کھادوں گی۔“ نتالیہ بولی۔

وہ باہر آئے اور دروازوں سے ہوتے ہوئے عمارت سے باہر نکل آئے۔ گلیوں میں لمبا بھرا ہوا تھا اور جن جگہوں سے گزرتا خطرناک ہوتا تھا، وہاں روشنی کی گئی تھی۔ وہ تاریک گلیوں سے گزرنے لگے۔ برف باری نہیں ہوئی تھی مگر سردی انتہا کی تھی۔ وہ گرم کپڑوں میں بھی ٹھنڈے تھے۔ ایلکس نے پوچھا۔ ”تم کہاں کی رہنے والی ہو؟“

”ہیٹس کی۔“ نتالیہ نے کہا۔ ”میرا گاؤں شہر سے صرف تین میل دور ہے۔“

”تمہارے گھر والے؟“

”پہلے پورا گھر تھا۔“ نتالیہ نے آہستہ سے کہا۔ ”اب صرف ماں ہے۔“

”مجھے افسوس ہے۔“ ایلکس نے کہا اور پھر اپنے بارے میں بتایا۔ اس کے باپ کا دو سال پہلے انتقال ہوا

ایلکس چونکا، میکس مسکرا رہا تھا۔ باہر آنے پر اس نے کہا۔ ”اس خبر کو سب سے پہلے میں نے بریک کیا اس لیے ہائی کمان کی طرف سے مجھے میجر کا عہدہ دیا گیا ہے اور اب میں یہاں سرکاری رپورٹر ہوں۔“

ایلکس کو لیفٹیننٹ کے عہدے پر ترقی دی گئی تھی۔ یعنی اب وہ چھوٹے درجے کا افسر تھا۔ عمر اس کا تعلق کسی مخصوص آرمی سے نہیں تھا بلکہ وہ اسٹائیز کے اس گروپ کا حصہ تھا جسے میدان جنگ میں تشکیل دیا گیا تھا۔ ویسے وہ ساتویں رجمنٹ کا ایک حصہ تھا۔ شام تک وہ واپس اسٹائن گراڈ آچکے تھے اور یہاں روسی افواج کے زیر قبضہ علاقے میں ایک تباہ شدہ کارخانے کی عمارت میں اس کی ملاقات گروپ کے باقی ارکان سے ہوئی۔ یہ چار افراد تھے۔ جوزف، کریم، نتالیہ اور رونی۔ سوائے نتالیہ کے باقی تینوں تجربے کار سپاہی تھے اور برسوں سے جنگ کا حصہ تھے۔ انہیں نشانے کی وجہ سے اس گروپ میں شامل کیا گیا تھا۔ نتالیہ نوجوان تھی، مشکل سے بائیس برس کی حسین اور۔۔۔

تو تازہ لڑکی۔ ایلکس کو افسوس ہوا کہ وہ اس سے محاذ جنگ پر مل رہا تھا جہاں زندگی کے اگلے پل کا کچھ پتا نہیں تھا۔ پردوں سے بنے اس کمرے میں ایک میز تھی اور چاروں طرف کھڑکی کی چیمیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ کمران کے لیے مخصوص تھا۔ نتالیہ نے ایلکس سے ہاتھ ملایا تو اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔

”میں نے سنا ہے تم نے ایک منٹ میں چار جرمن مار گرائے جن میں کرنل ریف جیسا بڑا افسار بھی تھا۔“

”اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں بڑا افسار کر رہا ہوں۔“ ایلکس نے جواب دیا۔ ”کئی بات تو یہ ہے کہ براہ راست جنگ کا پہلا موقع تھا۔ میں دو گھنٹے پہلے مشرقی گھاٹ پر اترا تھا اور میرے ساتھ آنے والے نصف سے زائد نوجوان صرف دس منٹ میں مارے گئے تھے۔“

”جرمن زیادہ خطرناک ہتھیاروں سے مسلح ہیں۔“ جوزف نے کہا۔ وہ لمبا ترنگا، مضبوط جسامت اور سخت چہرے والا شخص تھا۔ کریم کا تعلق یوکرین سے تھا۔ نسلاً وہ مسلم تاتاری تھا۔ دہائی چھوٹی جسامت اور لڑکوں جیسے چہرے والا نہیں کھنکھناتا تھا۔ اس کی عمر اس کے چہرے سے نہیں جھلکتی تھی۔ وہ سب خوش دلی سے ایلکس سے ملے۔

جوزف اس گروپ کا سربراہ تھا۔ بیڑے سے شغل کے بعد وہ کام کی طرف آئے۔ جوزف نے لائین کی روشنی میں میز پر ایک نقشہ بچھایا اور اس پر سرخ مارکر سے بنے سیکٹرز کی وضاحت کرنے لگا۔ ”یہ کل دس سیکٹرز ہیں۔ یہ سارا علاقہ



رکھ سکتے تھے۔ نتالیہ اور کریم ایک جگہ تھے جبکہ جوزف اکیلا تھا۔ ایکس اور رونی نے روشنی ہونے سے پہلے اپنے مورچے بنا لیے۔ ایکس ایک پائپ کے اندر تھا اور یہاں سے وہ ایک طرف نظر رکھ سکتا تھا جبکہ رونی نے دو پائپوں کے درمیان والی جگہ منتخب کی تھی اور یہاں سے وہ ایکس کے عقب میں نظر رکھ سکتا تھا۔ اب انہیں انتظار کرنا تھا اور ایک نشانی کے لیے سب سے صبر آزما کام بھی ہوتا ہے کہ اسے انتظار کرنا ہوتا ہے۔ کچھ دیر بعد رونی نے سرگوشی میں کہا۔ ”کیا خیال ہے، وہ پہلے سے یہاں نہیں ہو سکتے اور اب روشنی کا انتظار کر رہے ہوں؟“

”ہو سکتا ہے۔“ ایکس نے تسلیم کیا۔ وہ اپنی چھوٹی سی دور بین سے سامنے فیکٹری کے شیف دیکھ رہا تھا۔ یہاں فیکٹری کے باہر کی سمت بھی ایسی لمبیں تھیں جہاں مورچا لگا یا جاسکتا تھا مگر رات بے پناہ سردی میں رہنا آسان کام نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جوزف، نتالیہ اور کریم کہاں تھے؟ وہ ایسی جگہوں کو خاص طور سے کھونٹ رہا تھا جہاں سے ان تینوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ اچانک اسے ایک شیف میں معمولی سی حرکت محسوس ہوئی اور اس نے تیزی سے رائفل سنبھال کر اس کا رخ اس شیف کی طرف کر دیا۔ رونی بھی چوکنہ ہو گیا۔ اس نے اشارے سے پوچھا۔

”کیا ہوا ہے؟“

ایکس نے جوں ا اشارہ کیا کہ سامنے والے شیف پر کوئی ہے۔ اس دوران میں وہ رطل کی دور بین سے دیکھ رہا تھا۔ بالآخر اسے ایک رائفل نظر آئی مگر وہ ساکت تھی۔ اس کی صرف نال نظر آ رہی تھی۔ اس دوران میں رونی بھی عقب کا جائزہ لے رہا تھا اور اب روشنی تیز ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے اشارے سے ایکس کو بتایا کہ اس نے بھی ایک نشانی تلاش کر لیا ہے۔ مگر اس کی جھلک نظر نہیں آ رہی ہے بلکہ صرف نال دکھائی دے رہی ہے۔ ایکس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے رونی کو منع کیا۔ ”ناگزرت کرنا۔“

مگر اسی لمحے ایک فائر کی آواز گونجی۔ رونی نے فوراً نشی میں سر ہلایا کہ فائر اس نے نہیں کیا ہے۔ پہلے فائر کے بعد دوسرے فائر کی آواز گونجی اور ایکس نے باہر نکلنے ہوئے کہا۔ ”دھوکا... یہ ٹریپ تھا۔“

اب وہ رہ کر فائرنگ ہو رہی تھی۔ جیسے ہی ایکس اوپر ہوا ایک گولی اس کی طرف آئی اور اس سے فولادی پائپ سے ٹکرائی۔ وہ واپس پائپ میں محسوس کیا۔ رونی اپنی جگہ دبا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”دامیں طرف اوپر ہی سمت سے۔“

تھا اور ماں اس سے بھی پہلے گزر چکی تھی۔ اب اس کا دنیا میں سوائے دو بہنوں کے اور کوئی نہیں تھا مگر وہ دونوں بھی اس سے دور تھیں۔ ”میں نے آخری بار انہیں پاپا کی تدفین میں دیکھا تھا۔“

”میں محسوس کر سکتی ہوں کہ اپنے لوگوں سے بھڑنا کتنا اہمیت ناک ہوتا ہے۔“ نتالیہ نے کہا اور اس کے قریب ہو گئی۔ اس نے ایکس کا ہاتھ تھام لیا۔ اسپتال زیادہ دور نہیں تھا مگر انہیں بہت گھوم پھر کر جانا پڑا تھا۔ اسپتال ایک ایسی عمارت میں تھا جو گولہ باری کا نشانہ بنی تھی مگر اس کا مرکزی ہال سلامت تھا۔ نتالیہ نے اسے ایک ڈاکٹر کے سپرد کیا اور خود ڈیوٹی پر چلی گئی۔ ڈاکٹر نے اس کے پاؤں کی چوٹ دیکھی اور اسے چند گولیوں کے ساتھ ایک مرہم بھی دیا۔ ایکس کو خاص تکلیف نہیں تھی، وہ صرف نتالیہ کے ساتھ کے لیے یہاں تک گیا تھا۔ اگلے دن ان کا رول سوج سورے روانہ ہوا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا اور باہر تاری تھی۔ انہوں نے سفیدی مائل خاک کی لباس اور دیگر چیزوں کے ذریعے خود کو محفوظ کیا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ اپنی رائفلوں کی نال پر بھی کپڑے لپیٹے ہوئے تھے تاکہ ان کی چمک لٹائیاں نہ ہو۔ سب سے آگے جوزف تھا اور باقی سب اس کے پیچھے تھے۔ وہ ایک تباہ شدہ فیکٹری میں داخل ہوئے۔ یہاں ہر طرف بڑے بڑے فولادی پائپ اور مشینری بکھری ہوئی تھی۔ تاریکی کی وجہ سے وہ آہستگی سے حرکت کر رہے تھے تاکہ آواز نہ ہو۔ بالآخر وہ فیکٹری کے مرکزی ہال میں داخل ہوئے۔

”اس جگہ سے۔“ جوزف نے اوپری ہالکونیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”درجنوں روسی سپاہی جرمن اسٹائیز کا نشانہ بن چکے ہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے، وہ یہیں ہوتے ہیں؟“

”نہیں، وہ اسی وقت آتے ہیں اور دوبارہ تاریکی ہونے کے بعد واپس چلے جاتے ہیں۔“ جوزف نے کہا۔ ”آج ہم ان سے پہلے آئے ہیں اور اب ہمیں ان کے لیے گھات لگانا ہوگی۔“

جوزف انہیں مناسب جگہوں پر لگانے لگا اور اس نے بیچے سے پہلے کہا۔ ”یاد رکھنا، اپنی حفاظت تمہاری اپنی ذمہ داری ہے۔ کوئی کسی کے لیے اپنی زندگی داؤ پر نہیں لگائے گا۔“

ایکس اور رونی کو درمیانی فلور پر ایک ایسی جگہ ملی تھی جہاں سے پائپ مختلف سمتوں میں جا رہے تھے۔ یہاں نہ صرف مناسب آڑ تھی بلکہ وہ یہاں سے چاروں طرف نظر



رونی اس میں غائب ہو گیا۔ چھ منٹ بعد نیچے سے اس کی آواز آئی۔ ”میں پہنچ گیا۔“

مگر ایکس اس دوران میں نیچے موجود جرموں کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں نیم تاریکی تھی اور جیسے کی جیسے زیادہ تھیں۔ ایکس کا اندازہ تھا کہ کم سے کم تین جرمین اور موجود تھے۔ اسے خیال آیا کہ وہ انہیں یہاں سے بہتر نشانہ بنا سکتا ہے۔ اس نے اوپر شیلف کی طرف دیکھا جس پر موجود جرمین مارا گیا تھا۔ وہاں سے ہائی جرمینوں کے مورچے بہتر نظر آ سکتے تھے۔ وہ اس طرف بڑھا۔ اس میں خطرہ تھا مگر نیچے کے مقابلے میں کم تھا۔ وہ شیلف تک پہنچا تو اس نے جرمین کو دردی کے بجائے عام لباس میں پایا۔ صرف اس کے سر پر موجود سیاہ کپڑے پر سوایکا کا مخصوص نازی نشان بنا ہوا تھا۔ گولی نے اس کا سرا ڈا دیا تھا۔ ایکس نے اس کی رائفل دیکھی جو بہت جدید قسم کی تھی اور اس پر لگی دو زمین بھی شاندار تھی۔

ایکس نے اسے دستکریل کر جگہ بنائی اور اس کی رائفل کی دو زمین سے نیچے کا جائزہ لینے لگا۔ جلد اس نے دو جرمینوں کے مورچے تازہ لپے اور ایک مورچے پر رائفل مرکوز کر لی۔ وہاں موجود جرمین وقفے وقفے سے قاتل کر رہا تھا۔ اس کا ہاتھ نظر آ رہا تھا مگر ہائی جسم آڑ میں تھا۔ ایکس نے سانس روک کر اس کے ہاتھ کا نشانہ لیا اور قاتل کیا تو اس کا ہاتھ اور رائفل کی نال غائب ہو گئی۔ ہاتھ پر زخم کیا کر وہ احتیاط بھول گیا تھا اور نیچے موجود ایکس کے کسی ساتھی نے اسے نشانہ بنایا۔ گولی کھا کر وہ کھلی جگہ پر گر گیا اور ساکت ہو گیا۔ ایکس نے احتیاط کے طور پر اس کے سر میں گولی اتار دی۔ دو ساتھی گنوانے کے بعد جرمینوں کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ پہا ہو گئے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد ایکس نیچے پہنچا تو اس کے ساتھی کریم کی لاش کے پاس افسردہ کھڑے تھے۔ جرمین اسٹائپر کی گولی نے اس کی گردن میں سوراخ کر دیا تھا۔ نالیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایکس نے اپنی ٹوپی اتاری اور جوزف سے کہا۔ ”ہمیں اس کی لاش واپس لے جانی ہوگی۔“

”بہت مشکل ہے۔“ جوزف نے کہا مگر نالیہ نے اصرار کیا۔

”ایکس ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کریم ہمارا ساتھی ہے۔ ہم اسے واپس لے کر جائیں گے۔“

انہوں نے نکلے پائیاں اور کیوس تلاش کر کے اسٹریچر بنایا اور اس پر کریم کی لاش رکھ کر روانہ ہوئے۔ راستے میں

ایکس پھنس گیا تھا۔ قاتلوں سے لگ رہا تھا کہ جرمین کئی ہیں اور وہ بہتر پوزیشنوں پر تھے۔ پتا نہیں نالیہ، جوزف اور کریم کس حال میں تھے۔ اس نے چلا کر نالیہ کو آواز دی۔ ”تم ٹھیک ہونا؟“

”ہاں۔“ نالیہ کی آواز میں لرزش تھی۔ ایکس کا دل ڈوبنے لگا، کوئی مارا گیا تھا۔ روئی بھی فکر مند تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”سنو، میں نکل کر اس سمت قاتل کروں گا اور تم پانسپ کر اس کر کے دوسری طرف جاؤ گے۔“

”اس میں خطرہ ہے۔“

”خطرہ مول لینا ہو گا۔“ روئی نے کہا۔ ”ہم پھنس گئے ہیں اور کوئی مارا بھی گیا ہے۔“

ایکس نے سر ہلایا۔ روئی نے اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کر اس طرف قاتل کیا جہاں جرمین موجود تھا اور ایکس نے اٹھ کر چلا گیا۔ لگائی اور پانسپ کے دو بری طرف جا کر۔ وہ بال بال بچا تھا کیونکہ جرمین کی چلائی ہوئی گولی اس کے پاس سے گزری تھی۔ اب وہ محفوظ اور آزاد تھا۔ قاتل کر کے روئی واپس آڑ میں چلا گیا تھا۔ اس نے اشارے سے ایکس کو جرمین کی پوزیشن بتائی۔ اس کے مطابق وہ درمیانی شیلف میں تیسری کھڑکی کے پاس تھا۔ ایکس نے آئینہ نکالا اور اسے بہت آہستہ سے آڑ سے نکال کر دیکھا۔ اس بار اسے نشانہ بھی نظر آ گیا۔ اس کی چلائی گولی نے آئینے کے گلوے کر دیے۔ ایکس نے آہستہ سے کہا۔ ”اس کی توجہ مجھ پر ہے، تم اس کی توجہ بناؤ۔“

روئی نے سر ہلایا۔ ”میں قاتل کروں گا۔ اس کی توجہ ہٹے گی تو تم اس پر قاتل کرنا۔“

ایکس تیار ہو گیا۔ روئی نے ذرا پیچھے سرک کر اچانک پانسپ کے اوپر سے اٹھتے ہوئے شیلف کی طرف قاتل کیے۔ وہ آڑ میں ہوا تھا کہ جرمین نے جوابی قاتل کیے۔ دونوں نے عجلت سے کام لیا تھا اس لیے دونوں فٹ گئے مگر ایکس نے سکون سے اس کا نشانہ لیا اور وہ گولی کھا کر شیلف پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ اب وہ اس طرف سے محفوظ تھے۔ ایکس نے روئی سے کہا۔ ”ہمیں نیچے جانا ہو گا۔“

”پانسپ نیچے جا رہے ہیں۔“ روئی نے کہا۔

”تمہیں پھنس نہ جائیں، آگے سے بلاک نہ ہوں۔“

”چانس لینا پڑے گا۔“ روئی نے پھر کہا۔ ”میں پہلے جاتا ہوں۔“

روئی پانسپ میں کھس گیا۔ یہ دوفٹ نظر کا پانسپ تھا۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



انداز میں میکس کی طرح جذبات کی جھلک نہیں تھی۔ ایکس خاموشی سے واپس آ گیا۔ جاتے وقت وہ خوش تھا مگر اب وہ اندر سے بھی چپ سا تھا۔ اس کے اندر تالیہ کے لیے جو خانہ کھلا تھا، وہ بند ہونے لگا تھا۔ اس دن انہوں نے ایک مختف سیکٹر کو چیک کرنا تھا۔ جوزف کا کہنا تھا کہ کل والے سیکٹر میں اب جرمن نہیں آئیں گے۔ یہ نیا لٹیچوں کا اصول تھا کہ ایک بار جو جگہ دشمن کی نظر میں آ جاتی تھی، وہاں دوبارہ نہیں جاتے تھے بلکہ نیا ٹھکانا تلاش کرتے تھے۔ اس لیے آج جوزف نے نیا سیکٹر چیک کرنے کا فیصلہ کیا۔ تالیہ آج نیم کا حصہ نہیں تھی۔ مگر اس سیکٹر میں انہیں جرمنوں کا سراغ نہیں ملا تھا۔ وہ واپس آئے تو تالیہ ان کی خطرناکی سے اس نے ایکس سے کہا۔

”میں تمہیں ایک سچے سے طوائی ہوں۔“  
بچہ ہیرک کے باہر راہداری میں اپنا بکس رکھے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جوتے پالش کرتا تھا۔ اس کی عمر گیارہ سال تھی مگر وہ چہرے سے ذہین اور سمجھ رکھ رہا تھا۔ تالیہ نے اس کا تعارف کرایا۔ ”یہ میٹائل کو سکوف ہے۔ اس کے پاؤں میں ہم کا گلوٹا تھا اس لیے اسپتال آیا۔ مجھے وہیں ملا تھا۔“ ایکس نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ”تم جوتے پالش کرتے ہو؟“

انہیں بہت دشواری پیش آئی مگر وہ کامیاب رہے۔ کریم کی قربانی سے قلع نظر آج انہوں نے دگنی کامیابی حاصل کی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ روسی اسٹائجر جرمن اسٹائجروں پر حاوی رہے تھے۔ اس رات انہوں نے کامیابی کا جشن منایا۔ کریم کی موت کا دکھ زیادہ دیر نہیں رہا تھا کیونکہ یہ میدان جنگ کا حصہ ہوتا ہے۔ موت اور جنگ کا چوٹی واسن کا ساتھ ہے۔ تالیہ اس جشن میں شریک نہیں تھی۔ وہ اپنی ڈیوٹی پر روانہ ہو گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد جوزف نے اچانک کہا۔ ”یہ تم پر مرتی ہے۔“

ایکس خاموش رہا، روٹی نے بھی تائیدی کی۔ ”تم سے اس کا رویہ بالکل مختف ہے۔“  
”ہارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔“ ایکس نے بچا ہوا گلاس مطلق میں اٹھیل لیا مگر جوزف نے یقین سے کہا۔  
”ہوگی..... جلد ہوگی۔“  
اگلی صبح سورج نکلنے سے پہلے ایکس اسپتال پہنچا۔ وہ تالیہ کی تلاش میں تھا، جب اس نے دیکھا کہ وہ میکس کے ساتھ ہے۔ وہ دونوں ایک طرف بیٹھے تھے۔ میکس جس طرح تالیہ سے بات کر رہا تھا، اس کے دلی جذبات دور سے بھی محسوس ہو رہے تھے۔ تالیہ ہنس رہی تھی مگر اس کے

## ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

موسم سرما کی دل فریبیاں  
فوری کے شگے کی مست فریبیاں

**ماہیا جال** ● باپ کی تلاش میں پر خار راستوں پر گامزن بیٹی کا کٹھن سفر ہوس زرکا ہولناک کھیل **امجدہ و نسیم** کا انتخاب

**آوارہ گز** ● دکھ کے شتر کبھی نہیں کی ایک زلی اور انوکھی دنیا کی جھلک... ہر ایک کو اپنی تلاش کا سماں پیش تھا۔ **ڈاکٹر عبد الباقی** کی شہوت


**جواری** ● **احمد اقبال** کے شہدادت سے ایک فوری کے کھیل کے نئے نئے انداز

**مغرب کے نالی انداز** ● مغربی دنیا کی تہذیب اور اس کی مٹاؤں کی کہانیوں کی کہانیاں

**سورق کی کہانیاں**

**پہلی کہانی** ● فیلم ہارڈ بولڈوشنا دلیوں میں قتل و خون کی پراسرار کارروائیاں

**دوسری کہانی** ● محبت اور صداقت کی جنگ میں کسی ایک کی فتح کا دل خراش فسانہ



آپ کے تجربے...  
شونے... محبتیں... کھاتیں...  
اور نئی دلچسپ باتیں... کھاتیں



اس بار تالیہ نے دوسری طرف دیکھا۔ "اس کے بارے میں، میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔"  
 ایکس گہری سانس لے کر رہ گیا۔ "میکس میرا اچھا دوست ہے۔"

"میں جانتی ہوں لیکن وہ موقع پرست بھی ہے۔ اس واقعے سے اس نے کہیں زیادہ ناکہ اٹھایا ہے۔"  
 ایکس سمجھتا تھا مگر اس نے اس بارے میں زیادہ نہیں سوچا تھا۔ میکس سحافی کی حیثیت سے فیلڈ ہیڈ کوارٹر میں ڈیوٹی دے رہا تھا اور اسے میجر کاربیک بھی مل گیا تھا جبکہ ایکس صرف لیفٹیننٹ بن کر میدان جنگ میں خطرات مول لیتا پھر رہا تھا۔ اس نے تالیہ سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم ہمارے ساتھ مت جایا کرو۔"  
 "کیوں؟"

"اس میں بہت خطرہ ہوتا ہے۔" ایکس نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔ "تم نے دیکھا، ڈرامی غلطی سے کریم جان پار گیا۔"

"ہاں لیکن اب میں اس گروپ کا حصہ ہوں۔"  
 "تم نرس ہو اس لیے اس ڈیوٹی سے بچ سکتی ہو۔"  
 "پہلے میں سوچ رہی تھی کہ اس کام سے انکار کر دوں۔" تالیہ نے اسے چمکتی آنکھوں سے دیکھا۔ "مگر اب میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔"  
 "کیوں بدل دیا ہے؟"

"میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔" تالیہ نے آہستہ سے کہا۔  
 "خطروں میں بھی؟"

"ہاں خطروں میں بھی۔" تالیہ نے اقرار کیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی اور ایکس بے اختیار اس کی طرف کھنچا چلا گیا تھا۔ پھر کوئی راہداری کی طرف آیا تو وہ جلدی سے الگ ہو گئے مگر ان چند لمحوں میں ان کے بیچ ہمیشہ کے لیے خاموش عہد و پیمان ہو گئے تھے۔ ایکس نے کہا۔  
 "اب میں پہلے سے زیادہ چاہتا ہوں کہ تم اسٹائیز کی جنگ سے دور رہو۔"

"مجھے اس کے لیے درخواست دینی ہوگی لیکن امید ہے کہ درخواست منظور ہو جائے گی کیونکہ نرسوں کی بہت کمی ہے۔"  
 "بس تم درخواست دے دو۔" ایکس نے خوش ہو کر کہا۔ "میں جزیل گریگ سے بات کر سکتا ہوں۔"  
 "اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

☆☆☆

"نہیں سر۔" میٹاکل نے احماد سے کہا۔  
 "یہ جرمنوں کے علاقے میں بھی جاتا ہے۔" تالیہ نے انکشاف کیا تو ایکس چونک گیا۔  
 "جرمنوں کے علاقے میں؟ وہ تمہیں کچھ نہیں کہتے؟"

"نہیں سر کیونکہ میں ایک بچہ ہوں اور انہیں بھی جوتے پالش کرنے والے کی ضرورت ہے۔"

میٹاکل تالیہ سے مانوس تھا اور اس وجہ سے مکمل کر بات کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ جرمن کیمپ میں عام فوجیوں کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو فوجی وردی میں نہیں ہوتے اور ان کے پاس فوجی ہتھیاروں کے بجائے صرف دوہین لگی رائفلیں ہوتی ہیں۔ ان کی تعداد نصف ورجن سے زیادہ نہیں ہے اور وہ چال ڈھال سے بھی فوجی نہیں لگتے۔ وہ صبح سویرے جاتے ہیں اور رات میں تاریکی ہونے کے بعد واپس آتے ہیں۔ ان میں ایک طویل قامت نیم گنچا شخص بھی ہے۔ اس کے ساتھی اسے کارل میکر کہتے ہیں۔ کارل میٹاکل سے اکثر جوتے پالش کراتا ہے۔ وہ اسے معاذ خنے کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں بھی دیتا ہے۔ بچہ سمجھ کر وہ اس کے سامنے ایسی باتیں بھی کر جاتا ہے جو غصہ ہوتی ہیں اور میٹاکل نے جو سنا، اس کے مطابق کارل اور اس کے ساتھی اسٹائیز ہیں اور وہ گھات لگا کر روسی فوجیوں اور عام افراد کو شوٹ کرتے ہیں۔ ایکس نے میٹاکل سے جوتے پالش کرائے اور اسے چند سکے دیے تو وہ خوش ہو کر گیا۔ تالیہ نے ایکس کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے یہ کارل ہی جرمن اسٹائیز کا سربراہ ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔" ایکس نے کہا اور پھر ہچکچا کر بولا۔ "تم میکس لائونف کو جانتی ہو؟"

تالیہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تم کیسے جانتے ہو؟"  
 "میں نے اسے اسپتال میں تمہارے ساتھ دیکھا ہے۔"  
 "وہ میرے گاؤں کا رہنے والا ہے۔" تالیہ نے بھی ہچکچا کر جواب دیا۔ "ہم ایک ہی اسکول میں پڑھے ہیں۔"  
 "اس کے علاوہ بھی کچھ...؟"

تالیہ نے اس کی طرف دیکھا۔ "میری طرف سے اور کچھ نہیں ہے۔"

ایکس نے اپنے اندر اطمینان محسوس کیا۔ ورنہ جب سے اس نے تالیہ اور میکس کو ساتھ دیکھا تھا، اندر سے ایک عجیب سی غلطی کا انکار تھا۔ "اور میکس کی طرف سے؟"



کیا۔" اس نے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے جوزف کو ٹھیک پیشانی میں گولی ماری۔ ہے۔"

"اس کے باوجود میں دیکھنا چاہوں گا۔"

وہ اوپر کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک جگہ سے الیکس نے آئینے کا ٹکڑا اٹھالیا۔ وہ اس چار منزلہ عمارت کی چھت پر آئے۔ یہاں بھی ملبا موجود تھا اور مارٹر گولوں نے چھت میں کئی جگہ سوراخ کر دیے تھے۔ الیکس نے روٹی سے کہا۔ "تم کسی سوراخ سے نیچے نچا جائزہ لو گے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ وہ فائر کرے اور تم دیکھو گے کہ وہ کہاں سے فائر کر رہا ہے؟"

روٹی نے سر ہلایا اور منڈیر کی طرف بڑھا۔ اس نے ایک سوراخ دریافت کر لیا۔ وہ نیچے دوڑ تک پھیلے بلے کو دیکھنے لگا۔ الیکس نے پہلے آئینے کی مدد سے نیچے دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ آئینے کی چمک، جرمن نشانہ کی توجہ حاصل کر لے گی۔ پھر اس نے اپنا ہیلمٹ اتار کر اسے رائفل کی نال سے اوپر کیا تو فوراً گولی آ کر اس پر لگی۔ روٹی نے سر ہلایا۔ "میں نے دیکھ لیا ہے، اب ہر آؤ۔"

"کہاں ہے؟" الیکس اس کے پاس پہنچ گیا۔

"پٹریوں کے درمیان دیکھو جگہ جگہ چھوٹے کمرے ہیں، ان پر ملبا گرا ہوا ہے۔ فائر وہیں سے ہوا ہے۔"

"کس طرف سے؟"

"بالکل درمیان میں کسی جگہ سے میں نے دھواں اٹھتے دیکھا تھا۔"

فاصلہ چھ سو میٹر سے زیادہ تھا اور جرمن کا نشانہ بالکل درست لگا تھا۔ الیکس کا دل رواں دینے لگا کہ یہ وہی شخص کارل ہے۔ میخائل نے اس کے بارے میں جو بتایا تھا، اس سے لگ رہا تھا کہ وہ ماہر نشانہ چی ہے اور اسے کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس شام وہ کیپ میں اپنی بیرک میں موجود تھے۔ تالیہ کا چہرہ ستا ہوا تھا کیونکہ جوزف اس کا پاس ہی نہیں، اس کا استاد بھی تھا۔ ای نے تالیہ کو نشانے بازی کی تربیت دی تھی۔ اس نے تالیہ کی خوب صورتی سے کبھی نا جائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ اس سے شفقانہ انداز میں پیش آتا تھا۔ اپنی نیم کے لیے وہ ہاپ جیسا تھا اس لیے سب اس کا دکھ اب تک محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے۔۔۔

بیولی سے کھانا کھایا اور اب بیڑے سے غم غلط کر رہے تھے۔ تالیہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "میں بھی کل چلوں گی۔"

"نہیں۔" الیکس نے بے ساختہ کہا۔ "کارل بہت خطرناک شخص ثابت ہو رہا ہے۔"

الیکس، جوزف اور روٹی عمارتوں کے بلے کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ الیکس نے میخائل سے حاصل شدہ معلومات سے جوزف کو آگاہ کیا تو اس نے انکشاف کیا کہ اس نے بھی کارل کے بارے میں سنا ہوا ہے۔ جاسوسوں کے مطابق خود جرمن بھی کارل کو بہت پر اسرار سمجھتے ہیں۔ وہ کسی سے کھلنے پلنے والا آدمی نہیں ہے۔ اس کے بارے میں واحد کہانی یہ ہے کہ روسی محاذ پر اپنے اکلوتے بیٹے کی ہلاکت کے بعد وہ بہ طور اسٹائپر اس جنگ میں شامل ہوا تھا اور اس کی واحد ساتھی اس کی رائفل ہے۔ وہ کھلی جگہوں سے گریز کر رہے تھے کیونکہ یہاں اسٹائپر کی موجودگی کا بہت زیادہ امکان تھا۔ ایک جگہ بم نے عمارت کا سامنے والا حصہ اڑا دیا تھا۔ وہ اس کے دوسرے فلور سے گزر رہے تھے کہ راستے میں یہ پھٹا ہوا حصہ آ گیا اور عمارت کھلی تھی۔ فرش کا ٹوٹا حصہ تقریباً آٹھ فٹ تھا اور اسے چھلانگ لگا کر اس کو جاسکتا تھا۔ سب سے پہلے الیکس گیا اور آرام سے دوسری طرف پہنچ گیا۔ پھر روٹی گیا اور آخر میں جوزف نے چھلانگ لگانی مگر ابھی وہ ہوا میں تھا کہ اس کے جسم کو جھٹکا لگا اور وہ دوسری طرف آنے کے بجائے نیچے گر گیا۔ روٹی تیزی سے آگے آیا تھا مگر الیکس نے اسے پیچھے کھینچ لیا۔

"بیکار ہے، اس کی پیشانی پر گولی لگی ہے۔"

انہوں نے احتیاط سے نیچے جھانکا تو جوزف کی لاش بلے کے ڈھیر پر پڑی تھی۔ وہ مر چکا تھا۔ جرمن نشانہ چی کا نشانہ کمال کا تھا کہ گولی پیشانی کے عین وسط میں لگی تھی۔ سامنے دوڑ تک گوام اور ریل لائن کی پٹریاں تھیں جن پر کہیں کہیں ناکارہ بوکیاں اور مال بردار ڈبے کھڑے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ بلے کے ڈھیر تھے اور جرمن نشانہ چی ان میں سے کہیں بھی ہو سکتا تھا۔ جرمنوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ روسی بھی جوانی کھردرائی پر اتر آئے تھے اور اب اس علاقے پر قبضے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ یہاں سے جرمنوں کو نشانہ بنا سکیں۔ جرمن روسی نشانے بازوں کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ الیکس سوچ رہا تھا کہ ان کا نصف دستہ ویسے ہی ختم ہو گیا ہے۔ دو مارے گئے تھے اور تالیہ کو اس نے خود پیچھے رہنے کو کہا تھا۔ اس نے روٹی سے کہا۔

"میں اوپر جانا ہوں گا۔ میں ایک نظر اس علاقے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"یہ بہت خطرناک ہوگا۔ تم نے اس کا نشانہ دیکھا نہیں ہے۔" روٹی نے نیچے پڑے جوزف کی طرف اشارہ



”تمہیں یقین ہے کہ وہ کارل ہی ہے؟“ نتالیہ نے حیرت سے پوچھا۔

ایسا صرف ایک صورت میں ہو سکتا تھا جب اسے پہلے سے اطلاع ہو۔ ہیرک کا دروازہ کھلا تو وہ سمجھے کہ روٹی ہو گا مگر آنے والا میکس تھا۔ وہ تنکا ہوا لگ رہا تھا۔ رسی علیک سلیک کے بعد ایکس نے اسے حیرت پیش کی اور پوچھا۔ ”کہاں سے آرہے ہو؟“

”میری چھٹی حس کہہ رہی ہے۔“

”ناسکو سے۔“ اس نے کہا۔ ”وہاں اعتریشیل پریس کے لیے ایک بریفنگ تھی۔ مجھے یہ کام سونپا گیا تھا اسے نمٹا کر آرہا ہوں۔ یہاں کیا چل رہا ہے؟“

”میدان جنگ میں چھٹی حس نہیں، گن چلتی ہے۔“

میکس نے عام سے انداز میں پوچھا تھا مگر ایکس اور نتالیہ دونوں جھینپ گئے۔ ایکس نے جلدی سے کہا۔ ”کچھ نہیں۔“

”میں پیشہ درسا ہی نہیں ہوں۔“ ایکس نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ ”میں چھٹی حس پر انحصار کرتا ہوں۔“

نتالیہ باہر نکل گئی تھی، میکس نے حیرت سے کہا۔ ”اسے کیا ہوا ہے؟“

روٹی کا موڈ خراب تھا۔ اس نے ہیرک کی نئی یوٹیل اٹھائی اور کمرے سے نکل گیا۔ ایکس نے نتالیہ کی طرف دیکھا۔ ”کارل کو کیسے پتا چلا کہ ہم اس سیکٹر میں آگئے؟“

نتالیہ نے بھی سگریٹ ساگایا۔ ”پتا نہیں۔ ویسے نتالیہ بتا رہی تھی کہ تم اسی کے گاؤں سے تعلق رکھتے ہو؟“

نتالیہ پھر حیران ہوئی۔ ”اسے کیسے پتا چل سکتا ہے؟“

میکس نے عام سے انداز میں پوچھا تھا مگر ایکس اور نتالیہ دونوں جھینپ گئے۔ ایکس نے جلدی سے کہا۔ ”کچھ نہیں۔“

”وہ باقاعدہ مورچا بنا کر اس ویران جگہ پر ہمارا غنچر تھا اور وہاں مورچا بنانے کا کوئی جواز نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہمارا خاتمہ کرے۔ ہماری نصف نظری وہ ختم کر چکا ہے۔“

نتالیہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی، اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

”ابیس! کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میں نے.....“

میکس نے بھی سگریٹ نکال لیا۔ ”ہاں، ہم نوجوانی تک ساتھ رہے پھر میں یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے ناسکو چلا گیا۔“

”اسمٹانہ باتیں مت کرو۔“ ایکس نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

ایکس سوچ رہا تھا کہ کیا نوجوانی میں ان میں پسند کا رشتہ رہا تھا مگر نتالیہ نے اسے کسی تعلق کی تردید کی تھی۔ وہ چونکا، میکس اس سے گروپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور جب اس نے جوزف کی موت کا بتایا تو اسے دمچکا لگا۔

”جب تمہارے کہنے کا مقصد کیا ہے؟“ نتالیہ نے جذباتی لہجے میں کہا اور اٹھ کر باہر جانے لگی تھی کہ ایکس نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روکا اور پھر اپنی طرف مچھلی لیا۔ نتالیہ مزاحمت نہیں کر سکی یا پھر وہ مزاحمت کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ جب جذبات کا طوفان تھا تو دونوں پر سکون تھے۔ نتالیہ اپنا حلیہ درست کرنے لگی۔ اس بار اس نے جذباتی ہوئے بغیر پوچھا۔ ”کیا تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟“

”جوزف مارا گیا؟“

”نہیں لیکن مجھے لگا کہ یہ بات کسی طرح جرموں تک پہنچی ہے۔“

”آج ہی کی بات ہے۔ جرم نٹانچی نے اسے ماتھے پر گولی ماری۔“

”لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ اس کا ذریعہ میں نہیں ہوں۔ میں نے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔“

”تم لوگ اس کا جھنجھٹا بگاڑ سکتے؟“ میکس کے انداز میں سوال سے زیادہ اصرار تھا۔

”میکائل.....“

”اب تم اور روٹی رو گئے ہو۔“

”وہ صرف ایک معصوم بچہ ہے۔“ نتالیہ بولی۔



میکس کا چہرہ مست کیا اور پھر وہ خاموشی سے بصرک سے نکل گیا۔ اس کے جانے سے بعد ایکس نے انہوں سے کہا۔ ”تم نے اچھا نہیں کیا۔“

تالیہ بھی شرمندہ تھی۔ ”سو اب میرے منہ سے نکل گیا۔“ اگلے دن ایکس اور رونی روانگی کی تیاری کر رہے تھے کہ میکس آ گیا۔ اس نے ورنی پہنی ہوئی تھی اور اس کے شانے پر اسٹینڈر رائفل تھی۔ ایکس نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ”میں سوچ رہا تھا کہ تم آؤ گے یا نہیں۔“

میکس نے کہا۔ ”آج کہاں جانا ہے؟“

”اس سیکٹر میں۔“ ایکس نے نقشے پر واضح کیا۔ ”کل بھی ہم یہیں گئے تھے۔“

”جرمن یہاں موجود ہیں۔“

”ہاں۔“

”کیا ہم فضائیہ کی مدد حاصل نہیں کر سکتے؟“

ایکس نے اسے دیکھا۔ ”یہ آدمی کا آدمی سے اور گولی کا گولی سے مقابلہ ہے۔ جرمن نے بھی اپنی فضائیہ کو نہیں بلایا ہے۔“

”مگر وہ ہمارے دو ساتھی موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔“

”ہم نے بھی حساب برابر رکھا ہے۔“ ایکس نے کہا تو میکس نے بے دلی سے سر ہلایا۔ وہ ایکس کی حکمت عملی سے متعلق نہیں تھا مگر اس نے پکار فضائیہ کی مدد لینے پر اصرار نہیں کیا۔ وہ روانہ ہو رہے تھے کہ تالیہ بھی آگئی۔ وہ ورنی میں اور رائفل کے ساتھ تھی۔ ایکس نے کہا۔

”ٹلے ہوا تھا کہ تم نہیں جاؤ گی۔“

”آج میں جاؤں گی۔“

وہ روانہ ہوئے۔ وہ آئی سیکٹر کی طرف جا رہے تھے مگر اب راستہ دوسرا تھا۔ وہ ان ٹارگوں سے دور تھے جہاں سے گزشتہ روز گزرے تھے۔ اب وہ ریل کی پٹریوں اور ان پر کھڑے ڈبوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ ایکس نے تالیہ سے کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ رہے اور جب تک وہ راستہ کلیئر نہ کر دے، وہ آگے نہیں بڑھے گی۔ تالیہ نے کہا۔ ”تم میرے لیے فکر مند ہو؟“

”کیا نہیں ہونا چاہیے؟“ ایکس نے آہستہ سے کہا تو تالیہ مسکرانے لگی۔ ”کچھ دور سوؤ، دو میکس ان کی گفتگو میں سن پا رہا تھا مگر اس کی آنکھیں ان پر مرکوز تھیں۔ جیسے جیسے وہ اس جگہ کے قریب ہوتے جا رہے تھے جہاں سے جوزف پر قاتر ہوا تھا وہ پہلے سے زیادہ محتاط اور بے تھے۔ ریل کے لائنوں کے درمیان جگہ جگہ ملتا تھا، پہلے یہاں چھوٹے چھوٹے

”ابھی نہیں، پہلے ہمیں کوشش کر لینے دو۔“ ایکس نے کہا۔ ”مجھے خطرہ ہے کہ کہیں جنرل گروپ ہی ختم کر دے۔ محاذ کی صورت حال بدل رہی ہے۔ اب جرمنوں پر ہمارا دباؤ بڑھ رہا ہے اور آنے والا وقت ان کے لیے سخت ہوگا۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں اس جرمن سے کریم اور جوزف کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ میکس نے کہا۔

”کیا میری مدد کی ضرورت ہے؟ دو تین دن تک میں فارغ ہوں کیونکہ ابھی میں نے لیڈ بیڈ کو از سر پورٹ نہیں کی ہے۔“

”تم جاہلو تو کل ہمارے ساتھ چل سکتے ہو۔“

تالیہ کے ساتھ میخائل اندر آیا۔ وہ میکس کو دیکھ کر ششکا اور اس کی آنکھوں میں خوف نظر آنے لگا۔ تالیہ نے اسے تسلی دی۔ ”یہ ہمارا ساتھی ہے۔“

ایکس نے میخائل سے ہاتھ ملایا۔ ”کیسے ہو نئے دوست؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ میخائل بولا۔ ”میں کچھ بتانے آیا ہوں۔“

”کوئی خاص اطلاع ہے؟“

میخائل نے سر ہلایا۔ ”کارل کل سے جرمن کیمپ میں نہیں آیا ہے۔“

”کل سے؟“ ایکس چونکا۔ ”تمہیں یقین ہے؟.....“

میرا مطلب ہے کہ وہ آیا ہوا اور تمہیں بتانہ ہو؟“

”نہیں، میں رات بارہ بجے تک وہاں رہا تھا۔ پھر آج صبح چھ بجے پہنچا، کارل نہیں تھا۔ میں نے اس کے جاننے والوں سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ رات نہیں آیا۔“

ایکس نے اسے چند سکے دیے تو وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میکس نے کہا۔ ”جس طرح یہ پیسے کے عوض تمہیں اطلاعات دے رہا ہے، کیا اس طرح جرمنوں کو نہیں دے سکتا ہے؟“

”میخائل ایسا لڑکا نہیں ہے۔“ تالیہ نے انکار کیا۔ ”میں اسے جانتی ہوں۔“

”جنگ کے دوران کسی پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔“

میکس نے اصرار کیا۔ تالیہ کو غصہ آ گیا۔

”ہاں، جنگ میں دوست بھی پشت میں چھرا گھونپ دیتے ہیں۔“



وہ پڑیوں پر جھکا ہوا تیز قدموں سے اس طرف بڑھ گیا۔ ایکس کی نظریں اس سمت گمراہ تھیں اور وہ کوئی حرکت دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اسے حرکت نظر آگئی۔ دو بوگیوں کے درمیان والی جگہ پر ایک شخص اس طرح دیکھا ہوا تھا کہ صرف اس کا ہیٹ دکھ کی دے رہا تھا اور اس نے رائفل کا رخ ایکس کی طرف کیا ہوا تھا۔ وہ بردقت نیچے ہوا تھا اور گولی آکر ٹن سے بوگی کے ڈھکن پر لگی۔ تیزی کی وجہ سے ایکس اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور گول بوگی سے لڑھکتا ہوا نیچے برف کے ڈھیر پر آگرا۔ اس نے اٹھتے ہوئے چیخ کر روٹی کو آواز دی۔ ”روٹی! واپس آ جاؤ۔“

مگر اسی لمحے دوسرا قاز ہوا اور ایک چیخ سنائی دی۔ تالیہ بھاگی مگر ایکس نے سمجھت کر اسے پکڑ لیا۔ ”کیا تم بھی مرنا چاہتی ہو؟“

”روٹی۔“ وہ روہانہ لہجے میں بولی۔

”میکس! تم اس طرف سے جاؤ اور بہت ہوشیار رہنا۔“ ایکس نے کہا اور تالیہ کو ساتھ لے کر بوگیوں کی آڑ میں اس طرف بڑھا مگر جب وہ چند منٹ بعد وہاں پہنچے جہاں ایکس نے جرمن کو دیکھا تھا تو اس کے پاس ہی روٹی کی لاش پڑی تھی اور جرمن غائب تھا۔ وہ ایک بار پھر کامیاب رہا تھا۔ اس کی گولی روٹی کے دل میں اتر گئی تھی۔ اس شام جب وہ بیوک میں موجود تھے تو میکس نے ایکس سے کہا۔

”اب کوئی باقی نہیں رہا ہے۔ میرا خیال ہے تم اب اپنی خدمات دوبارہ اپنی رہنمائی کو دے دو۔“

”نہیں۔“ ایکس نے اس شام پہلا جملہ کہا۔ ”جب تک میں اسے مار نہیں دیتا، میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“

”تم اکیلے ہو۔“ تالیہ نے بھی کہا، وہ میکس سے متفق لگ رہی تھی۔

”وہ بھی اکیلا ہے اب جنگ اس کے اور میرے درمیان ہوگی۔“ ایکس نے دانت چسپ کر کہا۔

میکس نے اسے دیکھا۔ ”دوست! تم خود کو خراج کر رہے ہو۔ جرمن جلد یہاں سے جانے والے ہیں۔ یورپ میں ان کی حالت خراب ہے اور جلد روس کی تازہ دم فوج نئے ہتھیاروں سے حملہ کرنے والی ہے۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ آنے والے موسم ہر ماہ میں ہماری جنگ روی سرحدوں سے باہر ہوگی۔“

”ابھی اس میں بہت وقت ہے اور مجھے امید ہے کہ مجھے اتنا وقت ملے گا کہ میں کارل کو ٹھکانے لگا سکوں یا پھر وہ

کمرے سے جن میں ریلوے کا اسٹاف ٹھہرتا یا کام کرتا تھا مگر بمباری نے ان میں سے بیشتر کو تباہ کر دیا تھا۔ ایکس بلبے کے ایک ایسے ہی ڈھیر سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ بہنے والے خلا میں غائب ہو گیا۔ تالیہ نے چیخ ماری۔

”ایکس۔“ وہ خلا میں جھک گئی تھی۔ ”تم ٹھیک ہونا؟“

میکس اور روٹی بھی تیزی سے آئے تھے۔ انہوں نے جھانک کر دیکھا تو ایکس تقریباً دس فٹ نیچے فرش پر پڑا دکھائی دیا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ”میں ٹھیک ہوں، تم لوگ ہوشیار رہو۔“

بالآخر وہ کھڑا ہوا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس کی چھت بمباری کا نشانہ بنی تھی۔ پھر اس پر بلبا آن پڑا تھا اور وہ اسی بلبے سے گزر رہا تھا کہ اس کے بوجھ سے ٹین کی شیٹ نیچے گر گئی تھی۔ وہ کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس میں دیواروں میں کئی سوراخ تھے۔ فرش پر بلبے کا ڈھیر تھا۔ اس نے سوراخوں سے باہر کا جائزہ لیا تو اسے کرا موہچے کے لحاظ سے ٹھیک لگا۔ یہاں سے وہ سارا علاقہ دکھائی دے رہا تھا جہاں جرمن نشانچہ کے موجود ہونے کا امکان تھا۔ اس نے باہر نکل کر اپنا خیال پیش کیا تو سب سے پہلے تالیہ نے جانفت کی۔ ”یہ بہت رگلی ہے۔ یہاں حفاظت کے لیے کچھ نہیں ہے اور اکیلا آدمی بہت آسانی سے نشانہ بن جائے گا۔“

”میں نے صرف خیال پیش کیا ہے۔“ ایکس نے کہا اور وہ آگے روانہ ہو گئے۔ اچانک روٹی نے انہیں روکنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب نیچے بوک گئے۔ ایکس زمین سے لگ کر روٹی تک گیا۔ اس نے کہا۔ ”وہاں اس طرف میں نے کسی کی جھلک دیکھی ہے۔“

اس طرف متواتر پڑیوں پر بے شمار ڈبے الگ الگ کھڑے تھے۔ ایکس نے کہا۔ ”اس طرف چھپنے کی بے شمار جگہیں ہیں۔ میرا خیال ہے وہاں جانا خطرناک ہوگا۔“

”میں ایک بار چیک کرتا ہوں۔“ روٹی نے اصرار کیا۔ ”تم مجھے کور دو۔“

ایکس نے آس پاس دیکھا اور پھر ایک آئل بوگی کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں اس پر چڑھ کر دیکھتا ہوں، اگر مجھے مناسب لگا تو میں تمہیں اشارہ کروں گا ورنہ تم واپس جاؤ گے۔“

روٹی رضامند ہو گیا۔ ایکس بوگی پر چڑھا اور اس کے ڈھکن کے ساتھ ابھری گول جگہ پر مورچا بیٹایا۔ اس نے رائفل رکھ لی تھی۔ مگر یہ جگہ زیادہ محفوظ نہیں تھی۔ اسے دور سے دیکھا جاسکتا تھا۔ اس نے مڑ کر روٹی کا اشارہ کیا اور



## کیا آپ کو معلوم ہے؟

☆ ایک منٹ میں انسان کا دل تقریباً چھ سیر خون رکوں میں بھیج دیتا ہے۔

☆ ایک منٹ میں خون جسم کے کونے کونے سے چکر لگا کر دل میں واپس آ جاتا ہے۔

☆ کہتے ہیں ایک منٹ میں دنیا میں ایک ہزار کعبہ نٹ بارش ہوتی ہے۔

☆ زمین اپنے محور کے گرد ایک منٹ میں 950 میل چکر لگاتی ہے۔

☆ ایک منٹ میں سمندر 35 ہزار ٹن میٹھا پانی دریاؤں سے حاصل کرتے ہیں۔

☆ انتخاب۔ انم کمال، کراچی

## ذہین امیدوار

☆ ایک فرم کا مالک، ملازمت کے امیدوار سے۔  
”تمہیں یقین ہے کہ تم یہ کاروبار چلا لو گے؟“

☆ امیدوار۔ ”کیوں نہیں جناب۔ میں نے کافی رش میں سائیکل چلائی ہے۔“

☆ سرسید۔ کشور کمال، کراچی

## اقوال زریں

☆ غلوک میں جب تک ذہن کا نظام نہیں چلایا جائے  
گودیا میں امن نہ ہوگا۔ (قول سید عطاء اللہ شاہ بخاری)

☆ انتخاب۔ ڈاکٹر شہیر احمد، ہائی سیکورٹی  
نیوسینٹرل جنرل ملتان

کئی تھی آگے تھے اور ان کی دیکھ بھال میں اسے ایک لمحہ بھی آرام کا نہیں ملا۔ وہ ناشا کر کے کافی پی رہے تھے کہ نتالیہ کے ایک ساتھی نے میسر میں جھانکا اور بلند آواز سے بولا۔ ”نتالیہ! میٹائل کا پتا چلا؟“

نتالیہ کھڑی ہو گئی۔ ”کیا..... کیا ہوا؟“

”وہ صنعتی علاقے کے ریل پارڈ میں ملا ہے۔“ ساتھی نے اگرچہ واضح نہیں کہا تھا مگر نتالیہ اور ایلکس سمجھ گئے تھے۔ وہ بھاگتے ہوئے وہاں پہنچے جہاں میٹائل کی لاش سنگل کے کعبے سے لٹک رہی تھی اور دور دوری فوجی اسے اتار رہے تھے۔ نتالیہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ میٹائل کی لاش اتری تو اس نے اسے گود میں لے لیا۔ میٹائل کا بچہ سیاہ ہو گیا تھا مگر اس کی مصیبت برقرار تھی۔ اس کی داگیں بندھی ہوئی تھیں۔ ایلکس نے زور لگا کر اسے کھولا تو اس میں ایک مسکے دیا ہوا تھا اور یہ جرمی کا مسکہ تھا۔ نتالیہ نے مسکہ دیکھا تو بے قابو ہو کر چلانے لگی

کا میاب رہے۔“ ایلکس کے لہجے میں زہر آ گیا تھا۔  
”تم کل جاؤ گے؟“ نتالیہ نے پوچھا۔  
”ہاں لیکن میں اکیلا جاؤں گا۔“  
”پلیز۔۔۔۔“

”میں جانے سے پہلے تم سے ملنے آؤں گا۔“ ایلکس نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”ممکن ہے اس کے بعد میں کئی دن واپس نہ آؤں یا شاید کبھی واپس نہ آؤں۔“

”ایسا مت کہو۔“ نتالیہ نے تڑپ کر کہا تو میکس نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ایسی نظروں سے اس نے اس وقت بھی نتالیہ کو دیکھا جب وہ ایلکس کے گرنے کے بعد مضطرب ہو گئی تھی۔ پھر وہ کھڑی ہو گئی۔ ”میں جا رہی ہوں، صبح تمہارا انتظار کروں گی۔“

نتالیہ کے جانے کے بعد میکس بھی کھڑا ہو گیا۔ ”میں چلتا ہوں۔ شاید آج مجھے فیڈ ہیز کوارٹر رپورٹ کرنا پڑے۔“

”یعنی کل تم نہیں آؤ گے؟“  
”مشکل ہے، اب میں اس معاملے میں شامل نہیں ہو سکتا۔“ میکس نے صاف گوئی سے کہا۔ ”عملی طور پر اسٹائپر گروپ ختم ہو چکا ہے۔“

”جب تک ایک بھی اسٹائپر ہے، گروپ ختم نہیں ہو سکتا۔“ ایلکس نے سخت لہجے میں کہا تو میکس نے اسے ہمدردی سے دیکھا۔

”میں تمہارے احساسات سمجھ رہا ہوں دوست لیکن میں نے حقیقت بیان کی ہے۔ جلد تمہیں رپورٹ کرنا پڑے گی اور تمہیں ہیڈ کوارٹر بلوایا جائے گا۔“

”میں نے کہا تھا کہ کل میں جاؤں گا تو میری واپسی کا میابی سے مشروط ہوگی۔“ ایلکس نے اپنی رائفل اٹھاتے ہوئے کہا۔ میکس کے جانے کے بعد وہ لیٹ گیا اور پھر..... بے خبر سو گیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو صبح ہو رہی تھی۔ وہ تیار ہو کر اسپتال آیا جہاں نتالیہ رات کی ڈیوٹی کے بعد تھکی ہوئی اس کی منتظر تھی۔ اس نے اٹھا کی۔

”ایلکس میری بات مان لو۔ کارل بہت خطرناک شوٹر ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ ایلکس نے آہستہ سے کہا۔ ”لیکن میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔“

”تم نے ناشا کیا؟“

ایلکس نے انکار کیا تو نتالیہ اسے لے کر میس میں آئی۔ وہ ناشا کرنے لگے۔ نتالیہ نے بتایا کہ رات اچانک



تاریکی چھاتے ہی وہ حرکت میں آیا اور ٹخن کی چادر سرکار کمرے سے نکل آیا۔ اس نے بہت احتیاط سے کام لیا تھا کہ کوئی آواز نہ ہو جس سے جرمن اس کی موجودگی سے واقف ہو جائے۔ فارغ ہو کر اس نے پہلے جانے کا سوچا مگر پھر اسے احتیاط کے خلاف سمجھتے ہوئے واپس آ گیا۔ ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ چند لمحوں کے لیے ہی کسی مگر تالیپہ سے مل آئے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کل زندہ رہے گا یا نہیں۔ مرنے سے پہلے وہ ایک پارٹیا کو دیکھنا چاہتا تھا۔ سرد آہ بھر کر وہ کمرے میں آیا اور ٹخن کی چادر برابر کر لی۔ اب اسے اگلے چوبیس گھنٹے تک رہنا تھا۔

جس وقت ایکس واپس آیا، عین اسی لمحے تقریباً تین سو گز کی دوری پر ایسے ہی ایک کمرے سے کارل نکلا تھا۔ اس نے باہر آ کر اپنا نام کھولا اور خاموشی سے ایک طرف بڑھ گیا۔ اس کی واپسی ایک گھنٹے بعد ہوئی تھی اور وہ پھر اسی جگہ روپوش ہو گیا۔ جس طرح ایکس اس سے بے خبر تھا، اسی طرح کارل کو علم نہیں تھا کہ ایکس کا ٹھکانا کہاں ہے مگر وہ دونوں جانتے تھے کہ وہ اسی جگہ ہیں۔ اب دونوں صبح کے انتظار میں سو رہے تھے۔ درحقیقت وہ سو نہیں رہے تھے بلکہ آرام کر رہے تھے، اور ان کے ذہن نیند کی حالت میں بھی چوکنا تھے۔ صبح ہوتے ہی ایکس چوکنا ہو گیا۔ سورج اس کی پناہ گاہ کے عقب میں دائیں طرف سے نمودار ہو رہا تھا اور جب وہ کسی قدر بلندی پر آتا تو سامنے والا حصہ پوری طرح روشنی میں آ جاتا۔ اس وقت ایکس وہاں پڑی سوئی بھی دیکھ سکتا تھا۔

مگر اس کا حریف، جو پ کی شعاعیں عین سامنے سے آنے کی وجہ سے اچھی طرح دیکھنے سے قاصر ہوتا اور اسی وقت ایکس سوراخوں سے باہر جھانک کر اس کی پوزیشن کا اندازہ کر سکتا تھا۔ اس نے سوراخوں کے پتھر نکال دیے اور دور بین سے سامنے کا جائزہ لینے لگا۔ اسے ایک جگہ شبہ تھا کیونکہ وہاں ملتا کچھ اس طرح پڑا تھا جیسے اسے خاص طور سے یہاں لاکر ڈالا گیا ہو۔ یہ فطری انداز میں نہیں پڑا تھا۔ اس بلبے میں جا بھ جا رہے تھے۔ ان کے درمیان سے کسی رائفل کو بہ آسانی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ سورج اوپر آیا تو ایکس نے اضافی سوراخ پتھر لگا کر بند کر دیے تھے۔ اب صرف دو سوراخ کھلے تھے اور ایکس ان کے سامنے آنے سے بھی گریز کر رہا تھا کیونکہ دھوپ اس طرف آگئی تھی اور اگر کوئی دور بین سے دیکھ رہا تھا تو اسے اندر حرکت نظر آ جاتی۔ وقت گزرتا رہا۔ تین بجے ایکس کو پاس ہی آئیں

”یہاں کا کام ہے، میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔“  
تالیپہ نے بھاگنے کی کوشش کی تو ایکس نے اسے جکڑ لیا۔ وہ اسے تکی دے رہا تھا اور ٹخن دلا رہا تھا کہ وہ کارل سے اس نا حق نکل کا بدلہ لے کر رہے گا۔ رفتہ رفتہ تالیپہ کا جوش تمسنے لگا۔ اس نے ایکس کی طرف دیکھا۔ ”تم سچ میں اسے مار سکو گے؟“

”میں نہیں جانتا لیکن اگر میں واپس آیا تو کارل زندہ نہیں ہوگا۔“

”تب جاؤ، میں تمہارا انتظار کروں گی۔“ تالیپہ نے اپنے آنسو صاف کیے۔ ایکس نے اسے پیار کیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ تالیپہ میٹائل کی لاش اٹھوا کر اسپتال تک لائی جہاں اسے دیگر لاشوں کے ہمراہ تدفین کے لیے بھیج دیا گیا۔ دوپہر کے وقت نزدیکی محاذ پر دشمنوں کی دیکھ بھال اور مرہم پنی کے لیے اسپتال سے نرسوں اور ڈاکٹروں کو طلب کیا گیا تھا۔ تالیپہ کو سوتے سے اٹھا کر روانہ کیا گیا۔ ابھی وہ محاذ پر دشمنوں کو دیکھ رہی تھی کہ جرمن طیاروں نے حملہ کر دیا اور ان کے گرائے بیوں نے فیلڈ میڈیکل کیپ میں تباہی پھیلا دی۔

☆☆☆

ایکس کو اس جگہ چوبیس گھنٹے ہو گئے تھے۔ وہ ہماری کیمپ میں لپٹا ہوا تھا اور اس کے باوجود سردی اس کی رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی۔ وہ آتے ہوئے اپنے ساتھ راشن اور پانی لے آیا تھا۔ رات کی تاریکی میں اس نے خاموشی سے کمرے میں اتر کر اس کی چھت پر ٹخن کی چادر رکھ لی تھی اور جب صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو اس نے کمرے میں اضافی سوراخ پتھر لگا کر بند کیے اور صرف دو سوراخ چھوڑ دیے تھے جن سے وہ باہر کا جائزہ لے سکتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کٹڑی کا ایک ٹکڑا ساتھ لایا تھا جسے اس نے تراش کر اور رنگ کر کے ایسی صورت دے دی تھی جیسے کسی انسان کی آنکھ اور چہرے کا حصہ ہو۔ جب اسے باہر دیکھنا ہوتا تو وہ پہلے اسے سوراخ کے آگے کرتا اور جب اسے اطمینان ہو جاتا کہ جرمن نے اس کی پناہ گاہ کو نہیں تاڑا ہے تب وہ باہر دیکھتا تھا۔ اب تک اسے جرمن کا سراخ نہیں ملا تھا مگر اسے یقین تھا کہ جرمن اپنی جگہ موجود ہے۔

دن میں ایکس کم سے کم پانی اور کھانا استعمال کر رہا تھا تاکہ حاجت کا مسئلہ نہ ہو۔ وہ رات سے پہلے اس جگہ سے لگتا نہیں چاہتا تھا۔ دن میں یہاں معمولی سی حرکت بھی نظروں میں آ جاتی۔ شام تک اسے حاجت محسوس ہونے لگی تھی اور رات تک کا وقت اس نے بہت مشکل سے گزارا۔



ایکس نے پھر اس کی بات سمجھنے کی کوشش کی۔ "تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"  
 "اگر میں اس سوراخ کے سامنے جاؤں تو؟"  
 "جرمن تمہارے سر میں سوراخ کر دے گا۔" ایکس نے پہلو بدلا۔ "میں نے نکالیہ کا پوچھا ہے؟"  
 ایکس نے گہری سانس لی۔ "وہ ایک لیڈ کمپ میں تھی جب جرمن طیاروں نے وہاں بمباری کی۔"  
 ایکس نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور وحشت زدہ لہجے میں بولا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"وہاں موجود سب افراد مارے گئے۔" ایکس پھر رونے لگا۔ "نکالیہ بھی ماری گئی۔ میں نے اسپتال میں اس کی لاش دیکھی ہے۔"  
 ایکس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے خود کو کہتے سنا۔ "تم مجھے یہ بتانے آئے ہو؟"  
 "نہیں۔" ایکس نے آنسو صاف کیے۔ "میں ایک اور مقصد لے کر آیا ہوں۔"  
 "مجھے قتل کرنے کا۔" ایکس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "ایک بار پھر تمہاری ہمت جواب دے گئی۔"

"نہیں، اس کام سے۔" ایکس نے کہا اور اچانک آگے بڑھ کر سوراخ سے آنکھ لگا دی۔ اس سے پہلے کہ ایکس اسے روکتا پادا میں کھینچتا، گولی کی آواز آئی اور ایکس پلٹ کر پیچھے گرا۔ گولی ٹھیک اس کی آنکھ میں لگی تھی اور وہ فوراً مر گیا تھا۔ ایکس کو کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ وہ رو رہا تھا۔ ایکس اس کا دوست تھا مگر وہ اس کا دشمن تھا۔ وہ اس سے نفرت کرتا تھا اور اس کے لیے رو رہا تھا۔ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ ایکس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اس نے آنکھیں صاف کیں اور دوسرے سوراخ سے باہر جھانکا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ جرمن اسی جگہ سے برآمد ہوا تھا۔ وہ طویل قامت تھا اور اس نے سر پر کپ ہیکن رکھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ایکس حرکت میں آ گیا اور ایک منٹ بعد وہ پٹیوں پر جرمن کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس کے نزدیک پہنچ کر ایکس نے رائفل تانی اور بولٹ چڑھایا تو جرمن آواز سن کر سناکت رہ گیا۔ پھر وہ کیپ اتارتے ہوئے ایکس کی طرف گھوما تھا کہ اس نے فائر کر دیا۔ گولی ٹھیک جرمن کی پیشانی پر لگی۔ وہ پلٹ کر گرا اور سناکت ہو گیا۔ ایکس نے گہری سانس لے کر رائفل نیچے کر لی۔ مقابلہ ختم ہو گیا تھا اور وہ قانع تھا مگر ایسا قانع جو اپنا سب کچھ ہار گیا ہو۔



سنائی دیں تو وہ بچے کتنا ہو گیا۔ ایسا لگا کہ کوئی فرد اس بچے پر چل رہا تھا جس کے نیچے اس کی پناہ گاہ تھی۔ اس نے رائفل کا رخ سمت کی طرف کر لیا اور اچانک ٹین کی شیٹ ہٹی تو وہ ٹریگر دباتے دباتے رہ گیا۔ آنے والا ایکس تھا۔  
 "ابھی تم میرے ہاتھ سے مارے جاتے۔" ایکس نے سرد لہجے میں کہا۔ ایکس اندر آیا اور اس نے چادر واپس اپنی جگہ کی۔ وہ تھکا ہوا اور زخمی لگ رہا تھا، اس کی گردن آلود وردی پر جا بہ جا خون کے دھبے تھے۔ وہ آ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"کاش کہ تم ٹریگر دبا دیتے۔"  
 "اگر تمہاری خواہش موت ہے تو وہ زیادہ دور نہیں ہے۔ جرمن واقف ہو گیا ہے کہ میں کہاں ہوں اور اب وہ ہمارے یہاں سے نکلنے کا انتظار کرے گا۔"  
 "میں جانتا ہوں۔" ایکس نے آہستہ سے کہا۔  
 ایکس چونکا پھر ایک خیال اس کے ذہن میں سرسرا نے لگا۔ "تم جانتے ہو، اس کا مطلب ہے کارل کو ہمارے بارے میں اطلاع تم دیتے تھے؟"  
 ایکس کا چہرہ مست گیا۔ "ہاں، میں ہی اسے بتاتا تھا۔"

ایکس نے یہ مشکل خود پر قابو پایا اور نہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس ذلیل شخص کے سر میں گولی اتار دے مگر وہ صرف اتنا کہہ سکا۔ "کیوں..... کیوں؟"  
 ایکس رونے لگا۔ "میں پاگل ہو گیا تھا۔ مجھے نکالیہ کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ تمہیں چاہتی تھی اور میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔"  
 "تم میں خود اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنے ہاتھ سے میرا خاتمہ کر سکو اس لیے تم نے دشمنوں سے ساز باز کر لی؟"

"ہاں، میں بزدل ہوں۔ میں خود سے تمہیں مار سکتا تھا۔" ایکس نے اپنا چہرہ صاف کیا۔ "میں رائفل لے کر آیا تھا مگر وہ باہر چھوڑ دی ہے۔"  
 ابتدائی صدمے پر قابو پانے کے بعد ایکس اس کا رد عمل سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایکس اسے ہوش دحواس میں نہیں لگ رہا تھا۔ پھر اسے یاد آیا، وہ نکالیہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے ماضی کا ذکر کر رہا تھا۔ ایکس کا دل ایک لمحے کو رکا۔ "ایکس! تم کیا کہنا چاہ رہے ہو..... نکالیہ کیسی ہے؟"

ایکس کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے مورچے میں موجود سوراخوں کی طرف دیکھا۔ "جرمن سمجھ رہا ہے کہ میں ابھی یہاں آیا ہوں۔"



# سودان جنوں

چوتھا حصہ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

عرصہ دراز سے صیہونی قوتیں امتِ مسلمہ کے عزم و حوصلے کو سبوتاژ کرنے کی سازشوں میں مصروفِ عمل ہیں۔ اس رپہ کائنات کا بھی کیسا انوکھا انصاف ہے۔ ہر دور میں فرعون پیدا کرتا ہے اور پروردگار موسیٰ بھی الگ بناتا ہے جو انہی کے درمیان رہ کر پرورش پاتا ہے اور فرعوننی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ آج بین الاقوامی منظر نامہ جو داستانِ دل گیر سناتا ہے اس نے تمام عالمِ اسلام میں دکھ کی ایک لہر پیدا کی ہوئی ہے۔ حساس دلوں میں آج بھی ارضِ مقدس میں صیہونی یلغار ان کی چہرہ دستبوں کے خلاف نفرت و غیظ کی آگ بھری ہوئی ہے کیونکہ غاصب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو نذرِ آتش کر کے ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے کی مذموم اور تباہکار سازش تیار کی تھی... جسے روکنے کے جرم میں اسرائیلی فوجیوں نے نادار اور مجبور فلسطینی عوام کو اپنی ہتھیاریت اور بربریت کا نشانہ بنانا شروع کیا اور فلسطینی بستیوں میں خون کی بولی کھیلی۔ اسرائیلی سازشوں کے تانے بانے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ آج بھی موت و ہار گلی گلی دروازوں پر دستک دیتی گھوم رہی ہے لیکن... آج یہی کچھ پاگل لوگ عصمتوں کے محافظ بنے ایک سودانے جنوں میں مبتلا ہوں...

اب اس بازی کا انجام... اعلیٰ رنگت اور مکروہ چہروں والی شیطانی قوتوں کی بربریت کا لرزہ خیز منظر



COPIED FROM WEB







COPIED FROM WEB





تیس یہ اطلاع دینے کے بعد واپس جا چکی تھی۔ اب ان تینوں کی دم بخودی نگاہیں وارد روم کے دروازے پر تھی ہوئی تھیں..... وہاں اب انہیں بھاری جسامت اور چوڑے شانوں والا ایک درمیانے قد کا آدمی نظر آیا۔ اس کا چہرہ بھی چوکور اور بھرا بھرا تھا، پیشانی کی طرف سے بال ایک سرخ و پھپھ مٹیج پیدا کرتے ہوئے اڑ چکے تھے۔ آنکھیں بہت چھوٹی اور گول تھیں۔ اس نے جسم پر پولیس شریف کی مخصوص وردی پہن رکھی تھی۔ دائیں ہولسٹر سے اسٹین لیس اسٹیل کے سردی ریوالور کی جھلک نظر آرہی تھی جس کے سرے سے ایک چمچن مختصر کڑے کی صورت میں اس کے پیلٹ سے منسلک تھی، اس کے اندر داخل ہوتے ہی عقب میں اس کے دو ساتھی بھی نمودار ہوئے تھے۔ دونوں جوان اور اسارٹ تھے اور وردی پوش بھی۔ ان میں ایک عورت بھی تھی جبکہ مسٹر جان کا چہرہ ایک دببے اور رعب کی خمازی کر رہا تھا۔ ہونٹ پتکے تھے۔

ماسوائے جینی کے ڈاکٹر کمال احمد اور حماد امدال یہ اندازہ قائم کر چکے تھے کہ یہ ہی آدمی جینی کا باپ اور پولیس شریف مسٹر جان نسوٹر تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اپنی بیٹی جینی کی وہاں غیر حتمی موجودگی سے مسٹر جان کا چونکا لازمی امر تھا اور اسی سبب اس کے چہرے سے ہویدا روایتی رعب اور دببے میں فرق بھی آیا تھا۔

”ہلو ڈیڈ.....“ جینی نے سنجیدہ لہجے میں باپ کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

”ہائے ہئی..... یہ بتاؤ تم ادھر کیسے؟“ مسٹر جان ایک سرد مہری نظر بیڈ پر صاحب فرمائش پڑے ڈاکٹر کمال اور اس کے قریب سر ہانے والی کرسی پر حماد پر ڈالتے ہوئے اپنی بیٹی سے بولا۔ اس کا لہجہ بھی اس کی بھاری شخصیت سے ہم آہنگ تھا۔

”ڈاکٹر کمال میرے کلاس فیلو ہیں۔ ہم لیڈیونیورسٹی میں اسکے فیلوشپ کر رہے ہیں۔“ جینی نے بتایا۔ جان نسوٹر نے اپنے ہار یک ہونٹ بھیج کر ہولے سے اپنے سر کو اٹھاتی جھبش دی پھر وہ آگے سرکا۔ حماد اب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جینی نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی تھی۔ جان نے حماد سے مصافحہ کیا تو جینی نے اس کے ہارے میں مختصر آپ کو بتایا۔ حماد سے مصافحے کے دوران جان نے اس کے چہرے پر..... گہری نظریں ڈالی تھیں۔ حماد نے اسے کرسی پیش کی مگر وہ وہیں کھڑے کھڑے بیڈ پر نیم دراز ڈاکٹر کمال سے مخاطب ہو کے بولا۔

”ویل ڈاکٹر!..... ہاؤ آر یو؟“  
”لعل قاتن سرا!..... کچھ بہتر ہے طبیعت.....“ ڈاکٹر کمال نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ ”بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ آپ مس جینی کے قادر ہیں۔“

”ہوں..... نو ڈاؤٹ..... بٹ..... میں اپنی پوسٹ اور اپنے فرائض منصبی کو اپنی ذمہ داری پر ہمیشہ ترجیح دیتا ہوں۔“ وہ کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے آئے بولا۔ ”تمہارے ساتھ جو کچھ ہوگا وہ خالصتاً انصاف کی بنیاد پر ہوگا، کسی سفارش کی بنا پر نہیں اور اس وقت میں تمہاری کلاس میٹ کے باپ کی حیثیت سے نہیں، ایک ذمے دار پولیس آفیسر کے روپ میں تمہارے سامنے ہوں..... اس لیے تم بھی اپنا بیان غیر مبہم اور صاف رکھنا، وٹس اٹ۔“ وہ اس کرسی کے قریب آیا جو حماد نے اس کے لیے خالی کی تھی، ڈاکٹر کمال کو مسٹر جان کے میکانیکی سے لہجے میں چھپی وہ کبیرتا آمیز صمیمیہ ضرور محسوس ہوئی تھی جسے ڈاکٹر کمال کے ذہن طہارح نے اس کے اس مختصر کتاہے پر محمول کیا تھا کہ شاید وہ جینی کے حوالے سے ایک محتاط قسم کے زعم میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اگر کمال اسے کسی پر غلطی الزام تراشی کر کے سزا دلوانے کی کوشش کرے تو وہ جینی جان ایسا ہرگز نہیں کرے گا..... جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی اور ڈاکٹر کمال ہی نہیں اس کی اپنی بیٹی جینی بھی شریف جان کے فہارے سے ہوا نکالنے والی تھی۔ جب اسے چشم دید گواہان سے یہ پتا چلتا کہ مجرم کون ہے۔ چنانچہ اس کی بات سن کر..... ڈاکٹر احمد نے مستی خیز مسکراہٹ سے اپنا ایک ہاتھ مصافحے کے لیے اس کی طرف بڑھا دیا اور بولا۔

”ناکس گول..... مسٹر جان! گلیڈ ٹو میٹ یو..... آپ کے خیالات جان کر خوشی ہوئی اور یہ اطمینان بھی کہ آپ انصاف کے تقاضوں پر کسی قسم کی فیصلی ریلیٹیشن شپ کو فروغ نہیں دیتے..... پلیز..... جسٹ..... ہواے سٹ.....“

شریف جان نسوٹر نے بھویں اچکائیں، مصافحہ کیا اور کرسی پر براجمان ہو گیا۔ نقل و صورت سے ہی نہیں بلکہ اپنے لہجے سے وہ عیار اور گرگ ہاراں دیدہ نظر آتا تھا۔ ڈاکٹر کمال کے لب و لہجے اور طمانیت بھری رمز پر مسکراہٹ نے اس کے اندر ایک عجیب سی کھٹک پیدا کر دی تھی۔

جان نسوٹر کے کرسی پر براجمان ہوتے ہی ڈاکٹر کمال نے ایک گہری ہکاری خارج کر کے ایک اور وار کیا۔  
”تو آپ پہلے..... میرا بیان لیٹا پسند کریں گے..... یا پھر چشم دید گواہان کا.....؟“

”چشم دید گواہان.....؟ وہ کہاں ہیں؟“ شریف جان



”مسٹر کمال! میں نے آپ سے کچھ اور پوچھا ہے کہ تمہارا کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا تھا..... یا تمہیں کسی پر شہ ہو؟..... کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حادثہ محض اتفاق ہو؟“

”یہ حادثہ اتفاق تو بہر حال نہیں تھا۔“ ڈاکٹر کمال نے بالآخر بتایا۔ ”کار کا بدلنا ہوا رخ اور اچانک تیز رفتاری کے ساتھ میری طرف بڑھنا صاف ظاہر کرتا تھا کہ نشانہ میں ہی تھا۔ رہی بات جھگڑے کی تو میرا آج تک کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ میرا طبی ریکارڈ آپ کنفرم کروا سکتے ہیں۔ ہاں البتہ..... کچھ نظریاتی اختلافات کے باعث تھوڑے دنوں پہلے میرا ایک شخص کے ساتھ سہ ماہی ضرور ہوا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے کمال نے اسے ڈی کارلو کے بارے میں بتادیا۔

”ہوں۔“ جان نے ہنکاری لی۔ ”میرا نہیں خیال کہ محض اتنی سی بات پر ایک پڑھا لکھا بائبل ایجوکیٹڈ اسکالر اس طرح کی خطرناک مہمانہ نزکت کر سکتا ہے..... بہر حال تمہیں شہ کے کا حق اور اختیار ہے۔“ جان نے لمبیر لہجے میں کہا تو اس کی بات پر کمال سمیت حماد کا دماغ جلنے لگا جبکہ جینی کے چہرے پر استہانی شرمساری اور خجالت کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ ظاہر ہے وہ بھی اپنے پولیس آفیسر باپ کی جانبداری اور حقائق سے پکڑائی کرنے پر شرمندگی محسوس کر رہی تھی جبکہ جان کو ابھی دھماکا خیز انکشافات کا طم ہونے والا تھا، وہ بھی شاید حماد کی طرح کافی دیر سے کھڑی اندر ہی اندر ضبط و تحمل کا مظاہرہ کر رہی ہوگی، بول ہی پڑی۔

”ڈیڈ!..... اس کار کے اندر..... ڈی کارلو ہی موجود تھا، اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ..... آپ اب ڈراما سٹر حماد اور ہمارے بیان بھی قلم بند کر لیں تاکہ آپ کو اپنے کنٹریکٹس دینے کے بعد وہاں نہ لینے پڑ جائیں۔“

ڈاکٹر کمال اور حماد کے لیے جینی کے باپ کو ایسے چھیٹے ہوئے تیز جملوں کی توقع ہرگز نہ تھی، تاہم کمال اور حماد نے دیکھا جان نوٹرنے بیٹی کی بات پر اپنی سولی چر بیٹی گردن گھما کر اس کی طرف گھورنے کے انداز میں دیکھا تھا۔ پھر لمبیر لہجے میں بولا۔

”مائی ڈائرن..... اقاؤن کو میں تم سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں..... مجی وجہ ہے کہ مجھے آج تک اپنے کنٹریکٹس واپس لینے نہیں پڑے۔ ہاں ان میں ترمیم کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ اکثر ایسے کمپوز بھی میں نے اپنی تیس سالہ پیشہ ورانہ زندگی میں جھکتائے ہیں جن میں جمونے گواہوں کو بھی میں نے سخت سزا دیں دلوائی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ حماد کی طرف متوجہ ہوا۔ ”ہاں مسٹر.....؟“

کو جیسے ایک جھٹکا۔ کمال نے مسکراتے ہوئے اپنی شفاف حدسوں والی ٹینک کو عادتاً انگلی سے درست کیا اور پھر اس کے قریب خاموش کھڑے حماد اعمال اور جینی نوٹرن کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ دونوں چشم دید گواہ آپ کے سامنے کھڑے ہیں جبکہ آپ کی بیٹی کی گواہی ذرا کٹھ پتلی ہے۔“

ڈاکٹر کمال کے اس انکشاف پر شریف جان نے سیٹی بھانے کے انداز میں اپنے پتکے ہونٹ سکھڑے اور بولا۔

”او..... آئی..... سی..... میں ان سے بھر بات کرتا ہوں..... پہلے تم اپنا بیان دو گے..... تمہارے ساتھ آخر ہوا کیا تھا اور کیا تم نے ان لوگوں کو بھی پہچان لیا تھا.....؟ آئی مین.....“

نمبر پلیٹ وغیرہ نوٹ کی.....؟“ قریب کھڑے اس کے دونوں ہاتھن میں خاتون نے ڈیجیٹل ڈائری نکال لی تھی جبکہ دوسرے نے آواز ریکارڈ کرنے کے لیے ایک ڈیوائس پکڑ لی تھی۔

اس کے سوال پر ڈاکٹر کمال نے قدرے چھپتی ہوئی نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے جواباً کہا۔

”میرا خیال ہے جناب کوئی راہ چلنے آدی کو متب سے اچانک مگر مار دے تو اس بے چارے کو تو اپنا ہی ہوش نہیں رہے گا تو وہ نمبر پلیٹ کیا پڑھ پائے گا۔“

”کار کی نمبر پلیٹ میں نے نوٹ کی تھی اور اس کے اندر موجود چاروں افراد کو بھی دیکھا تھا مسٹر جان!“

قریب موجود حماد اعمال نے قدم سے جوش سے بتایا تو مسٹر جان نے اس کی طرف سرد نظروں سے گھومتے ہوئے

ٹوکا۔ ”ابھی آپ کی باری نہیں آئی بیان دینے کی، اپنی باری میں آپ بولے گا۔“ ڈاکٹر کمال کو ہی نہیں بلکہ حماد اور جینی کو بھی مسٹر جان کے لہجے سے جانبداری کو بوا آنے لگی۔

”ہاں تو ڈاکٹر کمال!..... کیا تمہاری کسی سے دشمنی تھی؟..... یا تمہارا اس کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا تھوڑے دنوں پہلے.....؟ یا کسی پر شہ؟“

جان نے ایک بار پھر اپنا روئے سخن اس کی طرف موڑا تو اس بار ڈاکٹر کمال نے بھی اسے سرد اور طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

”مسٹر جان.....! بہتر ہوگا کہ پہلے آپ ان دونوں چشم دید گواہان سے بیان لے لیں کیونکہ میں سردست کچھ نہیں بتا سکتا۔ اس لیے کہ کار کی ٹکر لگنے کے بعد سے میری آنکھ یہاں

ہسپتال کے بیڈ پر رکھی ہے۔“ اس نے پاس کھڑے حماد اور جینی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جان بھی ایک کانیاں اور عیار آدی تھا، اس کے چھیٹے ہوئے طنز کو بھانپتے ہی بولا۔

”مسٹر جان.....! بہتر ہوگا کہ پہلے آپ ان دونوں چشم دید گواہان سے بیان لے لیں کیونکہ میں سردست کچھ نہیں بتا سکتا۔ اس لیے کہ کار کی ٹکر لگنے کے بعد سے میری آنکھ یہاں

ہسپتال کے بیڈ پر رکھی ہے۔“ اس نے پاس کھڑے حماد اور جینی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جان بھی ایک کانیاں اور عیار آدی تھا، اس کے چھیٹے ہوئے طنز کو بھانپتے ہی بولا۔

”مسٹر جان.....! بہتر ہوگا کہ پہلے آپ ان دونوں چشم دید گواہان سے بیان لے لیں کیونکہ میں سردست کچھ نہیں بتا سکتا۔ اس لیے کہ کار کی ٹکر لگنے کے بعد سے میری آنکھ یہاں

ہسپتال کے بیڈ پر رکھی ہے۔“ اس نے پاس کھڑے حماد اور جینی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جان بھی ایک کانیاں اور عیار آدی تھا، اس کے چھیٹے ہوئے طنز کو بھانپتے ہی بولا۔



اسی عقیدہ کا نیا نہ بنایا تھا..... جو ان دونوں کے لبوں پہ آتے آتے رہ گئی تھی۔

"اس حوالے سے ڈی کارلو بھی تم لوگوں پر یہ الزام عائد کرنے کا حق رکھ سکتا ہے کہ اسے اپنے تین مخالفین کی عاذا آرائی کا سامنا ہے..... جو اس کی نفسی گریب خراب کرنے کے ساتھ تاج برطانیہ میں اس کے باپ کا بھی ایج خراب کرنے کی مذموم سازش میں مصروف ہیں۔" جان نسوٹر نے جینی کی طرف نکتے ہوئے کہا تو اس بار حماد بھی چپ نہ رہ سکا۔ جینی سے یولا۔

"ویل جینی! آپ کے ڈیپ تو ابھی سے ہی ڈی کارلو کی وکالت کرنے لگ گئے ہیں..... یہ اس پر کیا ہاتھ ڈالیں گے۔" اس طنزیہ جوت پر شیرف۔ جان نسوٹر نے اپنی چندی چندی آنکھوں سے گھورتے ہوئے حماد کی طرف دیکھا۔ وہ حماد سے کوئی سخت بات کہتے۔ ہتے رک گیا۔ اس کے بعد وہ کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

نامہ جیسی ایک۔ سہاد۔ لیزی رورٹر کے اس وقت دہشت زدہ ہو جانے کی وجہ بڑی مقولہ گی۔ رات کا وقت اور بھیر و روم کا چوگر و کھلا تھا میں مارتا ہوا بلا فخر سمندر اس پر مستزاد ایک آبدوز پر بے سہارا لگا ہوا انسانی وجود جو محض کسی ایک حوقالی لہر کے اشارے پر بھی ہو کہ وہ ایک ہی بلے میں اسے آبدوز کی خالی ہاڈی سے دو بارہ بیت ناک سمندر میں پھینک دے۔ ایسے ہولناک ماحول میں..... اچھے اچھوں کا بتا پانی ہو جائے۔ نامہ کی بھی اس وقت یہی حالت ہو رہی تھی۔ آپ دوز کی ہاڈی کے ساتھ وہ کسی کمزور دہشت زدہ آبی مخلوق کی طرح چٹٹی ہوئی تھی اور اس کے چہرہ اطراف بیت ناک سمندر کے اچھٹے پانیوں کا ہولناک شور تھا اور تاریکی تھی۔ اسے کچھ پتا نہ تھا کہ اس کا ساتھی عابد شکھری کہاں تھا؟ اس نے ہڈیانی نیچے نما آواز سے اسے دو تین بار پکارا بھی تھا مگر اسے مگر عابد جواب دیتا بھی تو سمندر کی..... بندہ ہم موجوں کے شور و شغب میں بھلا اس کی آواز کب سنائی دیتی جبکہ خود نامہ کو اپنی آواز دہتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ چند ثانیوں تک خالی الذہنی کی حالت میں اسی طرح چٹٹی آبدوز کے سہارے ہولے ہولے..... بچکولے کھاتی رہی..... وہ پانی سے بھی شرابور ہو رہی تھی۔ آسمان پر بادل خونخاک انداز میں گر بنے لگے تھے اور مہلا دھار بارش بھی شروع ہو چکی تھی..... ایسے میں نامہ کو اپنی زندگی محاورہ نہیں بلکہ حقیقتا بننے کے سہارے پر ہی محسوس ہو رہی تھی کہ اچانک..... وہ

"حماد اندال....." اس کے استفسار یہ بات کائے پر حماد نے کہا تھا۔

"نیں..... مسٹر حماد!..... اب آپ کا بیان شروع ہوتا ہے..... مگر میں نے ابھی جو جملے اپنی بیٹی جینی سے کہے..... انہیں ذرا ذہن میں رکھ کے میرے سوالوں کے جوابات دیجیے گا۔ Agreed؟"

جان نسوٹر کے لب و لہجہ میں بھی تنہیہ بالکل واضح تھی مگر اس ڈھکی چھپی دھکی کے پیچھے ایک جائیدار اندہ ہٹ دھری کو شاید وہاں صرف ڈاکٹر کمال ہی کے ذہن رسا نے بھانپنے کی کوشش چاہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ وہاں موجود چشم دید گواہان، بشمول اس کی اپنی بیٹی جینی کو بھی باطل قرار دے سکتا تھا۔ ڈاکٹر کمال سر دست خاموش ہی رہا۔ تاہم حماد نے ابتدا کر دی۔ اس نے پولیس شیرف جان نسوٹر کو وہی کچھ بتایا جو تھوڑی دیر پہلے وہ کمال اور جینی کو بتا چکا تھا۔ اسے سن کر جان نسوٹر کے چہرے پر استہزائی سی مسکراہٹ کی رمتی ابھری۔ پھر وہ اپنی بیٹی جینی کی طرف متوجہ ہوا، اس نے بھی وہی کچھ بتایا تو آخر میں جان نسوٹر اپنی دونوں رانوں پر ہاتھ رکھ کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تو کیا ڈیڈ آپ بھائی کا بھی بیان قلم بند کریں گے؟" جینی نے پوچھا۔

"یقیناً....."

"پھر آپ ڈی کارلو کی گرفتاری کے احکامات بھی جاری کر ڈالیں گے؟"

"ابھی اس سلسلے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" جان نسوٹر نے جینی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ رخصت ہونے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے دونوں تاہین عقب میں تھے۔ اچانک جان دروازے کے قریب پہنچی کر رک گیا اور پھر وہیں کھڑے کھڑے اس کے تاہین ایک دم دائیں بائیں ہو کر الٹ کھڑے ہو گئے۔

"قریبی دوستوں کی گواہی زیادہ قابل قبول نہیں ہوتی، بہتر ہوگا کہ..... تم لوگ ڈی کارلو سے صبح صفائی کی کوشش کرو۔"

"برگز میں ڈیڈ!" جینی یکدم سچے سچے سے بولی۔ "آپ انصاف کے تقاضوں کی وجہاں بھیر رہے ہیں۔ کیا آپ ڈی کارلو جیسے شر پسند کے خلاف کوئی عملی کارروائی کرنے سے بچکھارے ہیں؟ اس لیے کہ اس کا باپ امریکی پارلیمنٹ کا ممبر ہے؟"

ڈاکٹر کمال اور حماد کے مطابق جینی نے اپنے باپ کو



آبدوز کی مخصوص دھاتی سطح پر موٹے موٹے فولادی ریٹ اور نٹ وغیرہ لگے ہوئے تھے جن کی مدد سے دونوں خود کو جمائے ہوئے تھے اور اب میرے دیرے آگے بھی کھینکے لگے تھے۔ وہ ابھی اپنے ہدف سے تھوڑی ہی دور تھے کہ انہیں اچانک آبدوز کی سطح کی تھر تھراہٹ (واہریشن) میں اضافہ ہوتا محسوس ہوا۔ عابد نادل اچھل کر قلع میں آن لگا۔ کیا آبدوز دوبارہ نیچے گھرے پانیوں میں جانے والی تھی؟ ایک اذیت ناک اور جارحانہ نسل خدشہ اس کے ذہن میں ابھرا تھا۔ اس نے چلا کر نامہ سے کہا۔

”نامہ! جلدی آگے بڑھو..... آبدوز شاید نیچے جانے والی ہے۔“ اس کی بات سن کر نامہ کے ہاتھ پاؤں بھی پھول گئے۔ وہ دونوں آبدوز کے جس مذکورہ گوشے تک پہنچنا چاہ رہے تھے، یقینی طور پر وہاں ان کے داخلے کے لیے دروازے وانہیں تھے۔ ابھی اندر داخل ہونے کا مرحلہ پائی تھا اس کے لیے کوئی حل نکالنا تھا ابھی..... لیکن بس! ایک امید تھی ایک آس تھی۔ اندر ن کی یہ فطرت ہے کہ وہ آخری دم تک اپنی جان بچانے کے لیے جگ دو دو جاری رکھتا ہے۔ سو یہ دونوں بھی اس وقت وہی کچھ کر رہے تھے۔ عابد شیکھری کو بھی یہ امید تھی۔ آبدوز کے مذکورہ گوشے پر پہنچنے کے اندر داخل ہونے کی کون نہ کوئی سہیل ضرور مل ہی جائے گی کیونکہ وہاں اور کچھ نہیں تو ایسے کوئی سوراخ نما نیوب کے آہنی ڈھکن نظر آئی جائیں گے جو ایمر جنسی کی صورت میں آبدوز کی نکاسی کا راستہ کہلاتا تھا۔

بالآخر وہ اس جگہ پہنچ گئے مگر قریب پہنچنے ہی عابد کو آبدوز کے کوہان پر اسرارینا نظری بحر یہ کا مخصوص موٹو گرام والا نشان نظر آ گیا اور اس آئپرہ جیسے نکتہ جگت کے میں ڈوب گیا۔ ان کے لیے یہ صورت حال آسمان سے گرا گجور میں اٹکا والی ہوئی تھی لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے چاروں طرف موت تھی اور یہ دونوں گویا موت کے دامن میں ہلکورے کھارے تھے..... عابد نے ابھی نامہ کو یہ کر یہ حقیقت نہیں بتائی تھی کیونکہ اب بالآخر اس نے دشمنوں کی کھیار میں ہی مجبوراً پناہ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

عابد نے اپنی ہی کوشش جاری رکھی اور پھر جلد ہی اس کی امید برآگئی۔ مذکورہ گوشے میں اسے بفر رومز ڈور کے علاوہ..... وہ گول ”آدہ گزار“ ڈھکن نظر آئی گیا جسے ایمر جنسی ایگزٹ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اب انہیں اصل مرحلہ درپیش تھا۔ وہ اسے کھولنے کا تھا، اس طرح کے

چوکی۔ اس کے پاؤں برسی کی گرفت کا احساس ہوا۔ بے اختیار اس کے قلع سے بیخ خارج ہو گئی۔ ابھی تک یہ بات واضح نہیں ہوئی تھی کہ آیا یہ آبدوز کس ملک کی تھی۔

”نامہ.....“ دفعتاً اسے اپنے قریب عابد شیکھری کی آواز سنائی دی اور وہ خوشی سے چور ہو کے جواہا چلائی۔

”عابد..... عابد..... تہہ..... تم..... کہاں ہو.....؟“

”ادھر ہوں۔ تمہارے پیروں کی طرف.....“ نامہ

آواز کی سمت لینے لینے بٹٹی اور عابد کو دیکھ کر بے اختیار اس کے گلے میں پانہیں ڈال دیں۔ عابد خود بھی آبدوز کی باڈی کی چکنی پھسلواں سطح سے چپکا ہوا تھا۔ سمندر اور بارش کے پانی سے وہ بھی شرابور تھا۔ تیز خزانے دار بارش اور طوفانی ہواؤں نے تھلکہ چار کھا تھا۔ عابد تھوڑی کوشش کے بعد کہنیوں اور سینے کے بل ٹھٹھا ہوا نامہ کے قریب ہو گیا کیونکہ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اسے ہولناک حالات نے وہشت زدہ کر رکھا تھا۔ نامہ کو بھی عابد کی قربت سے کچھ حوصلہ ہوا تھا۔ اس نے نامہ کا ہاتھ دبا یا، جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنی ہمت اور حوصلوں کو خطا نہ ہونے دے۔ اس کے ساتھ ہی عابد کی نظریں تیزی سے گرد و پیش کا جائزہ بھی لینے میں مصروف

تھیں۔ اسے بالکل ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے وہ کسی دیویدکل ڈھیل پھلی کی پشت کے ساتھ چپکے ہوئے ہوں۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ زیادہ دیر آبدوز کی سپاٹ پشت پر سوار رہنا ان کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا اور اس سے بڑھ کر ایک خطرہ اور بھی لاحق تھا جس کے تصور سے ہی لرزہ طاری ہو جاتا تھا کہ کچھ پانہیں تھا کہ آبدوز کسی وقت بھی سمندر کے

گہرے پانیوں میں جا سکتی تھی۔ ایسی صورت میں بھیانک موت ان کا مقدر ہوتی، لہذا عابد نے قریب ہونے کے باوجود قدرے چلا کر نامہ سے کہا۔ ”میرے ساتھ..... ساتھ آگے کھسکتی رہو..... ہمیں اندر داخل ہونے کی کوشش کرنا

ہوگی۔“ جواہا نامہ نے سرکوا ثباتی جنبش دی۔ عابد کو آبدوز کا وہ واحد وسطی حصہ نظر آ رہا تھا جو کسی کوہان کی طرح آبدوز کی پشت پر ابھرا ہوا تھا۔ انٹرنس اور ایگزٹ وہیں تھا..... یقیناً وہ دروازے بند ہی ہوں گے لیکن عابد کو کچھ امید تھی کہ وہیں

کہیں ”بفر رومز“ کا خلا ضرور پناہ ہوگا جہر مختلف خود کار میکانزم کے تحت آبدوز میں نہ صرف آکسیجن بھری جاتی ہوگی بلکہ قاتلو پانی بھی باہر نکالا جاتا ہوگا۔ اگرچہ یہ کوئی زیادہ پر امید سہارا نہیں تھا لیکن بچنے چرخی کی آخری ٹھٹھائی اور لرزائی روشنی کے مصداق..... سو وہم امید ضرور تھی۔

دونوں نے آگے کھسکتا شروع کر دیا..... یہ شکر تھا کہ

دونوں نے آگے کھسکتا شروع کر دیا..... یہ شکر تھا کہ

دونوں نے آگے کھسکتا شروع کر دیا..... یہ شکر تھا کہ

دونوں نے آگے کھسکتا شروع کر دیا..... یہ شکر تھا کہ

دونوں نے آگے کھسکتا شروع کر دیا..... یہ شکر تھا کہ

دونوں نے آگے کھسکتا شروع کر دیا..... یہ شکر تھا کہ



فدا کی حدت میں غیر معمولی اضافہ ہوتا رہتا تھا..... آکسیجن کی بھی اکثر و بیشتر گیل از وقت ضرورت پڑتی رہتی تھی اور اس "اضافی ضرورت" کے پیش نظر آبدوز کو بار بار تھوڑی دیر کے لیے سطح سمندر پہ لانا پڑتا تھا..... یہ آگوسٹ آبدوزیں امریکا سے حاصل کردہ تھیں۔

نائب کپتان نے دو تین بار آبدوز کے چیف انجینئر سے کہا تھا کہ وہ اس کا حل لگا لے مگر شاید اس نے کچھ خاص توجہ نہ دی تھی اور اسے "روٹین" کا مسئلہ قرار دیا تھا لیکن جانے کیا بات تھی کہ بیٹرنوٹ کا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ اسے کسی "خاموش خرابی" کی بو آتی محسوس ہو رہی تھی، جو کسی وقت بھی خوف ناک اور خوابیدہ عفریت کی طرح بیدار ہو کے ان سب کو گھل لے گی..... بیٹرنوٹ بھی کینپن پر ایمان سے کم تجربے کا رہتا تھا۔ وہ ایک نکلنے والا اور گول سرد والا بیوڈی تھا۔ اس نے امریکی بحریہ سے تربیت حاصل کی تھی، گھنی بھوری مونچھیں اور گھبے پن کی لطف مائل اس کے سر کو دکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ پرانے زمانے کے بحری قذاقوں کا کوئی سردار ہو۔ چالیس سالہ نائب کپتان بیٹرنوٹ.....

ریڈیو الیکٹرونکس ایکسپٹ۔ سے ترقی کرتے ہوئے ایٹمی آبدوز کا نائب کپتان بنا تھا جو ایک غیر معمولی بات تھی۔ اس کے بڑے افسران اسے جنگی چالوں کا ماہر خیال کرتے تھے جو آبدوزوں کے ساتھ اس طرح کھیلا تھا جس طرح شطرنج کے مہروں سے کھیلا جاتا ہے۔ اس ایٹمی آبدوز آگوسٹا میں "ہائیڈرو فون لائن" سسٹم اس نے فٹ کیا تھا۔ جب اس کی چھٹی حس کچھ زیادہ خطرے کا الارم بجانے لگی تو اس نے کینپن پر ایمان سے اس سلسلے میں حتمی بات کرنے کا فیصلہ کیا اور ابھی چاہتا تھا کہ اٹھ کر اس کے کمرے کی طرف جائے کہ انٹرکام پر پر ایمان کی کال آگئی۔ اس نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا تھا۔ چند منٹوں بعد دونوں روبرو تھے۔

"ریزیڈنٹ مارل اروڈت بیوڈی ابھی ابھی کال موصول ہوئی ہے..... وہ کواٹر وائی لینڈ میں واقع ہمارے اسپاٹی اسٹیشن میں آج ہی پہنچے ہیں۔ ہمیں وہاں فوراً طلب کیا ہے۔"

کینپن پر ایمان نے ہوانا کے سرکاری سگنلنگ کمانڈر سے کہا تو نوٹ کی پیشانی پر سلوٹس ابھرا آئیں، بولا۔ "کیا حملے کے احکامات صادر ہونے والے ہیں سر؟"

"ایسا کچھ لگتا تو نہیں..... لیکن ایڈمرل اروڈت بیوڈی کو بھی لگتا ہے ہائر اتھارٹیز سے کچھ خاص نوعیت کے خفیہ احکامات ملے ہیں جس کے لیے انہیں ہم سے کواٹر وائی لینڈ

ایمر جنسی راستے عموماً کوئی خود کار لاک سسٹم سے مبرا ہوتے ہیں۔ یہ ہاتھ اور ذرا آزمانی سے کھولے جاسکتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے اندر سے کھولنے کے مقابلے میں باہر سے کھولنا مشکل کام تھا مگر عابد نے اسے کرنے کا عزم کر لیا تھا..... یہ اسرائیلی آبدوز تھی۔ انہیں یہ معلوم ہو چکا تھا مگر اب بھی وہ اس ہولناک حقیقت سے پوری طرح آگاہ نہیں تھے کہ یہ اسرائیل کی ایک ایٹمی میزائل بردار آبدوز "آگوسٹا" تھی، آگوسٹا 291..... جس کے اندر اس وقت اسرائیلی بحریہ کا کینپن پر ایمان اپنے کمرے میں موجود تھا اور چائے کا آخری گھونٹ بھرنے کے بعد سر کو کرسی کی پشت سے لگ لگا کر آنکھیں بند کر چکا تھا۔ اس سفر پر نکلے ہوئے اسے ایک ماہ ہو چکا تھا..... اور اس کے کانوں میں کسی اور قسم کی آوازوں کے بجائے صرف آبدوز کے انجن سے نکلنے والی بھاب کی "شوشوں" اور اس کے دو انجنوں کا شور ہی سنائی دیتا تھا۔ اس کی دنیا سٹ کر صرف آبدوز کی "سینٹرل کمانڈ پوسٹ" تک ہی محدود رہ گئی تھی۔

یہ ایک نیچا چھت والا کمر تھا جس میں بیس آدی ڈیوٹی پر ہوتے تھے اور اسے لوگوں کے فہمنے رہنے سے یہ کمر گرم رہتا تھا۔ اس گرم فضا میں مشینوں کی گھول گھول اور مختلف قسم کے سوکچ آن آف کرنے کی آواز آتی رہتی تھی۔ یہ چھوٹی سی جگہ ایک ایٹمی میزائل بردار آبدوز کے کمانڈ سینٹر سے کہیں زیادہ کسی ٹیکنیری کا حصہ معلوم ہوتی تھی۔

اسرائیلی بحریہ کے کپتان پر ایمان کی یہ آبدوز آگوسٹا 291..... بحیرہ روم کے ایک خفیہ ہیڈ کوارٹر میں لیبیا سے تقریباً ایک ہزار نائیکل دور گشت کر رہی تھی۔ اس کا مشن لیبیائی ساحلوں پر گشت کرنا تھا۔ اسرائیل اب اس آبدوز کے ذریعے لیبیا اور اس سے ملحقہ اسلامی ریاستوں پر فوری طور پر ایٹمی حملہ کر سکتا تھا..... تاہم اس آبدوز آگوسٹا 291 کا ایک مقصد اور بھی تھا۔ بحیرہ روم اور لیبیا سے متصل ساحلی کناروں پر آباد اسلامی ممالک سے فلسطینیوں کے لیے جو خفیہ کمک..... جو جدید ہتھیاروں وغیرہ کی صورت میں ہوتی تھی ان پر نہ صرف کڑی نگاہ رکھنا تھا بلکہ انہیں ٹریس کر کے تباہ بھی کرنا تھا۔ کینپن پر ایمان نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آگوسٹا کو سطح آب پر لانے کا حکم جاری کیا تھا۔ "بحری اسکوپ" پر متعین نائب کپتان بیٹرنوٹ بھی پچھلے چند گھنٹوں سے ریٹائرنگ روم میں تھا۔ چلتے پھرتے اس ایٹمی ری ایکٹر کی حامل ایٹمی آبدوز میں مسلسل قیدی کی صورت میں ڈیوٹی دیتے رہتا کسی مذاہب سے کم نہ تھا۔ اس سے آبدوز کی محدود



دیکھو غور سے۔۔۔ وہیں آفیسر کوچ جن نے فوراً آگے بڑھ کر ڈائل پھیل کا جائزہ لیا اور اس کے چہرے پر تشویش کی ہلکی روشنی ابھری جو دوسرے ہی لمحے معدوم بھی ہو گئی۔ پھر وہ اذرا ہٹکھی مڑوہانہ کپتان نوت سے بولا۔

”سرا یہ درست کیا جا چکا ہے۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر پہلے سل نمبر پانچ میں نائٹک ایڈمن رہا تھا۔ اسے درست کیا جا چکا ہے۔“

”پھر یہ سوئی کیوں تھرک رہی ہے؟“

”یہ دھیرے دھیرے مسمول پہ آجائے گی سرا! میں پھر بھی چیک کرتا رہوں گا۔“ وہیں آفیسر کوچ جن نے کہا۔ اس کے بعد وہ تینوں آبدوز کے ”دبائے“ کی طرف آگئے۔ یہاں موجود ”پروپیلر“ سیکشن انچارج ایک تیس سالہ خوش شکل عورت سارہ تھی۔ ریڈار سیکشن بھی ساتھ ہی تھا۔ یہاں آبدوز کے ”صوت گیر“ آلات نصب تھے جو آبدوز کے ”پروپیلر“ کے سمندر کے پانی میں چلنے سے پیدا ہونے والے جوار بھانا کی لہروں کو کنٹرول کرتے تھے جو دشمن آبدوز کے صوت گیر آلات (Sonar) سکنل کی صورت میں پکڑ سکتے تھے۔ یوں انہیں فوراً اسرائیلی آبدوز آگوسٹا کی قریب میں موجودگی اچانک چل جاتا۔

نوت نے اپنی اسپیکشن ہم قسم کرنے کے بعد وہیں آفیسر کوچ جن سے دریافت کرنا چاہا کہ آخر سل نمبر پانچ میں نائٹک ایڈمن بننے کی کیا وجہ تھی جس کا وہ خاطر خواہ جواب نہ دے سکا۔ سوائے اس سے کہ یہ عمومی نوعیت کا ایک ”کیمیائی تعامل“ تھا جو دور کر دیا گیا ہے۔ نیز اس نے بیٹرنوت کو اس بات کی بھی تسلی دی کہ وہ آبدوز کے سنی ایٹمی ری ایکٹر کے نظام پر بھی مسلسل نظر رکھے ہوئے ہے۔

اپنی طرف سے اگرچہ دونوں مذکورہ آفیسرز نے آگوسٹا کے نائب کپتان بیٹرنوت کو ہر طرح سے تسلی دے دی تھی مگر جانے کیا بات تھی کہ پھر بھی اسے اپنے اندر کوئی پھانس سی چھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ بہر طور اس نے بہت جلد کیمپین پر ایمان کو اپنی مثبت یا منفی اسپیکشن رپورٹ دینا بھی لہذا اس نے کیمپین کو جوں کی توں رپورٹ پیش کر دی چونکہ اس کے پاس خود اپنی بے چینی کی کوئی ٹھوس وجہ نہیں تھی اس لیے وہ اس سلسلے میں خاموش تھا رہا۔

تھوڑی دیر بعد۔۔۔۔۔ جس وقت کیمپین پر ایمان سسلی کے جزیرے کو انڈو میں اسرائیلی غصیہ اسپائی اسپیکشن میں موجود اسرائیلی بحریہ کے ریڈار ایڈمرل اردوت یعود کو فون کرنے والا تھا کہ اچانک پر پیلر ایڈمرل ریڈار اسپیکشن انچارج سارہ نے انٹرکام پر اسے چٹکا دیتے والی اطلاع دی کہ

میں فوری میٹنگ کی ضرورت پیش آئی ہے۔“

”او کے سر!۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔“ نائب بیٹرنوت کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”کوئی پرابلم۔۔۔۔۔؟“ کیمپین پر ایمان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں اپنی بھوسیں سکڑائیں۔

بالآخر اس نے وہ مسئلہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

”میں اس وقت سسلی روانہ ہونا ہے۔ اگر تمہیں ایسا کوئی مسئلہ محسوس ہو رہا ہے تو اسی وقت سدباب کر دو۔۔۔۔۔ بلکہ خود ایک پارا اسپیکشن کر لو۔۔۔۔۔ تھوڑی تسلی بخش رپورٹ کے بغیر میں روائٹی کے احکامات جاری نہیں کروں گا۔ ڈو ات ناؤ۔۔۔۔۔ ہیری اپ۔“

کیمپین پر ایمان نے بارعب لہجے میں کہا تو وہ اسے مخصوص انداز میں سلیوٹ کر کے پلٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک انجینئر اور ایک وہیں آفیسر کے ساتھ

معاہتے کے لیے سب سے پہلے آبدوز کے کیمپارٹمنٹ نمبر سات میں پہنچا۔ آبدوز میں کیمپارٹمنٹس میں تقسیم کی گئی تھی۔ نمبر چار، ایک بڑا سا کمر تھا جس میں سولہ ”والٹ“ تھے اور ہر والٹ میں ایٹمی میزائل رکھے تھے۔ والٹ پانچ

فٹ قطر کا تھا جس میں آرابیس ایم 28 قسم کے ایٹمی میزائل نصب تھے۔ یہ میزائل جس قدر دشمنوں کے لیے مہلک تھے اسی قدر ان لوگوں کے لیے بھی خطرناک تھے جو ان کے قریب موجود تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میزائلوں کے راکٹ دوایسے ابھرنوں سے چلتے تھے جو بڑی تیزی سے آگ پکڑ لیتے ہیں۔

میزائل رکھنے والے خانوں Silos میں پمپ لگے ہوئے تھے جن کا مقصد یہ تھا کہ اگر کسی خانے میں سمندر کا پانی داخل ہو جائے تو اسے فوراً باہر نکال دیا جائے کیونکہ اگر

یہ پانی میزائل سے خارج ہونے والی نائٹروجن ٹیٹرا آکسائیڈ سے مل جاتا تو اس کے نتیجے میں بننے والا تیزاب میزائل کی باڑی کو کھاجاتا اور میزائل آبدوز کے اندر ہی پھٹ سکتا تھا۔

نائب بیٹرنوت اس وقت انجینئر اور وہیں آفیسر کے ساتھ مشاہدے میں مصروف تھا۔ سل نمبر سات، چھ اور چار میں وہ تینوں تھوڑی دیر تک پانی کے رساؤ کا مشاہدہ کرتے رہے۔ پھر کیمیکل کے ری ایکشن سے بننے والے دھوئیں کی

نشاندہی کرنے والے الارم کا بھی جائزہ لیا گیا۔ کنٹرول پھیل پر پمپ چلانے والے سوئچ بورڈ کو چیک کیا گیا۔ کیمیائی لیک کی نشاندہی کرنے والی سرخ رنگ کی سوئی خطرے کے ذون سے دور تھی، تاہم اس کے ہلکے سے ارتعاش کو نوت نے فوراً

بھانپ لیا۔ اس نے وہیں آفیسر سے حکمانہ کہا۔ ”اس ڈائل کو



صل کرم میں ایک مسلم تاجر کے مکان کے خانے میں ہونے والی مجاہدین کی خفیہ میٹنگ سے واپسی کے وقت "المجاہد" کی زبیدہ قیصری اور PLSO کی لیٹی آفندی کے خورد پھرے جوش سے متما ہے تھے۔ دونوں مجاہدوں کے دلوں میں ملنے والے مشن کی جلد سے جلد تکمیل کے عزائم انہیں حرکت پذیری پر مجبور کر رہے تھے۔

بیت صفائے پہنچ کر باقر کو بھی صل کرم کی میٹنگ کے اہم نکات سے آگاہ کر دیا گیا۔ جس کے مطابق "المجاہد" کی (زبیدہ قیصری) کو فرنت P (خالد بن جنید) کے ساتھ "لیبیا مشن" کے سلسلے میں مشترکہ طور پر آپریشن کرنا تھا۔ سب سے پہلے انہیں بحیرہ روم کے گہرے پانیوں میں موجود دو اسرائیلی U-boats آگوستا 291 اور آگوستا K-9 کو نشانہ بنانا تھا۔ جس کی وجہ سے فلسطینی مجاہدوں کی سورسز متاثر ہو رہی تھیں۔ مشن کی تکمیل کے بعد انہیں سسلی کے جزیرے کوانڈو میں اسرائیلی خفیہ ایسپائی ایشن کو تباہ کرنا تھا جدھر اسرائیلی بحریہ کی ہائی کمانڈ پوسٹ ہر وقت موجود رہتی تھی۔

جبکہ PLSO کی (لیٹی آفندی) کو تیونائی کے احوارے مشن کو مکمل کرنا تھا۔ باقر کو افسوس ہوا تھا کہ اب جبکہ انہیں اہم ترین مشن سونے گئے تھے تو وہ خود صاحب فرانس تھا جبکہ تنسن کی تلاش بھی ان کے ذمے تھی۔ باقر کا باپاں کا اندھا زنی تھا اگرچہ اس کی حالت اب قدرے بہتر تھی مگر لیٹی نہیں چاہتی تھی کہ باقر اس اہم مشن میں اس حالت میں ساتھ چلے لیکن باقر بعد رہا۔

اگلے روز پو پھنسنے سے پہلے زبیدہ قیصری اپنے دو بہترین کمانڈوز کے ساتھ صل کرم کی طرف روانہ ہوئی۔ وہاں انہیں پی فرنٹ کے خالد بن جنید سے ملنا تھا اور لیبیا مشن پر روانہ ہونا تھا جبکہ لیٹی آفندی اور باقر اپنے پی ایل ایس او کے تین مجاہدوں کے ساتھ تیونائی روانہ ہونے کے لیے کمر بستہ ہوئے۔ اس کے لیے انہوں نے اگلے دن بعد مغرب روانگی کا پروگرام بنایا تھا جبکہ اس صبح زبیدہ وغیرہ پہلے ہی صل کرم کی طرف روانہ ہو چکی تھیں۔

مغرب کی نماز وہیں بیت صفائے کی پہاڑی ٹھکانے میں ادا کرنے کے بعد لیٹی اور باقر اپنے تین کمانڈو ساتھیوں عبداللہ، نسیتی احمد اور علی ارسلان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

روانگی کے لیے انہوں نے جس خفیہ راستے کا انتخاب کیا تھا یہاں اسرائیلی فوجیوں سے مذبحیڑ ہونے کا خطرہ کم ہی تھا، تاہم پھر بھی ہر ممکنہ خطرے اور بھڑ جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہی تھی۔ وقت اور حالات کے تقاضوں کو

طرابلس کی بندرگاہ سے ایک بحری جہاز حیدہ کے لیے روانہ ہوا ہے۔ اس جہاز میں بھاری مقدار میں مسکری آلات سمیت گندھے سے فائز ہونے والے لطیاریہ شکن میزائل لدے ہوئے تھے۔ یہ خفیہ کنگ..... لیبیا میں مقیم فلسطین لبرل آرگنائزیشن PLO کی طرف سے مستطقی حریت پسند مجاہدین کے لیے روانہ کی جارتی تھی۔ طرابلس کی بندرگاہ میں موجود موساد کے ایک جاسوس..... جو وہاں "ہاربر ماسٹر" کے نام کی حیثیت سے گھسا بیٹھا تھا..... نے یہ رپورٹ بھیجی تھی۔ علاوہ ازیں مذکورہ جہاز میں بہت سارے ہلکے ہتھیار بھی لوڈ ہو رہے تھے۔ اسرائیل کی کھلی جارحیت کے جواب میں فلسطینی مجاہدین کی بھی اس طرح کی خفیہ کنگ کی ترسیل کا سلسلہ جاری رہتا تھا جسے سبوتاژ کرنے کے لیے اسرائیلی جاسوس ان مذکورہ اسلامی ممالک میں گھسے بیٹھے تھے۔

بہر طور کمیٹین پر ایمان کے لیے یہ خبر چونکا دینے والی تھی۔ اس جہاز کو تباہ کرنے کے لیے پریمان اور فوت فوری طور پر ایکشن پلان کے لیے سر جوڑ کے بیٹھے گئے۔ ساتھ ہی آبدوز کو دوبارہ سمندر کی گہرائیوں میں اتارنے کا بھی حکم جاری کر دیا گیا۔

ادھر جس وقت عابد شکھری اور نائما آبدوز آگوستا کی پشت پر سوار اس کے ایمر جنسی دروازے کے ڈھکن کو کھولنے کی سر توڑ مگر نام کام کوششوں میں مصروف تھے تو اس وقت انہیں گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ ان کے چہروں کے رنگ زرد پڑ گئے۔ یہ لوگ بھی سمجھے کہ شاید آبدوز دوبارہ سمندر کی گہرائیوں میں اترنے والی ہے مگر دوسرے ہی لمحے عابد ٹھٹکا۔ ایک جگہ سے باڈی شق ہوئی تھی دونوں کو ہان کی آڑ میں چلے گئے۔ اس وقت پروویبل اینڈ ریڈ اریکشن کے دو افراد معمول کی بیرونی چیکنگ کے لیے باہر آئے تھے۔ یہی وہ موقع تھا جب عابد اور نائما ان کی نظروں سے بچ کر دروازے سے فوراً اندر کھسک گئے۔ وہ دونوں مذکورہ افراد ریڈ اریسٹم کی ایک معمولی خرابی کو دور کرنے کی نیت سے آئے تھے، جس کی ایک ٹیکنیکل خرابی کا تعلق باہر سے تھا۔ خرابی تھوڑی دیر بعد ہی دور کر لی گئی تھی اور جلد ہی انہیں اندر داخل ہونے کا کاشن مل گیا کیونکہ آبدوز نیچے جانے والی تھی۔ وہ دونوں لپک کر اندر داخل ہو گئے اور خود کار دروازے ایئر ٹائٹ لاگ کر دیے گئے۔ وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ دونوں واردان کی موت بن کے اس خطرناک اسرائیلی ایٹی آبدوز کے اندر داخل ہو چکے تھے۔

☆☆☆



قریب پڑتا تھا..... اس مقام سے تقریباً پچیس کلومیٹر دور جنوب مشرق کی طرف سے ایک دوسرا راستہ صحرائے نجف کی طرف جاتا تھا جدھر اسرائیلی ڈیمون ریسرچ پلانٹ تھا۔ فارم کی عمارت کے ایک صاف سترے کمرے میں یہ پانچوں مجاہد بیٹھے تھے۔ رات کا کھانا سرو کیا جا چکا تھا جو خاصا پر تکلف تھا۔ کھانے میں بھیڑ کا بہنا ہوا گوشت، ایلے ہوئے چاول، روٹی اور کھجوروں کا مرتبا بھی شامل تھا۔ حسن علی خود بھی شامل تھا۔ کمرے میں روشنی تھی اور یہ خاصا بلند چھت والا کمرہ تھا۔ ایک عمر رسیدہ ملازم بھی وہاں موجود تھا مگر لٹلی نے اس کی چال ڈھال سے محسوس کیا تھا کہ اس کی ملازمت کی نوعیت اور ہی قسم کی تھی تھی پھر کھانے کے دوران لٹلی نے ایک اور بات محسوس کی تھی۔ مذکورہ ملازم کو اس نے کئی بار خود کو پہ خور گھورتے نہی پایا تھا اور جب لٹلی کی غیر ارادی طور پر اس پر نگاہ پڑی تھی تو اس نے یکدم اپنی نظرس دوسری طرف پھیر لی تھیں۔ جانے کیوں لٹلی کے دل میں کھٹک ابھری۔ کھانے کے بعد قبوے کا دور چلا۔ اس وقت لٹلی نے حسن علی کو اپنے نئے مشن سے بھی آگاہ کرنا تھا مگر..... اس کے مذکورہ ملازم کی وہاں غیر معمولی موجودگی اور اس کی طرف سے پیدا ہونے والی نامعلوم سی کھٹک کے باعث وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ نہ ہی اسے یہ موقع مل پاتا تھا کہ وہ حسن علی سے اس کے بارے میں استفسار کرے۔

بالآخر حسن علی نے خود ہی لٹلی کے چہرے اور اس کی بار بار ابھن آمیز نگاہیں اپنے ملازم پر بیڑتے دیکھ کر فوراً بھانپ لیا اور پھر اس کی طرف آنکھوں آنکھوں میں اشارہ کرتے ہوئے ہولے سے لٹلی کو مخاطبہ کر کے بولا۔

”عزیزی لٹلی! بات تو کچھ صحیح ہی محسوس ہوتی ہے مگر بتا دینا بھی مقصود ہے..... یہ..... میرا حساب کار (مشق) محمود ہے۔ جس کے اکلوتے بیٹے اسد کو غداری کی پاداش میں تمہاری گولی کا نشانہ بننا پڑا تھا۔“

لٹلی..... اپنے میزبان اور ہمدر حسن علی کی اس بات پر بری طرح چونکی۔ اس بوز سے بد نصیب باپ پر دکھ اسے بھی تھا کہ تموزے دنوں پہلے ل بات ہے جب اسی جگہ اسد نامی جوان اس کے ہتول کی گولی کا نشانہ بنا تھا، وہ اس بد نصیب آدمی کا واحد اکلوتا بیٹا تھا۔

وہ حسن علی سے اذراہ اسف بولی۔ ”مجھے بھی اس بات کا دکھ تھا۔ میرا ارادہ اسد کو ہلاک کرنے کا نہیں تھا حالانکہ اس کا جرم ناقابل معافی تھا۔ اسد کی غداری آشکار ہوتے ہی میں اسے صرف لعن طعن کر کے چھوڑ دینا چاہتی تھی مگر.....“

دنگہ رکھتے ہوئے یہ پانچوں جری مجاہد پانچواہ ہی روانہ ہوئے تھے۔ اس بار انہوں نے اپنا ”اسٹے پوائنٹ“ ابولھر کے سرائے کے بجائے کھجوروں کے تاجر حسن علی کا فارم مقرر کیا تھا۔ یہ وہی کھجوروں کا فارم تھا جہاں کچھ عرصہ پہلے لٹلی ایک ناخوشگوار اور سخت تجربے سے گزر چکی تھی۔ جب حسن علی کے حساب کار محمود الحسن کے بیٹے اسد نے غداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے لٹلی کے کھانے میں بے ہوش کرنے کا سٹوف ملا دیا تھا تاکہ بعد میں وہ اسے ایک اسرائیلی یہودی افسر کے حوالے کر کے من مانگا انعام وصول کر سکے۔ مگر لٹلی نے اپنی تربیت اور ذہنی فراست کو بروئے کار لاتے ہوئے غداری اسد کی یہ مکروہ سازش ناکام بنا دی تھی، نہ صرف یہ بلکہ اسے اپنی ہتول کی گولی سے جہنم داخل بھی کر ڈالا تھا۔

ریڈیو انٹریکس سسٹم پر لٹلی نے حسن علی سے رابطہ کر کے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی آمد کے بارے میں مطلع کروایا تھا۔ بیت مغانہ والے اپنے خفیہ ٹھکانے سے نکل کر یہ لوگ ایسے مقام پر یہ خیریت پہنچ گئے جو طے شدہ تھا۔ یعنی حسن علی کی بھیجی ہوئی گاڑی انہیں لینے کے لیے وہاں پہنچنے والی تھی۔ تھوڑی دیر میں ایک پرانے ماڈل کارا کٹ ٹرک وہاں آن پہنچا۔ ڈرائیونگ سینیٹ میں صرف دو افراد تھے۔ بغیر وقت ضائع کیے یہ پانچوں کد کڑے مار کے ٹرک کے پچھلے بچھلے والے حصے میں مختلف خالی جگہوں میں جا دیکھے..... ٹرک کو دانستہ طور پر کھجوروں کی بوریوں سے لادا گیا تھا..... ان سب کے سوار ہوتے ہی ٹرک روانہ ہو گیا۔

رات چھتے لگی تھی۔ آج سحاق چاند کی رات تھی..... طباق چاند کے مقابلے میں سحاق چاند کی رات وقت سے پہلے ہی اتری ہوئی محسوس ہوتی ہے اور اپنے عروج پر پہنچنے پہنچنے سخت تاریک ترین رات کہلاتی ہے..... ایسی ہی شب پیدا اس وقت بھی طاری ہو چکی تھی۔ ہر سو اندھیرے کی چادر سی اتی ہوئی تھی۔ کھلے تاریک آسمان پر ستارے بھی کم ہی نظر آ رہے تھے۔ کھجوروں سے بھرا کٹ ٹرک نیم صحرائی علاقے سے گزر رہا تھا۔ اس کی میڈیٹیشن بھی کم ہی پڑ رہی تھی۔ تاہم گھانا ٹوپ اندھیروں میں یہ بھی کم نہ تھی۔ ڈرائیور بڑی مشاقی کے ساتھ منہ سب رفتار سے ٹرک دوڑا رہا تھا اور اس نے دانستہ ایسے راستے کا انتخاب کیا تھا جو معمول سے ہٹ کر تھا اور شرت گت بھی۔

پون گھنٹے بعد یہ سب بہ خیریت..... حسن علی کے کھجوروں والے فارم میں جا پہنچے۔ یہاں سے تیونائی یعنی ڈیوڈ اسٹار کے اسٹیٹ ہیڈ کوارٹر کی طرف جانے والا راستہ



عمود الحسن نے اپنے عہد کے اندر سے ایک پستول نکال کر لیلیٰ پر تان لیا۔ اس کی حرکت پر وہیں موجود حسن علی سمیت سب بکا بکا رو گئے۔

”م..... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بے رحم عورت!.....“ حساب کار عمود جوش غیظ سے لرزتی آواز میں لیلیٰ کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”تت..... تم نے..... میرے جوان بیٹے..... میرے واحد سہارے اسد کو جس بے رحمی سے اپنی گولی کا نشانہ بنایا تھا، آج میں تم سے اس کا انتقام لے کر رہوں گا۔“

لیلیٰ کے چہرے پر سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ باقر کی آنکھیں بھی پھیل گئی تھیں۔ اس کے تینوں ساتھی بھی اس اچانک اور بالکل غیر متوقع صورت حال پر ایک لمحے کو بہت ہتکھڑے رہ گئے تھے مگر حسن علی نے ہمت کرتے ہوئے اپنے حساب کار عمود سے.... حکمانہ درستی سے کہا۔ ”یہ کیا پاگل پن ہے..... عمود.....؟“

”یہ پاگل پن نہیں ہے آقا یہ خون کا بدلہ خون ہے.....“ وہ فرمایا۔ اس کے بیٹے کی موت نے اسے انتقام میں اندھا کر ڈالا تھا۔ ”یہ خون کا صلہ اسے صاف بھی کر سکتی تھی۔“

”میں اسے واقعی ہلاک نہیں کرنا چاہتی تھی۔“ بالآخر لیلیٰ نے ہمت کر کے جوتی عمود سے کہا۔ ”مگر وہ محض روپوں ہیوں کے لالچ میں یہودیوں کا آلہ کار بن چکا تھا اور ہمارے شہید مجاہدوں کی قربانیوں کو نہ صرف خاک میں ملاتا رہا تھا..... بلکہ..... ان کے فلسطین اور قوم کے حق میں بنائے گئے منصوبوں کو بھی آئندہ سبوتاژ کرنے کا ناپاک عزم کیے ہوئے تھا۔ ایسے میں.....“ لیلیٰ کی بات حلق میں ہی اٹک گئی کیونکہ اس وقت کمرے میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا..... اس میں ایک بیچ بھی شامل تھی۔

☆☆☆

پی فرنٹ کا خالد بن جبیر اپنے ساتھی فتح دانہال جبکہ الجہاد کی زبیدہ اپنے ساتھی فاروق کے ساتھ ”لیبیائی مشن“ پر مشترکہ طور پر روانہ ہونے کی پلاننگ میں مصروف تھے..... انہیں اٹلی میں سسلی کے جزیرے کو انڈر آئی لینڈ پہنچنا تھا جہر نہیں..... اسرائیل کا ایک بڑا خفیہ ”سٹ آؤٹ سسٹم“ ہاؤس کرنا تھا اور وہ تھا اسرائیلی اسٹیشن.....

اپنے آپ مشترکہ لائحہ عمل کے تحت انہوں نے اٹالین پاسپورٹ کے ذریعے ہوائی سفر کو ترجیح دی تھی۔ اگرچہ پہلے ان کا ارادہ حدیہ کی بندرگاہ میں بحری سفر کرنے کا تھا مگر اس میں خطرہ بھی تھا۔ یہ غیر محفوظ روٹ ہوتا ان کے لیے جبکہ

”میں سمجھتا ہوں.....“ حسن علی نے ہولے سے یہ کہتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ ”اسد بیوں کے لالچ میں آ گیا تھا مگر اس کا باپ ایسا نہیں۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے میرے فارم کا حساب کار ہے اور بہت دیانت دار انسان ہے..... خود اسے بھی اس بات کا دکھ ہے کہ اس کے بیٹے نے اچھا کام نہیں کیا تھا..... مجاہدوں کے بعض کڑے اصولوں سے وہ بھی واقف ہے جو فداری کی سزا کو صرف موت برسی ہی سمجھتے ہیں۔ تمہاری نینے والی اطلاع اور اسد سے مشفق خیر پر میں نے عمود الحسن کو قائل کر لیا تھا۔ اس کی طرف سے تم اب بے فکر ہو۔ اس کے دل میں تمہارے لیے کوئی ناراضگی یا کینہ نہیں۔“ حسن علی نے اپنی مختصر اصرارحت بھری گفتگو ختم کی مگر جانے کیوں لیلیٰ کو تسلی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پچھلے چند منٹوں کے دوران عمود کی اس کی طرف ٹھورتی نظروں میں اس نے کئی سوالوں کی چیم کو انتقام کے شعلوں میں لپٹے ہوئے محسوس کیا تھا۔ لیلیٰ نے اس کو اپنے ایک فطری وہم آمیز خدشے پر بھی محمول کرنے کی کوشش چاہی تھی لیکن جیٹ..... وہ مطمئن نہ ہو پائی۔

”اس بار تم لوگوں کا کیا مشن ہے؟“ بالآخر لیلیٰ کو پرسوج انداز کی خاموشی میں مستغرق پا کر حسن علی نے پوچھا۔ مگر اب لیلیٰ کا چین اور اعتبار رخصت ہو چکا تھا۔ اس نے ہار دزدیدہ نگاہوں سے عمود کی طرف دیکھا جو حسن علی کی آٹری بات پر دانستہ قریب آ گیا تھا۔ لیلیٰ نے ایک لمبی ہنکاری خارج کر کے دانستہ اتنا کہا۔

”اس بار ہمارا مشن ذرا اہم نوعیت کا ہے..... جس کے مطابق.....“ لیلیٰ نے اتنا کہہ کر پھر کن انکھوں سے عمود الحسن کی طرف دیکھا۔ وہ اسے ہمہ تن گوش نظر آیا۔ اگرچہ یہ ظاہر اس نے اپنی توجہ کی اور جگہ مرکوز کر رکھی تھی مگر اس نے کان لیلیٰ کی مشن آشکار کرنے والی گفتگو پر کھڑے محسوس ہو رہے تھے، لہذا یہاں تک کہنے کے بعد لیلیٰ دانستہ چپ ہو گئی اور یونہی اس کے قبوے کی تعریف کر ڈالی۔ حسن علی بھی ایک جہان دیدہ آدمی تھا، وہ لیلیٰ کے مسلسل تذبذب میں جتلا رہنے کا مطلب سمجھ ہی چکا تھا لہذا بولا۔

”شکر ہے..... میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہیے..... میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔“

لیلیٰ نے اندر ہی اندر سکون کی سانس لی۔ وہ یہی چاہتی تھی کہ حسن علی اسے مشن بتانے پر اس وقت مجبور نہ کرے اور وہی ہوا۔ حسن علی اٹھ کھڑا ہوا تو یہ سب بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر اچانک علی..... ادھیز عمر حساب کار



ڈرائیور نے ہولے سے کہا اور پھر یہ سب لوگ بلیڈ اور پلے رنگ کی مریبانوں میں سوار ہو گئے۔  
 ”مجھے سکندر کہتے ہیں، ہم اس وقت وکسپور یہ مارکیٹ (Vucciria Market) سے گزریں گے۔ وہاں ایک ریٹائرمنٹ میں تمہیں اترنا پڑے گا۔ وہاں میرا ایک ساتھی ویٹر کے بیس میں راہنمائی کرے گا۔“  
 سکندر نامی ڈرائیور نے اپنی نظریں سامنے وینڈا سکرین کے پار جمائے رکھتے ہوئے بڑی متنت سے کہا۔

”کیا ہمیں آج کہیں ٹھکانا کرنا پڑے گا، یا.....“  
 خالد نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چہرہ ڈاکٹر سکندر اس کی چھوڑی ہوئی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔ ”ہاں!..... تم لوگوں کو کم از کم دو دن یہاں مختلف مقامات کی سیر کرنا ہوگی اور کچھ تاریخی مقامات میں دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے تصویر کشی کرنا ہوگی لیکن خبردار..... کسی مقامی آدمی سے الجھنے کی غلطی نہ کرنا۔ اٹلی میں مافیا کی ڈان کے ”دی عام افراد کے روپ میں گھومتے پھرتے ہیں..... غیر ملکی ٹورسٹ ان کا خاص شکار ہوتے ہیں..... ان کا مقصد محض خوف زدہ کر کے بلیک میل کرنا اور اپنے عمرمانہ مفاد کے لیے استعمال کرنا ہوتا ہے۔“  
 ایک لمبے توقف کے دوران اس نے ڈرائیور کو موڈ کراپنے برابر میں بیٹھے خالد کی طرف بھی دیکھا تھا پھر آگے بولا۔

”سسلی میں تمہارا چینی طور پر پارلمو (Palermo) میں ہی قیام ہوگا۔ بالخصوص وہاں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا۔ سسلی پارلمو..... خطرناک مافیا کی چیفس کا گڑھ ہے لیکن اگر تم لوگ اپنے کام سے کام رکھو گے، تو تمہارے مشن کے لیے اٹلی اور سسلی سے زیادہ مملو ترین مقامات کوئی نہیں ہو سکتے۔“

”تمہارا مطلب ہے..... یہاں ہمیں کسی اسرائیلی خفیہ ایجنسی کا کوئی ڈر نہیں ہونا چاہیے؟“ غنمی سیٹ پر قاروق اور دانیال کے ساتھ براہیمان زبیدہ نے اٹلی بارلب کشائی کرتے ہوئے سکندر سے دریافت کرنا چاہا۔  
 ”یقیناً۔“ وہ بولا۔ ”اس لیے تو کہہ رہا ہوں..... بس! اپنے کام سے کام رکھنا۔“

”ہم یہاں ویسے بھی سیر پانا کرنے نہیں آئے ہیں..... لہذا عظیم مشن سے زیادہ ہمیں یہاں کسی شے میں دلچسپی سرے سے ہی نہیں ہے۔“ قاروق نے چپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ شاید سکندر کا بار بار انہیں یہ کہنا سے برا لگا تھا۔  
 ”تم شاید میری بات کا مطلب نہیں سمجھتے دوست!“  
 سکندر نے وینڈا سکرین کے اوپر لگے بیک ویو مرر میں ایک نظر

ہوائی سٹر کے لیے اٹالین پاسپورٹ پر اسرائیلی حکام کچھ زیادہ چیکنگ کے مراحل سے مسافروں کو گزرنے نہیں دیتے تھے کہ اسرائیل کے عرصہ دراز سے اٹلی سے اچھے تعلقات اور روابط تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اٹلی اور سسلی میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کرسچین کے علاوہ وہاں ایک بڑی تعداد میں ”جیوش کیوٹی“ بھی رہتی تھی۔ غالباً بحیرہ روم کے قریب واقع اٹلی واحد ملک تھا جس سے اسرائیل کے اچھے تعلقات تھے جبکہ مسلم کیوٹی اٹلی میں تھوڑی تعداد میں تھی۔

اٹالین پاسپورٹ کا انتظام فلسطینی مجاہد گروپوں کے لیے چنداں مشکل نہ تھا۔ ان کے ہمدرد جوئس سے مراٹس اور لیبریا سے اردن اور شام بشمول قبرص تک پھیلے ہوئے تھے۔ چند دنوں بعد ہی یہ دونوں فلسطینی گروپوں کے اہم کمانڈوز..... ٹورسٹ کے بیس میں گل ایب سے اٹلی کی طرف پرواز کر چکے تھے۔ مختلف ناموں اور مختلف بیس میں یہ لوگ ایک خشک دوپہر میں اٹلی کے دارالحکومت روم کے انٹروپورٹ میں اترے۔ ان چاروں (خالد بن جبیدہ، زبیدہ، قیسری، وحید دانیال اور قاروق) نے مغربی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ ایڈ ونچر کٹ نما فیکر سامان تھا۔ کیمرے اور ہینڈری کیم کے علاوہ ان کے پاس ٹورسٹ گا بیڈ بک اور دیگر ایسا چھوٹا موٹا سامان تھا جو انہیں مکمل طور پر ٹورسٹ گروپ ظاہر کرتا تھا۔ خالد اور زبیدہ نے ایک دوسرے کو میاں بیوی کے طور پر شوکر رکھا تھا۔ باقی دانیال اور قاروق ان کے دوست تھے۔ لیبریا میں مقیم فلسطینی مجاہدوں کی سب سے بڑی سوڈس P.L.O. کا ایک ایجنٹ بھی..... انٹروپورٹ کے باہر ایک ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں ان کے انتظار میں پہلے سے موجود تھا۔ کسٹم ایجنڈا میگزینیشن سے ایک گھنٹا سرکھائی کے بعد یہ چاروں باہر آ گئے۔

ان چاروں کے طے مذکورہ ایجنٹ کو بتا دے گئے تھے۔  
 ”آج موسم خشک ہے مگر دوستوں کے لیے یہ پریشانی کا باعث بہر حال نہیں بنے گا۔“ ایک دہلے پہلے اور ہر ظاہر عام سے نظر آنے والے وردی پوش ٹیکسی ڈرائیور نے آگے بڑھ کر مسکرا کر ان سے کہا، تو جواہا..... خالد کھنڈری مسکراہٹ سے بولا۔

”ہمیں اس کی پوری امید ہے..... بشرطیکہ یہاں سے روانہ ہونے کے بعد کبھی..... (اٹالین کافی) سے ہماری تواضع کی جائے۔“  
 ”کلیئر۔“

دونوں طرف سے مخصوص کوڈورڈز کے ادا ہوتے ہی



قاروق کا برا سا منہ بننے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ”اس میں کیا فک ہے کہ مجاہدین کو ہمیشہ اپنا مشن اپنی جان سے بھی بڑھ کر عزیز ہوتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اگر کوئی تم سے خواہ مخواہ بھی الجھنے کی کوشش کرے تو اسے طرح دے جانا۔ بس ایسی مافیائی ٹاؤٹ کے گھبرے سے بچنے کا واحد طریقہ ہے۔ تم شاید نہیں جانتے کہ..... پوری دنیا کی سب سے زیادہ طاقت ور مافیائی اٹلی اور سسلی میں سرگرم ہے۔ اٹلی کے قدیم شاہی خاندان ”باربرن“..... انہی کے ہاتھوں زوال پذیر ہوئے۔“

”تمہاری رہنمائی کا شکریہ برادر! ہم اب واقعی اس بات کا خاص خیال رکھیں گے۔“ وائیل نے مشکور لہجے میں کہا اور قاروق نے بھی جیسی انداز میں دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

کھڑکی سے باہر اٹلی کے اس خوب صورت تاریخی شہر (دارالحکومت) روم کے نظارے بہت دلچسپ تھے مگر چاروں مجاہدوں کے لیے ان میں کوئی رنگینی نہ تھی۔ اس کے برعکس ان کے دل و دماغ میں جوش جنوں اور فیتہ کی مستحمانہ آگ بھری ہوئی تھی، اپنے عظیم مجاہدوں ابو جہاد اور ظہیر اللوزیر کے اسرائیلی بیویوں کے ہاتھوں بہانہ گل پر ان کے سینے آتش انتقام سے بھرے ہوئے تھے اور آج وہ انہی کا بدلہ چکانے آئے تھے۔ ان کے اس اہم مشن کی کامیابی سے نہ صرف اسرائیل کے خارجی عظیم تر مفادات پر کاری ضرب پڑتی بلکہ آئندہ کے لیے ان کے چہرے ہوئے ہمدردوں کی جاری رسد کی صورت میں خفیہ امداد کی رکاوٹیں بھی دور ہو جائیں۔ یہی نہیں..... برادر اسلامی ملک لیبیا کو جس اسرائیل کی طرف سے کسی بھی وقت انہی جھنڈے کا خدشہ دامن گیر رہتا تھا، وہ بھی ایک طویل عرصے کے لیے تس جاتا..... جب تک لیبیا کو سنبھلنے اور اس کا جتنی اصولوں کے تحت کچھ سدباب کرنے کا اچھا خاصا وقت مل جاتا..... یہی سب تھا کہ خود لیبیا بھی اپنے ہاں مقیم فلسطینی مجاہدوں کو سپورٹ کرنے والے ایسے مقتدر ہمدردوں کے لیے راجت ہوار کے ہوئے تھا۔

تھوڑی دیر بعد یہ لوگ..... وکسیور یہ ماریٹ میں سڑک کے بالکل کنارے ہی واقع ایک اوپن انٹرنیشنل ریسٹورنٹ کے قریب جا پہنچے۔

جیسی انہیں وہاں چھوڑ کے روانہ ہو گئی۔ البتہ..... وقت و رخصت..... سکندر نے اتنا ضرور کہا تھا کہ یہ وقت ضرورت ان سے دو بارہ ملاقات بھی ہو سکتی ہے۔

ریسٹورنٹ میں بھانت بھانت کے لوگ موجود

تھے۔ اریب قریب نوڈ اسٹائل کی بھرماری تھی۔ سڑک کے دو روہ گلیاں بھی تھیں۔ ان گلیوں کی بلند دیواروں پہ اقامتی گوشوں پر قدیم طرز تعمیر کے حامل چوبارے نظر آ رہے تھے۔ کہیں نیم برہنہ عورت و مرد کے جیسے تھے تو کہیں جانوروں کو تیر سے شکار کرتے پتکے۔

ریسٹورنٹ میں موٹو سرخ و سفید چڑیوں والے مرد عورتیں، زیادہ تر بنیان اور ٹیکروں میں ہی نظر آ رہے تھے۔ اس کی وجہ دھوپ اور موسم کی خشکی تھی۔ دھوپ کو تو یہ لوگ ویسے بھی ایک نعمت کا درجہ دیتے تھے اور چلتے پھرتے گویا ”سن باتھ“ کا کوئی موزن باتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ کسی کو کسی سے کوئی غرض نہ تھی اور کوئی اپنے اپنے لوگوں میں یا پھر کھانے پینے میں مشغول تھا۔ ایسے میں سکندر کی حسیبہ انہیں باطل ہی محسوس ہو رہی تھی کہ کوئی جان بوجھ کر ان سے یہاں الجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

بہر طور یہ چاروں جیسے ہی ایک خالی میز کی طرف جا کر براجمان ہوئے بول کے جن کی طرح ایک لمبا سا شخص ان کی طرف بڑھا۔ اس کے جسم پر مذکورہ ریسٹورنٹ کے مخصوص موٹو گرام والی وردی تھی جس کی پشت پر مچھلی اور سینے پر آرکٹوپس بنا ہوا تھا۔ گویا یہ ریسٹورنٹ ”سی نوڈ“ کے نیے مشہور تھا۔

”ڈیپ فرائنڈ پران اینڈ فرینڈ اور زبردست کافی لے آؤ۔“ خالد نے اس ویٹر کی طرف پہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوکے سر! کیا آپ آرکٹوپس کی ڈش پسند فرمائیں گے جو یہاں کی ایک خاص ڈش ہے؟“

ویٹر نے سواہر ہانہ کہا تو خالد نے فقط نفی میں سر ہلا دیا۔ لیکن اس ویٹر نے انہیں ریسٹورنٹ کے اندر ایک میز پر جا کے بیٹھنے کو کہا۔ بس کانہر بھی اس نے بتا دیا اور خود مستحق انداز میں آرڈر لے کر واپس پلٹ گیا..... لیکن ویٹر ان کا مطلوبہ تھا۔

”کیا یہ بھی کوئی نوڈورڈز تھے..... یا محض آرڈر؟“

زبیدہ نے مسکراتے ہوئے نیچی آواز میں خالد سے پوچھا۔

”دونوں۔“ خالد نے مختصراً جواب دیا اور پھر یہ چاروں ریسٹورنٹ کے اندرونی گوشے میں آ گئے۔

ان کے مطلوبہ نمبر والی میز کو نے میں اور نسبتاً الگ تھلک مقام پر چنا۔ یہ چاروں وہیں جا بیٹھے۔

بلاشبہ مذکورہ ویٹر PLO کا ہی ایجنٹ تھا جس کے بارے میں سکندر نے انہیں بتایا تھا۔ ان کے میز کرسیاں سنبھالنے ہی وہ ایک بڑی سی ٹرے میں کھانا سجانے



سے PLO یعنی ہمارا تیسرا اور آخری ایجنٹ ملاقات کرے گا جو تم لوگوں کی مشن کے سلسلے میں سپورٹ اینڈ لاجسٹک فراہم کرنے کے بعد غائب ہو جائے گا۔ آگے تم چاروں کو اپنی صوابدید پر سب کچھ کرنا ہوگا۔ اس کی بات پر خالد نے اپنے سرکوشاہات میں جنبش کی۔

ان چاروں کو جہاں جگہ ملی یہ وہاں پڑ کے سو گئے۔ شام گئے جاگے تو..... PLO کے اس دوسرے ایجنٹ نے ان کے لیے مکن میں کچھ کھانے پینے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ نہادھو کر یہ سب لوگ تازہ دم ہو چکے تھے۔ کھانے کے بعد..... اس ایجنٹ نے انہیں ایک تھری وکیلر کار میں بندرگاہ کی طرف روانہ کر دیا۔

انہوں نے جس سرم (sire mar) میں سسلی کی طرف اپنا سفر شروع کرنا تھا، اس کی نشاندہی اور نکلنے کا بندوبست بھی اس "ویئر نما" ایجنٹ نے کر دیا تھا۔ بندرگاہ اور اس کے اطراف کا ملاقہ بھی بڑا دلچسپ تھا۔ تھری وکیلر کار کو تین لیرا ادا کر کے یہ لوگ اتر آئے، ایک دو منزلہ گلوری ریور کروزر سسلی کی طرف روانگی کے لیے موجود تھی۔ گلف آفس کی طرف دانیال اور فاروق نے رخ کیا جبکہ خالد اور زبیدہ ہی پورٹ کے اندر بڑھ چکے تھے، یہاں ایک نہایت کم رش والی جگہ پر رک کر پتھر بے پروا نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگے۔ خالد بن جنید نے جینز کی ٹائٹ پیٹھ پہن رکھی تھی اور ہاف آسٹین کی نیلی شرٹ، آنکھوں پہ اس نے سیاہ چشمہ چڑھا رکھا تھا۔ بچیس چھبیس سالہ خوب رو خالد اس وقت کسی کھلنڈرے نوجوان کی طرح ہی نظر آ رہا تھا جبکہ تیس پچیس سالہ گوری رنگت اور صحت مند جسم کی مالک زبیدہ نے بھی وقت اور حالات کی مجبوری کے باعث نختوں سے اونچی سیاہ چست پتلون اور اوپر لوز شرٹ پہن رکھی تھی۔ گھنے بال کا نہروں تک آتے تھے جنہیں اس نے پونی ٹیل کر رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں پر بھی دھوپ کا چشمہ تھا جسے اس نے اپنی پیشانی پہ کر رکھا تھا۔ ایسے میں اس کی غیر معمولی کشادہ آنکھوں کی خوب روئی گہراہن لیے ہوئے تھی۔ دانیال اور فاروق ہم عمر تھے، جو تیس بائیس کے پنے میں تھے۔ انہوں نے لائیک ٹیلرز پر نیکی اسٹائل کی بنیان ڈالنے کی شرٹیں زیب تن کر رکھی تھیں۔

اب تک سب ٹھیک جا رہا تھا۔ خالد اور زبیدہ کو خوشی تھی کہ ان کے مزید دو دن ضائع ہونے سے بچ گئے تھے، ورنہ تو ٹیکسی ڈرائیور کے روپ والے PLO کے ایجنٹ نے یہی کہا تھا کہ ممکن ہے انہیں دو روز بعد سسلی کے لیے روانہ

وہاں آن پہنچا اور سرو کرنے کے دوران جب وہ خالد اور زبیدہ کے درمیان میں جھکا تو ہولے سے ہول بھی چلا گیا۔

"تیس منٹ میں یہ سب ختم کرنا ہوگا، جب میں ملنے لے کر پلٹوں گا تو اس وقت میری ڈیوٹی بھی آف ہو چکی ہوگی۔ باہر نکل کر تمہیں مجھ سے ملے بغیر..... مجھے صرف فالو کرنا ہوگا۔ مگر میرے پیچھے آنے کا تمہارا اعزاز ایسا ہی ہونا چاہیے جیسے تم اردگرد کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے ہو۔ کلیئر؟"

"اوکے....." خالد نے ہولے سے جواب دیا۔ یہاں سے بچیس منٹوں کے دوران یہی کچھ ہوا۔ یہ چاروں اب ریٹورنٹ سے نکل کر ویٹر کے پیچھے چلنے لگے جس کے جسم پر اب وروی کے بھائے عام سامقانی لباس تھا۔ یہ پیدل سفر بھی پندرہ تیس منٹ جاری رہا۔ اس کے بعد انہوں نے ویٹر کو ایک ٹگ سی گلی میں مڑتے دیکھا۔ یہ بھی اس میں مڑ گئے۔

یہاں انہیں ایسا کوئی خطرہ تو نہ تھا مگر..... یہ سب احتیاط کے پیش نظر ہی کیا جا رہا تھا۔ گلی میں مڑتے ہی ویٹر ایک چکر وار زینے ملے کرنے لگا اور اوپر ایک اتقامتی قلیٹ کے دروازے پر پہنچ کر اور جیب سے چابی نکال کے دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے لگا۔ یہ چاروں بھی زینے چڑھتے وہاں پہنچ چکے تھے۔

اگلے چند منٹوں بعد یہ سب اندر ایک کمرے میں موجود تھے، قلیٹ دو کمروں کا تھا۔ مختصر سا لاؤنج تھا۔ اس کی ہر شے بکھری ہوئی تھی۔ وہ ایک کمرے میں جا بیٹھے۔ ویٹر نے اپنا نام بتائے بغیر انہیں الٹ رہنے کا کہا اور صرف اتنا بولا۔ "تم لوگوں کو آج رات ہی سسلی کے لیے روانہ ہونا پڑے گا۔ اس لیے ابھی تم آرام کر کے سفر کی ٹکٹیں اتار لو۔" "سسلی پہنچ کر ہمیں چھبیاروں اور ایک عدد خطیہ ٹھکانے کی ضرورت پڑے گی۔ اس کا کیا بندوبست ہے؟" خالد بن جنید نے اس سے دریافت کیا تو وہ بولا۔ "یہ سب تمہیں سرم (sire mar) میں سوار ہونے کے بعد معلوم ہو جائے گا۔"

"سرم.....؟" خالد نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ ایک کار فیوری سروں ہے۔ ایک گلوری ریور کروزر..... جو لوگوں کو اٹلی اور سسلی کے جزائر تک پہنچانے کی سروں کہلاتی ہے جبکہ عام راستوں اور سڑکوں کے لیے یہاں انٹرنیشنل سروں ہے....." اس نے بتایا۔ "سرم میں ہی سسلی کی طرف سفر کرنے کے دوران تم



چوڑی تھی۔ اس آدمی کے منہ سے کوانڈو کا لفظ زبیدہ کو چوتھانے کا سبب بنا تھا۔ یہ ستر قبیلہ امت کا تھا تاہم ریسٹنگ اینڈ ریٹرننگ کے لیے انہوں نے مشنز کے طور پر ایک سوئٹ لے رکھا تھا۔ یہ ایک پریش نشست آہ تھی۔ ایک دو کا ڈیج بھی کونے میں دھرے پڑے تھے۔ زبیدہ لوٹنے کا کہہ کر باہر نکل آئی تھی اور راہداری سے ہوتی ہوئی اسٹین لیس اسٹیل کی ریٹنگ والی مختصر سیزھیوں کے ذریعے دوبارہ عرشے پر آگئی۔ اس کی عقابلی نگاہوں نے جلد ہی ان دو آدمیوں کو دیکھ لیا جو دو فولڈنگ چیئر پر ایک گول میز کے قریب بیٹھے اسکاچ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دونوں سرخی مائل رنگت کے مقامی ہی آدمی نظر آتے تھے، تاہم زبیدہ کی گھاگ نگاہوں نے تاڑ لیا تھا کہ یہ ہم اچھے قماش کے نہیں لگتے..... ان دونوں میں سے ایک کے منہ سے ہی اس نے کوانڈو کا نام سنا تھا۔ وہ ان کے قریب کی ایک خالی میز پر جا بیٹھی۔ مردوں کو مٹی اسکرٹ والی طرح دار اسارٹ سی ویٹس سرو کر رہی تھی جبکہ مرد ویٹز خواتین کو..... زبیدہ کی میز کی طرف لپکنے والا سفید شرٹ اور ڈی کے نیچے سیاہ پتلون پہنے ایک خوب رو ساویز تھا۔

زبیدہ نے اسے اپنے لیے ایک مرد و لائم جوس لانے کا کہا جو تھوڑی دیر بعد ہی ایک پیگ کی شکل میں اس کے سامنے دھر کے لوٹ گیا۔ نفیس قسم کے بلوریں پیگ کے کنارے پر ادھ کٹا لیمو "اڑسا" ہوا تھا۔

"یار رو جرو!..... میں پاس کے گھسے سے بہت ڈرتا ہوں، کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔" زبیدہ نے ایک کو اپنے ساتھی سے یہ کہتے سنا۔

دوسرا جواباً بولا۔ "نہیں چیک! تاخیر کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا مگر مسئلہ یہ ذرا اور سم کا ہے، کچھ میں نہیں آتا..... ایسے حساس اور نازک معاملات پاس کو خود کروانے چاہیے تھے، لاسکی رابطہ بھی کیا جاسکتا تھا۔"

روجر نامی شخص نے قدرے منہ بسور کے کہا تھا۔ زبیدہ جس مقصد کے لیے یہاں بیٹھی تھی، وہ ابھی تک پورا نہیں ہوا تھا مگر کوانڈو کے لفظ پر وہ بیٹھی رہی۔

"کوانڈو پہنچنا ایک الگ مسئلہ ہے۔ جو خطرے سے خالی نہیں..... میں نے تو سنا ہے وہاں ایسا حساس بلکہ مہلک اور سنگین ترین سکیورٹی سسٹم ہے کہ ایک پرندہ بھی وہاں پر نہیں مار سکتا..... پھر ہم تو....."

"میں بھی یہی کہنا چاہ رہا تھا۔" چک نامی اس کے ساتھی نے بر ملا کہا۔ "ہم تو خیر جو۔ بی چھے نہیں جا رہے ہیں۔"

ہونا پڑے اور شکر تھا کہ "ممکن" نہ ہو سکا تھا اور انہیں اسی روز انٹی (روم) چھوڑنے کا گرین سگنل مل گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دانیال اور فاروق آتے نظر آئے، ان کی چال ڈھال سے لاابالی پن بہ دستور عیاں تھا۔ یہ دونوں پارلر موم (سٹیل) کے چارنگٹ خرید لائے تھے۔

گھڑی رپورٹ کر دیا کہ ان کے سوار ہونے کے آدھے گھنٹے بعد دو تین بار ہلنگ ہنگارنے کی آواز ابھری اور پھر ان کا پارلر موم کی طرف سفر شروع ہو گیا۔

جس وقت یہ آبنائے مہینا سے گزر رہے تھے، اس وقت رات اترنے لگی تھی اور نضا خٹک ہونے لگی تھی۔ اپنی ایڈونچر کٹ سے انہوں نے کچھ گرم جیکٹس وغیرہ نکال کر پہن لی تھیں۔ گھڑی کرور میں ہر شے کی سہولت تھی۔

پارلر موم، پلیئر ڈروم، سوئمنگ پول، کلب..... غرضیکہ وہ سب کچھ جس کی یہاں کے لوگوں کو خوشی میں ہمیشہ ضرورت رہتی تھی۔ سفر انہی گہما گہمیوں اور رنگینیوں کے ساتھ جاری تھا کہ اچانک رپورٹ کرور کی رفتار بتدریج کم ہونے لگی، یہاں تک کہ وہ آبنائے مہینا کے بیچ بلکورے کمانے لگی۔ پتا چلا کہ رپورٹ کرور میں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ اس طرح کا ایک

اعلان مختلف کپارٹمنٹس اور کمروں، تفریحی پوائنٹ پر نصب پیکٹروں پر کیا جانے لگا۔

"ایک معمولی ٹیکنیکل خرابی کے باعث کرورز "لدیلا" کو اسٹاپ کر دیا گیا ہے۔ ہمارا تربیت یافتہ عملہ بہت جلد اس کی خرابی دور کر دے گا..... آپ اپنی تفریح جاری رکھیے۔"

مسافروں کو اس کی کوئی پروا نہ تھی بلکہ انہوں نے اسٹیکر پر ہونے والے اس اعلان کو شاید سنتے میں بھی دلچسپی نہ لی ہو۔ وہ سب اپنی اپنی عورتوں اور تفریح میں مگن تھے مگر.....

خالد اور زبیدہ وغیرہ کے لیے یہ بات باعث پریشانی تھی اس لیے کہ وہ اپنے مشن کی تکمیل میں کسی قسم کی تاخیر نہیں چاہتے تھے۔ بہر طور اب ایک غیر معینہ انتظار کے سوا کیا کیا جاسکتا تھا۔ یہ لوگ عرشے سے اپنے سوشل کی طرف بڑھے۔ کرورز میں لائٹنگ کا بھی غیر معمولی بندوبست کیا گیا تھا۔ رات کی تاریکی میں سب آج پر جیسے کوئی قانون بلکورے لے رہا ہو۔

لوگ اس وقت کو بھی انجانے کر رہے تھے۔

راہداری کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک زبیدہ ٹھکی۔ دائیں بائیں عرشے پر فولڈنگ چیئر اور میزوں پر بھی کچھ لوگ موجود تھے، انہی میں سے دو افراد میں سے ایک کو..... زبیدہ نے اپنے ساتھی سے کچھ کہتے سنا تھا۔ باقی تو وہ کچھ نہ سمجھ پائی مگر..... جو جملہ تیز اور شناسا تھا اس پر ضرور



باس نے ہمارے لیے کوائڈو کے جڑے تک پہنچنے کے لیے ایک تھرو پر اپرچیزل کا بندوبست کروا دیا ہے لیکن..... پھر بھی..... مجھے ایسا لگتا ہے..... جیسے ہم وہاں بغیر وعایت پہنچ بھی جائیں تو وہاں کبھی نہیں لوٹ پائیں گے۔“

”خیر!..... اسکا بات بھی نہیں چک۔“ روبرو اسکا ج و سکی کا ایک گھونٹ بھر کے بولا۔

”ہمارا باس، کوائڈو کی اینٹ سے اینٹ مجا دے گا۔ اسرائیلیوں نے وہاں کھربوں ملین ڈالرز لگائے ہیں۔ وہ اپنے اس خفیہ ایسائی اسٹیشن کا نقصان اور اس کی privacy پر آج تک نہیں آنے دے گا اور پھر سب سے اہم بات یہ کہ چیک ڈو کر کے نام سے سسلی ہی نہیں پورا اٹلی بھی کا پتا ہے۔“

”مگر اسرائیلیوں کو شاید باس کی خطرناکیوں کا علم نہیں۔“

اس وقت اسپیکر ہنکارا۔ مسافروں کو روانگی کی خوشخبری سنا دی گئی تھی۔ رپورٹرز اور ایجا کی فنی خرابی دور کر دی گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد روبرو اور چک بھی اٹھ کر ایک طرف بڑھ گئے۔ مگر زبیدہ وہیں بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے پہ ستانے اترے ہوئے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے سسلی سے پار سوئیک پہلے ہی سے اندر ہی اندر ایک آگ بھڑکی ہوئی ہے اور خود ان چاروں کو بھی ایک ہاتھی نہیں کئی ہاتھیوں کے درمیان رہنا پڑے گا۔

☆☆☆

آکر مین جیری جونیز کی طرف سے گرین سگنل ملنے ہی جزل آنرک فرناش فوراً حرکت میں آیا تھا۔ وہ کمشنر بیریڈ ناؤن کی لاڈلی اکلوتی بیٹی بازغہ کو کسی بھی صورت میں زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک یہودی کی غداری قوم کی تباہی پر مٹج ہو سکتی ہے..... وہ جس قدر سنگ دل اور سفاک ذہنیت کا مالک تھا، اتنا ہی مکار اور عیار بھی تھا۔ اسے اس حقیقت کا بھی خوب اندازہ تھا کہ کمشنر ناؤن بھی یقیناً بہت پہلے سے اس بات کا ادراک کر چکا ہوگا اور وہ اپنی بیٹی کو کسی متوقع سزا سے بچانے کے لیے ضرور ہاتھ پاؤں مار رہا ہوگا لہذا اس نے سب سے پہلے اور فی الفور کمشنر بیریڈ ناؤن کی گرفتاری اور نظر بندی کے احکامات جاری کر ڈالے۔ اس کے بعد..... اس نے بازغہ کی تلاش اور بصورت دیگر اسے دیکھتے ہی گولی مار دینے کے احکامات جاری کر دیے۔ گویا وہ بازغہ کے ڈسجھ وارنٹ جاری کر چکا تھا۔ وہ بھی اپنے ہیڈ کوارٹر کے ”سچویشن روم“ میں تھا کہ اسے ایک چمکادینے والی اطلاع موصول ہوئی، جسے سن کر

فیڈو غضب کے مارے اس کا چہرہ مزید سخ ہو کے مکروہ نظر آنے لگا۔ اگرچہ وہ پہلے ہی بازغہ کی تلاش کے لیے سات لڑاکا اور انتہائی تربیت یافتہ کمانڈوز بازغہ اور اس سرے مریض کی تلاش میں روانہ کر چکا تھا۔ جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ تیہائی حملے کے کسی زخمی مجاہد کو اسٹینٹ سے نکال لے گئی ہے۔ اور اس سلسلے میں جزل فرناش نے اسپتال کے جی ایم ایس کی بھی خوب خبر لی مگر اس وقت اسے بازغہ کے بلیک وارنٹ جاری کرنے کے اختیار نہیں ملے تھے۔ تاہم اس نے مفرور بازغہ کے باپ کمشنر بیریڈ ناؤن کو فوری طور پر اپنے آفس طلب کر لیا تھا۔

بیریڈ ناؤن جیسے ہی اپنا منہ لٹکائے اور سنے ہوئے چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوا تو تہرہ غضب سے جھکتے ہوئے جزل فرناش نے اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ بھاری بھر کم ہونے کے باوجود وہ لمبے ترنگے جزل فرناش کے ہتھوڑے جیسے ہاتھ کا تھپڑ کھا کے چند قدم پیچھے لڑکھڑانے پر مجبور ہو گیا۔

”ناؤن! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اپنی غداری بیٹی کو تم نے ہی فرار کروا دیا ہے، اس سلسلے میں تربیت پسند کے ساتھ۔“

جزل فرناش بھڑیے کی فراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ اس کی آنکھوں سے غضب کی خوف ناک ٹپک رہی تھی۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جہازی سائیکل میز سے بھرا ہوا گبی نال والا خوف ناک پستول نکال لیا اور اس پر تان لیا۔

”آئی ول شوٹ یو..... بتاؤ مجھے کدھر گئی ہے تمہاری غداری بیٹی؟“

ناؤن کی حالت غیر ہو رہی تھی، پہلے تو اس نے دل ہی دل میں شکر کیا تھا کہ اس کی پھول سی نازک بیٹی بازغہ جلد بھی گئی ہوگی، تم از کم اس درندہ صفت آدمی سے دور ہی تھی تاہم وہ جزل فرناش سے خوف زدہ بھی تھا۔ اسے اپنی جان خطرے میں نظر آرہی تھی۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

”سس..... سر!..... مم..... مجھے تو نہیں معلوم..... میں تو خود تیہائی دھاوے کے بعد محل ایبب روانہ ہو گیا تھا..... شہر کے حالات کچھ شیک نہیں تھے۔“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ جزل فرناش طلق کے بل دہازا۔ ”میں پوچھتا ہوں..... تم نے اپنی بیٹی کو کدھر فرار کروا دیا ہے؟“ ناؤن کی پیشانی سے پسینا بہنے لگا تھا، وہ بولا۔



اور اس کا منہ بروشم کی طرف ہے۔ امریکی سیکرٹریٹ میں مجھے بیٹھے الیا بیتہ نے ایک سازش کے تحت عراق کے مخالف دھڑے کے چند عاقبت نااندیش جرنیلوں کو امریکی غیبی احکامات کے تابع بننے پر مجبور کیا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب مشرق وسطیٰ میں علیٰ بحران نے جنم لیا تھا جس کا واحد مقصد عراق کے ممکنہ اٹمی پروگرام کو سبوتاژ کرنا تھا۔ عراقی عوام کی یہ بد قسمتی تھی شاید کہ..... عراقی صدر امریکا کی تہ میں کوڑیا لے ناگ کی طرح چھپے بیٹھے اسرائیلی منصوبے کو نہ سمجھ سکا۔ جس نے اپنے مخلص اور وقار رساتھیوں کا خیال رکھنا اور ان کی باتوں کو اہمیت دینا چھوڑ دیا اور کویت پر چڑھائی کر دی۔ اسرائیلی سازش کا اثر دھماکہ چاڑھے عراق کو لنگھنے کے لیے سرکنا شروع ہو چکا تھا، الیا بیتہ نے نیپل ماؤنٹ پر اکیس فلسطینیوں کو گولیاں مار کے شہید کر دیا۔ اس طرح اسرائیل نے فلسطینی مسئلے کو بھی علیج کے بحران سے شلک کرنے کا جواز پیدا کر ڈالا۔ عراق میں تیل کی راشن بندی کر دی گئی۔ برطانیہ کے سائٹ وزیر اعظم مسٹراڈورڈ بیتہ نے بغداد میں عراقی صدر سے ملاقات کی اور ان سے برطانیہ کے بوڑھے اور بیمار باشندوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ عراق نے فرانس کے سارے 330 اور برطانیہ کے 34 رہنماؤں کو مسٹر بیتہ کے ہمراہ بذریعہ ہوائی جہاز بغداد سے جانے کی اجازت دے دی۔ عراقی ری پبلکن گارڈز مکمل طور پر امریکا کی مٹھی میں تھے اور امریکا اسرائیل کی مٹھی میں تھا۔ عالمی بساط پر اسرائیل نے غضب کی چال چالی تھی۔

علیٰ بحران کے بعد اسرائیل..... عراق کو سبوتاژ کرنے کے لیے اپنے ایک نئے ایجنڈے پر عمل پیرا ہو چکا تھا۔

الیا بیتہ امریکی مقتدرہ کے ذریعے چند ایسے عاقبت نااندیش عراقی جرنیلوں کو قابو کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اسرائیل کا ناگ نہیں... بلکہ ایک آگ اگلنے والے ڈرگیوں کی طرح عراق کو بغداد سمیت جسم کرنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔

یہاں دانشمندانہ ڈی سی بیس الیا بیتہ کے فوہاگ تیل کی چیرہ دستیوں جاری تھیں۔ ادھر..... لندن میں "ہنگامہ آری" کے اس جڑواں بیچ..... شن بیتہ کی مادام میڈوسا..... وہاں پہلے سے "جیوش ہوم" کی مدد سے ایک بڑی تجارتی مہینی قائم کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ ابھی اسرائیل کو امریکا کی طرح کم از کم برطانیہ میں

"میں قسم کھاتا ہوں مرا مجھے اس بارے میں کچھ نہیں پتا۔"

جنرل فرناش کا مکروہ چہرہ لال پیلا ہوا ہوا تھا۔ اس کی چندی چندی آنکھوں سے سفاکی ٹپک رہی تھی۔ وہ شعلہ بار نظروں سے اپنے سامنے خزاں رسیدہ پتے کی طرح سبکپاتے کھڑے کشنر ہیریز ناؤن کو گھورے جا رہا تھا۔ بسی خوف ناک نال والا پستول ابھی تک اس کے دائیں ہاتھ میں تھا جس کی نال کا رخ ناؤن کی طرف ہی تھا اور انگلی ٹریگر پر ہولے ہوئے تھرک رہی تھی۔ کچھ ایسا ہی نظر آتا تھا کہ جنرل فرناش کسی بھی وقت اسے شوٹ کر ڈالے گا۔ اسی وقت گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور چھت کا پلستر اکھڑ کر نیچے گرا۔ اپنا فیٹہ ٹکانے کے لیے جنرل فرناش نے چھت پر قائر ڈاغا تھا۔ بہر طور..... اس نے اسی وقت ہیریز ناؤن کو وروی اتارنے کا حکم دے ڈالا اور اسے نظر بند رہنے کے احکامات جاری کر دیے۔

تھوڑی دیر بعد وہ فون پر ان سات لڑاکا کمانڈوز کو لیز کرنے والے ایجنٹ پالی مور سے رابطہ کر رہا تھا جنہیں اس نے بازغ اور تیسرے مریض (مسن) کی تلاش میں روانہ کیا تھا۔

☆☆☆

"ہنگامہ آری" کے موروثی ہیرو اور بانی یہ الفاظ دیگر یہودیوں کے باپ..... آئرمن ہیری جونیئر کے ساتھ اھصاب شل کر ڈالنے والی کارز میٹنگ بھگتانی کے بعد..... شن بیتہ کی مادام میڈوسا نے ہی نہیں بلکہ الیا بیتہ کے چیف فوہاگ تیل نے بھی سکھ کی سانس لی تھی۔ یہ قول فوہاگ کے مادام میڈوسا خوش قسمت تھی کہ وہ آج آئرمن ہیری کے حساب سے بلکہ اس کے ہاتھوں موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچا تھی۔

دونوں نے وہ رات پروگرام کے مطابق بروشم کے ایک پیرکنٹر ہوم میں اکٹھے بسر کی تھی۔ اس کے بعد شام سے پہلے پہلے وہ دونوں اپنے الگ الگ ہوائی سفر پہ روانہ ہو گئے تھے۔ مادام میڈوسا نے لندن کا رخ کیا تھا جبکہ فوہاگ تیل نے واشنگٹن کی ٹھانی تھی۔ وہ وہاں امریکی وزارت خارجہ کے سیکرٹریٹ میں ایک اہم عہدے پر فائز تھا۔ عالمی معاملات میں گریٹر اسرائیل پلان کے مفادات کو آگے بڑھانا اس کا خاص مشن رہتا تھا..... کیونکہ یہودیوں نے اپنے عظیم اسرائیل کو ایک علامتی سانپ کا نام دے رکھا ہے۔ جو تمام عالم اسلام کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے



مور سے مخاطب ہو کر حکمانہ کہہ اور خود ہی... جواب دیا تھا۔

”بلکہ..... اس کے کسی کام آنے کی کوشش کرو..... تمہاری بھردی اسے متاثر کرے اور تمہارا اس پر کوئی احسان اسے مجبور بنا ڈالے۔“

میڈوسا نے آگے ہدایت دی تو اس کے بجائے نیلی آنکھوں والی جزیلا نے ایک نگاہ قریب بیٹھے اپنے سامنے بالی مور کی طرف دیکھتے ہوئے میڈوسا سے کہا۔

”یہ مسلم لوگ..... بالخصوص دوسرے ملک سے ہائر اسٹڈی کے لیے آئے کسی مقامی فرد سے کم ہی گھلتے ملتے ہیں۔“

”انہیں مجبور کرو..... مجبور..... بہت سے طریقے ہیں۔ کیا تم جیسی گھاگ ایجنٹ کو یہ طریقے بھی بتانا پڑیں گے؟“ مادام میڈوسا نے ورشت لہجے میں جزیلا اور بالی مور کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

”حسن، شباب، شراب سے میری جوانی تک..... ہر جھکنڈے آزما لو..... ہمیں ہر حالت میں یہ دونوں قابل فوجوان چاہئیں۔ انہیں برین واش کر کے اپنے عقیم تر اسرائیل کے لیے استعمال کرنا ہوگا..... وینس اٹ.....“

”اوکے میڈم..... ایسا ہی ہوگا۔“ بالآخر جزیلا نے کہا۔ تھوڑی دیر بعد مادام نے انہیں جانے کا حکم دے دیا۔ ڈیکامیٹہ ان کارپوریٹڈ کمپنی کی اس سات منزلہ عمارت کے ٹاپ فلور کا یہ لہجہ چڑا کاٹنرلس روم بھائیں بھائیں کرنے لگا کیونکہ شن بیٹہ کے۔ دونوں مذکورہ ایجنٹوں کے نکلنے ہی مادام بھی وہاں سے اٹھ کر اپنے شاہانہ طرز کے آفس میں آگئی تھی۔

پچھلے فرش والے آفس پر قبضہ اشیا اور جدیدہ، نفس اور بیش قیمت اشیا سے موزن تھا۔ اس کی دیواریں ہلکے بزرنگ کے شینڈ والے شیٹے کی تھیں۔ جہازی سائز کی میز کے پیچھے اونچی پشت گاہ والی ریو لوٹنگ چیئر نظر آ رہی تھی۔ کرسیوں کے علاوہ نفس قسم کے صوفے بھی لگے ہوئے تھے۔ میز کے سامنے دیوار پر ریٹائلس ایچ کی ٹی وی اسکرین (ایم ای ڈی) نصب تھی۔ مادام میڈوسا کمرے میں پہنچ کر اپنی چیئر کے پیچھے جا کر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔ سامنے دور تک بلند و بالا عمارتیں اور اوپر نیلے آسمان پر سفید بادلوں کی کھوپڑیاں تیر رہی تھیں۔ نیچے معروف شاہراہ تھی۔ وہ ہونٹ پینچنے چندا نے اسی طرح کھڑی کچھ سوچتی رہی، پھر پلٹ کر اپنی بھاری بھرم سیاہ چیئر پر براجمان ہو گئی۔ اس کی میز پر

خاطر خواہ طریقے سے اپنے نیچے گاڑنے کا موقع نہ ملا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ برطانیہ خود بھی امریکا کے آگے سر جھکاتا تھا، تاہم اسرائیل یہاں پر دوسرے طریقے سے اپنے مقاصد حاصل کرنے میں معروف کار تھا۔ شن بیٹہ اس کی واضح مثال ہے۔ ایک بڑی ٹریڈ کمپنی کی کرتا دھرتا مادام میڈوسا نے اس وقت اپنے سیونٹھ لیپ اسٹریپ کے سات منزلہ دفتر کے ٹاپ فلور میں..... دو اہم ایجنٹوں نے بالی مور اور جزیلا کو بلا یا تھا۔

مذکورہ دونوں ایجنٹوں نے ویسٹ یارک سٹارز اور بالخصوص لندن کی انٹرنیشنل اسٹڈی سینٹرز کے پائے کی یونیورسٹی کو چیک کیا تھا۔ آج ان کی رپورٹ ایک پاکستانی اسکالر ڈاکٹر کمال احمد سے متعلق تھی۔

بالی مور اور جزیلا نے ڈاکٹر کمال کے متعلق بشمول اس کے پاکستانی بیک گراؤنڈ کے ساری تفصیل مادام میڈوسا کے گوش گزار کر دی۔ ان میں ڈاکٹر کمال کی اسرائیلیوں کے خلاف آواز بلند کرنے سے لے کر عراقی دوست حماد اندال اور پولیس شریف کی بیٹی جیتھیرن سوٹر کی دوستی تک ساری اطلاعات شامل تھیں۔ یہی نہیں اپنے ہم قوم ہم مذہب بیودی ڈی کارلو کی ڈاکٹر کمال سے ذاتی چپقلش کے بارے میں بھی بتا دیا۔

”چھ فٹ قد، چوڑے شانے، گورا رنگ، خوب رو، ہونہار طالب علم، پیشکش پاکستانی، چہرے پہ شفاف عدسوں کی ٹینگ۔ یہ ظاہر ٹمبرے ہوئے پانی جیسے چہرے پر تاثرات مگر اندر سے غضب کا جو شیلہ اور شعلہ بیاں مقرر وطن کی محبت سے سرشار..... نظر آنے والا ڈاکٹر کمال احمد لیڈز یونیورسٹی کی اب ہر دلعزیز شخصیت بن چکا ہے۔“

جزیلا نے ڈاکٹر کمال کی شخصیت کا صراحت بھرا نقشہ مادام میڈوسا کے سامنے کھینچا تھا۔ تاہم مادام میڈوسا ڈی کارلو کے تذکرے پر فوراً جزیلا کی طرف دیکھ کر ہر جوش لہجے میں بولی۔

”ٹی القور ڈی کارلو سے رابطہ کرنے کی کوشش کرو۔ یہ ہمارے مشن میں بہت اہم ثابت ہو سکتا ہے۔“

”ہاں مادام!..... ایسا ہی ہوگا۔“ جزیلا نے موز بانہ انداز میں اپنے سر کو اٹھاتی جیش دی۔ جس، ہائیس سالہ گوری چٹی اور نازک اندام سی نظر آنے والی درمیانی قد کی جزیلا شن بیٹہ کی ایک خطرناک ٹاپ ایجنٹ تھی۔

”تم کسی طرح..... حماد کے قریب ہونے کی کوشش کرو۔“ مادام میڈوسا نے جزیلا کے ساتھ بیٹھے بالی



دلکش خوشبودن سے بسا مارچ 2015ء کا پر بہار پاکیزہ

# کراچی

نگہت سیما  
اور رفاقت حاوید  
کے دلشیں ناول

زاهدہ پروین کا خوب صورت منی ناول..... جنگل کا پھول

زمر نعیم تشریف لائی ہیں متاثر کن مکمل ناول اسیر وفا کے ساتھ

نبیلہ ابرار کا نیا ناول متاع دل صرف آپ کے لیے

شیریں حیدر کی پُر سوچ تحریر..... آئینہ

رضوانہ پرنس کی حاضری  
فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ کے ہمراہ  
بڑے اداکارہ سنبل ملک کی دلچسپ باتیں

سمرائے تھر کی کھنائیوں سے متعلق سیما رضا ردا کا پر فکر افسانہ

اس کے ساتھ ساتھ عالمی یوم خواتین کے حوالے سے ماہر فلکاروں کی فکر انگیز مگر دلآویز تحریریں جن میں  
سیما بنت عاصم، ام ثمامہ، روشانہ عبد القیوم،  
فرزانہ نگہت، بشری باجوہ، نظیر فاطمہ، سلمیٰ غزل، سحرش فاطمہ،  
ام ایمان، نادیہ جھانگیر، فرحت احمد اور قراۃ العین، نیکیل شامل ہیں

مستعمل مختلف دلچسپ دلکش مستقل سلسلوں کا پر سرشار تقریب امتزاج صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے



مختلف ٹیلی فون کے علاوہ کپیوٹر بھی دھرا چڑا تھا۔ اس کی خرد ملی انگلیاں بغیر تار والے سپر کپیوٹر سے کھلتی رہیں۔ اس کے بعد سامنے اسکرین پر نئی وی شریات کے بجائے کپیوٹر اسکرین کا نقشہ آن ہو گیا۔ وہ اب پورے امہاک کے ساتھ ڈاکٹر کمال کے مکمل تصویر پر اور عمریری بائیوڈیٹا کو دیکھ اور پڑھ رہی تھی۔ یہ سب تفصیل جزیلا سے حاصل کر رہے تھے۔ بالآخر کچھ سوچ کر اس نے نئی وی اسکرین سے کپیوٹر سیٹ.... کو آف کر کے نئی وی آن کر دیا۔ آواز بلی رگی اور اپنی خوب صورت سڈول کلائی پر بندھی بہ ظاہر ہنس قیمت نظر آنے والی رست وایج کو چہرے کے قریب کر لیا۔

وہ اب وایج ٹراٹسمیر پر جزیلا سے حکمانہ مخاطب تھی۔ "جزیلا..... تم فوری طور پر پہلے ایک کام کرو.... سب کچھ چھوڑ کر..... ڈی کار لو کو تلاش کر کے اس کے ساتھ تھوڑے راہ درسم بڑھاؤ اور پھر اسے میرے پاس لے آؤ..... اوکے..... انس اور....." اس کا اٹھائی جواب نے بغیر میڈوسانے رابطہ منقطع کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ..... اپنی کار میں روانہ ہو رہی تھی۔ اس کا رخ لیڈز یونیورسٹی کی طرف تھا۔ ذہن میں ابھرنے والے کسی اچانک اور فوری خیال کے تحت وہ اب بذات خود ڈاکٹر کمال سے ملاقات کا ارادہ رکھتی تھی۔

☆☆☆

ایمبولینس اسٹیٹ کی حدود سے نکل چکی تھی اور خاصی تیز رفتار کی ساتھ تل ایب کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ ڈرائیور کے چہرے پہ کچھ الجھن کے تاثرات نمودار ہونا شروع ہوئے تھے، وجہ بہت معقول تھی کیونکہ اس نے بھی اسپتال کے احاطے میں اندر بیٹھے کمشنریز ناؤن اور اس کی بیٹی بانڈھ سے ہونے والی گفتگو کسی حد تک سن لی تھی۔ آخر کو وہ بھی ڈیوڈ اشار کی اسٹیٹ سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے بھی دال میں کچھ کارا محسوس ہونے لگا تھا مگر بردست اس میں ایک کمشنری بیٹی (بانڈھ) سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوگی تھی۔ وہ کم از کم تل ایب کے کسی بڑے اسپتال تک پہنچنے سے پہلے خاموش ہی رہنا چاہتا تھا مگر اس کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہوگی۔

اندریشاک وسوسوں اور خطروں کی گود میں دھرتی پہ رات اپنے نصف پہر کی طرف گامزن تھی، ہر سو گہری تاریکی کا راج تھا۔ آسمان پر محاق کا چاند دور نہیں نیم سمرانی افق کی طرف جھکا ہوا تھا۔ سڑ تھوڑی دیر خاموشی سے جاری رہا۔ اس کے بعد اچانک بانڈھ نے ایک ایسی حرکت کر ڈالی کہ ایمبولینس کے ڈرائیور کو بیک وقت حیرت و تشویش کا ایک

زبردست جھٹکا لگا۔

برابر والی سیٹ پر بیٹھی بانڈھ نے پستول نکال لیا تھا جس کا رخ ڈرائیور کی طرف تھا۔

"گاڑی روک دو۔" دوسرے ہی لمحے وہ اس سے حکمانہ درشتی سے بولی۔

ڈرائیور..... بانڈھ کی اس غیر متوقع حرکت پر اپنی جگہ ہکا بکارہ گیا مگر جب بانڈھ نے انتہائی سرد لہجے میں اسے حکم عدولی پر گولی مارنے کی دھمکی دے ڈالی تو ڈرائیور نے فوراً ایمبولینس کی رفتار بتدریج کم کرنا شروع کر دی۔ اس وقت ڈرائیور کی ساعتوں میں کمشنریز ناؤن کی وہ بات گونجنے لگی جو وہ ایمبولینس کے بالکل قریب کھڑا اپنی بیٹی بانڈھ سے انتہائی یوگلاہٹ آمیز پریشانی اور تشویش سے کہہ رہا تھا۔

"بیٹی! تمہاری جان اس وقت سخت خطرے میں ہے۔ فلسطینی مجاہدوں سے تمہارے بہرہ روانہ رویتے نے جزیل فرناش کو آگ بجوا کر دیا ہے۔ وہ تمہیں کسی وقت بھی گرفتار کر کے گولی مار دینے کا حکم صادر کر سکتا ہے۔ اس سفاک آدمی سے کوئی بھی بچید نہیں۔ تم فوراً آج کی فلائٹ چکو اور امریکاروانہ ہو جاؤ۔ چلو میرے ساتھ میں تمہیں تل ایب سے باہر نکال دوں۔"

"میں کبھی ہوں گاڑی روک دو۔ ورتہ گولی مار دوں گی تمہیں۔" ڈرائیور کو سوچوں میں پا کر بانڈھ نے اسے پھر دھمکی دی جبکہ ڈرائیور تب تک اپنی ساعتوں میں گونجنے والی کمشنریز ناؤن کی باتوں کا مطلب.... اب ٹھیک طرح سے سمجھ گیا تھا۔ پھر دفعتاً اس کے جی میں نہ جانے کیا سائلی کہ اس نے یکدم ایمبولینس کی رفتار بڑھا دی۔ بانڈھ کی آنکھوں میں درشتی کی لہر کے ساتھ ایک خوف کی پرچھائیں بھی ابھری۔ وہ ہڈیاں اٹھا۔ میں چلا کر بولی۔

"یہ..... یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے تم سے کہا ہے، گاڑی روک دو۔ میں تم پر فائر کرنے لگی ہوں۔"

"میں جان چکا ہوں، تم کیا کرنے جا رہی ہو۔" ڈرائیور فراہٹ سے متناہد آواز میں بولا۔ "ضرور ایمبولینس کے اندر کوئی زخمی دشمن موجود ہے.... تم مجھ پر گولی چلاؤ گی تو یہ گاڑی الٹ جائے گی اور پھر کوئی نہیں بچے گا۔"

ڈرائیور کی بات پر ایک لمحے کو بانڈھ بری طرح پریشان ہوئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا بولے اور کرے؟ بات اس کی بھی ٹھیک تھی۔ ایمبولینس کی رفتار اتنی تیز کے قریب تھی اور اسٹیئرنگ پر ڈرائیور ہی کی گرفت تھی۔ ایسے میں اگر بانڈھ اس پر گولی چلا دیتی تو یقیناً گاڑی



اس اعصاب شکن کشاکشی میں بازغہ کے حواس مثل ہو کر رہ گئے تھے۔ ایسبویٹنس رکھے ہی ہر سو دم بہ خودی خاموشی چھا گئی۔ جیسے کوئی بہت بڑا طوفان آتے آتے ٹل گیا ہو۔

بازغہ دوسرے دروازے سے اتری۔ فوراً ایسبویٹنس کا عقبی ڈبل پٹ کا دروازہ کھول دیا۔ مریض پریشانی کے عالم میں اٹھے بیٹھے تھے، محسن زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے بازغہ کو خون میں لہھڑا دیکھا تو مزید تشویش زدہ ہو گیا۔

”بب..... بازغہ! تم ٹھیک تو ہونا..... یہ..... یہ..... خون.....؟“

”میں ٹھیک ہوں..... لیکن.....“ بازغہ کچھ کہتے کہتے رکی، باقی دو مریض حیران پریشان ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک سے رہا نہ گیا..... چلا کر بولا۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کون ہو تم لوگ؟“ اس کے اشتہاء آمیز استفسار پر..... بازغہ اور محسن نے کوئی توجہ نہ دی۔ البتہ بازغہ نے ان دونوں کو ڈانٹ کر خاموش کرادیا۔ وہ ایک عجیب سی الجھن میں مبتلا ہو گئی تھی۔ ان دونوں مریضوں کی موجودگی میں وہ محسن سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی، تاہم اس نے محسن کو سہارا دے کر ایسبویٹنس کے عقبی حصے سے اتارا..... اس کے بعد وہ اسے سہارا دے کر ڈرائیونگ کیمین میں سوار ہو گئی۔ محسن وہاں ڈرائیور کی لائٹ دیکھ کر چونک پڑا، تاہم بازغہ نے مختصر الفاظ میں اسے سب بتا دیا۔ یہ بھی کہ جزل فرناش نے ان کی تلاش میں سات لڑاکا کمانڈوز بھی روانہ کر دیے ہیں اور ڈرائیور بھی اسپتال کے جی اے کو یہاں کی لوکیشن بتا چکا ہے، یہ سن کر محسن کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ سات بے رحم اسرائیلی کمانڈوز بجلی کی تیزی کے ساتھ حرکت میں آتے ہیں، تاہم وہ بھی یہاں کے چپے چپتے سے واقف تھا، بولا۔

”بازغہ!..... ہم بہت تکین اور خطرناک صورت حال سے دوچار ہیں..... ہمیں فوراً یہ ایسبویٹنس چھوڑ کر اس وقت پیدل آگے بڑھنا ہوگا..... جلدی.....“

”لل..... لیکن..... تم زخمی.....“

”میں ٹھیک ہوں.....“ محسن نے بات کافی۔ ”دیر مت کرو، ہمارے پاس وقت کم سے بھی کم ہے۔ آؤ، میں یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا تو..... بازغہ نے اسے سہارا دیا۔ اس کے بازو اور ٹانگہ کے زخموں کی اتنی کافی حد تک کم تھی، بازغہ اسے پہلے اس کی کنڈیشن کے بارے میں پتا چکا تھی کہ بازو کی ہڈی محفوظ تھی، گولی گوشت خیر کر نکل گئی تھی، جبکہ ناف میں گولی ران کے

بے قابو ہو کر الٹ جاتی۔ یہ ایک خطرناک اور جان لیوا حادثے کا باعث بھی بنا۔ ڈرائیور نے حاضر دماغی سے بروقت ایک خطرناک چال چلی تھی۔ اس نے بھی بازغہ کی اس تشویش آمیز پریشانی کو تازہ لیا تھا۔ بازغہ جتنی رہی، حالات یکدم خراب ہونے لگے تھے۔ ڈرائیور نے گاڑی کا رخ مل ایب کی جانب ہی کر رکھا تھا۔ دلچسپ ایسبویٹنس میں لگے وائرلیس سیٹ پر ڈرائیور کو کال بھی موصول ہو گئی۔ یہ اسٹیٹ کے اسپتال کے جی اے کی کال تھی۔ سات اسرائیلی لڑاکا کمانڈوز کو اس نے ایسبویٹنس کی لوکیشن کے بارے میں بتانا تھا۔ اپنے جی اے کی کال اور بات سن کر اس نے فوراً اسے بتا دیا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا اور..... وہ اس وقت کہاں ہے، بازغہ کا ہاتھ ٹھنک گیا۔ اس کا چہرہ وحوش نظر آنے لگا۔ صورت حال کی سنگینی اور خطرناکی کا اسے بھی اور اک ہو گیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ایک بار وہ کمانڈوز کے ہتھے چڑھ گئی تو پھر کچھ بھی نہیں بچے گا۔ نہ وہ، نہ اس کا محبوب محسن.....

بازغہ کی بے بسی پر اسرائیلی ڈرائیور کے بدہیت ہونوں پر بڑی سکرود مسکراہٹ ابھری۔ مگر دوسرے ہی لمحے بازغہ پر جیسے جنون طاری ہو گیا۔ وہ پھری ہوئی شیرنی بن گئی۔ ایک مل کھاتے موٹہ پر ڈرائیور نے جیسے ہی گاڑی کی رفتار ڈرامم کی بازغہ شیرنی کی طرح خراتے ہوئے اس پر بھٹ پڑی۔ ڈرائیور نے مزاحمت کرنے کے بجائے اپنا حربہ آزمانا چاہا اور موٹہ کا تے ہی اس نے رفتار بڑھانی چاہی۔ بازغہ نے اپنا ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر جمادیا اور پاؤں کی شوکر ڈرائیور کے اس پاؤں پر مارنے لگی جو ایک سلسرہ زپریر جمانے کی کوشش کر رہا تھا، نتیجتاً ایسبویٹنس جھکے کھانے لگی۔ ڈرائیور نے بالآخر بازغہ پر جھپٹا مارا..... ردعمل میں وہ اب بازغہ کو ہتھارتا کرنا چاہتا تھا۔ بازغہ نے اس کے پہلو سے نال لگا دی اور بسبلی وادی۔ گولی کا دھماکا ہوا۔ بازغہ کا پستول والا ہاتھ خون سے لہھڑ گیا۔ ڈرائیور ساکت ہو گیا۔ ایسبویٹنس ڈولنے لگی، بازغہ نے پستول پھینک کر ہاتھ اسٹیرنگ پر جمانے کی کوشش چاہی۔ وہ ایسا کرنے سے قاصر تھی کہ دروازہ کھولتی اور ڈرائیور کی لاش باہر دھکیل دیتی۔ اس صورت میں ایسبویٹنس کے اٹنے کا خطرہ تھا۔ تاہم وہ..... ڈرائیور کی لاش سے چھکی رہی اور صرف اسٹیرنگ کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ ڈرائیور کا پاؤں ایکسٹریٹر سے ہٹ گیا تھا، بازغہ نے ایک موقع پر دھیرے دھیرے بریک پیڈل پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔ ایسبویٹنس کا الجھن کھانس کر بند ہو گیا۔ ڈرائیور دیر بعد ایسبویٹنس بھی رک گئی۔



مقام پر بیوست تھی، تاہم حالت قدرے بہتر تھی۔ وہ بازو کے سہارے تھوڑا ٹکڑا کے چل رہا تھا۔ اسٹے کے نام پر ان کے پاس صرف ایک عدد ہسپتال تھا، جس کے چیمبر میں پانچ گولیاں تھیں، ایک ڈرائیور پر بازو نے خرچ کر ڈالی تھی۔

موجودہ حالات میں محسن کا یہ فیصلہ درست تھا کہ انہوں نے ایبویونس ویرانے میں چھوڑ دی تھی ورنہ ایبویونس کا نظروں میں آجانا نسبتاً آسان ہوتا۔ وہ دونوں اب تاریکی کا حصہ بننے پیدل آگے بڑھ رہے تھے۔ رات دے پاؤں سرک رہی تھی۔ ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ کہیں کہیں خود رو اور اونٹ کنارہ جھاڑیوں کی بھی بہتات نظر آتی تھی، وہ دونوں ر کے بغیر آگے بڑھتے رہے۔۔۔۔۔ پھر

ایک نسبتاً بلند ٹیلے کے قریب پہنچ کر ذرا سستانے کے لیے ر کے، محسن کو بیاس محسوس ہونے لگی۔ بازو کی بھی کم بری حالت نہیں تھی۔ محسن اور بیاس سے اس کا بھی برا حال تھا۔ محسن کو اس کی تکالیف کا احساس تھا جو اس کی اپنی نہیں تھیں۔ ان تکالیف اور صعوبتوں کا تعلق..... تعلق خاطر سے تھا.....

اور وہ تھا محسن..... محبوب..... محسن نے بازو کے اس جذبہ دل کی عہارت کو آنکھوں سے ہی نہیں دل سے بھی بڑھا تھا۔ بارہا موقعوں پر اسے سمجھانے کی بھی کوشش چاہی تھی کہ وہ جس راہ کا مسافر ہے اس راہ پر خار میں اس طرح کے جذبات کی کوئی محتاجت نہیں ہوتی۔ بے شک فطرت کے منافی چلنا بھی کاربنداب سے کم نہیں مگر جو لوگ ایک کا ز ایک مقصد اور ایک عزم کے لیے اپنی راہ کا تعین ایک بار کر لیتے ہیں پھر انہیں اپنی پہلی اور آخری منزل میں اپنا وہ نیک مقصد ہی نظر آتا ہے اور کچھ نہیں مگر بازو نے محسن کی یہ ساری باتیں

یک جہش ابرو جھلا دی تھیں۔ اس نے یہ جواب دے کر محسن کو لا جواب کر رکھا تھا کہ وہ اس سے محبت سے پہلے ہی اس کے کا ز، اس کے نیک مقصد سے متاثر ہو چکی تھی۔ محبت تو ویسے بھی کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔ کسی بھی راہ سے کسی بھی ذریعے سے بازو کو بھی اعتراف تھا۔ جذبہ انیسیت ہی محبت کی پہلی سیزم ہے اور انیسیت اثر پذیر کے عمل سے پھوٹی ہے۔ بازو نے اپنے تلفظ نفسی ادوار میں بہت کچھ پڑھا اور سیکھا تھا..... وہ برے بھلے کی تمیز کرنا جانتی تھی... مثبت انداز فکر رکھنے والے ہی راہنمائی پاتے ہیں۔ وہ بھی محسن کی راہنمائی پار ہی تھی اور خوش تھی۔

محسن اب اسے خود سے چاہتا بھی تو جدا نہیں کر سکتا تھا۔ جانتا تھا، بازو اس کے ساتھ بہت دور تک نکل آئی ہے۔ اتنی دور کہ اب اس کے لیے واپسی کے تمام دروازے

بند ہو چکے ہیں۔ پلٹ کر دیکھتی تو پتھر کی بنا دی جاتی۔ اسے اب آگے ہی دیکھنا تھا، آگے ہی چلتے رہتا تھا اور وہ محسن کے ساتھ آگے چل رہی تھی۔

اچانک آسمان پہ گزرا ہٹ کی آواز ابھری۔ بازو سہم سی گئی، خود محسن کے پیروے پر تشویش کے آثار نمودار ہوتے چلے گئے۔ اس مخصوص قسم کی آواز کو دونوں اچھی طرح پہچانتے تھے۔ خوفناک دشمن ان کے تعاقب میں قریب پہنچ رہے تھے۔ یہ ٹیلی کا پتھر کی آواز تھی، محسن نے ریٹیلے ٹیلے کی ڈھلان پہ لیٹے لیٹے ذرا سہرا بھار کے آواز کی سمت دیکھا۔ جلتی بھجتی روشنی کے جھمکے اسے دور سے ہی نظر آنے لگے، اس وقت ان کی تلاش کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔

”دشمنوں کا ٹیلی کا پتھر آ رہا ہے، جھاڑیوں کی اوٹ میں آ جاؤ فوراً۔“ محسن نے ہولے سے کہا۔ دونوں تیزی سے سرکتے ہوئے ایک ڈھلان پر اگی گھنی جھاڑیوں کے مختصر سے جھنڈ کی اوٹ میں ہو گئے اور تب محسن نے ذرا سہرا بھار کر سامنے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ دشمنوں کا ہی ٹیلی کا پتھر تھا، اس میں سات اسرائیلی لڑاکا کمانڈوز جدید اسٹے سے لیس تھے اور وہ اپنے ٹیلی کا پتھر سے ایک تیز گول دائرے والی سرچ لائٹ زمین پر ڈالنے انہی کی طرف آ رہا تھا۔ محسن بھی ہولناک حقیقت کا اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ ان کے قدموں کے نشانات بھانپ چکے تھے، یہ بڑی خطرناک اور سنگین صورت حال تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر کمال کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ حماد اسے یونیورسٹی کیسپس لے آیا تھا۔ جینی بھی ان کے ہمراہ تھی مگر آج وہ یونیورسٹی کیسپس میں نہیں رکی تھی۔ ڈاکٹر کمال اور حماد کے کیسپس پہنچنے ہی وہ اپنی کار میں گھر چلی گئی تھی۔

”جینی ایک اچھی لڑکی ہے۔ ورنہ میں اس کی طرف سے غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔“ حماد نے اعتراف کیا۔ دونوں کمرے میں آگئے تھے۔ ڈاکٹر کمال کی حالت کافی بہتر تھی۔ وہ بیڈ پر نیم دراز ہو گیا تھا جبکہ حماد اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

حماد کی بات سن کر ڈاکٹر کمال نے ہلکی مسکراہٹ سے حماد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ابتدا میں مجھے بھی یہی محسوس ہوا تھا کہ جینی کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئی کہ شاید حقیقت جان لینے کے بعد وہ... اپنے بھائی ریان کی طرف سے جانب داری کا مظاہرہ کرے گی جیسا کہ اس کے باپ شیرف جان نے کیا۔“



ہی ساتھ دیا تھا جبکہ جینی پر ان الزام لگا دیا تھا کہ وہ ڈاکٹر کمال کی ڈی کارلو کے ساتھ اتنی رنجش کی وجہ سے کمال کا ساتھ دے رہی ہے..... جینی گھروالوں سے ناراض ہو کر ہمیشہ کے لیے یونیورسٹی کیسپس آ کے فروسٹ ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر کمال اور حماد نے اس پرفیسوز کا اظہار کیا تھا اور دوستی کے ناتے اسے سمجھانے کی کوشش پائی تھی کہ وہ شخص ان کی خاطر اپنے گھروالوں سے ناراضگی ترک کر ڈالے۔ پھر جینی نے ڈاکٹر کمال سے قدرے سختی سے کہا۔ ”میں نے تمہاری خاطر نہیں بلکہ حق اور انصاف کی خاطر یہ سب کیا ہے۔ میں اگر ایک ذمے دار پولیس آفیسر کی جینی نہ بھی ہوتی تو بھی میں اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹی۔ ماڈرنٹ! ڈیڈی ایک پولیس آفیسر ہوتے ہوئے بھی نا انصافی کا مظاہرہ کریں گے، مجھے اس کی بالکل توقع نہ تھی بلکہ مجھے بھی پورا یقین ہے ڈیڈی کو بھی اندازہ ہے، یہ حرکت ڈی کارلو کی نئی ہے مگر یونیورسٹی انتظامیہ کی طرح وہ بھی ڈی کارلو پر ہاتھ ڈالنے سے ہچکچا رہے ہیں۔“

اس پر ڈاکٹر کمال کو اعتراف کرنا پڑا، بولا۔  
”پہلے میں یہی سمجھتا تھا کہ تیسری دنیا کے مقابلے میں مغرب کے حرقی یافتہ ممالک میں قانون کی سختی سے پاسداری کی جاتی ہے اور بلاشبہ ایسا میں نے یہاں ہوتے بھی دیکھا ہے لیکن آج کبھی بار.....“

”کہیں کم کہیں زیادہ..... ایسا ہوتا ضرور ہے۔“ اس بار حماد نے کہا۔ ”ڈی کارلو بلاشبہ ایک مہربان اور وہ شخصیت کا چٹا ہے، اقربا پروری اور شخصی دباؤ کا زہر ہر جگہ اپنا اثر منواتا ہے..... تاہم شاید سنگین جرائم کے معاملات میں ایسا نہ ہوتا ہو۔“

تینوں دوست آپس میں ادھر ادھر کی گفتگو کرتے رہے۔ تاہم جینی نے اپنے گھروالوں سے ناراضگی برقرار رکھی تھی۔ آخری پیکر ایشینڈ کرنے کے بعد ڈاکٹر کمال نے ریسرچ کلب کا رخ کیا۔ 32 تے میں دو روز اسے ریسرچ کلب بھی ایشینڈ کرنا ہوتا تھا، وہاں سے وہ رات دس سے گیارہ بجے کے بعد ہی فارغ ہوتا تھا۔ آج کا دن ریسرچ کلب کا تھا۔ ریسرچ کلب کی عمارت یونیورسٹی بلاکس کی چار منزلہ بلڈنگ کے عقب میں واقع تھی۔ یہ نارنجی رنگ کی مستطیل شکل کی عمارت تھی اور خاصے وسیع رقبے میں پھیلی ہوئی تھی ایک وسطی گیٹ سے گزر کر وہاں پہنچتے تھے۔ کینٹین میں دوپہر کا کھانا کھا کے وہ تین بجے کمرے میں آیا۔ پھر لیب کوٹ سنبھالا، ضروری کتابوں کا ونڈ بیگ لیا اور ریسرچ کلب کی عمارت کا رخ کیا۔

یونیورسٹی کے آڈیٹوریم ہال پیکر ہال اور مختلف بلاک

”ہاں!..... مگر..... مجھے خوشی ہوئی جب تمہاری دوست جینی نے نہ صرف حقیقت کو تسلیم کیا بلکہ اپنے باپ کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔“ اس نے ذرا توقف کیا۔  
”میرا خیال ہے اس نے اب اپنے گھر کا رخ بھی اس لیے کیا ہے..... آج لگتا ہے اس کی اپنے باپ سے ہی نہیں بلکہ اپنے بھائی سے بھی مگر ماگرم بحث ہوگی۔“  
”ہاں! مجھے بھی یہی لگتا ہے مگر بارحماد! میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے جینی کے گھر میں کسی قسم کا آپس میں کشیدگی ہو۔“ ڈاکٹر کمال نے سنجیدگی سے کہا۔

”لیکن اس حسب کالے بیودی ڈی کارلو کو مزہ ضرور ملتی چاہیے..... ورنہ وہ اور شیر ہو جائے گا۔ یہ بات قانونی طور پر آن دی ریکارڈ ہونی چاہیے۔ وہ دوسرا مجرمانہ حملہ بھی کر سکتا ہے۔“ حماد کے لہجے میں نظر اور تشویش کے گہرے سائے تھے۔

”رپورٹ تو لکھوادی گئی اس کے خلاف، دیکھیں کیا نتیجہ نکلتا ہے؟“ کمال نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں! جینی بھی اس معاملے میں خاموش بیٹھنے والی نظر نہیں آ رہی، مگر دوست! تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تم بلاوجہ یونیورسٹی کیسپس کی حدود سے باہر مت نکلتا..... اور کہیں جانا تو مجھے ضرور ساتھ رکھنے کی کوشش کرنا۔“

”تمہارا شکر یہ حماد!..... میں تو تمہارا ویسے بھی ممنون ہوں اگر تم مجھے بروقت اسپتال نہیں پہنچاتے تو نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔“

ڈاکٹر کمال نے توصیفی لہجے میں کہا تو حماد بے اختیار سر جھٹک کر بولا۔ ”دوست! اس میں احسان یا شکر یہ کی کیا بات ہے۔ تم میرے ہم مذہب اور برادر اسلامی ملک پاکستان سے تعلق رکھتے ہو، یوں بھی یہ میرا انسانی ناتے فرض بھی بنتا تھا، تمہاری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو میں اس کے کام بھی آنے کی کوشش کرتا۔“

اگلے دن ڈاکٹر کمال یونیورسٹی نہیں گیا۔ جینی نے نوٹس کے سلسلے میں اس کی مدد کر دی تھی۔ حماد بھی پیش پیش رہا تھا البتہ جینی کا موڈ سخت خراب نظر آ رہا تھا۔ کمال کے پوچھنے پر اس نے ایک سچ حقیقت کا قدرے شرمندگی کے ساتھ اظہار کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ان کی توقع کے عین مطابق جینی کی اپنے باپ اور بھائی سے مگر ماگرم بحث ہوئی تھی۔ بھائی نے اس روز واردات والے دن ڈی کارلو کی کار میں اپنی موجودگی سے صاف انکار کر دیا تھا اور باپ نے بھی بیٹے کا



ڈاکٹر کمال کے دل کو گھونسا سا لگا۔ اسے اپنے پن میں ایک دکھ کا احساس ہوا تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے اس کے قدم ٹکھت رک گئے۔ اس نے مڑ کے دیکھا۔ اس میں احساس ہمدردی کے سوا کوئی عامیانہ جذبہ نہ تھا۔ اچانک اس برقع پوش خاتون کے ہاتھ سے بیگ گرا اور کھل گیا۔ پختہ روش پر بیگ گرتے ہی اس کے اندر سے کچھ کتابیں اور دیگر عام سی اشیاء نکل کر ادھر ادھر بکھر گئیں۔ کمال کے پیروں کو جیسے بریک لگ گئے۔ ازراہ ہمدردی وہ پلٹا..... خاتون کے لیے برقع میں اکڑوں بیٹھ کر اپنی چیزیں سینٹا مشکل ہو رہا تھا، تاہم کمال نے آگے بڑھ کر اس کی مدد کرنا چاہی اور ساتھ ہی شستہ لہجے میں بولا۔

”میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ بیٹیز.....“

اس دوران دونوں کے چہرے اور نگاہیں بہت قریب قریب ہو گئیں، تو کمال کو ایک اور جھٹکا لگا۔ بے داغ اور شفاف حدسوں والی ہینک کے پیچھے خاتون کی دکھش اور کشادہ آنکھوں میں نئی اتری ہوئی تھی اور جانے کب سے اتری ہوئی تھی کہ اب آنسو بن کر بہنے لگی تھی۔ اس نے ایسی ہی ایک نم ناک سی نگاہوں سے جمال کے چہرے کو دیکھا..... حیا کی سرخی اجھری اور نقاب کے پیچھے سے لب کی سوہوم سی حرکت ڈاکٹر کمال نے محسوس کی۔

اس گفتگو کی دونوں طرف سے ابتدا شدہ انگریزی میں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کمال کو یہ خاتون کچھ پریشان اور دکھی بھی لگی۔ وہ جلدی جلدی اس کی چیزیں سینٹے لگا اور چند سینکڑوں میں کتابیں سینٹ کر اس کے بیگ میں ٹھونس دیں۔ اس گلیل وقت میں اس نے دو ایک بار اپنے ذہن پر زور دینے کی کوشش بھی کی تھی کہ شاید اس نے ان دو برسوں میں ریسرچ کلب آتے ہوئے اسے دیکھا ہو، مگر عیث اسے یاد نہ آیا۔ اسے حیرت بھی ہوئی، آج پہلی بار مشرقیت کی مجال ایک برقع پوش خاتون کو دیکھا تھا۔ آخر یہ کون سی؟ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے، خاتون نے ایک بار پھر دل سے اس کا شکر یہ ادا کیا۔ اس کا لہجہ اب بھی سسکا سسکا اور دکھی محسوس ہوا تو کمال سے نہ رہا گیا، بولا۔

”میرا نام ڈاکٹر کمال احمد ہے۔ میں یہاں ایک پاکستانی ریسرچ اسکالر ہوں..... برا مت مانیے گا پلیز.....! آپ کو بھرپور اسلامی اقدار اور مشرقی روایت میں دیکھ کر مجھے ایک جہی اور جذبہ بانی سی خوشی ہوئی ہے مگر اس خوشی میں کوئی جھالیاتی ہوس کے بجائے ایک احساسِ تاخر..... فرنگیوں کے دہس میں ایسی روایات پر اٹکی رہتا..... آپ کے بلند کردار کی نمائندگی کرتا ہے۔ تہذیب ایک مسلمان ہونے کے نامے میرا اتنا فرض تو ضرور

کے مقابلے میں ریسرچ کلب کی عمارت میں خاموشی اور سناٹا طاری رہتا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ یہاں کوئی ذی نفس نہیں ہوتا تھا۔ سب ہوتے تھے مگر اپنے پریکٹیکل ورک میں اس قدر انہماک کے ساتھ مصروف رہتے تھے کہ..... بازو والے فرد سے بھی انہیں بولنے کا یارا نہیں رہتا تھا۔

ریسرچ کلب کی عمارت پام اور سنگھتوں کے درمیان گھری ہوئی تھی، موسم خوشگوار تھا۔ اکثر دن میں بارش ہوتی تھی۔ فضا تھوڑی خشک ہو جاتی تھی۔ لندن ویسے بھی بارشوں اور بادلوں کا شہر کہلاتا ہے۔ فضا وہی دھلی سی تھی، البتہ آج ٹھنڈک میں کاٹ کے بجائے ایک خوشگوار پن محسوس ہوتا تھا۔ موسم سرد اور آسمان پر چھانے ہوئے بادلوں کی وجہ سے سرشام ہی اندھیروں کا گمان ہوتا تھا..... اس لیے ریسرچ کلب کے اطراف اور اندر کہیں کہیں لائٹس آن ہونے لگی تھیں۔ ایک خوب صورت ماربل چیمپ کی روش بہ چلتا ہوا جب وہ داخلی گیٹ کے قریب پہنچا تو ایک خاتون کو اندر سے نکلتا دیکھ کر اسے نہ جانے کیوں ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی کیونکہ وہ خاتون سر تا پایا سیاہ برقع اور حجاب والے نقاب میں تھی، برقع کا اسٹائل خالص مشرقی تھا۔ پاکستانی اسٹائل کی اس برقع پوش خاتون کو جس کی صرف آنکھیں دکھائی دیتی تھیں، اگرچہ اس پر بھی سفید شفاف حدسوں اور نیس فریم والی ہینک لگی ہوئی تھی، گلہز بقیہ فوٹو سنز تھے، جو دن کی روشنی میں سیاہ پڑ جاتے تھے۔ آنکھیں اس کی خوب صورت اور روشن تھیں۔ اس کی چال ڈھال میں ایک وقار تھا۔ اس نے کوئی بڑا اونڈ ہیگ اٹھا رکھا تھا جس کا بلیٹ شاید نوٹ چکا تھا اس لیے اس نے اسے تھوڑا فولڈ کر کے خاصا اوپر اٹھا رکھا تھا۔

عورتوں کو گھونسا، یہ ڈاکٹر کمال احمد کی فطرت ہی نہیں تھی لیکن اس خاتون میں ڈاکٹر کمال کی غیر ارادی دکھنچی کی وجہ یہی تھی کہ..... خاتون مذکورہ مشرقی روایات ہی کا نہیں بلکہ ہم بائبل کا بھی عمل نمونہ نظر آتی تھی۔ ورنہ تو وہ سر تا پا ستر پوش تھی۔ اس کے نازک اندام وجود کا کوئی حصہ نظر انداز نہیں ہوتا تھا، حتیٰ کے ہاتھوں تک میں سیاہ دستا نے چڑھا رکھے تھے..... کچھ اسلامی روایات کا مریخ اور مشرقی اقدار کا منبع اس کی شخصیت کو چار چاند لگائے ہوئے تھا، اس سبب ڈاکٹر کمال اسے احترام کی نگاہ سے چند ثانیے دیکھتا رہا اور فوراً نظر جھکا کر آگے بڑھا، وہ قریب آنے لگی۔ ڈاکٹر کمال کے کچھ عجیب سے محسوسات ہونے لگے۔ جب وہ اس کے قریب سے گزری تو معاً ایک بجلی سی آواز کمال کی سامتوں سے کھراکی۔ یہ آواز ایک روتی ہوئی سکاری سے تھی مشابہ تھی۔



کمال جیسے با اصول اور آدوش پرست انسان کے لیے یہ باتیں اسے بے چین کر دینے کے لیے کافی تھیں۔  
 بولا۔ "آپ..... کب سے یہاں مقیم ہیں؟ اور کس ملک سے belong کرتی ہیں؟"

"میں انڈین نژاد ایک مسلم گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں تاہم میری پیدائش ادھر ہی کی ہے۔" اس نے بتایا۔  
 "اوه..... واقعی..... پھر تو آپ یہاں کی سٹیزن ہوئی نا؟"  
 "ہاں..... لیکن باوجود اس کے ہم جیسے لوگوں کو..... یہاں دوسرے اور تیسرے درجے کے شہری ہی کی حیثیت حاصل رہتی ہے۔"

"یقیناً یہ تو آپ نے بالکل درست کہا۔" کمال بولا۔  
 پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر اسے دکھادیا۔

"کچھ اچھا تو نہیں لگتا..... لیکن خدا کے لیے آپ میری نیت پر شہمت کیجیے گا۔ اب میں اپنی شرافت کے گن تو نہیں گاتا، مگر بہر حال اس پورے ادارے میں ڈاکٹر کمال احمد فرام پاکستان اپنی روادری، اصول پسندی اور ایک ہونہار اسکاٹر کی حیثیت سے مشہور ضرور ہے..... میرا کارڈ رکھ لیجیے، میں شاید آپ کے کسی کام آنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔" خاتون نے قدرے جھجک کر کارڈ کمال کے ہاتھ سے لے لیا پھر بولی۔

"میرے پاس تو ایسا کوئی کارڈ نہیں۔ ویسے میرا نام مرینہ ہے..... میں ویسٹ یارک شائر کے ایک چھوٹے سے علاقے "ویسٹ کورڈ" میں رہتی ہوں۔"

"اوه....." ویسٹ کورڈ کے نام سے کمال چونکا تھا۔ اسے معلوم تھا اس علاقے میں زیادہ تر انڈین مسلم کمیونٹی کے لوگ رہتے تھے۔ وہاں ان کی رہائش بڑی قابل رحم تھی۔ عام سا علاقہ تھا اور ڈر ہائما کلاوی کے تندو تار یک گھروں میں یہ لوگ رہتے تھے۔

"آپ کی کوالی فیکیشن کیا ہے؟" کچھ سوچتے ہوئے کمال نے آخری سوال کیا۔

"میں نے میڈیکل کچھ پوسٹ گریجویٹ سائنس اینڈ ٹیکنیشن میں ڈپلوما کیا ہے۔ یہاں میں لیب ٹیکنیشن کے شعبے میں تھی۔" مرینہ نے بتایا اور ڈاکٹر کمال متاثر ہوا۔

بولا۔ "اوکے! آپ لکرنہ کریں..... بہر حال مجھے افسوس ہے آپ کے ساتھ یہاں ناروا سلوک روا رکھا گیا جس کی پاداش میں آپ کو اتنی اچھی جاب سے ہاتھ بھی دھونا پڑے۔" اس کے بعد کمال نے بھی اسے مختصراً اپنے بارے

بتا ہے کہ پار فیر میں آپ کی پریشانی کی وجہ تو پوچھ سکتوں۔"  
 اس کی بات سن کر برقع پوش خاتون نے اپنی نم ناک آنکھوں سے بغور اس کی طرف دیکھا۔ کمال کو اس کی کشادہ آنکھوں میں نئی کی صورت تیرتی ایک دکھ آمیز اداسی محسوس ہوئی، پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔ "بہت خوشی ہوئی مجھے بھی..... کہ اجنبی ہونے کے باوجود..... ایک مسلمان ہونے کے ناتے ہمارا رشتہ دیا غریب بھی کس قدر مضبوط ہے اور بلاشبہ میرا دکھ ایک ایسا ہی کوئی اپنا ہی سمجھ سکتا ہے لیکن مجھے اپنے اس دکھ پر فخر بھی ہے۔ اس لیے کہ اس کا تعلق خدا نخواستہ میرے کسی برے کریکٹریکی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی اسلامی روایات اور احکامات کی پابندی کے باعث ہے۔ یہاں دیگر ایسی خواتین کی طرح مجھے بھی کچھ ناروا اور جانبدارانہ اور تنہیک آمیز صورت حال سے گزرنا پڑتا ہے۔"

ڈاکٹر کمال اس کی بات سمجھ رہا تھا۔ تاہم وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ جب وہ لکھ بھر کے لیے رکی تو کمال مستفسر ہوا۔  
 "آپ کو کبھی یہاں دیکھا نہیں، کیا آپ یہاں کام کرتی ہیں؟ آئی مین..... کوئی جاب یا اسٹڈی وغیرہ؟"

"کرتی تھی، کام اور اسٹڈی..... دونوں....." وہ قدرے سسک کر بولی۔ "تھوڑے عرصے پہلے ہی مجھے یہاں لیب اسٹنٹ کی جاب ملی تھی مگر تھوڑے دنوں بعد ہی مجھ پر دباؤ ڈالا جانے لگا کہ میں برقع میں نہ آؤں۔ چند دن یہ بحث چلتی رہی، میں ایک مذہبی اور قدامت پرست مسلم گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرے لیے یہ ممکن نہ تھا۔ بالآخر آج مجھے جاب سے فارغ کر دیا گیا۔ بہت مشکلوں سے مجھے یہ جاب ملی تھی..... لیکن....." وہ پھر سسک پڑی۔

اس کی مختصراً چٹانے ڈاکٹر کمال احمد جیسے حساس انسان کو بھی دکھی کر دیا مگر دوسرے ہی لمحے جوش سے بولا۔ "آپ اس کی بالکل لکرنہ کریں۔ آپ ایک بہادر اور عظیم خاتون ہیں۔ میں آپ کا احتجاج میڈیا پر لے کر جاؤں گا۔ لیفٹ جیسے ایک بڑے بین الاقوامی طبی ادارے میں اس طرح کی تعصبانہ سرگرمی خود ان کے لیے وبال جان بن جائے گی۔"

"نہیں..... نہیں..... میں خود کو تماشا نہیں بنانا چاہتی..... یہاں لندن میں میرے عزیز رشتے دار بھی رہتے ہیں۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کریں گے، بہر حال آپ کا شکر یہ..... میں پہلے بھی زندگی کی گازی کھینچنے کے لیے اپنے بوڑھے ماں باپ اور چھوٹے بھائی بہن کا پیٹ پالنے کے لیے چھوٹے موٹے کام کر لیا کرتی تھی..... اب وہی کر لوں گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ پھر سسک پڑی تھی۔



ہی کی جڑیں کاٹ ڈالو..... اس کے لیے خواہ برقع اوڑھنا پڑے یا لمبی لمبی ڈانھیاں ہی کیوں نہ رکھنی پڑیں۔

مادام میڈوسا اپنے شاہانہ آفس روم میں بھاری بھرم چیز پر بیٹھی تھی اور اس کے حسیں چہرے سے یہ فاتحانہ مسکراہٹ تھی تو کشادہ آنکھوں میں زہریلا چمک بھورے لے رہی تھی۔ اس کی بھڑکی آنکھوں میں ڈاکٹر کمال کا دیا ہوا خوب صورت گولڈن گھڑ کا ڈزیننگ کارڈ تھا۔ لگاؤ اس کارڈ پر مرکوز تھیں، پھر اس کارڈ کی دھار پر وہ اپنی زبان پھیرنے لگی اور ہولے سے خود کلامی میں بڑبڑائی۔ "ڈاکٹر کمال!..... میں اپنے وطن اسرائیل کو تمہاری صورت میں ایسا تحفہ پیش کروں گی کہ راقی دنیا تک پوری یہودی قوم مادام میڈوسا کا احسان نہیں بھولیں گے۔"

ادھر ڈاکٹر کمال اس کریمہ انگیز حقیقت سے بے خبر..... "مرینہ" کی پرئم شخصیت کے حصار میں کھویا ہوا تھا۔ حتی الامکان اس نے اپنا کام نپڑایا اور ریسرچ کلب سے نکل کر کیپس کی جانب چل پڑا۔ پام اور تاریخی جتوں والے درختوں کے درمیان گھری پختہ روش پہ چلتے ہوئے بھی وہ مرینہ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا..... ہلکی بوند باندی شروع ہو گئی تھی۔ اس نے احتیاطاً ساتھ لائی ہوئی چھتری کھول کر تان لی۔ دوسرے ہاتھ میں فائل بیگ تمام رکھا تھا۔ موسم کی متابعت سے اس نے لمبا رین کوٹ پہن رکھا تھا۔ یونیورسٹی بلاک کی دیوار کو کراس کر کے وہ ایک وسیع پارک کے درمیان سے گزرتا ہوا پختہ فرش والے احاطے میں آ گیا۔ جو پارش کے بانی سے چمک رہا تھا۔ یونیورسٹی بلاک کی طرف کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی، کچھ لوگ بھی چمپڑے ہوئے ادھر آتے جاتے دکھائی دیے، پارک کے الگ تھلک سڑج میں چار یا چھ گورے گوریاں گروپ بنائے گئی گھاس پر بیٹھے خوش نظیوں میں مصروف تھے۔ یہاں جو بھی لوگ نظر آ رہے تھے، ان کا تعلق ادارے کے کسی نہ کسی شعبے سے تھا۔ ڈاکٹر کمال خاموشی سے چلتا ہوا اپنے روم میں آ گیا۔ کچن میں اپنے لیے ہلکا پھلکا برگر بنا کر کھایا اور ذرا ذرا بعد کپڑے بدل کر بستر پر لیٹ گیا۔ لیٹتے وقت بھی اس کے چشم تصور میں اس برقع پوش مسلم خاتون مرینہ کا حجاب پوش چہرہ..... شفاف عدسوں کے پیچھے جمبھکتی کشادہ آنکھیں او۔ ان میں حیرتی تھی..... سسکتا لہجہ، وہ سب یاد آنے لگا۔ اسے واقعی مرینہ سے ہمدردی ہونے لگی تھی، مگر وہ یہ سوچنے پر بھی مجبور تھا کہ محض جذبہ ہمدردی تھا یا اس میں کسی اور جذبے کا بھی دخل تھا.....؟ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کی بے تک کی زندگی میں کبھی محبت

میں بتا دیا اور خاتون کی مدد کے لیے اس سے اجازت بھی لینا پڑی۔ جسے قدرے جھجک کے ساتھ مرینہ نے قبول بھی کر لی..... پھر وہ خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

کمال اندر لیب کلب کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ وہ رات گیارہ بجے تک وہاں کام کرتا رہا۔ مگر اس کا دھیان اس مسلم برقع پوش خاتون کی طرف ہی لگا رہا۔ اس کے شہ انداز گفتگو... اس کے رکھ رکھاؤ، خودداری اور وضع داری نے اسے از حد متاثر کیا تھا۔ پھر یہاں اس کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک اور پروفیشنل جیلسی جیسے حالات کے بارے میں سن کر وہ بھی ہوا تھا۔ وہ خود ایک پڑھا لکھا اور ہانٹلی ایجوکیٹڈ انسان تھا۔ پڑھے لکھے کی قدر کرتا تھا۔ مرینہ کے بارے میں یہ سن کر کہ اسے محض اپنے اہل اصولوں کی خاطر ریسرچ کلب جیسے ادارے کی جانب چھوڑنا پڑی تھی حالانکہ اس بڑے ادارے میں جاب ملنا کسی خوش قسمتی سے کم بات نہ تھی۔ مگر آفرین ہے اس خاتون پر، اپنے اصولوں کا اس نے سودا نہیں کیا تھا۔ اس نے ادارے کی جانبدارانہ پالیسی سے اختلاف کیا تھا اور بغیر حجاب کے جاب پر آنا اسے قبول نہیں تھا مگر اس کی خاطر اس نے نوکری کو لات مار دی تھی۔ یہی سب باتیں کمال سوچتا رہا اور مرینہ کے لیے اس کے دل و دماغ میں قدر و قیمت سوا ہوتی گئی۔ اس نے عزم کر لیا تھا کہ وہ اس کی مدد کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

ڈاکٹر کمال کے لیے مرینہ (برقع پوش مسلم خاتون) سے ملاقات اتفاقی ضرور تھی مگر..... مرینہ کے لیے نہیں..... مرینہ..... اپنا بیگ سنبھالے ڈاکٹر کمال سے رخصت ہوئی..... ذرا آگے جا کر اس نے مڑ کے دیکھا، کمال اندر جا چکا تھا۔ وہ لان میں آگئی۔ یہاں ایک نسبتاً ویران گوشے میں کھڑے ہو کے اس نے نہایت پھرتی کے ساتھ اپنا حجاب اتار دیا۔ آنکھوں سے چشمہ بھی۔ برقع کے پیچھے اس نے مغربی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ ٹائٹ چنٹ اور چست شرٹ۔ برقع بیگ میں ٹھونسنے کے بعد وہ باہر آگئی۔ سڑک پر چمپل پہل گئی۔ ایک طرف اس کی کار پارک تھی، وہ اس میں سوار ہو کے روانہ ہو گئی۔ برقع کے نیچے سے جس خاتون کا چہرہ برآمد ہوا تھا، وہ کسی مرینہ کا نہیں بلکہ "شن بیچہ" کی زونل چیف مادام میڈوسا کا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ڈاکٹر کمال جیسے لوگوں کو کس طرح متاثر کیا جاسکتا ہے۔ یہ انداز صیہونیت کی ایک چال اور فیری میسن کا بنیادی منشور تھا کہ دشمنوں کو لٹکارنے کے بجائے انہی کے ہمیں میں ان کے درمیان حس چٹھو۔ انہی کا طریقہ، وتیرہ اور دستور اپنانے کے ان



تھا۔ سردی کے باعث کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں، تاہم باہر موسم خوشگوار تھا۔ دھوپ نکلی، دوئی تھی، رختوں سے کمرے اندر پڑ رہی تھیں۔ اس نے بیروں میں سوئی پہنی اور دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولتے ہی جیننی حسب عادت دندائی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ سب سے پہلے اس نے لائٹ آن کی تھی۔ کمال نے السائی ہوئی نلروں سے اس کا استقبال کیا تھا اور مختصر آہائے ہیلاویڈ گڈ مارننگ کے بعد پلٹ پڑا۔

جیننی نے ہلکے بیلوکھ کا گھنٹوں تک اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اوپر اسی رنگ کی شرٹ تھی جس کا گریبان کمال کے لیے غیر معمولی اور جیننی کے لیے معمولی کشادہ تھا۔ اس نے اپنے سنہری ہال سلپتے سے پن کمر کے ہاندھے ہوئے تھے نیلی آنکھوں میں اشتیاق بھورے لے رہا تھا اور بھرے بھرے گلانی ہونٹوں پہ رحم یہ سا ارتعاش نظر آتا تھا۔ وہ خاصی حسین نظر آ رہی تھی اور بہ کشش تھی۔

”مائی گاڈ!..... یہ تم نے کمرے کو تیل روم کیوں بنا رکھا ہے۔“ اس نے کہا اور گے بڑھ کر کمرے کی دو عدد کھڑکیاں کھول کر پردے بنا دیے۔ ”دیکھو..... باہر کتنا خوشگوار موسم ہو رہا ہے۔ لندن والوں کی تو گلٹا ہے آج قسمت جاگ پڑی ہے..... اس چمکتی دہتی دھوپ میں۔ آج سب کے گھروں پہ تالے ہی پڑے ہوں گے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کمال کی طرف بٹنی۔ وہ بیڈ پر جا بیٹھا تھا۔ جیننی اس کے سامنے والی کرسی پر چبھ گئی۔ گھنٹوں تک اس کے اسکرٹ سے نیچے برہنہ منڈول ٹانگیں ہولے ہولے تھرکتے لگیں۔

”کیسی ہو؟“ کمال نے سراٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”میں ٹھیک ہوں..... مگر جاؤ پہلے تم واش روم سے فارغ ہو جاؤ۔ میں کچن میں کچھ کھانے کے لیے بناتی ہوں..... میں نے صرف چائے پی ہے، ناشتا اکٹھے کرتے ہیں۔ ہے کچھ کچن میں..... یا بھاگیں بھاگیں کر رہا ہے؟“

کمال ہنس دیا۔ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”سب کچھ موجود ہے میرے لیے ہاف فرائی بنا لیتا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ ڈول سنبھالا اور ہاتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

گھنٹے بھر بعد دونوں دہشتے کی نیکل پر تھے، جیننی کا ارادہ ناشتے کے بعد ہمیں باہر نکلنے کا تھا جبکہ کمال کا لائبریری جانے کا ارادہ تھا۔ ناشتے کے دوران ہی حاد بھی آ گیا..... اس نے صرف چائے پی اور کپ تھا سے بیڈ پر چبھ گیا۔ کمال نے اس کے چہرے پہ کچھ مسرت بھرے تاثرات محسوس کیے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ان کے ساتھ اپنی کوئی خوشی شیئر کرنا چاہ رہا ہو۔

نام کے جذبات نے بھی شب خون مارا تھا یا وہ اب تک ایک خشک زندگی ہی بسر کرتا چلا آیا تھا اور اس کی خوش بھالی کہیں دب چکی تھی؟ بڑے بھائی ظہیر احمد کا خون سفید پڑتے ہی ساری ذمے داری..... کمال ہی کے کاندھوں پر آن پڑی تھی اگرچہ اس وقت اس کے ماں باپ بھی زندہ تھے مگر اتھک محنت اور عسرت و تنگدستی کی زندگی نے انہیں وقت سے پہلے ہی یوڑھا اور ناتواں کر ڈالا تھا۔ یہ کمال ہی جانتا تھا کہ کس طرح اس نے خود کو، بوڑھے ماں باپ کے علاوہ اپنی دونوں جوان بہنوں شمینہ اور راشدہ کو بھی سنبھالا۔ ان کی شادیاں کہیں۔ اس دوران کمال اپنی میڈیکل کی خشک اور مشکل تعلیم بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ پارٹ ٹائم جاب بھی اسے کرنا پڑی تھی۔ پھر وقت گزرا اور..... ماں باپ فوت ہو گئے۔ کمال پانچ سال کے لیے حصول علم کی خاطر پاکستان بہاولپور سے یہاں اس شہر خراب لندن آ گیا تو..... یہاں بھی اس کا یہی وتیرہ رہا یعنی پڑھائی۔ یہاں گوری فرنگی جیننی سے اس کی کسی حد تک بات چیت اور گورنرینڈ شپ ہوئی مگر وہ بھی زیادہ تر اکیڈمک لیول تک..... اگرچہ بعض مواقع پر جیننی نے کمال کی دبی ہوئی بھالیائی حس کو بھی بیدار کرنے کی کوشش چاہی تھی لیکن اسے یہ سب ”ہنوز دلی دور است“ والا معاملہ ہی لگا تھا۔ مگر وہ ناامید نہ تھی، جیستہ رہ بھر سے امید بہا رہے ہوئے تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ کمال سے دوستی کو جیننی نے اس سے آگے کے سٹی دے رکھے تھے، جو ابھی اس کے دل کے گوشہاں تھے۔

آج کمال نے سرسری انداز میں بستر پر لیٹے لیٹے ابتدا سے ان سب باتوں پر غور کیا تو اسے لگا انیسیت اور پسنڈیرگی بھی کوئی شے ہوتی ہے۔ وہ مرینہ کے بارے میں سوچتے سوچتے جانے کب نیند کی مہربان دیوی کی آغوش میں جا سویا۔

اگلے روز چھٹی تھی، وہ صبح دس بجے اٹھا۔ عام دنوں میں وہ سات بجے اٹھ جاتا تھا۔ ایک گھنٹے میں تیار ہو کے یونیورسٹی کا رخ کرتا۔ چھٹی والے دن صرف دو گھنٹے لیٹ اٹھا کرتا تھا۔ یہ نہیں کہ دن چڑھے سوتا رہے۔ گیارہ بجے تک وہ غسل وغیرہ اور ناشتے سے فارغ ہو کے لائبریری کا رخ کرتا۔ مگر آج اس کا جانے کیوں لائبریری جانے کا بھی جی نہیں چاہا۔ بستر سے اٹھ کر بھی اس پر کسٹنڈی ہی طاری تھی۔

جیننی چونکہ آج کل والدین سے ناراضی کے باعث مستقل طور پر یونیورسٹی کمپس میں ہی فرودش تھی، اس لیے وہ آن دمگی اور دستک دے ڈالی۔ کمال سلپنگ سوٹ میں



## کیا آپ لیوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لیوب مقوی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لیوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لیوب مقوی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی منگوائیں فون نمبر 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)

(دبئی پونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک

لیوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

”کیا بات ہے دوست آج خوش نظر آرہے ہو؟ کیا تم پر بھی جیننی کی طرح خوشگوار موسم کا اثر تو نہیں ہو گیا؟“  
کمال نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ناشائستہ کر چکا تھا۔ جیننی ابلے ہوئے اٹھے اور توش پر ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ اس نے فلاسک سے کمال کے اشارے پر اس کے خالی کپ میں چائے اٹھڑی دی۔ اپنے لیے جیننی نے کافی بنائی تھی۔

کپ تھامے کمال ناشتے کی میز سے اٹھ کر کرسی پر آ گیا۔ یہ رائیگ چیز تھی، جو باہر کیس کے لان میں کھلنے والی کھڑکی کے قریب دھری تھی۔ وہاں چمکیلی دھوپ اتری ہوئی تھی اور فضا دلی گھری نظر آتی تھی۔

”ہاں دوست! کچھ ایسی ہی بات ہے۔ میں آج تم دونوں سے اپنی ایک خوشی شیئر کرنا چاہتا ہوں۔“ حماد نے چائے کا گھونٹ بھر کے..... دونوں کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

”ضرور..... ہمیں بھی خوشی ہوگی، کیا خبر ہے؟“ کمال نے اس کی طرف دیکھ کر دوستانہ مسکراہٹ سے کہا۔

”میری بہن جیہ کی شادی ہے۔ نکاح سیر منی بہت دھوم دھام سے ہوگی۔ میری خواہش ہے اگر تم دونوں بھی اس میں میرے ساتھ شامل ہوتے۔“

حماد نے بتایا تو کمال سے پہلے جیننی یکدم اپنا کافی کا گک سنبھالے میز سے اٹھ کھڑی ہوئی اور دل آویز مسکراہٹ سے بچوں کی طرح خوش ہو کر بولی۔ ”ہاؤ امیزنگ..... کوئنگ رتج پو..... میری بڑی خواہش ہے کہ کسی مسلم میرتج سیر منی کو اٹیئنڈ کروں..... مگر.....“

”مگر کیا.....؟“ حماد نے اس کی طرف مستفراہ نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دلچسپی تھی، جسے ڈاکٹر کمال نے اس وقت تکلی پارخصوصی طور پر نوٹ کیا تھا۔ جب وہ اندر داخل ہوا تھا اور جیننی کو وہاں پا کر اس کی آنکھوں میں دلچسپی کو چھپتے دیکھا تھا۔

”نہیں..... کچھ نہیں..... اس اوکے..... پونٹی ٹنٹ کہنا میرا کھی کلام بن چکا ہے۔ ایسے ہی کہہ دیا۔“

”بٹ تمہیں بہن کی شادی پر میری طرف سے بہت بہت مبارک ہو۔“ ڈاکٹر کمال نے حماد سے کہا۔ ”تو پھر اس کا مطلب ہے تم..... اپنے وطن پلٹنے والے ہو۔“

”یقیناً.....“ وہ بولا ”لیکن اسکیے نہیں..... تم دونوں بھی میرے ساتھ چلو گے، پلیز..... تم دونوں میں سے کوئی انکار نہیں کرے گا..... اس مائی وٹس.....“



ملاقات یاد آگئی۔ اس نے پتا نہیں کیوں مرینہ کے بارے میں حماد اور جینی سے بریکل تک نہ کرے گی اس کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

(بے شک کمال نے جس خاتون مرینہ کے بارے میں کہا تھا وہ..... ایک بہرہ و بیباہ دام میڈو سماجی، مگر حقیقت پھر بھی وہی ہے جو حند کرہ بالا حجاب پوش مسلم خواتین کے بارے میں بتاتی گئی ہے۔ جو بہر حال ذہنی چمکی بات نہیں ہے) ممکن تھا کمال کے اس رخ اظہار کے بعد یہ موضوع آگے بڑھتا لیکن حماد نے فوراً کہا۔

”اب ایسی بات بھی نہیں کر جینی پر عراق جانے کے لیے حجاب کی شرط لگائی جائے..... تو پھر تمہارا کیا خیال ہے کمال!..... تم تو خود کہتے تھے کہ تمہیں عراق اور بالخصوص بغداد دیکھنے کا بہت شوق ہے۔“

”ہاں دوست!..... یہ شوق تو میرا اب بھی قائم ہے۔“ کمال نے فوراً ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ ”لیکن..... پڑھائی آڑے آتی ہے۔ ریسیرچ کا کام بھی کافی پڑا ہے۔“ ”ارے بھئی! پڑھائی سوتی رہے گی، محض دو چار روز کی بات ہے۔ تم دونوں کی بھی ایک آؤنگ ہو جائے گی۔“ حماد نے پورے اشتیاق آمیز لہجے میں کہا۔ پھر جینی سے مخاطب ہوا۔ ”تم اگر واقعی عراق جانے میں سیریس ہو تو..... پلیز.....! ذرا کمال کو بھی راضی کر لو..... میں یقین سے کہتا ہوں، بہت انوکھا ایڈونچر محسوس کرو گے، خوب انجوائے کرو گے..... میں تمہیں وہاں تاریخی مقامات کی بھی سیر کرواؤں گا۔ میرے والدین بھی تم دونوں سے مل کر بہت خوش ہوں گے بلکہ مس جینی! میری بہن حبیبہ تو تمہیں دیکھ کر زیادہ ہی خوش ہوگی، وہ بہت محبت کرنے والی بہن ہے میری.....“ جینی کا اشتیاق تو واقعی دو چند ہونے لگا تھا۔ حقیقت یہ بھی کہ ابتدا میں کمال ہی نہیں بلکہ حماد بھی جینی کی اس... دلچسپی کو مذاق ہی سمجھے ہوئے تھے مگر اب..... اس کا بڑھتا ہوا اشتیاق ہی نہیں بلکہ پوری رہنمائی پانچ چہرے محسوس کرنے لگے تھے، حماد کو زیادہ خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

بہر طور..... حماد کے کہنے کی دیر تھی کہ جینی نے کمال کی منتیں کرنا شروع کر دیں۔ بالآخر ٹھوڑی دیر بعد جب حماد نے یہ دیکھا کہ جینی اور ڈاکٹر کمال نے اس کے ساتھ عراق جانے اور اس کی بہن حبیبہ کی شادی میں شرکت کرنے کی ہامی بھر لی ہے تو اس کی خوشی دیدنی حد تک اس کے مسرت آمیز اور حیرت زدہ چہرے سے کافی دیر تک مترشح ہوتی رہی۔

☆☆☆

حماد انداز کی بات پر کمال تو الجھ سا گیا مگر جینی کھل گئی اور اسی لہجے میں حماد سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”رنجی؟ مسٹر حماد!..... کیا تم واقعی ہمیں اپنے ساتھ عراق لے جانا چاہتے ہو؟..... اٹ دل بی سوگریٹ۔ مجھے مسلم روایات دیکھنے کا بہت قریب سے موقع ملے گا۔ یہ میرے لیے ساری زندگی ایک گڈ میسوریز ہوں گی، تم کیا کہتے ہو..... کمال.....؟“ اس نے آخر میں کمال کو ٹھوکا دیا۔ وہ ایک کرسی اس کے قریب کھینچ کر براہمان ہو چکی تھی۔ حماد کو جینی کا بچوں کی طرح ہنسا مسکراتا چہرہ بہت بھلا محسوس ہو رہا تھا۔ مسکراتے وقت جینی کے سرخ و سپید رخسار دیکھنے لگتے تھے، ایک ڈھیل سا اس کے دائیں گال پر پڑتا تو حماد کی شوقیہ دید فزون ہونے لگتی تھی، ایسا ہی ایک معمولی سا گڑھا..... جینی کی ٹھوڑی پر بھی پڑتا تھا۔ بلاشبہ چوبیس، پچیس سالہ سرو قد جینی..... بیک وقت حسن و لطافت کے علاوہ مصومیت کا مریخ بھی تھی۔ اس کے حسن و شباب میں ایک جاڈیت تھی..... وہ بیک وقت طرح دار بھی نظر آتی تو بچوں جیسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہو جانے والی بھی۔ اس کے چہرے کی ڈلفری میں عجیب سا کھویا کھویا پن بھی حماد کو محسوس ہوتا تھا۔ آنکھیں نیلی تھیں مگر اس کے گوشے قدرتی کاجل لیے ہوئے تھے..... دوران گفتگو تو کمال نے حماد کو جینی کی کھٹکھٹاہٹ میں گم بھی ہونے دیکھا۔

اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تو کمال نے ہولے سے کھٹکھٹاتے ہوئے شرارتی لہجے میں جینی سے کہا۔ ”تو پھر دیر کس بات کی ہے..... تیاری پزلو عراق جانے کی..... بس ایک کام تمہیں کرنا پڑے گا، کسی مسلم اسٹور سے تمہیں ایک عدد حجاب خریدنا پڑے گا۔“

”یقیناً..... میں پہنوں گی حجاب.....“ وہ بڑے شوق سے بولی۔ ”میں نے یہاں بہت سی مسلم خواتین کو حجاب میں دیکھا ہے اور سچ پوچھو..... مجھے ان خواتین میں ایک وقار سا محسوس ہوتا ہے..... ایک دبدبہ سا ان کی شخصیت کے..... ہم کاب ہوتا ہے۔“

”لیکن جینی! مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ..... یہاں ایسی حجاب پوش مسلم خواتین کے ساتھ بسا اوقات ناروا سلوک بھی کیا جاتا ہے۔ انہیں تھیک اور مذاق کا نشانہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے بلکہ شرط رکھی جاتی ہے کہ حجاب پر انہیں بغیر حجاب کے آنا ہوگا۔“

کمال نے سٹی سے کہا۔ یہ بتاتے ہوئے اسے گزشتہ ریسیرچ کلب میں ملنے والی مسلم برقع پوش خاتون مرینہ سے



ہونے لگا تھا کہ یہ آبدوز کا ریڈار سیکشن تھا۔ وہ خود ایک بڑی جہازوں کی کمانڈر (کمپنڈر) کا مالک تھا۔ اس کی خاصی عمر سمندر گردی میں گزری تھی۔ وہ یہ سب باتیں سمجھ رہا تھا۔ جس دروازے سے وہ جہاز نکلا تھا، وہ تھوڑا کھلا ہوا تھا اس لیے اندر موجود وہ ان کی باتیں بھی بڑی آسانی سے سن رہا تھا۔

محلے کے تینوں افراد نے ہیڈ فون پہن چکے تھے۔ عابد ان کی وہ باتیں بھی سن رہا تھا جو انہیں احکامات کی صورت میں مل رہے تھے، ساتھ ہی وہ گاہے بگاہے سامنے لگی اسکرین پر بھی بہ غور نظر میں جمائے ہوئے تھا۔ کبھی کسی اسکرین کا رنگ سرخ ہو رہا تھا اور کبھی سبز..... ایک اسکرین پر نظر پڑتے ہی عابد ششکری بڑی طرح چونکا تھا..... اس اسکرین پر خوشی رنگ کا شینڈ سا پڑ رہا تھا جبکہ گراؤنڈ سیاہ تھا۔

وہاں "وار ہیڈ اسٹیشن" کا پورا رائف نظر آ رہا تھا۔ پھر ان تینوں کی گفتگو جو یہ کبھی آپس میں اور کبھی مائیک پر کپتان اور نائب کپتان سے کر رہے تھے، وہ سب سن کر عابد ششکری کے ایک لمحے کو تو ہاتھ پاؤں ہی بھول گئے تھے۔ اب جا کے

اس پر یہ بھیانک انکشاف ہوا تھا کہ ناوائسنگی یا حادثاتی طور پر بلاشبہ اسرائیلی جنگی آبدوز میرا تو تھی ہی..... لیکن یہ عام آبدوز نہیں بلکہ خطرناک ایٹمی آبدوز آگوستا تھی جو اس وقت اپنے آہنی بطن میں نہ جانے کتنے نیوکلیئر بم اور وار ہیڈ لیے

ہوئے تھی۔ نیز یہ آبدوز گزشتہ کئی روز سے ایک خطرناک اور تباہ کن مشن پر نکل ہوئی تھی، جس کا مقصد کسی وقت بھی مسلم ریاست لیبیا پر ایک کرنا تھا جبکہ ابھی انہوں نے لیبیا کی دو بڑی بندرگاہوں طرابلس اور بنغازی کو نشانے پر لے رکھا

تھا اور اوپر سے جتنی احکامات ملنے کے خطر تھے، تاہم اس وقت ان کا اہم مشن لیبیا سے لے کر لیبیا کے مجاہدوں کو جانے والے خفیہ امدادی جہازوں اور semergeships کو روکنا اور انہیں سبوتاژ کرنا تھا۔ ان کی آپس کی ہونے والی گفتگو اور وقتاً فوقتاً ملنے والے احکامات، اور جوابی بیانات جو مختصراً

رپورٹس کی صورت میں عابد ششکری کو سننے میں آئے تھے۔ ایک تو یہ کہ انہیں بالکل ابھی ایچ بی بنغازی کی بندرگاہ میں متعین یا بہ الفاظ دیگر "مس پینے" اسرائیلی جاسوس نے جو

بندرگاہ میں ہاربر ماسٹر کے نائب کی حیثیت سے چھپا بیٹھا تھا بھیجی جانے والی اپنی خفیہ رپورٹ میں مطلع کیا تھا کہ معترب طرابلس کی بندرگاہ سے ایک بحری جہاز "سیرج شپ" حیدر کے لیے روانہ ہوا ہے۔ اس جہاز میں بھاری مقدار میں عسکری آلات سمیت کندھے سے فائر ہونے

والے طیارہ شکن میزائل لدے ہوئے تھے، اپنے مذموم کثیر

آبدوز کے "سی کاک" کھول دیے گئے تھے۔ آبدوز اب دھیرے دھیرے سمندر میں ڈوبنا شروع ہو گئی۔

عابد ششکری اور ناٹس اندر داخل ہو چکے تھے اور عابد نے اب مزید احتیاط کے پیش نظر نامہ کو یہ حقیقت بالآخر گوش گزار کر دی کہ انہوں نے حادثاتی طور پر جس آبدوز کے اندر پناہ لی تھی، وہ درحقیقت ایک اسرائیلی آبدوز تھی۔ نامہ

نے جب یہ سنا تو اس کا چہرہ یکدم فق ہو گیا۔ تاہم عابد نے اسے تسلی دینی چاہی تھی کہ وہ اللہ پر بھروسہ رکھے، جو اب تک انہیں جان لیوا خطرات سے بچاتا آیا ہے وہی ان کی آگے بھی دست گیری فرمائے گا۔ نامہ کو کچھ حوصلہ ہوا.....

اور اس نے عابد کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرا کر اپنے سر کو ہاتھیں دھس دی تھی۔

آبدوز کا اندرونی ماحول باہر کی بہ نسبت اتنا پر شور نہ تھا۔ البتہ اس کی گھوم گھوم اور شوشوں سماعتوں کو مجروح کرتی محسوس ہوتی تھی، مگر یہ آوازیں بھی کسی کسی مخصوص گوشے سے ابھرتی محسوس ہوتی تھیں۔

بہر طور..... آبدوز کے اندر دونوں محتاط روی سے سرکتے ہوئے کسی تنگ سے گوشے میں چپے بیٹھے.....

تھوڑی دیر تک اپنے گرد و پیش کی سن گن لیتے رہے۔ عابد ششکری کے چہرے پر گہری فکر آمیز سوچ کے تاثرات ضرور ہو رہے تھے، نامعلوم کیوں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہاں معترب کسی بڑے اور زبردست

معرکے سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔ وہ دونوں اس وقت کسی بڑے خطرے کی گود میں آن کرے تھے تاہم یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ..... اب تک وہ دشمن کی نظروں میں نہیں آئے تھے۔ اگر آبدوز میں موجود اسرائیلیوں کو ان کی ذرا بھی

بھنگ پڑ جاتی تو یقیناً آبدوز کے کونے کونے میں ان کی زبردست اُحتد پانچ جاتی۔

یہ دونوں آبدوز کے شاہیں شاہیں کرتے ماحول میں نہایت محتاط روی کے ساتھ سرکتے ہوئے اس طرف نکل آئے جدھر آگوستا پر صوت گیر مشین کنٹرول کرنے والے محلے کے لوگ موجود تھے۔ ان کی تعداد تین تھی۔ عابد نے ایک گول شیشے کی کھڑکی سے اندر جھانکا..... وہاں سیکشن

انچارج سارہ موجود تھی اور دوسری تھی۔ عابد نے نامہ کو گرد و پیش پر نگاہ رکھنے کی تاکید کی تھی اور خود گول شیشے کی کھڑکی سے اندر جھانک رہا تھا۔

کمرے کے آلات، بڑی بڑی اسکرینیں اور مخصوص قسم کے بینک کرتے مشین بورڈز دیکھ کر اسے اندازہ



ہاتھ چوم لیا۔  
ٹھیک اسی وقت عابد کو ریڈار روم کے ادھ کھلے  
دروازے کے اندر سے کچھ جوشیلی آوازیں ابھرتی سنائی  
دیں۔ وہ چونک کر اس طرف متوجہ ہوا اور نامہ نے  
گرد و پیش پر اپنی نگاہیں گاڑ لیں۔

عابد نے اس بار دروازے کی ادھ کھلی جھری سے  
اندر جھانکا۔ سارہ کسی سے مؤدبانہ جوش کے ساتھ کہہ رہی  
تھی۔ اس کی نگاہیں سامنے ایک اسکرین پر تھیں۔ ”سر!.....  
یہ سرج شب کو ٹریس کر لیا گیا ہے مگر ابھی وہ ریج سے دور  
ہے..... آگے کیا حکم ہے؟“

دوسری جانب سے سارا احکامات سنتی رہی پھر یولی۔  
”اوکے سر!..... میں اسے ڈارگٹ کیے ہوئے ہوں۔  
فائرنگ کنٹرول کاؤنٹ ڈاؤن کے لیے میں نے ایگولری  
پاور auxiliary power کوری اسٹورڈ کرنا شروع  
کر دیا ہے..... دو تار پیڈ ریڈی فار شوٹنگ کر دیے ہیں۔“  
سارہ اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کر رہی تھی اور عابد کے  
پورے وجود میں لاتعداد چھوٹیاں سی رہتی محسوس ہو رہی  
تھیں۔ وہ کسی صورت میں اس امدادی جہاز کو ان کے  
ہاتھوں تیار ہونے دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اسکرین اسے بھی  
نظر آ رہی تھی، جس پر ایک بحری جہاز کا گراف متحرک تھا اور  
اس پر گول نارگٹ بجک کر رہا تھا، جس کی لکیروں پر رنگ  
ابھی گرین تھا۔ عابد جانتا تھا کہ اس کا مطلب یہی تھا جہاز  
ابھی ان کے تار پیڈ کی ریج سے باہر تھا۔

اس دوران عابد نے سارہ کے ایک ساتھی کو اس سے  
مخاطب ہوتے سنا۔

”ہمیں فائرنگ ریج کو رن کرنے کے لیے..... اپنی  
آبدوز کو نزدیک لے جانا ہوگا۔ کیپٹن پریمان کا حکم ملا ہے،  
وہ اس جہاز کو جلد سے جلد تیار کرنا چاہتے ہیں تاکہ سسٹمی ٹی  
طرف فوراً روانہ ہو جائے۔“

”یہ ممکن نہیں۔“ سارہ نے کہا۔ ”میں خود بات کرتی  
ہوں۔“ پھر اس نے انٹر کام پر کیپٹن پریمان سے بات کی  
اور مؤدبانہ اسے صورت حال بتاتے ہوئے کہا۔

”کیپٹن! ہم فائرنگ ریج حاصل کرنے کے لیے  
آبدوز تو آگے نہیں بڑھا سکتے۔ حدود سے تجاوز کرنے پر ہم  
لیپا کی محنتی جہتی آبدوزوں کے نشانے پر آجائیں گے اور ان  
کی نظروں میں بھی..... ہمیں تھوڑا ویٹ کرنا پڑے گا۔“

دوسری طرف سے غالباً اوتے کہا گیا تھا۔ سارہ اب  
مٹل بورڈ کے مختلف چلتے بچتے پنوں میں الجھ گئی تھی۔ ٹھیک

القاصد کے حصول کے لیے اسرائیل کی یہ ایٹمی آبدوز  
چوبیس گھنٹے بحیرہ روم میں لیپا، اردن اور شام کے ساحلی  
حدود کے قریب گہرے پانیوں میں گشت کرتی رہتی تھی۔  
فلسطینی مجاہدین کے لیے امداد پہنچانے والے اس مذکورہ  
بحری جہاز کو تار پیڈ وار کے تیار کرنے کا منصوبہ بنایا جا چکا تھا  
اور عابد شیکری کا چہرہ فرط جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ  
اپنے ہونٹ بھیجے کچھ سوچ رہا تھا..... وہ اس لیپا سے روانہ  
ہونے والے بحری جہاز کو تیار ہونے سے بچانا چاہتا تھا  
کیونکہ اگر یہ اسرائیلیوں کے ہاتھوں تیار ہو جاتا تو فلسطینی  
مجاہدین ایک بڑی تک اور امداد سے محروم ہو جاتے۔ یہ ان  
کا بہت بڑا نقصان ہوتا۔ عابد کے دل و دماغ میں یہ سوچ  
سوچ کر جوش کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا کہ ان کا حادثاتی  
طور پر اسرائیلی ایٹمی آبدوز میں داخل ہونا یقیناً مشیت  
ایزدی ہی تھا کہ وہ ان کی سازش سے باخبر ہو گیا تھا۔ اسے  
پورا یقین تھا کہ اس نیک مقصد میں اللہ اس کی بھرپور مدد  
کرے گا۔ تاہم وہ سوچنے لگا کہ وہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا  
تھا۔ ایک نیک مقصد کے لیے اسے اپنی جان جانے کا کوئی  
ڈر یا خوف نہ تھا مگر نامہ بھی اس کے ساتھ تھی..... اس نے  
جب نامہ کو یہ سب بتایا تو نامہ کے دل و دماغ سے بھی  
موجودہ احساسات کا سارا ڈر اور خوف جاتا رہا۔  
وہ پر عزم لہجے میں عابد شیکری سے یولی۔

”عابد!..... ہم جب قبریں سے روانہ ہوئے تھے تو اس  
پختہ عزم کے ساتھ ہم نے عہد کیا تھا کہ فلسطین کے مظلوم عوام  
اور اس پر کئی جارحیت کرنے والے اسرائیل کی ہر سازش کو  
نا کام بنا کر دیں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ کئی کے جال کی طرف  
اسلامی ممالک تک زہری طرح سرایت کی ہوئی یہودیوں کی ہر  
سازش کا مقابلہ کر کے اسے سبوتاژ کرنے کی کوشش کریں گے۔  
تم شاید یہ سمجھ رہے ہو گے، اس بھی ایک انکشاف کے بعد کہ ہم  
حادثاتی طور پر اسرائیل کی ایک خطرناک بوٹ میں آن پھنسے  
ہیں اور میں اپنی جان جانے سے خوف زدہ ہو رہی ہوں گی تو یہ  
غلط ہے..... ہمیں ہر صورت میں اس بحری جہاز کو نہ صرف بچانا  
ہوگا بلکہ اس آبدوز کو بھی تیار کرنا ہوگا جو اپنے اندر تیار کن  
سازشوں کے بحر سنبھالے ہوئے چھپی بیٹی ہے۔ میں تمہارے  
ساتھ ہوں، وقت کم ہے..... جو کرنا ہے جلدی کرو۔“

نامہ کی اس گفتگو نے عابد شیکری کو مرتاپا سہارا  
کر دیا۔ اس نے بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ منکرا  
کر نامہ کے کانٹے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تو نامہ نے بے  
اختیار اپنی گردن ذرا خم کر کے دیر سے سے موز کر اس کا



ہوئے عابد پستول سنبھالے اندر داخل ہو گیا۔ دونوں مردوں عورت اسکرین پر متوجہ تھے۔ ان کے کانوں پر ہیڈ فون تھے۔ ریڈیو روم میں الٹی گفٹی جاری تھی، عابد نے مرد کے عقب میں جا کر اس کا بھی وہی حزر کیا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دائیں جانب چیئر پر بیٹھی سارہ ری طرح چوٹی تو عابد نے نفرت و غیظ سے ہونٹ بھیج کر اس کے سر سے ہیڈ فون اتار پھینکا اور بھیڑیے جیسی خونخوار خراہٹ سے بولا۔

”خبردار!..... کوئی غلط حرکت مت کرنا..... کاؤنٹ ڈاؤن اور فائرنگ سسٹم آف کر دو..... جلدی..... ورنہ گولی مار کے بھجا اڑا دوں گا تمہارا۔“ پستول کی نال اس نے سارہ کی پیشی سے لگا دی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف اور حیرت کے طے چلے تاثرات تھے۔ غالباً اسے بھی ایک اجنبی حملہ آور کی ریڈیو روم میں تو کیا آبدوز میں بھی کھس آنے کا توقع نہ تھی مگر دوسرے ہی لمحے وہ جیسے سنبھل کے اسے دھمکا رہے ہوئے بولی۔

”تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جاسکتے..... بہتر یہی ہے کہ.....“ دوسرے ہی لمحے عابد شیکھری کا بائیاں ہاتھ حرکت میں آیا۔ اس کے مضبوط ہاتھ کا گھونسا سارہ کے جڑے پر پڑا تھا۔ اس کے حلق سے مارے اذیت کے چیخ خارج ہو گئی۔ گال پھٹ گیا اور شاید ایک آدھ دانت بھی نوٹ گیا تھا۔ اس کے منہ سے نکل جھل خون جاری ہو گیا تھا۔ کسی عورت ذات پر ہاتھ اٹھا، یہ عابد کا شیوہ نہ تھا لیکن یہاں معاملہ اور تھا۔ اس نے اسی ہاتھ کے پنجے سے سارہ کی گردن دو بوج لی جس سے بیچ مارا تھا۔ خونخوار خراہٹ سے دوبارہ بولا۔ ”بیہودن کتیا! اگر اب بھی تو نے میری بات نہ مانی تو میں تجھے جہنم واصل کرنے کے بعد بھی یہ سب کر سکتا ہوں..... میں بھی اس فیئڈ سے حلق رکھتا ہوں..... ورنہ تمہاری اس الٹی آبدوز میں کس طرح داخل ہو سکتا تھا۔“

عابد کے لہجے کی گھن گردن اور پر قطعیت دلیل نے سارہ کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا..... سارہ نے اس مقام تک آنے کے لیے بڑی محنت کی تھی۔ کتنے ہی اسرائیلی آفیسروں کی آغوش گرم کی تھی..... یہ اس کے کیریئر کی آخری مہم تھی۔ اس کے بعد اسے گل امیب کی بحر میں متعین کیا جانے والا تھا اور اس نے اپنے ایک چاہنے والے کے ساتھ روشن مستقبل اور اس کے ساتھ ہنس خوشی زندگی کے خوش آئند خواب دیکھے تھے۔ وہ یہ سب چکنا چور نہیں ہونے دیتا چاہتی تھی۔ اندازہ تو اسے ہو ہی چکا تھا۔ اس کا (عابد کا) حلق کسی حریت پسند تنظیم سے ہی ہو سکتا تھا ہذا کراہے ہوئے بولی۔

”و..... دیکھو..... میں مرنا نہیں چاہتی.....“

اسی وقت اسکرین پر بلک کرتے ٹارگٹ کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اب ٹارگٹ کا گول گراف..... امدادی شپ سمیت ریڈ ہو کے بلک کرنے لگا تھا۔ سارہ نے اس وقت پُر جوش آواز میں مائیک پر کپٹین پر ایمان سے بات کی۔

”کپٹین! ٹارگٹ جیس ہو گیا..... کاؤنٹ ڈاؤن شروع کیا جائے؟“

اسے اجازت مل گئی۔ سارہ کے ہاتھ تیزی سے مختل بورڈ پر تھمکنے لگے۔ ادھر ناہد شیکھری کے چہرے پر تشویش کے آثار نمودار ہو گئے۔ وہ کسی صورت میں بھی امدادی شپ کو تباہ ہونے نہیں دینا چاہتا تھا..... ابھی کاؤنٹ ڈاؤن شروع نہیں ہوا تھا..... بروسیس اسٹارٹ ہو چکا تھا۔ عابد شیکھری کی رگوں میں خون کی گردش یکثرت تیز ہونے لگی تھی۔ وہ کسی بھی لمحے جا رہا نہ قدم اٹھانے والا تھا۔ یہ اس کا خطرناک اقدام بھی ہو سکتا تھا۔ آبدوز میں موجود اسرائیلیوں کو ان کی بھٹک بھی مل جاتی تو کھلبلی مچ جاتی۔ عابد کو اس کی پروا نہ تھی۔ وہ ہونٹ پیچھے کچھ سوچتا رہا۔ اسی وقت کمرے میں تیز سیٹی کی سی آواز ابھری۔ دور کمرے میں روپوٹ کی سی زانا آواز سنائی دی۔

"Firing control countdown to launch & auxiliary power restored" اور اس آواز کے ساتھ ہی اس آواز نے الٹی گفٹی گنتا شروع کر دی۔ دو عدد تار پیڈ و فائر کیے جانے کے لیے ریڈی ہو چکے تھے۔ عابد کے لیے اب حرکت کرنا ناگزیر ہو چکا تھا۔ اس نے پلٹ کر ناغمہ سے مخاطب ہو کے اسے ساری صورت حال بتائی پھر اسے قنطر رہنے کا کہہ کر پستول نکال لیا۔ ابھی وہ اندر داخل ہونے کے ارادے سے بڑھا ہی تھا کہ اچانک حملے کے تین افراد میں سے ایک کو اس نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر دروازے کی طرف آتے دیکھا۔ عابد فوراً ایک طرف ہو گیا۔ وہ آدی باہر نکلا تو بری طرح ٹھنکا۔ سامنے اسے ناغمہ کھڑی دکھائی دی۔ جس کی موجودگی یقیناً اس آدی کے لیے ناقابل یقین ہی تھی۔ اس لیے وہ ایک اجنبی عورت کو دیکھ کر چند ثانیوں کے لیے تو حیرت زدہ ہی رہ گیا، پھر تیزی کے ساتھ اس کے ہاتھ نے بیٹھ کی جانب حرکت کی۔ وہ شاید کوئی ہتھیار نکالنا چاہ رہا تھا کہ اچانک عقب سے عابد نے اس کے سر کے پچھلے حصے میں اپنے پستول کا دست رسید کر دیا۔ وہ بجلی کراہ آمیز آواز کے ساتھ تھوڑا کر گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔

”اسے ایک طرف گھسیٹ کر لے جاؤ۔“ کہتے



تت..... تت..... تم اگر میری جان کی ضمانت دو تو میں.....  
تمہاری بات مان سکتی ہوں۔“

”میری اپنی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں تو تمہاری  
زندگی کی ضمانت کیا دوں گا۔“ عابد درشت لہجے میں بولا۔  
”لیکن اگر تم میری بات مزید کوئی وقت ضائع کیے بغیر مان لو  
تو..... میں تمہیں کوئی نہیں ماروں گا۔“  
”وعدہ کرتے ہو؟“

”ہاں..... وعدہ کرتا ہوں..... بشرطیکہ تم نے میرے  
کسی کام میں رکاوٹ نہ ڈالی تو۔“

سارہ نے اسی وقت مختل بورڈ سے کھلتا شروع  
کر دیا۔ عابد کی نظریں بھی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں، اس  
وقت ریڈار روم میں مختلف الارموں اور سیٹیوں کی آوازیں  
گونجنے لگیں۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ عابد نے  
دیکھا..... اسکرین پر ریڈار اور امدادی شپ کا گراف مسلسل  
بلک کر رہا تھا۔ دوسرے گراف میں اس نے سگار جیسے دو  
تار پیڑ کو جمیر سے نکتے دیکھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس کا  
پیرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔ اسی گنتی جاری تھی، وہ سوچ رہا  
تھا، سارہ اسے کسی قسم کا دھوکا تو نہیں دے رہی ہے کیونکہ  
ابھی تک یہ گنتی کا عمل رکھا تھا اور نہ ہی گراف غائب ہوا تھا۔  
پھر چند سیکنڈوں بعد گنتی پانچ پر آگئی۔ اس کے بعد چار.....  
پھر تین..... دو..... ایک..... زیریں..... اس کے ساتھ ہی  
عابد کی پھٹی پھٹی نظروں نے دوسری اسکرین سے دو سگار نما  
تار پیڑ کو ہلکے وقت حرکت کرتے دیکھا..... وہ اپنی دم  
سے پانی کے بلبوں کے طوقان چھوڑتے تیزی سے امدادی  
شپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

”اسرائیلی فوج!..... تو نے مجھے دھوکا دیا۔ تار پیڑ وقار  
کر دیے..... اب مرنے کے لیے تیار ہو جا۔“ عابد شہسمری  
نفرت و غصے کے مارے دانت بچھ کر بولا اور ہسٹول کی نال  
سارہ کی کتلی لگاتے ہوئے انگلی لہنی پر رکھ دی۔

”ٹھنٹ..... ٹھنٹ..... ٹھنٹ..... تم غلط سمجھے ہو.....“ سارہ  
خوف سے چلائی۔ ”تار پیڑ وقار کرنا میری مجبوری تھا،  
کاؤنٹ ڈاؤن..... آخری مرحلے میں تھا۔ جمیر میں چین  
ری ایکشن کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ تار پیڑ کو وقار کرنے سے  
تمہیں روکا جاسکتا تھا، اگر ایسا کیا جاتا تو وہ جمیر کے اندر ہی  
بلا سٹ ہر جاتے اور پھر یہ آبدوز بھی تباہ ہو جاتی۔“  
”تو پھر تم نے یہ کیا کیا ہے؟“ عابد کی کچھ جان میں  
جان آئی۔

”میں نے ان کی ڈگری (نشاندہ) تبدیل کر دی

ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اسکرین کو دیکھتے رہو، تمہیں میری  
سچائی کا ثبوت مل جائے گا۔“

عابد کی دم پہ خودی نظریں اسکرین پر جم گئیں۔ دو  
تار پیڑ..... گہرے پانیوں میں اپنے پیچھے ان گنت بلبوں  
کے انبار چھوڑتے امدادی شپ کی طرف بڑھ رہے تھے اور  
پھر چند ہی سیکنڈوں بعد عابد نے دیکھا، تار پیڑ وز.....  
امدادی شپ تک پہنچنے سے پہلے ہی داگیں باگیں مڑ گئے۔  
ان کا رخ سمندر کی گدلی کی طرف ہو گیا..... اور پھر وہ  
غائب ہو گئے۔ امدادی شپ..... جوں کا توں اپنے سفر کی  
جانب گامزن تھا۔ یہ دیکھ کر عابد نے بے اختیار سکون کی  
سانس لی۔ اچانک وہ ٹھنکا۔ ریڈار روم سے باہر اسے ایک  
گھٹی گھٹی سی چٹائی دی۔ اس نے چونک کر دروازے کی  
طرف دیکھا۔ اسے نامہ کی فکر لاحق ہونے لگی، ادھر.....  
سارہ نے عابد شہسمری کو ذرا غافل پا کر اچانک اس کے  
ہسٹول والے ہاتھ پر گھونسا رسید کر دیا۔ عابد اس حملے کے  
لیے تیار نہ تھا۔ نتیجتاً ہسٹول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر  
پڑا۔ وہ کمرے سے باہر دوڑ کر نامہ کی خیریت معلوم کرنا  
چاہتا تھا لیکن سارہ نے اچانک ”ہاتھ“ دکھا دیا تھا۔ ہسٹول  
عابد کے ہاتھ سے نکتے ہی سارہ نے رسی پر پٹے پٹے پھرتی  
کے ساتھ جھک کر ہسٹول اٹھانا چاہا تھا کہ عابد نے ہونٹ بچھ  
کر اپنے داگیں ہاتھ کا گھونسا اس کی گردن کے پچھلے حصے پر  
رسید کر دیا۔ سارہ کی کرب ناک چٹخنے سے اس کے پاس  
وقت نہ تھا۔ اس نے تیزی سے حرکت کی۔ اپنا ہسٹول تلاش  
کر کے اٹھایا اور دروازے کی طرف لپکا ہی تھا کہ اسے دو  
اسرائیلی وردی پوش فوجی نظر آئے۔ ان کے جسموں پر  
اسرائیلی بحریہ کی مخصوص وردی تھی اور سینے اور شولڈرز پر  
مخصوص نشان تھے ان کے سینے سے پہلے ہی عابد نے ان پر دو  
تین تیسے اوپر فائر جھونک دیے۔ دونوں کوس پر اپنی بھاری  
گتیں تاننے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ کریبرہ انگیز چیخوں کے  
ساتھ گرے اور ٹھنڈے پڑ گئے۔ عابد ان کی لاشوں کو  
پھلانگتا ہوا دروازے سے باہر آیا۔ ایک جانب اسے فلور پر  
نامہ آڑی ترچی پڑی نظر آگئی۔ اس کے نیچے ہونٹ سے  
مخون کی لکیر بہ رہی تھی..... وہ نیم بے ہوش تھی اور ہولے  
ہولے کراہ رہی تھی۔ اسی وقت آبدوز کے اندر ہلکے چپخنے  
گئے..... عابد نے نامہ کو سہارا دیا اور اسے ہوش میں لانے  
کی کوشش کرنے لگا..... دلچسپا عابد کو متعدد بھاری دوڑتے  
قدموں کی دھمک سنائی دی۔

جاری ہے





## رشتہ

تئویر ریاض

مغربی معاشرے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہاں ہر ایک کو مکمل طور پر شخصی آزادی حاصل ہے اور برائی کی سب سے بڑی چیز بھی وہی آزادی ہے جس کی کوئی حد مقرر ہے نہ ہی رشتوں کی کوئی پاسداری ہے۔ ان کے مقدرے ان کے رشتے کو بھی ایک ایسے ہی موڑ پر لاکھڑا کیا تھا جہاں زندگی اور موت میں سے کسی ایک کا چناؤ لازم تھا۔

مہذب دنیا میں خود غرض انسانوں کی بے باکیاں

قریب سے گزرنے والی مکی سڑک کے ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ سورج آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا اور اکتوبر کی سردی شروع ہو چکی تھی۔ اس سار پر میری توجہ اس وقت گئی جب ایک گوا اس کے تاروں سے ٹھرا پا۔ شاید گوا نے بھی یہی

میںڈولین میں کتنے والی گولی سے سوراخ ہو گیا اور ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ شاید اس میں سے خون بہ رہا ہے لیکن فوراً ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کے ارد گرد سرخ پتے بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ سار میرے گھر کے

سپنس ڈائجسٹ 119 مارچ 2015ء

COPIED FROM WEB



سو جاہوگا کہ اس میں سے خون نکل رہا ہے۔ جیسے ہی میں اس کے قریب گیا تو کواخوف زدہ ہو کر اڑ گیا۔

میں تقریباً سارا دن گھر سے باہر رہا تھا اور اس سردی میں مجھے اپنے کپڑے ناکافی محسوس ہو رہے تھے۔ میں بہت تھک چکا تھا اور مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی تاہم اس مینڈولین کو دیکھ کر میرا جھس بڑھ گیا تھا میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ مجھے پہلی گولی چلنے کی آواز سنائی دی اور گولی میرے ہاتھوں میں سے گزرتی ہوئی ایک قریبی درخت کے تنے میں جا گئی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ کیا ہو گیا ہے۔ میں نے مینڈولین اٹھایا اور اسے گھما پھرا کر دیکھنے لگا۔ دوسری گولی کی آواز سن کر میں ٹوکھڑا ہوا اور گھر تک پہنچنے کے لیے محفوظ راستے کے پارے میں سوچنے لگا جو جنگل سے گزرتا تھا پھر ایک آواز میری سماعت سے نکل گئی۔

”ڈاکٹر ڈیلن! یہ تم ہو۔ میں نے کافی دنوں سے تمہیں نہیں دیکھا۔“

میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔ ”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ تمہیں جواب دینا چاہیے۔ کیا پتا تم مجھ پر دوبارہ گولی چلا دو۔“

”سوری، مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ تم ہو۔“ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سڑک کے دوسری جانب بڑے بڑے درختوں کے درمیان میں رائفل پڑے کھڑا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک سیاہ لبادے میں ملبوس تھا اور سر کو ایک بیٹ سے ڈھانپ رکھا تھا جس کی وجہ سے مجھے اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ ہوگی لیکن دیکھنے میں وہ بچاؤ کا لگتا تھا۔

”میں نہیں جانتا تھا کہ یہ تمہاری زمین ہے۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نہیں تھے اور نہ ہی اس نے معذرت کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

”یہ مینڈولین تمہارا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

اس کے کہنے پر میں نے پہلی بار مینڈولین کو غور سے دیکھا۔ یہ ایک قدیم طرز کا ساز تھا جسے نیشنل اسٹریٹجی انسٹیٹیوٹ نے غالباً 1930ء میں بنایا تھا۔ ایسی چیزیں یادگار کے طور پر رکھی جاتی ہیں۔

”ہاں۔“ میں نے اس سے جموٹ بولا۔

”ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے اسے گولی کا نشانہ بنایا ہے۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”واقعی؟“ میں نے مینڈولین کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس میں صرف ایک سوراخ ہوا ہے۔ میں اسے نشانہ بازی نہیں کہوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا تم شکار کے لیے نکلے ہو؟“ میں نے اس کی رائفل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے مجھے ہانپنے کی کوشش کی اور بولا۔ ”ڈاکٹر! تمہیں کبھی کبھی گرجا آ جانا چاہیے توڑی سی عبادت تمہارے لیے مفید رہے گی۔“

”شاید تم بھول رہے ہو نہ میں پہلے اکثر اتوار کے روز گرجا آیا کرتا تھا البتہ ان دنوں مصروفیت کی وجہ سے نافذ ہو رہا ہے۔“

”میری خواہش ہے کہ تم اپنی مصروفیت میں سے کچھ وقت عبادت کے لیے بھی نکال سکو۔“ وہ طنز یہ انداز میں بولا۔

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے، اب میں چلتا ہوں۔“

”جاؤ لیکن اس شخص کو ضرور تلاش کرنا جس کا یہ مینڈولین ہے۔ یہ ایک نادر شے ہے یقیناً کوئی نہ کوئی اسے واپس لینا چاہے گا۔“

یہ کہہ کر وہ مڑا اور تیزی سے نیچے کی جانب چل دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کے تاریک حصے میں غائب ہو گیا۔ میں ایک دو منٹ وہاں کھڑا یہ دیکھنے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ کس جانب گیا ہے۔ سورج غروب ہو رہا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے پسینا آنے لگا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ مجھے بلو ماؤنٹین واپس آئے دس سال کا عرصہ ہو چکا تھا اور میں اس گھر میں تنہا رہ رہا تھا۔ میں اب بھی یہی سوچتا ہوں کہ کیا واقعی یہ میرے والدین کا گھر ہے۔ سچ پوچھیں تو سچ معنوں میں یہ کبھی گھر تھا ہی نہیں، یہ محض ایک مکان تھا جاسکتا تھا۔ جب چھوٹا تھا تب بھی میرے والدین اپنے کام کے سلسلے میں گھر سے باہر ہی رہا کرتے تھے اور میں کم وبیش تنہا ہی پردان چڑھتا رہا۔ یہ عمارت قبیلے سے لگ تھلک پہاڑی کے واسطے میں واقع تھی۔

جب میں دس سال کا تھا اس وقت اس قبیلے میں ایک باروق ماؤن اسکوائر ہوا کرتا تھا۔ مجھے مس مار تھا کا بول بھی یاد ہے جہاں بھرتین کھانے ملا کرتے تھے۔ میرے



پر گولی چلائی جو مینڈولین پر تکی اور وہ اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ وہ شخص جنگل میں غائب ہو گیا۔ عین اسی وقت میں وہاں پہنچ گیا اور جیسے ہی میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا رہیں نے یہ سمجھ کر گولی چلا دی کہ میں وہی شخص ہوں جس کا وہ پیچھا کر رہا تھا۔

”یہ معلوم کرنا ہوگا کہ وہ کون شخص تھا۔“ شیرف نے کہا۔ ”تمہارے لہجے سے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم اس شخص کے بارے میں جانتے ہو؟“

”رے گراہم۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”وہی مینڈولین بھایا کرتا تھا۔“

دوسری جانب چند لمبے خاموشی رہی پھر شیرف نے کہا۔ ”وہ تین سال پہلے مر چکا ہے۔“

”لیکن تم نے کبھی اس کی موت کی تصدیق نہیں کی۔“

”ہاں۔“ شیرف نے اعتراف کیا۔ ”لیکن اس کا اکثر دشمنوں کے ساتھ فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ آخری مقابلے میں اسے شکست ہوئی اور ایک گولی اس کے چہرے پر لگی پھر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ مینڈولین گراہم کا ہے۔“

”اچھا۔“ میں نے مایوس ہوتے ہوئے کہا۔ ”ایک منٹ ہولڈ کرو۔“

میں ہوٹل روم میں آیا اور مینڈولین کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کی پشت پر چاقو سے رے گراہم کے نام کا مختلف آر جی کندہ تھا۔ میں نے یہ بات شیرف کو بتائی اور کہا۔ ”اس کے علاوہ تم اس علاقے میں کسی اور شخص کو جانتے ہو جو مینڈولین بھاتا ہے؟“

”اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ شیرف بولا۔ ”لیکن اس علاقے کا شیرف اور تمہارا پرانا دوست ہونے کا وجہ سے یہ میرا فرض بنتا ہے کہ تمہیں دوبارہ یاد دلا دوں۔ وہ تین سال پہلے مر چکا ہے اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میری معلومات کے مطابق برادر نہیں اور گراہم کبھی نہیں ملے۔ برادر نہیں ایسا آدمی نہیں کہ کسی اجنبی پر گولی چلائے لیکن لگتا ہے تم نے پہلے ہی ایذا ذہن بنایا ہے۔“

”تمہیں میرے بچے سے اس کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”اب تم کیا کرنے والے ہو؟“ وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

”رے گراہم کی بیٹی اب بھی ڈیولز ہرٹھ میں رہتی ہے۔ وہ اس بارے میں ضرور جانتی ہے۔ وہی ایک ایسی

والدین ایک سگری کارنیوال میں ملازمت کرتے تھے جو دی نین شو کے نام سے مشہور تھا۔ میرے والد جادوئی کرب دیکھایا کرتے تھے۔ وہ بہت بڑے فن کار تھے اور ان کے کمالات دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے جبکہ والدہ ان کے ساتھ معاون کے طور پر کام کرتی تھیں۔ وہ غیر معمولی طور پر خوب صورت تھیں۔ انہوں نے محبت کی شادی کی تھی اور ان کے عشق کے قصبے پورے قصبے میں مشہور تھے۔ میں نے کالج کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے سولہ سال کی عمر میں گھر چھوڑ دیا تھا۔ میں یونیورسٹی میں جس شعبے سے وابستہ تھا، وہ دس سال بعد بند ہو گیا۔ میں بڑے شہر میں رہائش اور خوراک کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا تھا، اس لیے واپس اپنے آبائی گھر چلا آیا جو میرے والدین کی وفات کے بعد خالی پڑا ہوا تھا۔ یہاں رہ کر میں نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا اور اس سے مجھے تھوڑی بہت آمدنی ہونے لگی۔

گھر پہنچ کر میں نے نوٹے ہوئے ساز کو ایک کرسی پر رکھا۔ کوٹ اور جوتے اتارے پھر کچن میں جا کر کافی تیار کرنے لگا پھر میں نے شیرف کا نمبر ملایا اور اسے اس واقعے کی اطلاع دی جب میں نے ڈیٹا ریس کا نام لیا تو وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”یہ ایک غیر معمولی بات ہے وہ عام طور پر کبھی چرچ سے اتنی دور نہیں جاتا۔“

”میں جانتا ہوں لگتا ہے کہ اس نے مینڈولین کا نشانہ لیا تھا۔“

”کیا؟“ وہ چونکتے ہوئے بولا۔

”ہاں، وہ پرانے زمانے کا بنا ہوا ہے اور بہت سے لوگ ایسی چیزوں کو اپنے پاس رکھنا پسند کرتے ہیں۔“

”تمہیں وہ مینڈولین کہاں سے ملا؟“

”سڑک کے کنارے، میں اسے دیکھنے کے لیے جھکا ہی تھا کہ ڈیٹا ریس نے مجھ پر دو مرتبہ گولی چلائی۔“

”کیا وہ اسے حاصل کرنا چاہ رہا تھا؟“

”لگتا تو نہیں، جب وہ سامنے آیا تو اس نے مجھے پہچان لیا۔ ہمارے درمیان تھوڑی سی بات چیت ہوئی اور اس نے مجھے گرجا آنے کی دعوت دی۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔“ شیرف بولا۔ ”اب بتاؤ تم نے مجھے فون کیوں کیا ہے؟“

”مجھے لگتا ہے کہ برادر ریس کسی ایسے شخص کا تعاقب کر رہا تھا جس کے پاس یہ مینڈولین تھا۔ اس نے اس شخص



ہستی ہے جس کا رے گراہم نے ہمیشہ خیال رکھا۔

”لیکن تم وہاں اکیلے نہیں جاؤ گے۔“

”میں صبح ہونے کا انتظار کروں گا۔“

فون رکھنے سے پہلے اس کی آواز سنائی دی۔ ”نہیں،

تم وہاں نہیں جاؤ گے اس بات کو بھول جاؤ۔“

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے اپنا بدن تولیے سے

خشک کیا۔ کپڑے بدلے اور گھر سے باہر نکل گیا۔ سورج

تقریباً غروب ہو چکا تھا اور ابھی میں نے اپنی پک اپ کے

ڈریوے آدھا راستہ ہی طے کیا ہوگا کہ ہر چیز تاریکی میں چھپ

گئی۔ میں اس راستے پر کئی سال بعد آیا تھا۔ جگہ جگہ کچھڑے

گزرتا اور خطرناک موڑ کاٹتا ہوا جب میں اس علاقے کے

نزدیک پہنچا تو سڑک پر گرے ہوئے ایک درخت نے میرا

راستہ روک لیا۔ اب ٹرک کے ڈریوے آگے جانا ممکن نہ تھا

اور مجھے پیدل ہی بقیہ راستہ طے کرنا تھا۔ مجھے تو انجیلا کا گھر

بھی معلوم نہیں تھا۔ بس ایک امید کے سہارے ہی اس سیاہ

اور سردرات میں اسے تلاش کرنا تھا۔

میں نے پک اپ کے ڈرائیو بورڈ سے ایک طاقت ور

تاریخ نکالی اور اپنے راستے پر چل پڑا۔ اچانک مجھے۔۔۔

بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ یہ دن میں

ہونے والے واقعے کی وجہ سے ہے لیکن جلد ہی سمجھ گیا کہ

گہری خاموشی اور سناٹے کی وجہ سے میری یہ کیفیت بدوری

ہے۔ ٹھوڑی دیر چلتے رہنے کے بعد میں ایک اونچے نیچے پر

پہنچ گیا۔ یہ جگہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ بچپن میں شریف

اسکے سو اور میں اگست کی چاندنی راتوں میں یہاں آیا

کرتے تھے اور گھنٹوں یہاں بیٹھ کر روشنی میں اڑنے والے

کیڑوں کا قصہ دیکھا کرتے۔ ابھی میں انہی یادوں میں

کھویا ہوا تھا کہ اچانک مجھے ایک آواز سنائی دی۔

میں نے پنٹ کر دیکھا اور آواز کی سمت تاریخ روشن

کروی۔ وہاں گراہم کی بیٹی انجیلا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی

عمر بہ مشکل پندرہ برس ہوگی۔ اس کے جسم پر کوٹ تھا اور نہ

پروں میں جوتے اور وہ یقیناً سردی محسوس کر رہی

تھی۔ ”ہائے ڈاکٹر ڈیولن، میں کبھی کوئی اور ہے۔“

”ہیلو انجیلا۔“ میں نے تاریخ نیچے کرتے ہوئے

کہا۔ ”تم نے جوتے نہیں پہن رکھے؟“

”نہیں۔“ اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ”تم

جان سکتے ہو کہ کیوں نہیں پہننے۔“

”تمہیں اس کھلی جگہ میں نہیں آنا چاہیے۔ گھر واپس

جاؤ وہ یقیناً گرم ہوگا؟“

وہ کچھ کہے بغیر مڑی اور ڈھال کی طرف چل دی۔ میں

نے پیچھے سے آواز لگائی۔ ”اگر میں بھی آ جاؤں تو تمہیں کوئی

اعتراض تو نہ ہوگا؟“

وہ کچھ کہے سوچتی رہی پھر کہا۔ ”ٹھیک ہے آ جاؤ لیکن

تمہیں فوراً ہی واپس جانا ہوگا کیونکہ میرے کچھ مہمان آنے

والے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور اس کے پیچھے

چل دیا۔

ٹھوڑی دور چلنے کے بعد ہی اس کا کہیں نظر آ گیا۔

میں شاید اس اندھیرے میں اپنے طور پر اسے تلاش نہ

کر پاتا۔ وہ مجھے گھر کے بجائے کھڑکیوں کا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔

انجیلا نے دروازے کو دھکا دیا اور اندر چلی گئی۔ میں باہر ہی

کھڑا رہا۔ یہ بد اخلاقی ہوئی، آرمیں اندر چلا جاتا۔ چند گھنٹوں

بعد انجیلا کی آواز آئی۔

”اندر آ جاؤ۔“

اس گھر میں صرف ایک کمر تھا جس میں ایک بستر،

میز، واش بیسن اور چولہا رکھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں ونڈ

پمپ لگا ہوا تھا۔ کمرے میں کوئی آتش دان نہیں تھا۔ میں سمجھ

گیا کہ وہ جو لمبے سے ہی کھا پکانے اور کمرے کو گرم رکھنے کا

کام لیتی ہوگی۔ کمرے کی دیواریں سپاٹ جس البتہ فرش پر

ایک قالین بچھا ہوا تھا۔

”کیا تم اپنے جوتے اتار سکتے ہو ڈاکٹر ڈیولن؟“

انجیلا نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتی کہ قالین مندھا ہو جائے۔“

میں نے فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس جگہ روشنی

کے لیے کئی تیل کے چراغ جل رہے تھے اور وہاں گرمی کا

احساس ہورہا تھا۔ جو لمبے بہ کچھ پک رہا تھا جس کی خوشبو گھر

کے کھانے چھٹی تھی۔

انجیلا نے میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

کہا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“

وہاں دو کرسیاں رکھی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ ان

میں سے کس پر بیٹھوں۔ اس نے میری سوچ پڑھ

لی۔ ”دونوں کرسیاں ایک جیسی ہیں جس پر چاہو بیٹھ جاؤ۔“

وہ اٹھ کر بیسن کے پاس گئی۔ ایک چار میں پھولوں کا

گلدستہ رکھا اور اس میں ٹھوڑا سا پانی ڈالا پھر اس نے وہ

گلدستہ لا کر میز پر رکھ دیا۔

”بہت خوب صورت پھول ہیں۔“ میں نے تعریف

کرتے ہوئے کہا۔

”تم یہاں اس تاریکی اور سردی میں صرف میرے



اتنا اچھا نظر نہیں آتا۔“ جنگل سے زرتے ہوئے اس کے قدموں کی آواز سے بہت شور ہوتا ہے لیکن وہ کسی کو ڈراتا نہیں ہے۔“

”پھر تمہارے خیال میں یہ کس کی آواز ہو سکتی ہے؟“ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔  
”اوہ۔“ اس نے کمزوری آواز میں کہا۔ ”میں جانتی ہوں یہ کیسی آواز ہے۔“

گھر کے باہر کسی کے کودنے کی آواز آئی اور کھڑکی میں ایک بھیا تک چہرہ نمودار ہوا۔ وہ اتنا خوف ناک تھا کہ میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور کرسی پر گر گیا۔ جس بات نے مجھے سب سے زیادہ حیران کیا وہ یہ کہ وہ مکان کے اندر دکھ رہا تھا اور اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اسی لمحے ایک قاتر کی آواز آئی اور کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ کر اندر آن گرا۔ میں نے انجیلا کو پکڑا اور اسے کھینچ کر میز کے پیچھے کر لیا۔  
”کیا تمہارے پاس کوئی گن ہے؟“ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ”لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

ایک اور قاتر کی آواز سنائی دی اور کھڑکی میں نمودار ہونے والا چہرہ غائب ہو گیا۔ کچھ دیر تک کسی کے غرانے کی آواز آتی رہی پھر دروازے پر دستک ہوئی۔  
”انجیلا۔“ کسی نے اس کا نام پکارا۔

”اوہ، خدا تیرا شکر ہے۔“ انجیلا نے گہری سانس لی اور دروازہ کھول دیا۔ وہاں.... ڈیڈ ریس کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا انجیلا نے آگے بڑھ کر اس کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں اور ریس کے ہاتھ سے بندوق گر پڑی۔

برادر ریس نے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”ڈاکٹر ڈیولین، میں نے تمہارا اثرک باہر دیکھا ہے۔“

میں نے اپنے قدم مضبوطی سے زمین پر جاتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ باہر کون تھا؟“ وہ دونوں ساکت کھڑے رہے۔

”انجیلا نے یہ کیوں کہا کہ اس کی گن سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”کیا تم نے اس آدمی کو گولی مار دی؟“

برادر ریس چند لمحے تک اپنا ہونٹ کا تار رہا جیسے کسی گہری سوچ میں ہو۔ ”نہیں، میں نے صرف اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے گولی چلائی تھی تاکہ وہ انجیلا کو

پھولوں کی تعریف کرنے نہیں آئے۔ کیا میں تمہاری آمد کا مقصد جان سکتی ہوں؟“

”تمہارا باپ مینڈولین بچایا کرتا تھا۔“ میں مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ایک مینڈولین ملا ہے جو میرے خیال میں اسی کا ہو سکتا ہے۔“

”اوہ۔“ یہ کہہ کر وہ مڑی اور کھڑکی میں سے تاریک جنگل کی طرف دیکھنے لگی۔

”مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس نے بہت عرصہ پہلے اسے ”رسیوں کے میلے میں بچایا تھا۔“  
”ہاں۔“ اس نے گردن ہلاتی۔

”اس کی پشت پر اس کا نام لکھا ہوا ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید تم اسے لینا چاہو۔“

وہ اچانک مڑی اور غضب ناک آواز میں بولی۔  
”اسے میرے قریب بھی مت لانا۔“ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور اس نے اپنی انگلیوں سے واش بین کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا جیسے اسے اپنے گرنے کا ڈر ہو۔

”ٹھیک ہے نہیں لاؤں گا۔“ میں نے اسے نارمل کرنے کی کوشش کی۔

”اسے جلا دو۔“ وہ بولی۔

”کیا؟“ میں نے آگے کی طرف جھک کر اپنی سانس قابو کرنے کی کوشش کی۔

”اس منحوس چیز کو جلا دو۔“ اس نے شانے جھینکتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کا دھیان بتانے کے لیے کہا۔ ”آج کی رات اتنی خاموشی کیوں ہے؟“

”باہر کوئی ہے۔“ اس نے نیچی آواز میں کہا۔  
”ممکن ہے کہ وہ مہمان ہو جس کے آنے کی تمہیں امید تھی۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میرے یہاں مہمان آنے والا ہے؟“

”جب تم نے مجھے باہر نیلے پردے دیکھا تھا تو یہی کہا کہ تم کسی ور کے آنے کی توقع کر رہی تھیں پھر تم نے رات کے وقت میز پر پھول سجا کر رکھ دیے۔“

”تم واقعی ہوشیار آدمی ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”گو یا وہ بھوت سے نہیں ڈرتا۔“

”نہیں۔“ وہ ہنسی بھرتے ہوئے بولی۔ ”وہ میرا محبوب ہے، پھر عرصہ پہلے اس کے چہرے پر چوٹ لگ گئی تھی اور وہ



چھوڑ دے۔“

”تم بتاتے کیوں نہیں کہ یہ سب کیا تھا؟“ میں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

انجیلا نے ریس کی آنکھوں میں جھانکا اور بولی۔ ”بہتر ہوگا کہ اسے بتا دو۔ یہ کسی نہ کسی طرح خود ہی اندازہ لگا لے گا۔ اسے وہ پرانا مینڈولین مل گیا ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ ریس بولا۔ ”کچھ دیر پہلے اسے اسے مینڈولین کے ساتھ دیکھ چکا ہوں۔“

میں نے بے اختیار ریس کی گن کی طرف دیکھا۔ وہ اعشاریہ بائیس کی رائل ٹی اور اس سے چھوٹے موٹے کام ہی لیے جاسکتے تھے۔

”تم میری بات کا یقین نہیں کرو گے۔“ ریس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ مجھے چیلنج کر رہا ہو۔

”دیکھو۔“ میں نے تھوڑا سا بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں کم و بیش ہر معاملے کی چھان بین کر سکتا ہوں لیکن کھڑکی میں نظر آنے والا بھوت نہیں ہو سکتا۔“

ریس نے میری طرف ایک قدم بڑھایا لیکن انجیلا نے اس کا بازو پکڑ لیا اور بولی۔ ”نہیں ڈیٹھا! میں اسے سمجھاتی ہوں۔“ ریس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور رضامندی میں سر ہلا دیا۔

”ڈاکٹر ڈیولین! بیٹھ جاؤ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ باہر کیا ہوا۔“

میں نے اس کی آواز میں درد محسوس کیا لیکن کچھ بولا نہیں بلکہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ کر اس کے بونے کا انتظار کرتا رہا۔ اس نے لمحہ بھر توقف کیا پھر کہنے لگی۔

”تم جانتے ہو کہ میرا باپ ایک شیطان صفت انسان تھا اور اپنی طرف نیڑی نظر سے دیکھنے والوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا کرتا تھا۔ اس نے مجھ پر بھی بے تحاشا تشدد کیا اور کئی بار میں مرتے مرتے بنی۔ وہ میری زندگی کا خوش قسمت ترین دن تھا جب مجھے اس کے مرنے کی اطلاع ملی۔ میں اس کی تجویز و حکیمین میں شریک نہیں ہوئی۔ میں تو اس کی قبر پر بھی تھوکتا پسند نہیں کرتی۔“

مجھے اس کے بیان پر ہانگ بھی حیرت نہیں ہوئی۔ اس حوالے سے رے گراہم کی شہرت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔

”اس روز بھی وہ نشے میں تھا جب اس کا سامن ڈویر اور اس کے بھائیوں سے ہوا۔ حالانکہ ان کی اس کے

ساتھ کوئی دشمنی نہیں تھی لیکن اس نے ان پر گولی چلا دی۔۔۔ جواب میں انہوں نے بھی قاترنگ کی اور اس کا چہرہ گولیوں سے چھلٹی ہو گیا اور وہ اسے مردہ سمجھ کر پلٹے گئے۔ اس کی لاش ناقابل شناخت تھی۔ ان تینوں بھائیوں پر مقدمہ چلا لیکن انہوں نے بے موقوفہ اختیار کیا کہ انہوں نے ذاتی دفاع میں گولی چلائی تھی۔ قصبے کا ہر شخص رے گراہم کو جانتا تھا اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ نشے کی حالت میں وہ کیا کر سکتا ہے چنانچہ انہیں بری کر دیا گیا۔“

”لیکن ان سب باتوں کا مینڈولین سے کیا تعلق ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے وہ چہرہ دیکھا تھا۔“ انجیلا نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”تم جانتے ہو۔ کھڑکی میں کون تھا؟“

میں نے پلکیں جھنکا کیں اور ذہن کی آنکھ سے اس چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔ وہ کون تھا؟“

”وہ میرا باپ تھا اور اپنا مینڈولین لینے کے لیے رات میں یہاں کا چکر لگایا کرتا تھا۔“

”وہ ایک بار پھر ہمیں پریشان کرنے کے لیے واپس آ گیا ہے۔“ ریس بولا۔ ”وہ گزشتہ شب یہاں آیا تھا میں اسی وقت میں بھی یہاں پہنچ گیا۔ میں نے اسے زوردارانہ مار دی اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے رائل سے اس کا نشانہ لیتا چاہا لیکن وہ دور نکل گیا۔“

”تاہم اس نے دیوار پر لٹکا ہوا مینڈولین اتار لیا تھا۔“ انجیلا نے سرگوشی کی۔

اسی لمحے ایک آواز نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ کوئی شخص میرا ٹرک اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اچھلا اور دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے تارچ روشن کی اور تیزی سے پہاڑی کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ تاہم مجھے اطمینان تھا کہ وہ شخص اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے گا کیونکہ چابیاں میری بیب میں تھیں اور ان کے بغیر ٹرک اسٹارٹ نہیں ہو سکتا تھا۔

جیسے ہی میں ٹرک کے قریب پہنچا مجھے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ اب سینٹھ بعد میں نے اپنے دائیں جانب کسی کے دوڑنے کی آواز سنی۔ چور پہاڑی کی طرف واپس جا رہا تھا۔ یقیناً اس نے میری تارچ کی روشنی دیکھ لی تھی جو اس اندھیرے میں لائٹ ہاؤس کا کام کر رہی تھی۔ میں نے ان آوازوں کا تعاقب کرنے کی کوشش کی اور یوں لگا جیسے وہ ڈیولز ہر تھ کی طرف جا رہا ہے۔ میں نے اپنی



ہوئے کہا۔ ”لیکن تم تین سال تک کہاں رہے؟“  
 ”زیادہ تر بار تھ کیرولینا میں۔“ اس نے جھکے جھکے  
 لہجے میں کہا۔ ”کچھ وقت دوسری جگہوں پر بھی گزارا، لگتا ہے  
 کہ دنیا دیکھ لی۔“

”ٹھیک ہے، کیا تم بتانا چاہو گے کہ اس رات کیا ہوا  
 تھا جب تمہیں اس جھگڑے کے بعد مردہ سمجھ لیا گیا؟“  
 ”ہاں، میں بھی حقیقت بتانا چاہتا ہوں۔ اگر تم برانہ  
 مناؤ تو میں بیٹھ جاؤں۔“

وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر چٹان کے  
 ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گیا۔ میں بھی چند قدم کا فاصلہ طے کر کے  
 اس کے سامنے براجمان ہو گیا۔ اس نے دور خلا میں دیکھا  
 پھر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”ڈوویر کے بھائی اور  
 میں ایک ہی جگہ کام کرتے تھے۔ میں کارخانے میں تھا اور  
 وہ مال کی تقسیم کیا کرتے تھے۔ بہت سے لوگ یہ بات نہیں  
 جانتے تھے۔“

”شراب۔“ میں نے تصدیق کرنے کے لیے  
 پوچھا۔ ”تم شراب بنا تے اور وہ اسے بیجا کرتے تھے؟“  
 ”ہاں۔“ اس نے بے صبری سے کہا جیسے اسے بات  
 ختم کرنے کی جلدی ہو۔ ”ایک رات میرا ایک شخص سے  
 جھگڑا ہو گیا۔ اس نے مجھ پر چاقو سے وا کیا تو میں نے اپنے  
 دفاع میں گولی چلا دی۔ پھر اس کے چہرے پر لگے اور  
 وہ ناقابلِ شناخت ہو گیا۔ مجھے دفاع کا حق حاصل تھا لیکن یہ  
 بھی جانتا تھا کہ مجھے ہی مجرم سمجھا جائے گا۔ تمہیں شاید معلوم  
 نہیں کہ پرانا شیرف کتنا گھٹیا شخص تھا چنانچہ میں نے اپنی  
 جان بچانے کے لیے ڈوویر کے بھائیوں کے ساتھ مل کر  
 ایک پلان بنایا اور مرنے والے کے کپڑے خود بہن لیے اور  
 اپنے کپڑے اسے پہنا دیے تاکہ لوگ مجھے مردہ سمجھیں۔  
 اس کے بعد میں یہاں سے چلا گیا۔ ویسے ہی میں تہذیبی کے  
 بارے میں سوچ رہا تھا۔ انجیلا بڑی ہوئی تھی اور میرے بشیر  
 بھی وہ سکتی تھی چنانچہ میں نے ایک نئی زندگی شروع کرنے کا  
 فیصلہ کیا۔“

”اب کیوں آئے ہو؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”آدھی کو گھر کی یاد ستانے لگتی ہے۔“ اس نے کہا۔  
 ”ان تین سالوں کے دوران شراب کا ایک قطرہ بھی میرے  
 حلق میں نہیں گیا۔ اب میں ایک بالکل بدلا ہوا آدمی ہوں۔  
 میں نے سوچا کہ زندگی کے بقیہ ایام میں گزاروں۔ مجھ سے  
 کسی کو پریشانی نہیں ہوگی۔“  
 ”کیا تم آج ہی آئے ہو؟“

تاریخ بھاری اور جھگڑوں کی روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔ مجھے  
 اس اوچی چٹان تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ مجھے ایسا لگا  
 کہ کوئی شخص گریٹا میٹ کی سگ کو ہاتھ سے رگڑ رہا ہے۔ میں  
 جانتا تھا کہ وہ اپنے دفاع میں مجھ پر حملہ بھی کر سکتا ہے۔  
 چنانچہ میں نے اسے ہاتھوں میں لگانے کی کوشش کی۔

”ہائے۔“ میں نے بے لگشی سے کہا۔ ”میں ڈاکٹر  
 ڈیولین ہوں۔ ڈیولر ریس نہیں اور تم سے چند باتیں کرنا  
 چاہتا ہوں۔“

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ایک کرخت آواز لفظ میں  
 ابھری۔ ”تم نے کہا ڈاکٹر ڈیولین۔“

”ہاں۔“ یہ بات میرے حق میں جاتی تھی کہ بلجو  
 ماڈرن میں ہر کوئی میرے والدین کو جانتا تھا اور اگر کوئی مجھ  
 سے نہ ملا ہو جب بھی وہ مجھے اس حوالے سے پہچان سکتا تھا اور  
 کہا کو بھی مجھ سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے، میں تمہارا ہوں۔“ اس کی آواز پھر فضا  
 میں گونجی۔

چٹان کے عقب سے ایک ساپہ نمودار ہوا میں اس کے  
 مزید قریب ہو گیا اور جھگڑوں کی روشنی میں جو کچھ میں نے  
 دیکھا وہ ممکنات میں سے نہیں تھا۔ میرے سامنے دونوں  
 ہاتھ سینے پر باندھے اسے گراہم کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سیاہ  
 رنگ کا اود ڈال اور پتلی ہوئی سولی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس  
 کے سر کے بال غائب ہو چکے تھے اور چہرے پر مستقل  
 اداسی نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسے پہچاننے میں کوئی غلطی  
 نہیں کی۔ اسے گراہم تین سال پہلے مر چکا تھا لیکن اب وہ  
 میرے سامنے کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔

”میں تمہارے والدین کو جانتا ہوں۔“ اس نے نرم  
 آواز میں کہا۔ ”میں بھی ٹین شوٹ میں ساز بجا کرتا تھا جہاں  
 وہ کام کیا کرتے تھے۔“

میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اسے گراہم؟“  
 ”ہاں۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”سب  
 تمہیں مردہ سمجھ رہے ہیں لیکن تم زندہ سلامت میرے  
 سامنے کھڑے ہو۔ کیا ڈوویر کے بھائیوں نے تمہیں گل  
 نہیں کیا تھا؟“

”نہیں، وہ کسی اور کو مارنے آئے تھے میں تو نشے کی  
 حالت میں پڑا ہوا تھا۔“

”میں نے بھی یہی سنا ہے کہ اس روز تم نے بہت  
 زیادہ پی لیا تھا۔“ میں نے اس کے مزید قریب ہوتے



یہی محدود رکھو گے۔“

”ہاؤ تو کسی، وہ کہا راز ہے؟“

”میرے سوا کوئی نہیں جانتا کہ اس چنان کے پیچھے ایک غار ہے۔ میں بچپن سے ہی اس جگہ سے واقف ہوں اور کئی مرتبہ ہاں ہتھوں تک روپوش بھی رہ چکا ہوں۔“

”کیا تم جانتے ہو۔ ریس اور انجیلا تمہیں بھوت سمجھ رہے ہیں؟“

”نہیں۔“ اس نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا۔

”وہ اتنے مصوم نہیں ہیں انہوں نے تمہیں کہانی سنائی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا شاید یہ خیال ریس کے ذہن میں آیا ہو۔ میں ان دونوں کو الگ کرنے آیا تھا آج بھی میں اسی لیے آیا تھا۔“

میں اس کی بے چینی کو سمجھ سکتا تھا۔ برادر ریس اور انجیلا کا کوئی جوڑ نہیں تھا اور اسے گراہم کی خواہش ہوگی کہ وہ اپنی بیٹی کو اس سے دور رکھے۔

”اسی لیے تم کہیں کے گرد منڈلا رہے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”شاید تمہیں تو فری ہوگی کہ کھڑکی میں تمہارا چہرہ دیکھ کر ریس خوفزدہ ہو کر وہاں سے بھاگ جائے گا۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم وہاں موجود ہو۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”تمہیں دیکھنے کے بعد مجھے وہاں سے ہٹانا پڑا لیکن میں ہر قیمت پر انجیلا کو اس جگہ سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔“

”لگتا ہے وہ اس سے محبت کرنے لگی ہے۔“ میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”اچھا۔“ اس نے بس اتنا ہی کہا لیکن اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

”تمہارا مینڈولین میرے پاس ہے۔ میرے ساتھ گھر چلو۔ دیکھتے ہیں۔ شاید اس کی مرمت ہو سکے۔ میں تمہیں بہت عمدہ قسم کی گرما گرم کافی بھی پلاؤں گا۔“

”تاکہ تم اس دوران شریف کو فون کر سکو؟“ اس نے کہا۔

”ہاں۔“ میں نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ اس سے جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

”تمہارا بہت بہت شکریہ۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے انجیلا کی طرف سے تشویش ہے۔ میں دوبارہ وہاں جانا چاہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی ہلکے سے کھڑا ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ”کیا تم مجھے وہ غار نہیں دکھاؤ گے جہاں تم چھپے ہوئے ہو؟“

”نہیں، میں ایک نئے سے یہاں چھپا ہوا تھا۔ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ انجیلا کس حال میں ہے۔ میں زیادہ تر رات میں یہاں آیا کرتا تھا پھر میں نے اس جہنمی واقعہ کو دیکھا۔ اسے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا اور میں نے اسے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھ پر گولی چلا دی۔“

”تم نے اسے خوف زدہ کیا؟“

”نہیں اس نے مجھے ڈرایا۔“

”اگر تم یہاں رہنے کے لیے آئے تھے تو دیوار پر سے مینڈولین اتار کر کیوں بھاگ گئے؟“

”ہاں۔“ وہ کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”وہ مینڈولین اپنی مخصوص جگہ پر لٹکا ہوا تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اسے کیوں اچک لیا۔ شاید اس لیے کہ بہت دن سے کوئی ساز نہیں بنایا تھا۔“

”لیکن ریس تمہارا بیچا کر رہا؟“

”ہاں۔ اس نے تقریباً سارا دن میرا تعاقب کیا جیسے کسی جنگلی درندے کا شکار کرنے نکلا ہو۔ میں تمہارے گھر کے پاس سے گزر رہا تھا کہ وہ اچانک ہی میرے قریب آ گیا۔ اس نے گولی چلا دی جو مینڈولین پر لگی۔ وہ میرے ہاتھ سے گر گیا اور میں وہاں سے کھسک گیا۔ اگر تم درمیان میں نہ آتے تو میرا بیچنا مشکل تھا۔ مجھے اس کے تورا مجھے نہیں لگ رہے تھے۔“

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ مجھے یہ سب کچھ شریف اسکاڈ مور کو بتانا ہوگا۔“

وہ فراتے ہوئے بولا۔ ”تم وہی کرو جو تمہیں کہتا ہے۔“

”تم نے کس شخص کو قتل کیا تھا؟“

”میں خود نہیں جانتا کہ وہ کون تھا؟“

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کم از کم یہ تو بتا سکتے ہو کہ ایک ہفتہ کہاں چھپے رہے؟ اکتوبر میں تو اچھی خاصی سردی ہوتی ہے؟“

اس نے چاروں طرف دیکھا جیسے جائزہ لے رہا ہو کہ کہیں کوئی ہماری باتیں تو نہیں سن رہا پھر بولا۔ ”یہ بھی شریف کو بتاؤ گے؟“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ضروری نہیں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

اس نے مجھے پُر اعتماد انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ یہ ایک راز ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم ایسی چیزوں کا مطالعہ کرتے ہو اور میرا خیال ہے کہ تمہیں اس کے جاننے میں بھی دلچسپی ہوگی لیکن وعدہ کر دو کہ اسے تم اپنے تک



”اس وقت میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ کل دیکھ لیتا۔“  
یہ بہ کردہ اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ عین اسی وقت ٹیلے کی  
بلندی پر ہاتھ میں رائفل پکڑے ایک سایہ نمودار ہوا۔ اس  
کے ساتھ ہی چاند بھی ہادلوں کی ادٹ سے نکل آیا۔ ہر طرف  
چاند کی روشنی پھیل گئی۔ میں نے دیکھا وہ ریس تھا اور اس  
کے پہلو میں انجیلا کھڑی ہوئی تھی۔

رے گراہم کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے جیسے  
اسے زمین نے جکڑ لیا ہو۔ اس نے ریس کے چہرے پر  
نظریں جمادیں۔ انجیلا اپنی عمر سے دس سال بڑی اور کافی  
خولف زدہ نظر آ رہی تھی۔

”دیکھو۔“ میں نے بہ آواز بلند کہا اور ان دونوں کے  
چہرے میں آگیا۔ ”کیوں نہ تم سب میرے گھر چلو وہاں بیچہ کر  
بات کریں گے۔“

”مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔“ ریس اپنی رائفل بلند  
کرتے ہوئے فرمایا۔ ”یہ یوزھا مجھے انجیلا سے الگ نہیں  
کر سکتا، اب وہ میری ہے۔“

گراہم کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی اور  
ظہیر نے انداز میں بولا۔ ”اچھا، انجیلا اب تمہاری ہے۔“  
”ایک سنہ۔“ انجیلا نے کمزور سی آواز میں  
کہا۔ غالباً اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

”ہاں، میں بہت جلد تمہیں قبر میں پہنچا دوں گا۔“  
اس کے بعد انجیلا میری ہے۔ ”یہ کہہ کر اس نے گراہم پر  
رائفل تان لی۔ میں نے دیکھا کہ اس وقت تک گراہم اپنا  
چاقو نکال چکا تھا۔ اس نے ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں  
ریس پر حملہ کیا لیکن اس وقت تک وہ کوئی چلا چکا تھا۔  
ریس کی ٹانگ میں چاقو لگا جبکہ گراہم پیچھے کی جانب زمین  
پر گر پڑا۔

انجیلا نے چیخ ماری اور بے اختیار ریس کی طرف لپکی  
اور اس پر جھک گئی۔ رے گراہم کی جیکٹ خون سے سرخ  
ہو گئی تھی۔ اس نے کئی کے بل اٹھنے کی کوشش کی اور کراہتے  
ہوئے بولا۔ ”انجیلا سے دور رہو، کتیا کی اولاد۔“

انجیلا نے گوم کر گراہم کو دیکھا اور بولی۔ ”میں اس  
سے محبت کرتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک جھٹکے سے ریس  
کی ٹانگ سے چاقو نکالا اور اپنے لباس سے تھوڑا سا کپڑا  
پھاڑ کر اس کے زخم پر ہاتھ دیا۔

”ہم موسم بہار میں شادی کرنے والے ہیں۔“ ریس  
نے کہا۔ اس کے لہجے میں چنانوں جیسی سختی تھی اور وہ میری  
طرف دیکھ رہا تھا۔

”نہیں۔“ رے گراہم نے ہتھی لگا ہوں سے مجھے  
دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ اس شخص سے شادی نہیں کر سکتی۔  
ڈاکٹر، تمہیں ان کو روکنا چاہیے۔“  
”دنیا کی کوئی طاقت ہمیں نہیں روک سکتی۔“ ریس  
نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ ”تم پہلے ہی قانون کی لگا ہوں  
میں مر چکے ہو اور معترب اسی قبر میں لٹتی جاؤ گے جہاں تمہیں  
ہونا چاہیے۔“

”پلیز۔“ اس نے گڑگڑاتے ہوئے التجا کی۔ ”یہ اس  
سے شادی نہیں کر سکتی۔ ان کا رشتہ ہی کچھ ایسا ہے۔“

میری نظریں حیرت سے اس کے چہرے پر جم کر رہ  
گئیں۔ یوں لگا جیسے وہاں کوئی نہیں تھا اور وہ نادیدہ اجنبیوں  
کو یہ کہانی سنا رہا تھا۔

”اس بات کو بہ مشکل پندرہ برس ہوئے ہوں گے۔“

نیٹا ویلڈروپ میری بیوی کے پاس آئی اور اس کی گود میں  
ایک نوزائیدہ بچی جیسے وہ جنگل میں چھوڑنے آئی تھی لیکن  
بچی کے رونے کی آواز سن کر اس کا ارادہ بدل گیا اور وہ اسے  
جنگل میں چھوڑنے کے بجائے ہمارے پاس لے آئی۔  
ہمارے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے میری بیوی نے  
اس بچی کو گود لے لیا۔ اسی سال سردیوں میں ایک وائرس  
پھیلا اور نیٹا اس کی تاب نہ لا کر مر گئی پھر ہم نے سٹاک ڈیٹھار  
نے وہ علاقہ بنا شروع کر دیا ہے۔ میں ڈیٹھار کو لکرنا چاہتا تھا  
لیکن بیوی نے روک لیا۔ انجیلا، اب تم سمجھ گئی ہو گی کہ اس  
شخص سے کیوں شادی نہیں کر سکتیں۔ اس نے تمہاری ماں کی  
عزت لوٹی تھی۔“

انجیلا نے اپنے قدموں پر گھسٹنا شروع کیا۔ چاقو  
ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ لڑھکتے قدموں  
سے رے گراہم کی طرف بڑھی اور مسکراتے ہوئے  
بولی۔ ”تم سمجھتے ہو کہ ہمیں یہ بات معلوم نہیں لیکن ریس نے  
میری ماں سے شادی نہیں کی تھی۔ جوانی میں لوگ کئی  
عورتوں سے تعلقات استوار کرتے ہیں۔ میری ماں بھی  
ایسی ہی ایک عورت تھی اس سے میرے اور ریس کے  
رشتے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ تم مرتے وقت بھی جھوٹ  
بولنے سے باز نہ آئے۔“

اس نے مزید کچھ کہے بغیر ڈیٹھار ریس کا ہاتھ پکڑا اور  
اسے لے کر اپنے گھر کی جانب چل دی۔ رے گراہم پیچھے کی  
جانب زمین پر گر پڑا اور اس کی گردن ایک جانب ڈھلک  
گئی۔ میں نے جھک کر دیکھا اس بار وہ واقعی مرجھا تھا۔



صنف نازک کے شر اور بد اعمالیوں کا عبرت اثر ماجرا

دیمک

سرزا امجد بیگ

عورت کو اللہ تعالیٰ نے عزت اور مان کا جو رتبہ دیا ہے اس نئی مثال کہیں نہیں ملتی لیکن یہی عورت جب بھی چوراہے پر آجائے تو وہیں کی نہیں رہتی۔ کچھ ایسا ہی حال اس کی بے حیائی کا بھی تھا جسے نہ چار دیواری کا احساس تھا اور نہ ہی چادر کی تمنا... اسے تو اپنی سفلی خواہشوں کی تکمیل چاہیے تھی... معاشرے کی اسی دیمک سے پردہ چاک کرنے کے لیے مرزا امجد بیگ جب سامنے آئے تو بودہ کا بودہ اور پانی کا پانی ہو گیا... دیمک کے نقصان کا ازالہ تو ممکن نہ تھا لیکن مزید نقصان سے بچانہ ممکن ہو گیا۔

برابر من فح کمانا عین فطری اور جائز ہوگا۔ ایسا گولڈن چانس سال کے باقی گیارہ مہینوں میں کہاں ملتا ہے... ہم مسلمان بھی بڑی عجیب و غریب اور آسانی سے سمجھ میں نہ آنے والی قوم ہیں۔ پوری دنیا میں بسنے والی دیگر اقوام اپنے مذہبی تہواروں کے مواقع پر، ان تہواروں سے متعلق اشیائے ضرورت کو کم سے کم نرخوں پر فروخت کرنے کا بندوبست کرتے ہیں تاکہ ہر کمزور اور طاقتور یکساں طور پر مذہبی تہواروں کو مناسکے گا مگر ہمارا تو بادا آدم ہی نرالا ہے۔ اس کے آگے میں زبان کھولنے کی جسارت نہیں کروں گا۔ کاش! ہم نے اندھے جوش اور بہرے جذبات کو ایک طرف رکھ کر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اپنی کوتاہیوں، خامیوں اور زیادتیوں پر غور کیا ہوتا تو آج یوں زمانے میں ذلیل و رسوا نہ ہوتے۔ مگر ہمارے پاس غور کرنے کی فرصت ہے اور نہ ہی پشیمان ہونے کی توفیق کیونکہ ہمارے ایمان کی عمارت تو اس عین پر قائم ہے کہ جنت تو

ماہ صیام کے آغاز کے ساتھ ہی مہنگائی کے طوفان نے بھی سر اٹھایا ہوا تھا۔ اشیائے ضرورت کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی تھیں خصوصاً پھل، سبزی اور وہ تمام چیزیں جو صبح اور افطار کے لوازمات کے لیے لازم تھیں، ان کے نرخ کم آمدنی یا محدود آمدنی والے افراد کی دسترس میں نہیں رہے تھے، بہر حال کسی نہ کسی طور گزارہ تو کرتا تھا۔ یہ مہینا ایک سال کے بعد آیا تھا اور پلٹ کر بھی اسے ایک سال کے بعد ہی آتا تھا لہذا قرض ادھار کر کے اس بابرکت ماہ میں شاندار سحری اور افطاری بھی ضروری تھی۔

دوسری جانب ذخیرہ اندوز، منافع خور اور موقع پرست دکاندار بھی یہی سوچ کر میدان کمانی میں کود پڑے تھے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کی حماقت بنانے کا ایسا نادر موقع پھر ایک سال کے بعد ہی آئے گا، چنانچہ ان کی رنگوں اور جیبوں سے جتنا بھی ممکن ہو، نچوڑ لو۔ چونکہ یہ رحمتوں اور برکتوں والا مہینا ہے اس لیے اس ایک ماہ میں سال بھر کے





COPIED FROM WEB



میں نے پوچھا۔ "پولیس نے خالد کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا، جریز ہوتے ہوئے بولا۔ "دیکھیں صاحب! میں نے کہا تھا کہ یہ ایک خطرناک کیس ہے۔"

اس کے حماقت نما اصرار پر مجھے غصہ تو آیا تاہم میں نے فیسے کا اظہار مناسب نہ جانا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سلطان صاحب! اس بات کا فیصلہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں کہ یہ کیس کتنا خطرناک ہے۔ آپ بس مجھے حقائق سے آگاہ کر دیں۔" لگاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر کہا۔

"اب جلدی سے بتا دیں، پولیس نے آپ کے دوست کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟"

"عزت لوٹنے کے الزام میں۔" وہ بے ساختہ بولا۔

اس کی بے ساختگی نے مجھے چمکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ "عزت لوٹنے کے الزام میں... تمہارے دوست نے کس کی عزت لوٹی ہے؟"

میں غیر ارادی طرز پر "آپ" سے "تم" پر آ گیا تھا مگر میرے انداز کی اس تبدیلی کا سلطان نے کوئی اثر نہیں لیا۔ وہ میرے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"وکیل صاحب! خالد نے کسی کی عزت نہیں لوٹی۔ اس پر الزام ہے کہ اس نے اپنی پڑوسن گھیلے کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ گھیلے کی شکایت پر ہی پولیس نے خالد کو گرفتار کیا ہے۔"

"اوہ..... تو یہ حدود آرزوی نہیں کا کیس ہے۔" میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ "تم نے ٹھیک ہی کہا ہے سلطان، یہ واقعی خاصا خطرناک کیس ہے۔"

"جناب! وہ منت ریز انداز میں بولا۔ "میں خالد کو کافی عرصے سے جانتا ہوں۔ وہ اس لائن کا آدمی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کسی گہری سازش کے تحت اسے اس وبال میں ڈالا گیا ہے۔"

"گہری سازش!" میں نے روف پینڈ پر لہجے سے پوچھا۔ "کون کرتا ہے ایسی سازش؟"

"گھیلے.....!" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ "وہ کردار کی اچھی عورت نہیں ہے۔ اس نے اپنے کسی خاص مقصد کی خاطر خالد کو اس مصیبت میں پھنسا یا ہے۔"

"کیا تم بھی گھیلے نامی اس عورت سے مل چکے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔

میں نے جواب دیا۔

میں نے جواب دیا۔

میں نے جواب دیا۔

میں باپ کے درٹے میں ملے گی۔

ایسا دعویٰ کرتے ہوئے ہم بھول جاتے ہیں کہ جس باپ کے درٹے کی ہم بات کر رہے ہیں، وہ ہمارے علاوہ اور بھی بہت سی اقوام کا باپ ہے اور یہ حقیقت تو ہم صدیوں سے فراموش کئے بیٹھے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محض رب المسلمین نہیں بلکہ وہ رب العالمین ہے۔

اس طویل تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔ وہ دسمبر کی ایک خشک شام تھی۔ میں حسب معمول اپنے دفتر میں بیٹھا چٹپٹے کے تقاضے نبھا رہا تھا کہ ایک پریشان حالی شخص میرے چیمبر میں داخل ہوا۔ میں نے پیشہ وارانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔

وہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک کرسی سمجھ کر بیٹھ گیا۔ رسی علیک سلیک کے بعد میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور استفسار کیا۔

"جی..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"وکیل صاحب....." وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "میرا نام سلطان ہے اور میں ایک بہت ہی خطرناک کیس لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔"

سلطان نامی اس شخص کی عمر چالیس کے قریب تھی۔ اس نے شنوار لہجے میں زیب تن کر رکھی تھی۔ وہ ایک پتہ قسمت اور باریش شخص تھا۔ رنگت گندمی اور بدن مائل بہ فریبگی۔

"کیسا خطرناک کیس سلطان صاحب؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "آپ تو ٹھیک ٹھاک ہی نظر آرہے ہیں۔"

اگرچہ اس کے چہرے اور آنکھوں سے پریشانی مترشح تھی تاہم خطرناکی والی کوئی بات اس کے ساتھ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ میرے سوال کے جواب میں جلدی سے بولا۔

"جناب! یہ کیس میرا نہیں ہے۔"

"پھر کس کا کیس ہے؟ میں نے پوچھا۔"

"میرے ایک دوست کا۔" اس نے بتایا۔ "اس کا نام خالد حسین ہے۔"

"اوہ....." میں نے روف پینڈ اور قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔ "آپ کے دوست خالد حسین کو کیا ہو گیا ہے؟"

"خالد کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔"

"پھر کب کی بات ہے؟"

"چھٹی رات کے وقت یہ واقعہ پیش آیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے جواب دیا۔

میں نے جواب دیا۔

میں نے جواب دیا۔



”لیکن یہ کہ.....“ میں نے اس پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ ”جیسا کہ تم نے کہا اور میں نے اس کی تصدیق کی کہ یہ کیس واقعی بہت خطرناک ہے لہذا اس سے نمٹنے کے لیے بہت زور دار مقابلے کی ضرورت ہوگی۔ تمہیں اتنا تو پتا ہی ہوگا کہ عدالتی معاملات کی گاڑی ٹولوں کے پٹرول سے چلتی ہے.....؟“

”جی وکیل صاحب!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”میں یہ بات جانتا ہوں۔“

”اس کیس کو ہاتھ میں لینے سے پہلے مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میری فیس اور دیگر عدالتی اخراجات کون ادا کرے گا؟“ میں نے کہا۔

”صدیق صاحب.....!“ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”صدیق صاحب!“ میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”یہ کون صاحب ہیں؟“

”صدیق صاحب اس گیراج کے مالک ہیں جہاں میں اور خالد کام کرتے ہیں۔“ سلطان نے جواب دیا۔ ”وہ بہت مصروف انسان ہیں اس لیے انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ بعد میں وہ کسی وقت آپ سے ملنے آئیں گے۔ انہوں نے مجھے آپ کی فیس کے پیسے بھی دے دیے ہیں۔ آپ چاہیں تو ابھی مجھ سے لے لیں۔“

”ابھی نہیں..... کل!“ میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔ ”پہلے میں خالد سے ایک بھر پر ملاقات کر کے کیس کی نوعیت کا اچھی طرح جائزہ لے لوں۔ اس کے بعد کوئی حتمی فیصلہ کروں گا۔“

”ٹھیک ہے جناب، جیسی آپ کی مرضی۔“ اس نے کہا۔ ”میں کل دوبارہ آپ کے پاس آ جاؤں گا۔ میں لگ بھگ پانچ سال سے خالد کو جانتا ہوں اس لیے اس کی... جے گناہی کی گواہی دے سکتا ہوں۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک شریف شخص انسان ہے۔ اس پر جتنا کہ وہ الزام لگایا گیا ہے، میں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

”اگر ضرورت محسوس ہوئی تو کیا تم عدالت میں، خالد کی ٹیک نامی کی گواہی دو گے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی..... ضرور۔“ وہ اعتماد بھرتے لہجے میں بولا۔ ”آپ جب کہیں گے، میں گواہی دینے عدالت میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

”تم ایک سچے، مخلص اور انسان دوست آدمی ہو

اس کے ماموش ہونے پر میں نے چپتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”جی ہاں..... ایک آدھ بار دیکھنے کا موقع ملا ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”وہ اٹھل سی سے بازاری عورت نظر آتی ہے۔“

”تو کیا تم بھی خالد کے کہیں قریب ہی رہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں جناب، میری رہائش سلطان آباد میں ہے۔“ وہ اپنی گردن کولٹی میں جتیش دیتے ہوئے بولا۔ ”خالد لیاقت اشرف کالونی میں رہتا ہے۔ ہم دونوں کالونی پر واقع ایک موٹر گیراج میں کام کرتے ہیں۔“

”لیاقت اشرف کالونی نمبر ایک یا دو؟“ میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نام کی دو کالونیز تھیں۔ ایل اے سی ون (لیاقت اشرف کالونی نمبر ایک) اور ایل اے سی ٹو۔ محمود آباد اور حنفور کالونی کا بیشتر علاقہ ایل اے سی ون اور ایل اے سی ٹو کے درمیان واقع ہے۔

”لیاقت اشرف کالونی نمبر ایک وکیل صاحب۔“ سلطان نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”اس کالونی کے بعد محمود آباد شروع ہو جاتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سر کو اٹھاتی جتیش دی۔ ”اب مجھے بتاؤ کہ گزشتہ رات تمہارے دوست کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“

”جناب، واقعے کی تفصیل کے بارے میں تو مجھے زیادہ پتا نہیں۔“ وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ”اگر آپ تھانے جا کر خالد سے ایک ملاقات کر لیں تو ساری کہانی آپ کے علم میں آ جائے گی۔“

خالد حسین کو، سلطان کے بیان کے مطابق گزشتہ رات گرفتار کیا گیا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ پولیس نے آج صبح اسے عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہوگا اور اس وقت وہ پولیس کسٹڈی میں ہوگا۔

”ٹھیک ہے، میں آج رات کسی وقت متعلقہ تھانے جا کر خالد سے ملوں گا۔“ میں نے سلطان کی بات کے جواب میں کہا۔ ”اور اگر مجھے اس کی باتوں میں صداقت نظر آئی تو میں یہ کیس اپنے ہاتھ میں لے لوں گا لیکن.....“

میرے ادھورے جملے پر سلطان نے فکر مند نظر سے مجھے دیکھا اور بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ ”لیکن کیا وکیل صاحب؟“



”وہ ایک خطرناک مجرم ہے برکت صاحب! ڈیوٹی آفیسر مجھے پڑھانے کی کوشش کرنے لگا۔“ میں آپ کو اس سے ملاقات کی اجازت نہیں دے سکتا۔ انچارج صاحب نے اس سلسلے میں سختی سے منع کر رکھا ہے۔“

”آپ اپنے انچارج صاحب سے میری بات کر دیں، میں خود ان سے اجازت لے لوں گا۔“ میں نے بڑی رمان سے کہا پھر اپنی رست و راج پر نگاہ ڈالنے کے بعد اضافہ کیا۔

”میرے پاس گروقت ہوتا تو میں کل کسی وقت آکر خالد حسین سے ملاقات کر لیتا۔ کل صبح کی میری فلائٹ ہے۔ خالد میرا سسرالی رشتہ دار ہے۔ میں چاہتا ہوں، اس مصیبت کی گھڑی میں اس کے کسی کام آ جاؤں۔ اگر میں چلا گیا تو یہ بے چارہ ادھر حالات ہی میں پڑا سزاوار ہے گا۔“

میری اداکاری سے وہ یہی سمجھا کہ میں کوئی دولت مند شخص ہوں اور شاید خالد کی مالی مدد کرنے آیا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک پیدا ہوئی۔ وہ امید بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”برکت صاحب! انچارج صاحب تو اس وقت تھانے میں موجود نہیں ہیں۔ میں آپ کو صرف دس منٹ کے لیے حوالاتی سے ملنے کا موقع فراہم کر دیتا ہوں لیکن اس میں میرا کیا بھلا ہوگا.....؟“

بچلے کے اختتام پر اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا جیسے کسی گھڑی مرئی کو دیکھ کر جھٹکی بلا انتظار یہ انداز میں اس فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے کہ ”جست“ کب اور کس زاویے سے لگائی جائے۔

”جب میں خالد حسین کا بھلا کرنے یہاں آیا ہوں تو لگے ہاتھوں آپ کا بھی بھلا ہو جائے گا۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اب آپ فوری طور پر مجھے حوالاتی سے ملو اور میں تاکہ بھلائی کے عمل کا آغاز ہو سکے۔“

ڈیوٹی آفیسر نے فوراً سے دستبردار مجھے میرے مطلوبہ شخص تک پہنچا دیا۔ میں نے اپنی جیب خاص میں سے سو روپے کا ایک نوٹ نکالا کر اسے پیش کرتے ہوئے کہا۔

”آپ اسے نوٹ کن (بیجانہ) سمجھیں۔ کل دن میں کسی وقت میرا آدمی تھانے آکر آپ سے معاملات کرے گا اور آپ کی بھرپور خدمت کی جائے گی۔“

ڈیوٹی آفیسر نے فرط مسرت سے سو روپے کے کرارے نوٹ کو چوم کر جیب میں رکھا پھر معنی خیز انداز میں حوالاتی کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”جناب! اب

سلطان۔“ میں نے سنجھی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”تم کل دوپہر کے بعد کسی بھی وقت میرے پاس آ جاؤ۔ پھر آجیہدہ کا لائحہ عمل ترتیب دیں گے۔“

”جو حکم آپ کا وکیل صاحب!“ اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلا دی۔

میں نے آجیہدہ دو منٹ میں سلطان آف سلطان آباد کو چند اہم ہدایات دیں پھر رخصت کر دیا۔ سلطان ایک سادہ مزاج اور سیدھا سادہ انسان تھا۔ خالد حسین کے لیے اس کے دلی جذبات نے مجھے خاصا متاثر کیا تھا۔ وہ اپنے دوست کے لیے شکی اور قربانی کا جذبہ رکھتا تھا۔ فی زمانہ اس نوعیت کے جذبات دنیا سے ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔

☆☆☆

میں لگ بھگ دس بجے دفتری مصروفیات سے فارغ ہوا اور اپنی گاڑی کو محمود آباد کی سمت میں ڈال دیا۔ مجھے متعلقہ تھانے جا کر خالد حسین سے تفصیلی ملاقات کرنا تھی۔ محمود آباد کا علاقہ میرے لیے آؤٹ روٹ تھا تاہم چونکہ میں ایک لحاظ سے اس کیس میں ہاتھ ڈال چکا تھا لہذا آؤٹ روٹ اور ان روٹ کا حساب بے مقصدی ہو کر رہ گیا تھا۔

یہ ایک اتفاق تھا کہ اس وقت تھانہ انچارج اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھا ورنہ خالد حسین سے ملاقات کے لیے مجھے انگلی کو نیڑھا کرنا پڑتا۔ ڈیوٹی آفیسر کو جب میں نے اپنی آمد کی غرض و غایت کے بارے میں بتایا تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر طنزیہ انداز میں استفسار کیا۔

”آپ کون ہیں؟“

میں اپنا بریف کیس اور کوٹ وغیرہ گاڑی ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ اہم کاغذات کو نہایت ہی سلیپتے سے تھک کر کے میں نے شرٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ میری وضع قطع سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ میں کوئی وکیل ہوں۔

”میں حوالاتی کا ایک دوست ہوں..... برکت علی۔“ میں نے ڈیوٹی آفیسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس سے چند باتیں کروں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔“

”آپ نے حوالاتی کا نام خالد حسین بتایا ہے نا...؟“ وہ شک زدہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جیسے کل رات حدود آرمڈی فینس کے تحت گرفتار کیا گیا تھا.....“

”جی، آپ کا فرمایا ہوا بالکل درست ہے۔“ میں نے متحمل لہجے میں کہا۔ ”آج صبح ملزم کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا گیا تھا۔ میں اسی خالد حسین سے دس منٹ بات کرنا چاہتا ہوں۔“



”آ..... پ مجھے اس مصیبت سے نکال لیں گے.....؟“  
 ”اگر تم پورا واقعہ سچ مجھے بتا دو تو میں تمہیں اس  
 مصیبت سے نجات دلا سکتا ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں  
 میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سب سے زیادہ اہمیت تمہاری سچائی  
 کی ہے۔ وہی تمہاری بے گناہی کو ثابت کر سکتی ہے۔“  
 ”وکیل صاحب! میں نے ابھی تک کسی سے ایک جھوٹ  
 بھی نہیں بولا۔“ وہ فریادی انداز میں بولا۔ ”لیکن پولیس والوں  
 کو میری بات کا یقین ہی نہیں آتا۔ میرے مقابلے میں وہ اس  
 بری عورت کی بات کو اہمیت دے رہے ہیں۔“

”جی..... جی وہی۔“ وہ نفرت بھرے انداز میں  
 بولا۔ ”میں اسی بد معاش عورت کی وجہ سے اس مصیبت میں  
 پھنسا ہوں۔“

”اوہ..... تو تمہیں یقین ہے کہ ٹکلیڈہ کروار کی اچھی  
 عورت نہیں ہے۔“ میں نے ٹولنے والا نگاہ سے اس کی  
 طرف دیکھا۔

”نہیں یقین ہے وکیل صاحب۔“ وہ تاکیداً انداز میں  
 بولا۔ ”ایک سو ایک فیصد یقین ہے مجھے۔“

”تو تمہارا دعویٰ ہے کہ تم نے ٹکلیڈہ نامی اس عورت پر  
 بھرا نہ حملہ نہیں کیا۔“ میں نے بہ دستور گہری سنجیدگی سے  
 پوچھا۔ ”وہ محض تمہیں پھنسانے کے لیے اتنی بڑی بات کہہ  
 رہی ہے؟“

”میرا خدا مجھے غارت کرے اگر میں نے اس آوارہ  
 عورت کو چھوا بھی ہو۔“ وہ بے حد جذباتی انداز میں بولا۔  
 ”میں اتنے بڑے گناہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

میں پچھلے پانچ منٹ سے خالد حسین سے تعلق نوعیت  
 کے سوالات کر رہا تھا اور اس بات کا مجھے بہ خوبی اندازہ ہو گیا  
 تھا کہ وہ لفظ بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ اس نوعیت کے  
 کارنامے انجام دینے والوں کے انداز و اطوار اور ہی طرح  
 کے ہوتے ہیں۔ خالد میں وہ جرات اور پابک دہتی دکھائی  
 نہیں دیتی تھی جس قسم کا الزام ٹکلیڈہ نے اس پر عائد کیا تھا۔  
 مجھے خالد کی بے گناہی کا یقین آ گیا تو میں نے سب سے پہلے  
 اہم امور کو نمٹا لینا ضروری جانا۔

میں نے اپنی شرٹ کی جیب میں سے تہ شدہ  
 کاغذات کو نکال کر سیدھا کیا۔ ان میں آپ تو وکالت نامہ  
 تھا، ایک خالد کی درخواست ضمانت اور چند اہم نوعیت کے  
 دیگر کاغذات۔ میں نے پہلی فرصت میں نقشہ مقدمات پر  
 خالد کے دھمپے اور کاغذات کو دوبارہ پہلے کی طرح تہ

آپ دس منٹ کیا، بیس منٹ تک حوالاتی سے گفت و شنید  
 کر سکتے ہیں۔ انچارج صاحب ایک گھنٹے سے پہلے آنے  
 والے نہیں۔“

میں ڈیوٹی آفسر کو نظر انداز کر کے حوالاتی خالد حسین  
 کی جانب متوجہ ہو گیا۔ آپ کو یقیناً اس بات پر حیرت ہو  
 رہی ہوگی کہ سو روپے کے ایک نوٹ نے ڈیوٹی آفسر کو اس  
 قدر خوش کیسے کر دیا ہوگا۔ دراصل جس زمانے کا یہ واقعہ ہے  
 اس وقت سو روپے والے نوٹ کی بڑی اہمیت ہو کرتی تھی۔  
 چالیس سال کے بعد آج یعنی دو ہزار پندرہ بیسویں میں واقعی  
 سو ڈالروں کی اپنی وقعت اور قدر و قیمت کھو بیٹھا ہے۔ اس  
 میں آپ یہ مشکل ایک وقت کا سادہ سا کھانا ہی کھا سکتے ہیں  
 مگر چالیس سال پہلے سو روپے میں ایک متوسط فیملی کا  
 پورے دن کا خرچہ بآسانی چلایا جاسکتا تھا۔

پولیس والوں کی ایک مخصوص نفسیات ہوتی ہے۔  
 حرص اور لالچ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ میں  
 نے اسی سکتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے ڈیوٹی آفسر کے  
 سامنے خود کو امیر و کبیر اور انتہائی معروف انسان ظاہر کیا تھا۔  
 کسی بھی حوالاتی کے ایسے صاحب ثروت رشتے داروں  
 سے پولیس والے بہت محبت کرتے ہیں کیونکہ انہیں ان سے  
 ”بہت کچھ“ ملنے کی توقع ہوتی ہے۔ میں نے اپنی ابتدائی  
 گفتگو سے ڈیوٹی آفسر پر یہ تاثر قائم کر دیا تھا کہ کل دن میں  
 میرا ایک آدمی تھانے آکر ان سے حوالاتی کے معاملے پر  
 کوئی ذیل وغیرہ کرے گا۔ ڈیوٹی آفسر میرے اس جھانسنے  
 سے مطمئن ہو گیا تھا۔

خالد حسین کی عمر پینتالیس کے آس پاس نظر آتی  
 تھی۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ صحت  
 بس، واجبی سی تھی۔ وہ خاصا پڑھ مردہ اور تھکا ہوا دکھائی دیتا  
 تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور شیو بڑھا ہوا تھا۔ مجھے یہ  
 اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ  
 خالد ایک لاپرواہ اور بدسلوکی شخص تھا ورنہ حوالات کی ایک  
 رات انسان کا یہ حشر نہیں بنا ڈالتی۔

میں نے حوالات کی آہنی سلاخوں کو تھام کر دوستانہ  
 انداز میں اسے پکارا۔ ”خالد حسین! میں تمہارا وکیل ہوں۔  
 تمہارے سینہ صدیق صاحب نے مجھے تمہاری وکالت کے  
 لیے مقرر کیا ہے۔“

اس نے ویران سی نظر سے مجھے دیکھا اور کھسک کر  
 میرے قریب آ گیا۔ پھر اس کے حلق سے ایک ٹھنڈ اور  
 بے یقینی کی حامل آواز خارج ہوئی۔



اعزاز میں گردن ہلاتے: دوسرے بولا۔ "لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے بھی نیت لگا کر منظور حسین کے گھر میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ کسی کی نوہ میں گھر رہنا بھی ایک گناہ ہے۔" "منظور حسین اور شکیلہ کے گھر کی ساری تفصیل تو بیان کر دی۔" میں نے سوالات کے سلسلے کو سینٹے ہوئے کہا۔

"اب ذرا اپنے بارے میں بھی بتاؤ۔" "جی..... میں کیا بتاؤں اپنے بارے میں؟" وہ ہونٹوں کی طرح منہ کھول کر مجھے دیکھنے لگا۔

"یہی کہ تمہارے گھر میں کتنے افراد ہیں.....؟" میں نے پوچھا۔

"میں اکیلا ہی ہوں جی۔" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"اکیلا..... مطلب، تمہارے سوا گھر میں اور کوئی نہیں رہتا؟" میں نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔

"جی..... جی ہاں۔" اس نے آنکھیں پٹ پٹا کر جواب دیا۔

"تمہارے دیگر رشتے دار؟" "کوئی نہیں جی۔" وہ ایک غصّی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "والد صاحب میرے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ والدہ صاحبہ نے زندگی بھر میرا ساتھ دیا۔ دو سال پہلے وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی ہیں۔"

بات ختم کرتے کرتے اس کی آواز بھرا گئی۔ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ "کوئی اور بہن بھائی..... چاچا ماما.....؟"

"نہیں جی، کوئی بھی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"خالد حسین! میرے اندازے کے مطابق اس وقت تمہاری عمر پینتالیس سال کے قریب ہوگی۔ دو سال پہلے تمہاری والدہ کا انتقال ہوا یعنی اس وقت تم پینتالیس، تینتالیس سال کے ہو گے۔ تمہارے والد کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ والدہ نے تمہاری پرورش کی اور پال پوس کر تمہیں اتنا بڑا کر دیا۔ اس دوران میں والدہ صاحبہ کو تمہاری شادی وغیرہ کا خیال نہیں آیا، مائیں تو ان معاملات میں بہت حساس اور جلد باز ہوتی ہیں۔"

میرے ذہن میں جتنے بھی سوالات نمودار ہوئے وہ میں نے ایک ساتھ ہی کر ڈالے۔ میرے خاموش ہونے پر خالد حسین برا سامنے ہناتے ہوئے بولا۔

"میں نے شادی کی تھی جناب لیکن یہ خوشی مجھے اس نہیں آئی۔"

کر کے شرٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ خالد نے انگریزی میں دستخط کیے تھے۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ اس نے میٹرک کر رکھا تھا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی خالد حسین۔" میں نے دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"شکیلہ کو آخر تم سے ایسی کون سی دشمنی ہے جو وہ تم پر اتنا گھناؤنا الزام عائد کر رہی ہے.....؟"

"میں نے دو چار بار اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔" وہ بڑی مصویت سے بولا۔ "اس نے اپنے شوہر سے میری شکایت کر دی۔ منظور حسین مجھ پر خاصا گرم ہوا تھا۔"

"تم نے شکیلہ کو کیا سمجھانے کی کوشش کی تھی؟" میں نے انجان بننے ہوئے پوچھا۔

وہ جریز ہوتے ہوئے بولا۔ "یہی کہ..... یہی کہ وہ اپنا چال چلن ٹھیک کر لے۔ محلے واری میں اس قسم کی حرکتیں ٹھیک نہیں ہوتیں۔"

"تمہارے خیال میں شکیلہ کا چال چلن درست نہیں؟" "مجھے تو وہ بہت ہی مکار اور چال باز عورت لگتی ہے۔" وہ آنکھیں سینٹرتے ہوئے بولا۔ "منظور حسین ایک بوڑھا شخص ہے اور شکیلہ ابھی جوان چھان ہے۔ کوئی جوان اور خوب صورت عورت کسی بوڑھے شخص سے شادی کیوں کرے گی۔ میں سمجھتا ہوں، وہ منظور حسین کو لوہینا کر کوئی اور ہی کاروبار کر رہی ہے۔ میں پچھلے بیس پچیس سال سے منظور حسین کا پڑوسی ہوں۔ کافی عرصہ پہلے اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ اکیلا ہی اس گھر میں رہ رہا ہے۔"

میں نے کبھی اس کے کسی رشتے دار کو بھی آتے جاتے نہیں دیکھا لیکن جب سے منظور حسین نے شکیلہ سے شادی کی ہے، کوئی نہ کوئی نئی مردانہ شکل گھر میں نظر آ جاتی ہے اور وہ بھی ایسے وقت جب منظور حسین گھر میں نہ ہو۔"

خالد حسین خاصی چونکا دینے والی باتیں کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "یہ منظور حسین تمہارا کس طرف کا پڑوسی ہے؟"

"سامنے کا جی۔" وہ جلدی سے بولا۔ "ہم ایک ہی گلی میں رہتے ہیں۔ دونوں کے گھروں کے دروازے ایک دوسرے کے آگے سامنے کھلتے ہیں۔"

"اسی لیے تمہیں شکیلہ کے گھر میں تاک جھانک کا زیادہ موقع مل جاتا ہوگا۔" میں نے نیم طنز یہ انداز میں کہا۔

"اور تم اس کے گھر میں آنے جانے والے لوگوں کو آسانی سے دیکھ سکتے ہو گے؟"

"ایک حد تک آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ تائیدی



زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں کل صبح بھروس کے لیے روانہ ہونے والا ہوں۔"

"وزٹ یا بزنس ٹرپ؟" اس نے خاصی شوخی سے پوچھا۔  
 "وزٹ کا شوق تو عرصہ ہوا پورا ہو چکا۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "اب تو تمام تر نقل و حرکت بزنس ہی بزنس ہے۔"

وہ میرے جواب سے بے حد حائر دکھائی دیا، جلدی سے پوچھا۔

"برکت صاحب! آپ کس چیز کا بزنس کرتے ہیں؟"  
 "میں لیڈر جیکفٹس کا ایمپورٹرز ہوں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میرا مال پورے پورپ میں جاتا ہے۔ ہر تین ماہ کے بعد میں خود بھی ایک چکر لگاتا ہوں۔ کاروبار کی نگرانی بہت ضروری ہے۔ پارٹیوں سے بھی ملنا ہوتا ہے۔ فون پر تو رابطہ رہتا ہی ہے لیکن بالمشافہ ملاقات کی اپنی ہی ایک اہمیت ہے۔"

"اللہ آپ کو خیریت سے لے جائے۔" وہ غلو صی نیت کے ساتھ بولا۔

"مجھے امید ہے، خالد حسین کے ساتھ یہاں پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی؟" میں نے استفسار یہ نظر سے ڈیوٹی آفیسر کی طرف دیکھا۔

"آپ بالکل بے فکر ہو جائیں برکت صاحب۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ "نیکو سمجھیں کہ حوالاتی ادھر اپنے ہی گھر میں ہے۔"

میں نے ڈیوٹی آفیسر کی بات سنی۔۔۔ اور اس سے مصافحہ کرنے کے بعد بے فکر ہو کر تھانے سے نکل آیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو اس کیس کے کرداروں اور پس منظر سے اچھی طرح آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے طرم خالد حسین، اس کے قلعے دوست سلطان اور ان دونوں کے سیٹھ صدیق صاحب کی زبانی معلوم ہوئی ہیں اور باقی میری ذاتی ریسرچ ہے۔ ان تمام تر حالات و واقعات میں سے میں نے چند اہم نکات فی الحال آپ سے چھپا لیے ہیں۔ ان کو عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مواقع پر پیش کیا جائے گا۔

ایک بات کا تذکرہ کرنا میں بھول گیا کہ اگلے روز سلطان نے میرے آفسر آکر فیس وغیرہ ادا کر دی تھی۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھا کہ میں نے خالد حسین کا کیس لینے

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔  
 "ٹھیک سے میری شادی لگ بھگ پانچ سال رہی تھی وکیل صاحب۔"

اس کے چہرے پر تعجبی کے تاثرات ابھر آئے۔ ان پانچ سالوں میں، میں نے اور میری ماں نے سکھ کا ایک لمحہ بھی نہیں دیکھا۔ بالآخر تنگ آکر میں نے ٹھیکہ کو طلاق دے دی۔ "لحاتی توقف کر کے اس نے ایک السردہ سی سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ ایک طویل اور دکھ بھری داستان ہے وکیل صاحب۔ ٹھیکہ کو میری زندگی سے نکلے ہوئے اب تین سال ہو گئے ہیں۔"

"ٹھیکہ کے ساتھ تمہاری شادی پانچ سال رہی تھی۔" میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔ "اس دوران میں کوئی اولاد وغیرہ نہیں ہوئی۔ میرا مطلب ہے، پانچ سال ایک اچھا خاصا عرصہ ہوتا ہے؟"

خالد حسین نے بڑی رکھائی سے جواب دیا۔ "نہیں جی..... کوئی اولاد نہیں ہوئی۔"

میں نے مزید پانچ منٹ تک اس سے مختلف سوالات کیے پھر تسلی نشینی کے علاوہ چند اہم ہدایات دے کر حوالات سے نکل آیا۔

واپسی کے سفر میں ڈیوٹی آفیسر سے ملاقات لازمی تھی بلکہ مجھے تو یوں محسوس ہوا کہ وہ میری ہی راہ دکھ رہا تھا۔ ہماری نگاہیں چار ہوئیں تو وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"حوالاتی سے ملاقات ہوگئی جناب؟"  
 "بھرپور ملاقات ہوئی ہے۔" میں نے ذومعنی جواب دیا۔

"نکل آپ کا بندہ آرہا ہے؟" اس نے پُراشتیاق نظر سے مجھے دیکھا۔

"ضرور..... اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر اس معاملے کو ادھر ہی وینڈل نہ کیا گیا تو خالد حسین بے چارہ بہت بری طرح مارا جائے گا۔"

"برکت صاحب! آپ بہت عقل مند اور موقع شناس انسان ہیں۔" وہ تو سنی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ نے بتایا تھا کہ کل صبح آپ کی فلائٹ ہے۔ کیا میں جان سکتا ہوں، آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"یہ جاننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" میں نے



کھانا چاہتی ہوں۔“  
خالد حسین نے ثمینہ کو اچھی طرح دیکھ رکھا تھا۔ وہ بھرے بدن کی مالک ایک چالپ نظر اور پرکشش لڑکی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ خالد کی بھی ولی خواہش تھی کہ ثمینہ بیوی بن کر اس کی زندگی میں آجائے لیکن اس نے بھی اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس ہچکچاہٹ یا احتراز کا ایک نفسیاتی پہلو تھا اور وہ یہ کہ خالد احساسِ کمتری کا شکار تھا۔ وہ خود کو ثمینہ کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔

اس نے رو دھو کر میٹرک کیا تھا جبکہ ثمینہ گریجویٹ تھی۔ پھر وہ ثمینہ کے مقابلے میں کم رو اور ایویں سا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا پیشہ بھی اسے نارچہ کرتا تھا۔ وہ ایک معمولی موٹر مکینک تھا جبکہ ثمینہ کو بڑی آسانی سے ڈاکٹر، انجینئر اور بزنس مین کا رشتہ مل سکتا تھا۔ اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”ای! ثمینہ تو بڑی غرے والی ہے۔ کیا وہ مجھ موٹر مکینک سے شادی کے لیے راضی ہو جائے گی؟“

”یہ سوچنا تمہارا کام نہیں۔“ عتیق بیگم نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”جب میں اس معاملے میں ہاتھ ڈال رہی ہوں تو باقی کی باتیں تم مجھ پر چھوڑ دو۔ مجھے صرف تمہاری رضامندی چاہیے۔ باقی سب کچھ میں خود ہی ٹھیک کر لوں گی۔“

خالد کے دل میں گویا لٹو پھوٹ رہے تھے۔ اس نے عتیق بیگم سے کہا۔ ”ای! میں نے آپ کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا ہے۔ آج میں جس بھی مقام پر کھڑا ہوں، آپ سب ہی کا کارنامہ ہے۔ آج تک میں نے آپ کی ہر بات مانی ہے۔ اس معاملے میں بھی آپ جو فیصلہ کریں گی، مجھے منظور ہے۔“

”شاباش میرے پیچھے!“ عتیق بیگم نے فرطِ جذبات سے کہا۔ ”مجھے تم سے یہی امید تھی۔“

اس کے بعد عتیق بیگم نے بڑی سرگرمی دکھائی اور ایک سال کے اندر ہی ثمینہ اور خالد کی شادی ہو گئی۔ خالد کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا، اس کی سرتوں کو تاپنے کا کوئی پیمانہ نہیں تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے دنیا جہان کے خزانے مل گئے ہوں۔

شادی کے بعد بہ مشکل ایک ماہ خیریت سے گزرا ہونگا پھر بد مزگی کا آغاز ہو گیا۔ بیوی اور شوہر میں ان بن رہنے لگی۔ ثمینہ نے گھر کے کاموں کو بھی ہاتھ لگانا چھوڑ دیا۔ ادھر خالد اپنے کام پر روانہ ہوتا، ادھر وہ کبھی تان کر سوجاتی۔ عتیق بیگم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ثمینہ کو ہوا کیا ہے۔ دو تین ماہ تک وہ برداشت کرتی رہی پھر ایک روز تنہائی دیکھ کر اس

کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایک آدھ روز میں صدیقی صاحب بھی مجھ سے ملنے آئیں گے۔ میں نے سلطان کے ذمے بھی متحدہ کام لگا دیے۔ مجھے اس کیس کے چند کرداروں کے حوالے سے معلومات درکار تھیں۔ سلطان، خالد کا بے لوث دوست تھا۔ وہ یہ کام بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ کر سکتا تھا۔

☆☆☆

خالد حسین ایک بد قسمت اور حالات کا مارا ہوا انسان تھا۔ اوائلِ عمر ہی میں سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ گھر اپنا تھا لہذا ماں بیٹے کو زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ماں نے محنتِ مزدوری کی اور خالد کو نہ صرف پال پوس کر بڑا کیا بلکہ میٹرک تک تعلیم بھی دلا دی۔

خالد پڑھنے میں زیادہ اچھا طالب علم نہیں تھا لہذا اس نے تعلیم کو خیر باد کہا اور کام و حند سے لگ گیا۔ مختلف نوعیت کے مزدورانہ کام کرنے کے بعد کمپنی کی طرف نکل آیا اور سخت محنت کے نتیجے میں وہ ایک اچھا موٹر مکینک بن گیا۔ اس دوران میں اس نے مختلف گیراج بھی تبدیل کیے اور بالآخر صدیقی صاحب کے گیراج میں وہ سیٹ ہو گیا۔

بیٹے نے باقاعدہ کمانا شروع کیا تو ماں کو اس کی شادی کی فکر ہو گئی۔ عتیق بیگم کی ایک رشتے کی بہن عاتکہ حیدر آباد میں رہتی تھی۔ عاتکہ کی ایک ہی بیٹی تھی جس کا نام ثمینہ تھا۔ ایک رات عتیق بیگم نے خالد حسین سے کہا۔

”بیٹا! میں نے تمہارے لیے لڑکی دیکھ لی ہے۔“  
”لڑکی دیکھ لی ہے۔“ خالد نے ابھمن زدہ نظر سے ماں کی طرف دیکھا۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں ای؟“  
”اب تم اتنے بھی نا سمجھ نہیں ہو بیٹا۔“ عتیق بیگم نے کہا۔ ”میں تمہاری شادی کرنے والی ہوں، اپنی بہن کی بیٹی سے..... وہ جو حیدر آباد میں رہتی ہے۔“

”اچھا..... آپ عاتکہ خالد کی بیٹی کی بات کر رہی ہیں۔“ خالد نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ”ثمینہ کی.....؟“  
”ہاں۔ میرے ذہن میں وہی لڑکی ہے۔“ عتیق بیگم نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”ثمینہ تمہارے لیے بہت اچھی رہے گی۔ خوب صورت اور پڑھی لکھی لڑکی ہے اور سلیقہ شنار بھی.....“ لگائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر غم ناک انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”بیٹا! میرا تو اب چل چلاؤ ہے۔ پتا نہیں، کب اوپر سے بلاوا آجائے۔ میں جیتی آنکھوں تمہارا سہرا دیکھنا چاہتی ہوں اور اگر زندگی نے وفا کی تو میں اپنے پوتے پوتیوں کو بھی



نے خالد سے بات کی۔  
 "بیٹا! تمہیں کو کیا ہوا ہے.....؟"  
 "کیا ہوا ہے امی؟" انا خالد نے سوال کر دیا۔  
 "تمہیں کچھ نظر نہیں آ رہا بیٹا.....!"  
 "آپ کچھ بتائیں گی تو پتا چلے گا نا امی؟" خالد نے  
 جریز ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو کچھ بھی غلط نظر نہیں آ رہا....."  
 عطار بیگم نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ "یہ  
 تمہارے ساتھ تو ٹھیک ہے نا؟"  
 "جی بالکل ٹھیک ہے۔" وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا۔  
 پھر کریدنے والے انداز میں دریافت کیا۔ "کیا تمہینے  
 آپ کے ساتھ کوئی بد تمیزی کی ہے؟"  
 "میرے ساتھ کیا، وہ پورے گھر کے ساتھ انتہائی  
 بد تمیزی اور بے ہودگی کر رہی ہے۔ گھر کا ماحول تباہ و برباد ہو کر  
 رہ گیا ہے۔" عطار بیگم ایک دم پھٹ پڑی۔ "میں کوئی بڑی  
 گڑبڑ محسوس کر رہی ہوں..... سچ سچ بتاؤ خالد، معاملہ کیا ہے؟"  
 "اگر مجھے کچھ پتا ہوتا تو آپ کو ضرور بتا دیتا۔" وہ  
 کمزوری آواز میں بولا۔ "آپ تمہینے سے پوچھ کر دیکھیں۔"  
 "ٹھیک ہے..... اب میں امی سے پوچھوں گی۔"  
 عطار بیگم نے پُرسوج انداز میں کہا۔ "اس سے پہلے کہ پانی  
 سر سے اوپر ہو جائے، مجھے اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکالنا  
 ہوگا۔"

مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی۔ عطار بیگم نے  
 حالات کو درست کرنے کی جتنی بھی کوشش کی اس سے معاملہ  
 اور اگھتا چلا گیا۔ دن پر دن، مہینے پر مہینے اور سال پر سال  
 گزرتے چلے گئے لیکن مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ فساد اور لڑائی  
 جھگڑا روز بہ روز بڑھتا چلا گیا۔ اس دوران میں تمہینے  
 ناراض ہو کر میکے جانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ چھ  
 ماہ حیدرآباد میں رہتی۔ پھر یہ ماں بیٹا مت خوشامد کر کے  
 اسے کراچی لاتے۔ وہ چند روز یہاں گزارتی اور پھر بیک  
 ٹوڈی پولیس.....!

عطار بیگم کی آنکھوں کی بیٹائی بہت کمزور ہو چکی تھی لہذا  
 وہ اپنی بچہ پر کامل نظر نہیں رکھ سکتی تھی۔ تمہینے کا کراچی میں جو  
 مختصر قیام ہوتا اس دوران میں اس کا زیادہ تر وقت اس  
 پڑوس میں گزرتا تھا۔ یہ وہاں ہی صورت حال لگ بھگ  
 ساڑھے چار سال تک جاری رہی اور اس کا ڈراپ سین بڑا  
 ڈرامائی ہوا۔ اب کی بار جو تمہینے روٹھ کر میکے گئی تو وہاں سے  
 طلاق کا مطالبہ آ گیا۔  
 "خالد بیٹا! دیکھا تم نے۔ وہ کیا کہو اس کر رہی ہے؟"

"امی! وہ کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہے....."  
 خالد نے جھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر میں اسے آزاد  
 کروں گا تو وہ بھی خوش رہے گی اور میری زندگی میں بھی  
 سکون آ جائے گا۔"  
 "یہ..... یہ بات خود تمہینے نے تمہیں بتائی ہے؟" عطار  
 بیگم نے بے یقینی سے بیٹے کی طرف دیکھا۔  
 "نہیں! خالد نے لگی میں گردن ہلائی۔" میں نے  
 اس کے رو دیتے سے محسوس کیا ہے۔"  
 "ادبہ....." عطار بیگم نے ناگواری سے کہا۔ "اور تم  
 کیا چاہتے ہو؟"  
 "میرا خیال ہے، مجھے تمہینے کا مطالبہ پورا کر دینا چاہیے۔"  
 "جب تم اسے چھوڑنے کا حتمی فیصلہ کر چکے ہو تو پھر  
 کہنے کے لیے باقی کیا رہ جاتا ہے۔" عطار بیگم نے افسردہ  
 سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔  
 پانچ سال کی عذاب ناک ازدواجی زندگی گزارنے  
 کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے  
 جدا ہو گئے۔ طلاق والے واقعے کو اب تین سال کا عرصہ  
 گزر چکا تھا۔ اس سال کے ایک سال بعد ہی عطار بیگم کا



انتقال ہو گیا۔ پچھلے دو سال سے خالد حسین تنہائی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ سارا دن وہ گیراج میں گزارتا اور رات کو گھر میں آ کر سو جاتا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں بیٹھے بٹھائے وہ کسی مصیبت میں پھنس جائے گا اور مصیبت بھی ایسی کہ.....

اب اس تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ کریں۔ منظور حسین ساہس سال سے اس گھر میں تنہائی کی زندگی گزار رہا تھا۔ برسوں پہلے اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ محمود آباد گیٹ پر نکلے کہاں کا ٹھیلا لگاتا تھا اور اس کا دھندا خوب چلتا تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ بڑھاپے میں شادی کر بیٹھے گا۔ اس کی عمر ساٹھ سے ستواڑھی جبکہ ٹھیکلہ پینتیس کے آس پاس تھی خیر، انہوں نے شادی کی تھی اس لیے کوئی ان پر انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ٹھیکلہ کو منظور حسین کے گھر میں آئے کم و بیش چھ ماہ ہوئے تھے کہ خالد حسین کو ایک رات پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔ اس پر بڑا گھناؤنا الزام عائد کیا گیا تھا۔ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ خالد نے ٹھیکلہ پر مجرم نامہ حملہ نہیں کیا ہوگا اسی لیے میں نے اس کیس میں ہاتھ ڈالا تھا۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی طرز یعنی اپنے موکل کی درخواستِ ضمانت بھی دائر کر دی تھی۔ تمام متعلقہ افراد اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود تھے، صرف بیج کا انکار تھا۔ میر محفل کے پتھر وہ محفل بہ رنگ، بے بو، بے بے ذائقہ تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں بیج اپنے خیمبر سے برآمد ہوا۔ اس کی تنظیم میں تمام حاضرین عدالت اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ بیج جب کرسی انصاف پر براجمان ہو چکا تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ میں نے اپنے موکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دینا شروع کیے۔

”یو آئر! میرا موکل ایک سیدھا سادہ اور امن پسند انسان ہے۔ اسے ایک سوچی سمیٹی بھی سازش کے تحت اس کیس میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ طرز خالد حسین کی درخواستِ ضمانت کو منظور کیا جائے۔“

”طرز نے ایک گھناؤنے اور مکروہ جرم کا ارتکاب کیا ہے۔“ وکیل استفسار نے تیز آواز میں کہا۔ ”اگر اس کی درخواستِ ضمانت منظور کر لی گئی تو یہ انصاف کے اصولوں

کے منافی ہوگا۔“

”میرا موکل بے گناہ ہے۔“ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”میں اس کی شرافت اور نیک نامی کے لیے متعدد معتبر اور معزز افراد کو عدالت میں پیش کر سکتا ہوں۔ فی الحال..... میرے موکل کی درخواستِ ضمانت.....!“

”اگر وکیل صفائی اپنے موکل کی بریت کے لیے متعدد افراد کو عدالت میں پیش کر سکتے ہیں تو استفسار کے پاس بھی خرم کو مجرم ثابت کرنے کے لیے بہت کچھ ہے.....“

نہائی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ طرز کی درخواستِ ضمانت کو رد کرتے ہوئے اس کیس کو آگے بڑھایا جائے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں۔“

وکیل استفسار نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بولنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی یہ جرئت مجھے ناگوار تو گزری مگر میں بی گیا اور تحمل انداز میں کہہ۔

”جناب عالی! معزز عدالت انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ہی کام کر رہی ہے۔ اسی انصاف کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ طرز خالد حسین کی درخواستِ ضمانت کو منظور کیا جائے۔ میرا موکل اس معاشرے کا ایک امن پسند اور شریف انفس شہری ہے۔ اس کیس نے اس کی نیک نامی کو پہلے ہی بہت دھچکا پہنچایا ہے۔“

”نیک نامی..... شریف انفسی..... اونہا“ وکیل استفسار نے طنز انداز میں کہا پھر انگلی سے اکیوڈ پاس (طرزوں والے کٹہرے) میں کھڑے خالد حسین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے عمارت آمیز لہجے میں اضافہ کیا۔ ”نیک نام اور شریف انفس لوگ اس قسم کے کارنامے انجام نہیں دیا کرتے۔“

وکیل استفسار نے پچھلے دس پندرہ منٹ میں مجھ پر بہت سا قرض چڑھا دیا تھا۔ اس قرض کی فوری ادائیگی بہت ضروری ہو گئی تھی لہذا اس کی بات ختم ہوتے ہی میں نے تیز آواز میں استفسار کیا۔

”میرے قاضی دوست! آپ طرز کے کون سے کارنامے کی بات کر رہے ہیں؟“

میرے لاعلمی کے انداز پر وکیل استفسار ہنستا کر رہ گیا۔ نیم جارحانہ لہجے میں بولا۔ ”نما آپ کو اپنے موکل کے روتوں کی خبر نہیں ہے؟“

”ایک منٹ کے لیے فرض کریں کہ خبر نہیں ہے۔“



میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اگر آپ بتادیں گے تو میرے علم میں اضافہ ہو جائے گا۔"

"کمال ہے۔" وہ عورتوں کی طرح ہاتھ مچاتے ہوئے بولا۔ "آپ جس کیس میں اپنے موکل کی بیروی کرنے آئے ہیں اس کی حقیقت ہی سے آپ واقف نہیں..... میں کسی بھی قیمت پر یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں۔"

"میرے محترم دوست!" میں نے یہ دستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اگر آپ بتادیں گے تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ میں نے آپ سے کوئی بہت بڑی فرمائش تو نہیں کر دی۔"

جج اس دوران میں بڑی دلچسپی اور خاموشی سے ہماری نوک جھوک کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ میری بات کے جواب میں وکیل استفسار نے جوش بھرے انداز میں کہا۔ اس کا روئے سخن میری جانب تھا۔

"آپ کا موکل حدود آرڈی نہیں کے تحت گرفتار ہو کر اس عدالت تک پہنچا ہے جو کہ ایک انتہائی سنگین اور قابلِ مذمت جرم ہے۔ کیا مجھے یہ بھی بتانا ہوگا کہ حدود آرڈی نہیں کیا ہوتا ہے۔"

آخری جملہ اس نے بڑی سچی سے ادا کیا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ حدود آرڈی نہیں کی اہمیت کیا ہے لیکن میرے فاضل دوست! میرے موکل نے تو ایسا کوئی جرم نہیں کیا۔ یہ تو ایک مصحوم اور بے ضرر انسان ہے۔"

"یہ کتنا مصحوم اور بے ضرر ہے، یہ تو آپ جا کر اس عورت سے پوچھیں جو اس کے ظلم کا شکار ہوئی ہے۔" وکیل استفسار نے لفظ چبا چبا کر کہا۔ "اس وحشی نے ٹھیکلے کے ساتھ جس درندگی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی تفصیل تو مقلومہ ہی بتائے گی۔ اسی کی حکایت پر ملزم کو حدود آرڈی نہیں کے تحت گرفتار کر کے عدالت میں لایا گیا ہے۔"

"مقلومہ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا اور اس نے کن وجوہات کی بنا پر ایسی رپورٹ درج کرائی، اس معاملے کو بھی دیکھ لیں گے۔ فی الحال تو میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے وکیل استفسار کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ چونک کر بولا۔ "میری رائے..... کس سلسلے میں؟" "اس سلسلے میں کہ آپ ملزم کے ہارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ کو یقین ہے کہ میرے موکل نے اس

جرم کا ارتکاب کیا ہے.....؟" "جی ہاں..... مجھے پورا یقین ہے۔" وہ بڑے افسار سے بولا۔

"ویری گڈ!" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "پھر تو کام ہی بن گیا جناب۔" "کام بن گیا۔" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "کون سا کام بن گیا؟"

میں نے وکیل استفسار کی الجھن اور حیرت کی ذرا پروا نہ کی اور روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے دہنگ لہجے میں کہا۔

"جناب عالی! حدود آرڈی نہیں کے حوالے سے احکام خداوندی ہے کہ..... "بدکار (زانیہ) عورت اور بدکار (زانی) مرد میں سے ہر ایک کو سووڑے (کوڑے) مارو اور تمہیں اللہ کے معاملے میں ان پر رحم نہیں آنا چاہیے، اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو اور ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کے ایک گروہ (جماعت) کو حاضر رہنا چاہیے۔ بدکار (زانی) مرد سوائے بدکار (زانیہ) عورت یا مشرک کے نکاح نہیں کرے گا اور بدکار (زانیہ) عورت سے بھی کوئی نکاح نہیں کرے، گا سوائے بدکار (زانی) مرد یا مشرک کے۔ اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر جہت لگاتے ہیں اور پھر چار گواہ نہیں لاتے تو انہیں اتنی درے (کوڑے) مارو اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو اور وہی لوگ نافرمان ہیں....."

"وکیل صاحب!" جج نے غصہ سے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ اس آرڈی نہیں کی تفصیل عدالت کو کیوں سنا رہے ہیں؟"

جج کا سوال بجا تھا۔ میں نے تحمل انداز میں کہا۔ "جناب عالی! میں دراصل اس آرڈی نہیں میں "شہادت کی صحت" پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ استفسار کے مطابق میرے موکل نے ٹھیکلے نامی کسی عورت پر بھڑمانہ حملہ کیا ہے۔ استفسار وہ جرم ثابت کرنے کے لیے عدالت میں تین ایسے سنی شاہد پیش کرنا پڑیں گے جن کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسلمان ہوں، متقی اور پرہیزگار ہوں، ہا کردار اور صادق العقول ہوں۔"

"آپ بھی عجیب بات کر رہے ہیں وکیل صاحب!" جج نے غصے کے اوپر سے مجھے گھورا۔ "اس آرڈی نہیں میں تو چار گواہ لانے کی تاکید کی گئی ہے اور آپ تین کی بات کر رہے ہیں.....؟"



معائنہ ہے۔ اس معائنے سے ملزم کے جرم نامہ حملے کی تصدیق ہوگئی ہے لہذا اگر ملزم کی ضمانت منظور کی گئی تو یہ فریق جاتی کے ساتھ نائنٹھ ہوگی۔“

”جناب عالی! وکیل سرکار خواجہ خواہ میرے معصوم موکل کی ضمانت رکوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ میں نے بڑی رمان سے کہا۔ ”مناسب وقت آنے پر میں مظلوم ٹھیکہ کی عیاری کو بھری عدالت میں بے نقاب کر دوں گا۔ سردست میں وہ نکات سامنے نہیں لانا چاہتا۔ ابھی اس کیس کی شروعات ہے۔ میرے قبل از وقت انکشافات کیس کی آئندہ کارروائی پر منفی اثرات ڈال سکتے ہیں۔“

میرے خاموش ہونے پر وکیل استغاثہ نے ایک بار پھر زور شور کے ساتھ ضمانت کی مخالفت میں دلائل دینا شروع کیے جن میں مظلوم کے طبی معائنے، ہسٹری حالت اور مختلف کپڑوں کے لیبارٹری ٹیسٹ کا بھی حوالہ تھا۔ یہ تمام ایسے پوائنٹس تھے کہ جج نے خالد حسین کا درخواست ضمانت کو منظور کرتے ہوئے اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھجوانے کے احکامات صادر کر دیے۔

☆☆☆

آئندہ روز میرے موکل کا سینہ صدیق مجھ سے ملنے آفس آیا۔ یہ ہماری دوسری ملاقات تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ میرے آفس کا ایک چکر لگا چکا تھا۔ وہ پھلکی پھلکی پر عدالت میں بھی موجود تھا۔ تاہم عدالتی کارروائی کے اختتام پر میری اس سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔

”بیگ صاحب!“ وہ کبیر انداز میں بولا۔ ”میں ایک مکینیکل ڈیپارٹمنٹ کے ڈالا انسان ہوں۔ مجھے قانونی داؤ جج سے زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے اس کیس کے بارے میں؟“

”میں پوری طرح مطمئن ہوں صدیق صاحب!“ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”مگر خالد تو جیل چلا گیا.....“ ان نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”کیس کی نوعیت ایسی ہے صدیق صاحب کہ اس کی ضمانت ممکن نہیں تھی۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آپ فکر نہ کریں۔ وہ جیسے جیل گیا ہے، ویسے ہی رہا بھی ہو جائے گا۔ یہ سب عدالتی معاملات کا حصہ ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ تین چار ہفتوں میں، میں اپنے موکل کو باعزت بری کرالوں گا۔“

”ہوں.....!“ صدیق نے بوجھل سانس خارج کی

”تین کا ذکر میں نے اس لیے کیا ہے کہ چوتھا یعنی شاہد اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔“ میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

”کہاں ہے.....؟“ وکیل استغاثہ نے چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔

جج نے مجھ سے پوچھا۔ ”وکیل صاحب! آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟“

”وکیل استغاثہ کی جانب جناب عالی!“ میں نے انہوں لہجے میں کہا۔ ”تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے روبرو میرے فاضل دوست نے اس امر کا دعویٰ کیا ہے کہ انہیں پورا یقین ہے کہ میرے موکل نے ٹھیکہ نامی عورت پر جرم نامہ حملے کا ارتکاب کیا ہے۔“

”آئیٹیکشن پور آؤ!“ وکیل استغاثہ جج سے مشابہ آواز میں بولا۔ ”وکیل صفائی لہجے دار باتوں کا سہارا لے کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔“

”میں نے کیا کیا ہے؟“ میں نے حیرت بھری نظر سے جج کی طرف دیکھا۔

”وکیل صاحب!“ جج نے وکیل استغاثہ سے کہا۔ ”آپ اپنی بات کو وضاحت کریں۔“

”پور آؤ!“ وکیل استغاثہ معاندانہ نظر سے مجھے دیکھنے کے بعد جج سے مخاطب ہوا۔ ”استغاثہ کو تین چار یا دس بار گواہ پیش کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ فریادی عورت کی شکایت ہی کافی ہے۔ ٹھیکہ کا دعویٰ ہے کہ اس پر جرم نامہ حملہ کیا گیا ہے اور یہ حملہ ملزم خالد حسین نے کیا ہے۔“

”میرا موکل بے گناہ ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اور مظلوم ٹھیکہ کا دعویٰ جھوٹ اور مکاری کے سوا کچھ نہیں۔“

”جناب عالی! بات ٹھیکہ کے دعوے تک ہی محدود نہیں۔“ وکیل استغاثہ نے اپنی فاکوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”اگر اس نے زبانی کلامی دعویٰ کیا ہو تا تو پولیس کو اس پر اتنا سنجیدہ ایکشن لینے کی ضرورت نہیں تھی کہ معاملہ عدالت میں آجاتا۔ اس جرم نامہ واردات کے تمام ثبوتی ثبوت پولیس کی تحویل میں ہیں اور مناسب مواقع پر انہیں پیش بھی کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں.....“ اس نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”علاوہ ازیں، سب سے اہم ثبوت مظلوم ٹھیکہ کا طبی



اور گہری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔  
 صدیق کی عمر پچاس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ گندی  
 رنگت کا ایک پتہ قامت شخص تھا۔ اس نے جینز اور ٹی شرٹ  
 زیب تن کر رکھی تھی۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ اور بال زلفوں کی  
 شکل میں اس کے شانوں کو چھو رہے تھے۔ اس نے سر کے  
 بالوں کو باقاعدہ تیل وغیرہ لگا کر سیٹھے سے سنوار رکھا تھا۔ وہ  
 زیادہ پڑھا لکھا نہیں لگتا تھا لیکن اس کی باتوں سے تجربہ اور  
 دانش مندی جھلکتی تھی۔

میں نے صدیق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری  
 سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر آپ میری کارکردگی سے خوش نہ  
 ہوں تو میری طرف سے آپ پر کوئی دباؤ نہیں۔ آپ اگر  
 چاہیں تو.....“  
 ”ایسی بات نہیں ہے بیگ صاحب!“ وہ میری بات  
 پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”آپ شاید کچھ اور  
 سوچتے لگے۔“

”میں خالد حسین کو کافی عرصے سے جانتا ہوں۔“ وہ  
 ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جانتے تو اسے اور بھی بہت  
 سے لوگ ہوں گے لیکن مجھے اس بات پر مان ہے کہ مجھ سے  
 زیادہ اسے کوئی نہیں جانتا ہوگا۔ اس کی کوئی بات، زندگی کا  
 کوئی گوشہ مجھ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔“  
 ”یہ سب تو ٹھیک ہے صدیق صاحب!“ اس کے  
 خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ”لیکن ان باتوں کا خالد  
 حسین کی بے گناہی سے کیا تعلق ہے؟ یہ بات میری سمجھ میں  
 نہیں آرہی۔“

”ہے تعلق..... بہت گہرا تعلق ہے جناب۔“ وہ ایک  
 ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”آپ کے علم میں یہ  
 بات تو ہوگی کہ خالد حسین نے شادی بھی کی تھی؟“  
 ”جی ہاں۔ خالد نے مجھے اس بارے میں تفصیلاً بتایا  
 ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں  
 سمجھتا ہوں، شادی کے منانے میں وہ خاصا بد قسمت واقع  
 ہوا ہے۔“

”بد قسمت؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔  
 ”جی..... میرا کچھ خیال ہے۔“  
 ”آپ کن معنوں میں اسے بد قسمت کہہ رہے ہیں،  
 زرا وضاحت کریں گے؟“

”میں ان معنوں میں کہہ رہا ہوں کہ اس کی والدہ  
 نے ایک بہت اچھی جگہ اس کی شادی کرائی تھی۔“ میں نے  
 تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”میری معلومات کے  
 مطابق خالد کی بیوی ایک پڑھی لکھی اور خوب صورت عورت

میں نے صدیق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری  
 سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر آپ میری کارکردگی سے خوش نہ  
 ہوں تو میری طرف سے آپ پر کوئی دباؤ نہیں۔ آپ اگر  
 چاہیں تو.....“  
 ”ایسی بات نہیں ہے بیگ صاحب!“ وہ میری بات  
 پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”آپ شاید کچھ اور  
 سوچتے لگے۔“  
 ”پھر آپ اتنے دل گرفتہ کیوں نظر آ رہے ہیں۔“  
 میں نے کہا۔ ”آپ کی آنکھوں میں مجھے مایوسی کے سایے  
 دکھائی دیتے ہیں۔“

”میں سمجھ رہا تھا کہ خالد کی ضمانت ہو جائے گی۔“ وہ  
 صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”شاید اسی بات کا  
 کوئی تاثر ہو میری آنکھوں میں!“  
 ”صدیق صاحب!“ میں نے دوستانہ انداز میں  
 اسے مخاطب کیا۔ ”حدود آرڈی نہیں کو آپ کوئی معمولی کیس  
 نہ سمجھیں۔ پولیس نے مظلومہ کا طبی معائنہ بھی کرایا ہے۔  
 علاوہ ازیں استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ اس واردات کے محسوس  
 ثبوت بھی ہیں اس کے پاس۔ ان حالات کی روشنی میں  
 عدالت کسی قیمت پر ظرم کی درخواست ضمانت کو منظور کر رہی  
 نہیں سکتی تھی لیکن.....“ میں نے کھاتی توقف کر کے ایک  
 گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن میں نے مظلومہ ٹھیکہ کی ذات کے حوالے  
 سے جو ریسرچ کی ہے، وہ بڑی کارآمد اور مفید ہے۔ میں  
 اپنی کارکردگی سے کلی طور پر مطمئن ہوں۔ آپ کی دل فشگی  
 کا سبب شاید یہ ہے کہ آپ نے اس کیس کی تحقیق اور خطرہ کی  
 کو پوری طرح محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی۔“

”بیگ صاحب! یہ کیس چاہے کتنا بھی ہولناک کیوں  
 نہ ہو مگر مجھے ایک بات کا پورا یقین ہے کہ خالد حسین بے گناہ  
 و بے قصور ہے لہذا ہر قیمت پر اسے اس وبال سے باہر آنا  
 چاہیے۔“



استعمال کیا ہے، اس کی وضاحت ضروری ہے۔“  
 ”جی ہاں۔ بہت ضرور ہے۔“ وہ سنی خیر انداز  
 میں بولا۔ پھر مجھے سنی خیر تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔  
 میں ہکا بکا اسے دیکھتا چلا گیا۔

☆☆☆

آگے بڑھنے سے قبل میں آپ کی معلومات کے لیے  
 اتنا بتاتا چلوں کہ حدود آرڈی نینس کے ذیل میں جو کیسز  
 عدالتوں میں زیر سماعت ہوتے ہیں ان کی مکمل سماعت کو  
 الفاظ کی شکل دے کر تحریری انداز میں شائع کرنا ناممکن  
 ہے۔ ایسے معاملات میں دیکل صفحہ جتنے سفاکانہ انداز میں  
 سوالات کرتے ہیں، مظلومہ کو وہ سب سنتا اور برداشت کرنا  
 پڑتا ہے۔ ”شرع اور قانون میں تو کوئی شرم نہیں ہوتی“  
 لیکن ضابطہ اخلاق اس عدالتی کارروائی کو سن و سن حوالہ تحریر  
 کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نوعیت کی  
 وارداتوں میں اکثر کیس تو رپورٹ ہی نہیں ہوتے۔ لوگ  
 سوچتے ہیں، عزت پر داغ تو لگ ہی گیا ہے۔ اب عدالت  
 میں جا کر مزید رسوائی اور جگہ ہنسائی کا کیا فائدہ ہے۔  
 اگرچہ متاثرین کے اس رویے سے ظالم اور جاہل کے ہاتھ  
 مضبوط ہوتے ہیں اور اسے مکمل کھیلنے کا موقع بھی ملتا ہے۔

اس کیس کی ابتدائی چند پیشیاں سنگینی کارروائیوں کی  
 نذر ہو گئیں۔ لگ بھگ تین ماہ گزر جانے کے بعد پہلی  
 باقاعدہ کارروائی ہوئی۔ اس روز تمام متعلقہ افراد عدالت  
 میں حاضر تھے۔ جج کربی انصاف پر آکر بیٹھا تو کارروائی کا  
 آغاز ہوا۔ جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ظلم نے صحت جرم  
 سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ظلم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا  
 گیا۔ میں نے پچھلی دو طلاقاتوں میں اپنے موکل کو اچھی  
 طرح سمجھا دیا تھا کہ اسے اپنے بیان میں کن امور کا خیال  
 رکھنا ہے۔ خالد حسین نے بہت بجا مطالبانہ دیا تھا۔

ظلم کا بیان عمل ہوا تو ویل سٹاٹس جرح کے لیے  
 اکیوڑ ہا کس کے قریب چلا گیا اور اس نے بڑے طبعی انداز  
 میں جرح کا آغاز کرتے ہوئے ظلم سے سوال کیا۔

”تم تھکیلہ کو کب سے جانتے ہو؟“

”جب سے وہ میرے پڑوس میں آئی ہے۔“ ظلم  
 نے جواب دیا۔

”میں نے عرصہ پوچھا ہے؟“

”لگ بھگ چھ ماہ.....!“

ظلم نے تھکیلہ سے اپنی شناسائی کی وہ مدت بتائی تھی  
 جب وہ منظور حسین سے شادی کرنے سے بعد اس کے گھر کے

تھی لیکن اس بے چارے کو شادی کی شادمانی دیکھنا نصیب  
 نہ ہوئی۔ شادی کے فوراً بعد ہی گھر میں فساد کی فضا قائم ہو گئی  
 تھی۔ میاں بیوی اور ساس بہو میں ایک تناؤ کی کیفیت رہنے  
 لگی اور پانچ سال کی سچ و ترش رقابت کے بعد یہ رشتہ کپے  
 دھاگے کی طرح ٹوٹ گیا۔ ثمنینہ نے طلاق کا مطالبہ کیا اور  
 خالد حسین نے فوراً اس کا مطالبہ پورا کر دیا۔“

میں تھوڑی دیر کو تھما، اپنی سانس کو ہموار کیا پھر بات کو  
 مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”طلاق والے اس واقعے کے بعد  
 خالد کی زندگی سونی سونی ہو گئی تھی پھر ایک سال بعد اس کی  
 والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سے یہ بے چارہ دنیا میں  
 بالکل ایلٹ ہے۔“

”اس بے چارے کے بارے میں تو آپ کی  
 معلومات خاصی صحت مند ہیں۔“

صدیق نے تعریفی نظر سے مجھے دیکھا۔ ”لیکن کیا  
 آپ کو ثمنینہ کی بھی کچھ خبر ہے؟“  
 ”ثمنینہ کی خبر؟“ اب میرے چہرے پر کھنکھ کی باری تھی۔  
 ”اس کو کیا ہوا ہے؟“

”خالد سے طلاق کے کچھ ہی عرصے بعد ثمنینہ نے  
 اکرام اللہ نامی ایک شخص سے شادی کر لی تھی۔“ صدیق نے  
 انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ”اب اس واقعے کو لگ بھگ  
 ! چالیس سال گزر چکے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق اس  
 وقت اکرام اللہ سے ثمنینہ کے دو بچے ہیں۔“

”ہوں.....!“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ”اس  
 کا مطلب ہے، خالد حسین کا اندازہ بالکل درست تھا۔“  
 ”کیسا اندازہ بیگ صاحب؟“ وہ مجھ سے لہجے  
 میں مستفسر ہوا۔

”خالد حسین کو شک تھا کہ ثمنینہ کسی اور مرد کو پسند کرتی  
 تھی۔“ میں نے کہا۔ ”اسی لیے اس نے طلاق لی تھی۔ یقیناً  
 وہ مرد اکرام اللہ ہی تھا۔“

صدیق چند لمحات تک حذبذب انداز میں مجھے دیکھتا  
 رہا۔ جب مجھے اس کے انداز سے بے چینی ہونے لگی تو اس  
 نے میرے اطمینان کے لیے یہ شعر پڑھ دیا۔

”ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ“

دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا“

میں نے حیرت اور الجھن کے طے طے تاثرات کے  
 ساتھ اس کی طرف دیکھا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”صدیق  
 صاحب! میں غالب کے اس شعر کے معنی اور ملبوم سے تو  
 اچھی طرح واقف ہوں لیکن آپ نے جس تناظر میں اسے



”ڈانٹا نہیں تھا بلکہ ہمارے درمیان اچھی خاصی منہ ماری ہو گئی تھی۔“ میرے موکل نے بڑے احماد سے جواب دیا۔ ”میں نے بھی کہا، ’خصماں لوں کھاؤ..... جب تمہیں خود ہی اپنی عزت کا خیال نہیں تو مجھے کیا پڑی ہے۔ اس دن سے میں منظور حسین اور کھلیلہ کے معاملے سے لاشعور ہو گیا تھا۔“

”تم لاشعور نہیں ہونے تھے۔“ وکیل استغاثہ نے زہرے لہجے میں کہا۔ ”بلکہ تم نے ان کے معاملے سے لاشعور ہونے کی اداکاری شروع کر دی تھی اور کسی خاص موقع کے انتظار میں تھے جب تم اپنے دل کے ارمان پورے کر سکو اور پھر وقوع کی رات تمہیں یہ موقع میسر آ گیا۔ تم کسی بہانے مظلومہ کھلیلہ کے گھر میں گھسے اور اس پر بھرماند حملہ کر دیا۔ اس طرح تم اپنے ناآسودہ جذبات کے جنگلی بیاباں کو گل و گلزار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔“

”یہ سب جھوٹ ہے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔“ وکیل استغاثہ کے طوقانی حملوں کے جواب میں طوم نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ”حقیقت وہی ہے جو میں نے بیان کر دی ہے۔“

”مجھے طوم سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!“ وکیل استغاثہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور کندھے اچکا دیے۔

اپنی باری پر میں سوال و جواب کے لیے اکیوزڈ باکس کے قریب چلا گیا۔ میں نے طوم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہاری ڈیوٹی نامعلوم کیا ہیں؟“

”میں صبح گیارہ بجے گیراج پہنچتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور شام سات بجے میری چھٹی ہو جاتی ہے۔ پھر میں سیدھا گھر آ جاتا ہوں۔“

”گھر کتنے بجے تک پہنچ جاتے ہو؟“

”گیراج میرے گھر سے زیادہ دور نہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”زیادہ سے زیادہ میں ساڑھے سات تک گھر پہنچ جاتا ہوں۔“

”اس کے بعد تم کب کرتے ہو؟“ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بس جی، گھر ہی میں رہتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”گیراج سے واپسی پر میں نہادھو کر صاف لباس پہنتا ہوں، پھر رات کا کھانا کھاتا ہوں۔ کھانے کے بعد تھوڑی دیر تک ٹی وی دیکھتا ہوں اور پھر سو جاتا ہوں۔“

”کیا اس دوران میں کھلیلا اپنے گھر پر اکیلی ہوتی تھی؟“

سامنے والے گھر میں آیا ہوئی تھی اور یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ کھلیلہ اور منظور حسین کی شادی کے کم و بیش چھ ماہ کے بعد یہ افسوسناک واقعہ رونما ہوا تھا جس کی یادداشتیں میں میرا موکل ایک خطرناک مجرم کی حیثیت سے اس وقت کئبرے میں کھڑا تھا۔

”تم اپنی پڑوسن پر بری نظر رکھتے تھے؟“ وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو رفتہ رفتہ آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”لاحول ولا قوۃ!“ وہ کراری آواز میں بولا۔ ”میں نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی۔ میں ایسے کاموں کو گناہ سمجھتا ہوں۔“

”مگر مظلومہ کھلیلہ نے بیان دیا ہے کہ تم اکثر اسے ہوس بھری نگاہ سے دیکھتے تھے۔“ وکیل استغاثہ نے اصراری لہجے میں کہا۔ ”تمہارے دیکھنے کے انداز میں بازاری پن ہوتا تھا۔ کئی بار تم نے اسے غیظ اشارے بھی کیے تھے..... ہوں؟“

”وہ جھوٹ بولتی ہے، بکو اس کرتی ہے۔“ طوم نے نیم احتجاجی لہجے میں کہا۔ ”یہ سراسر مجھ پر بہتان ہے جبکہ..... جبکہ.....“

”یہ کیا ”جبکہ، جبکہ“ لگا رکھی ہے؟“ وکیل استغاثہ نے ڈانٹ بھرے انداز میں کہا۔

”جبکہ..... وہ خود آوارہ اور بد معاش عورت ہے۔“

طوم تقریباً بیٹ پڑا۔ ”منظور حسین کی غیر موجودگی میں وہ مختلف مردوں کو گھر میں بلاتی ہے اور ان کے ساتھ کچھ بے اڑاتی ہے..... میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو یہ اتنی میری دشمن ہو گئی اور..... اس نے مجھ پر گھناؤنا الزام لگا کر پولیس پکھری کے چکر میں ڈال دیا ہے۔“

”تم نے اسے کیا سمجھانے کی کوشش کی تھی؟“ وکیل استغاثہ نے طنز لہجے میں دریافت کیا۔

”بہن! کہ وہ نازیبا حرکتوں سے باز آ جائے۔“ طوم نے جواب دیا۔ ”اس سے ماحول خراب ہوتا ہے لیکن میری نامحاند باتوں کا اس پر خاک اثر نہ ہوا.....“

”بہن! بات تو یہ ہے کہ.....“ وکیل استغاثہ نے چہیتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم کھلیلہ کے لیے اپنے دل میں بڑے خطرناک جذبات اور ذہن میں گندی سوچ رکھتے تھے اور اسے ہوس بھری حریصانہ نظر سے دیکھتے تھے لیکن جب اس نے تمہیں گھاس نہیں ڈالی تو تم اس کے شوہر کے کان بھرنے میں مصروف ہو گئے۔ تمہاری لگائی بھائی سے منظور حسین اور کھلیلہ کے درمیان تلخ کلامی بھی ہوئی لیکن جب منظور حسین کو اپنی بیوی کی بے گناہی کا یقین آ گیا تو اس نے انہیں ڈانٹا تھا..... ڈانٹا تھا یا نہیں ڈانٹا تھا؟“



**سبج**

ایک نئے کلرک نے یہ کہہ کر اپنے افسر سے چھٹی ماگنی کہ اسے گھریلو کام کاج میں اپنی تیار بیوی کی مدد کرنا ہے۔

افسر بولا۔ "مگر تمہاری بیوی نے ابھی ابھی مجھے ٹیلی فون پر بتایا ہے کہ اس کی طبیعت اب بالکل ٹھیک ہے اور گھریلو کام کاج میں اسے تمہاری مدد کی بالکل ضرورت نہیں۔"

کلرک نے قہر مینی لگا ہوں سے افسر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس دفتر میں دو اشخاص ایسے ہیں جو کچھ بولنے کے شوقین معلوم نہیں ہوتے اور ان میں سے ایک میں ہوں۔ میری تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی۔"

☆☆☆

ماں۔ "بیٹا دیکھنا تو چہمت پر کون رو رہا ہے؟"

تھوڑی دیر بعد بیٹا واپس آ کر بولا۔

امی۔ "رو تو کوئی نہیں رہا۔ ابو چہمت پر بیٹھے گا کار ہے ہیں۔"

انتخاب۔ نعیم احمد، گجر نوالہ

کے ساتھ ہولیا۔ آپ اسے میرا جذبہ ہمدردی بھی کہہ سکتے ہیں۔ مجھے کیا بتاتا تھا کہ وہ مکار عورت، ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مجھے گھیر کر پھندے کی طرف لے جا رہی ہے۔ بہر حال، میں اپنی سادگی میں اس سے پیچھے ہولیا اور اس کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے گھیلہ کے حسب مفاد فریج کو کھسکا دیا۔ جب وہ مطمئن ہوگئی تو میں واپسی کے لیے مڑا، اسی وقت گھیلہ نے کہا۔

"رک جا میں خالد بھائی! میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

"اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے صاف منع کرتے ہوئے کہا۔ "میں جا کر سوؤں گا۔ اگر چائے پی لی تو نیند اڑ جائے گی۔"

"چلیں، چائے نہیں تو دودھ کا ایک گلاس ہی پی لیں۔" وہ بڑی لگاوت سے بولی۔ "اب پہلی مرتبہ میرے گھر آئے ہیں خالد بھائی! میں آپ کو کچھ کھلائے پلائے بغیر تو جانے نہیں دوں گی۔"

"جی میرا بچی اندازہ ہے اور عموماً اسی دوران میں، میں نے منظور حسین کے گھر میں اٹنے سے آدی کو آتے دیکھا ہے۔" طوم نے جی بھرے الفاظ میں جواب دیا۔

"مجھے یقین ہے، وہ لوگ نہ تو منظور حسین کے رشتے دار ہیں اور نہ ہی گھیلہ کے۔ یہ کوئی اور ہی خطرناک چکر ہے۔"

"دقودہ کی رات بھی تم نے کسی مشکوک شخص کو منظور حسین کے گھر میں داخل ہونے دیکھا تھا؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں..... میں نے کالے پھینسے کو دیکھا تھا۔"

"کالے پھینسے کو؟" میں نے چونک کر اپنے منہ کی طرف دیکھا۔

"جی وکیل صاحب!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا۔ "مجھے نہیں معلوم، اس بندے کا نام کیا ہے مگر میں نے اکثر اسے منظور حسین کی غیر موجودگی میں گھیلہ کے پاس آتے جاتے دیکھا۔ وہ ایک نیم نیم اور سیاہ رنگ کا آدی ہے۔"

"دقودہ کی رات تم کتنے بچے سوئے تھے؟" میں نے سوال کیا۔

"سو کہاں سکا تھا جناب۔" وہ بیزارگی سے بولا۔

"میں سونے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ یہ واقعہ پیش آیا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "وکیل صاحب! میں کوئی گیارہ بجے حسب معمول سونے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے گھیلہ کو کھڑے پایا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے منت ریز لہجے میں بولی۔

"خالد بھائی! اگر زحمت نہ ہو تو مجھے آپ سے ایک کام ہے....."

"ان لمحات میں وہ مجھے بہت مصوم اور سلیمی ہوئی نظر آئی۔ پھر زندگی میں پہلی بار اس نے مجھے "خالد بھائی" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اچانک میرے دل میں اس کے لیے ایب نرم گوشہ اہو گیا۔ میں نے کہا۔

"جی فرمائیں..... آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

"آپ کو پانچ منٹ کے لیے میرے ساتھ گھر پر جانا ہوگا۔" اس نے خوش شاہانہ انداز میں کہا۔ "فریج کو تھوڑا سا کھسکانا ہے۔ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔"

پتا نہیں، اس وقت میرے جی میں کیا آئی کہ میں اس



”بہت ہی افسوس ناک کہانی ہے۔“ میں نے ہونٹ  
کھینچتے ہوئے کہا۔ پھر روئے سخن سچ کی سمت پھیرتے  
ہوئے اضافہ کر دیا۔

”وشش آل پورا آرزو.....!“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔  
سج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت  
برخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔ ”وی کورٹ از  
ایڈ جرنل.....!“

☆ ☆ ☆

آئندہ پیشی پر استقامت کی جانب سے تین گواہ پیش  
کیے گئے جن میں ایک جوان کھلیہ کا بوڑھا شوہر منظور حسین  
اور دو دیگر بڑوسی اور گلے دار تھے۔ ان تینوں کے بیان میں  
کوئی ایسی خاص بات نہیں جس کو ضابطہ تحریر میں لایا جائے۔  
دونوں بڑوسی اس بات کے واہ تھے کہ انہوں نے وقوع کی  
رات کھلیہ کے گھر میں شور و غل کی آواز سنی تو اس طرف متوجہ  
ہوئے جیسی انہیں پتا چلا کہ ملازم خالد حسین نے بھانے سے  
کھلیہ کے گھر میں گھس کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ  
بیانات کسی اہمیت کے حامل نہیں تھے۔

منظور حسین ایک انتہائی سادہ اور ہونٹ انسان تھا۔  
میرے مختلف سوالات کے جواب میں اس نے بتایا کہ کھلیہ  
سے اس کی پہلی ملاقات کچھ کہاب کے ٹھیلے پر ہی ہوئی تھی۔  
وہ اس کے پاس کہاب لینے آئی تھی اور جب تک کچھ کہاب  
تیار ہوتے، وہ وہیں کھڑی بیٹھی بیٹھی باتیں کرتی رہتی تھی۔  
رفتہ رفتہ ان میں ”انڈرا-نینڈنگ“ پیدا ہو گئی۔ کھلیہ نے  
منظور حسین کو بتایا کہ وہ بندہ ہے اور اپنے بھائی کے پاس  
رہتی ہے۔ بھائی کو اس کی ننادی کی بڑی فکر ہے۔ کھلیہ نے  
جس شخص کو اپنا بھائی بتایا تھا یہ وہی بندہ تھا جس کے لیے خالد  
حسین نے ”کالے بھینسے“ کے الفاظ استعمال کیے تھے۔  
بعد ازاں اس بندے کا نام شاہد علی معلوم ہوا۔ شاہد علی اعظم  
بستی میں رہتا تھا اور دو دو ہی کی ایک دکان چلاتا تھا۔

الغرض کھلیہ اور منظور حسین کی ”انڈرا-نینڈنگ“ اتنی  
بڑھی کہ ان کے درمیان مائل قاصطے مت گئے۔ وہ ایک  
نقطے پر آ کر مل گئے۔ معلب یہ کہ ان کی شادی ہو گئی۔  
بڑھاپے میں کسی مرد کو جوان اور خوب صورت عورت مل  
جانے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ منظور حسین کا بھی  
یہی حال تھا۔ وہ دن رات کھلیہ کے فخرے اور ناز اٹھانے  
میں لگا رہتا تھا اور اس کے خلاف ایک چھوٹی سی بات سننے کو  
بھی تیار نہیں ہوتا تھا چنانچہ جب خالد حسین نے اسے کھلیہ

”پتا نہیں، یہ کھلیہ کے بار بار ”خالد بھائی“ کہنے کا اثر  
تھا یا میری مت ماری گئی تھی کہ میں اس کے بیڈروم میں رک  
کیا۔ وہ مجھے بیڈ پر بٹھا کر بکن کی طرف چلی گئی۔

”میرے ذہن کو عجیب سی بے چینی تھی اور جی چاہ رہا تھا  
کہ ابھی اٹھ کر بھاگ جاؤں لیکن اس نے کبلی مرتبہ ایسے  
اخلاق کا مظاہرہ کیا تھا لہذا میں اپنی شرافت سے مجبور ہو کر  
دل پر جبر کیے بیٹھا رہا۔ اگلے ہی لمحے لائٹ چلی گئی۔  
”یہ کیا ہوا؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”لائٹ چلی گئی ہے۔“ بکن کی طرف سے کھلیہ کی  
آواز آئی۔ ”آپ پریشان نہ ہوں، میں امیر جنسی لائٹ  
آن کرتی ہوں۔“

”میں اپنی جگہ اندھیرے میں بیٹھا رہا لیکن دل میں  
سکون نہیں تھا۔ اگلے ہی لمحے یہ دلی بے سکونی ایک بہت بڑی  
قیامت کو لے آئی۔ کھلیہ نے امیر جنسی لائٹ تو آن نہیں کی  
بلکہ اندھیرے کا قاتمہ اٹھا کر وہ عقب سے مجھ سے چٹ گئی  
اور زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔

”بھاؤ..... بھاؤ..... یہ شیطان میری عزت برباد  
کر رہا ہے۔ کوئی اس دردے کو گولی مار دے.....“

”ان لحاٹ میں میرا دماغ بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔ اس  
اچانک ٹوٹ پڑنے والی افتاد نے مجھے حواس باختہ کر دیا  
تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ کھلیہ نے اتنی  
مضبوطی سے مجھے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا کہ یہ قول فحشہ،  
اس نے مجھے جن چہٹا ڈال رکھا تھا۔ اس کا بدن مسلسل  
میرے بدن سے ٹکرا رہا تھا اور میں نے بڑے واضح انداز  
میں محسوس کیا کہ کھلیہ کا لباس جسم کے نازک حصوں پر سے  
پھنا ہوا تھا۔ اس احساس نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ اس سے  
پہلے کہ میں اس قیامت خیز صورت حال سے نکلنے کے لیے  
کوئی عملی ٹھگ دو کر تا، اچانک لائٹ آ گئی۔

”بیڈروم روشن ہوا تو میں کھلیہ کا نیم برہنہ بدن دیکھ کر  
کانپ اٹھا۔ وہ ہاتھوں سے مجھے مار رہی تھی اور رو کر اپنی  
بربادی کا ماتم کرتی چلی جا رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے میں نے  
کالے بھینسے کو کمرے میں نمودار ہوتے دیکھا۔ اس کی  
آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ کالے بھینسے نے آتے ہی مجھے  
مارنا شروع کر دیا۔ اس دوران میں شور شرابے کی آوازیں  
سن کر محلے والے بھی جمع ہو گئے تھے۔ پولیس کو بلا لیا گیا اور  
..... منظور حسین بھی کام سمیٹ کر گھر آ گیا۔ پولیس نے  
مختصری تفتیش کی پھر مجھے کھلیہ کو پامال کرنے کے الزام میں  
گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئی۔“



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



”آپ کو شاید اس لیے ظہن نہیں آ رہا کہ آپ تھانے اور جائے وقوعہ کے درمیانی فاصلے سے آگاہ نہیں ہیں۔“  
 آئی او نے معنی خیز نظر سے مجھے دیکھا۔  
 ”اسکی بات نہیں ہے خان صاحب!“ میں نے طنز کا جواب طنز سے دیتے ہوئے کہ۔ ”میں کراچی کے تمام تھانوں کی لوکیشن اور محل وقوع سے اچھی طرح واقف ہوں۔ دراصل پولیس سے ایسی مستعدی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔“  
 ”اس میں پولیس بے چاری کا کیا قصور ہے؟“ وہ نقلی آمیز لہجے میں بولا۔

”کوئی نہیں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔  
 ”آپ نے جائے وقوعہ پر پہنچنے ہی ملزم کو گرفتار کر لیا تھا؟“  
 ”تو کیا اسے گرفتار نہیں کرنا تھا؟“ وہ کٹہرے میں کھڑے میرے موکل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ”میں نے یہ کہا ہے کہ جائے وقوعہ پر آپ نے کوئی تفتیش بھی کی تھی یا جاتے ہی سپاہیہ ملزم کو ہتھیاری پہن دی تھی؟“  
 ”میں اس کیس کا تفتیشی افسر ہوں۔“ وہ بڑے فخر سے بولا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے کہ میں نے تفتیش نہ کی ہو۔ میں نے بیڈ شیٹ کا معائنہ کیا تھا جس پر مخصوص نوعیت کے دھبے پائے گئے تھے۔ بعد ازاں اس شیٹ کو لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے بھجوا دیا گیا تھا۔ میں نے موقع پر موجود چند افراد کے بیانات بھی قلم بند کیے تھے جو مظاہرہ کے گھر سے اٹھنے والے شور کی وجہ سے ادھر متوجہ ہو گئے تھے۔ علاوہ ازیں مظلومہ کے شوہر منظور حسین اور بھائی شاہد علی کے اہم بیانات بھی قلم بند کیے گئے تھے۔ مظلومہ کے گھر خصوصاً بیڈروم کے مختلف مقامات پر خرم کی اٹلیوں کے نشانات بھی پائے گئے تھے۔“

”بہت خوب.....!“ آئی او اپنی کارکردگی بیان کر چکا تو میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”ان تمام امور سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ میرے موکل نے مظلومہ شکیلہ کے ساتھ مبینہ زیادتی کی ہے؟“

”آپ بھی کمال کے وکیل ہیں جناب۔“ وہ سبز سے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مظلومہ کا تار تار لباس اس بات کا گواہ ہے کہ اس کے ساتھ بہت بڑا ظلم کیا گیا ہے۔ مظلومہ کا حلیہ بیان بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کوئی عورت خواہ مخواہ اتنا بڑا الزام خود سے منسوب کیوں کرے گی۔ مظلومہ کے بھائی شاہد علی نے بھی موقع کا نظارہ کیا ہے پھر سب سے بڑی بات مظلومہ کا طبی معائنہ ہے.....“ وہ لمبے بھر کو سانس ہموار

کے کرتوتوں کے بارے میں بتایا تو اس نے ان خالد ہی کو جھڑک دیا تھا۔

اگر معاملہ صرف کالے بھینسے تک محدود ہوتا تو خالد حسین کا تجسس بھی ساتویں آسمان کی سیر کو نہ جاتا۔ اس نے کالے بھینسے کے علاوہ بھی کئی مشکوک افراد کو منظور حسین کی غیر موجودگی میں اس کے گھر کا پراسرار ”وزٹ“ کرتے دیکھا تھا۔ بہر حال اسی کالے بھینسے کے ہاتھوں پٹ کر خالد حسین وقوعہ کی رات پولیس کے ہتھے چڑھا تھا۔

اس پیشی پر میں نے بیچ سے درخواست کی کہ میں اس کیس کے آئی او (انکوائری آفیسر) سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ بیچ نے فوراً میری فرمائش پوری کر دی۔ اگلے ہی لمحے انکوائری آفیسر وٹنس باکس (گواہوں والے کٹہرے) میں آکر کھڑا ہوا۔

کسی بھی کیس میں انکوائری آفیسر یا تفتیشی افسر کی حیثیت استفسار کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ اس کیس کا آئی او عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ شاید اس کا نام ریاست خان یا لیاقت خان تھا۔ بہر حال آسانی کے لیے اس کا نام ”خان صاحب“ فرض کر لیتے ہیں۔

”خان صاحب!“ میں نے سوالات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟“

”پولیس کے روزنامے کے مطابق یہ اطلاع وقوعہ کی رات یعنی پندرہ دسمبر کی رات سوا گیارہ بجے دی گئی تھی۔“ آئی او نے جواب دینے والا مظلومہ کا بھائی شاہد علی تھا جو اتفاق سے جائے وقوعہ پر پہنچا تھا اور وہاں بے حیائی اور آبروریزی کے مناظر دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس نے ملزم کو زور و کوب بھی کیا تھا۔ اگر وہ اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھتا تو شاید ملزم اس کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر جاتا۔ بہر حال، اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تھانے فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔“

آئی او کالے بھینسے کی حمایت سے فارغ ہوا تو میں نے پوچھا۔ ”آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟“  
 ”ساڑھے گیارہ بجے۔“

”یعنی اطلاع ملنے کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد.....“  
 میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو بالکل یقین نہیں آ رہا۔“



کرنے کے لیے رکھا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔  
 ”طبی معائنے نے اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی  
 کی تصدیق کی ہے۔“

میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ”مظلومہ کے طبی  
 معائنے سے اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی ہی  
 تصدیق ہوئی ہے یا یہ بھی پتا چلا ہے کہ اسے جبرمانہ حملے کا  
 نشانہ بنانے والا میرا موکل خالد حسین تھا؟“

”جناب! طبی معائنے کی رپورٹ سے یہ کیسے پتا  
 چل سکتا ہے؟“ وہ ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”اس امر کا پتا چلانے کے لیے آپ کو مبینہ حملہ آور کا  
 طبی معائنہ بھی کرانا چاہیے تھا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے  
 میں کہا۔ ”کیا آپ نے ملزم خالد حسین کا طبی معائنہ کرانے  
 کی زحمت گوارا کی تھی؟“

”ہم نے اس کی..... ضرورت محسوس نہیں..... کی۔ وہ  
 زروں ہو گیا۔“

”کیوں..... کیوں ضرورت محسوس نہیں کی؟“ میں  
 نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”جبکہ یہ نہایت  
 ہی اہم تھا۔“

”مظلومہ نے آنسوؤں کی لڑیاں پروتے ہوئے  
 ہمیں بتایا تھا کہ ملزم نے اسے وحشیانہ عمل سے گزارا  
 ہے.....“ وہ نکتہ بازی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”حالات و  
 واقعات بھی انہی امور کی نشاندہی کر رہے تھے۔ موقع کے  
 گواہان کے بیانات بھی اسی جانب اشارہ کر رہے تھے۔  
 اتنے شواہد کی موجودگی میں ملزم کے طبی معائنے کی ضرورت  
 محسوس نہیں کی گئی.....“

آئی او کی اہمیت و وضاحت پر میں نے کوئی خاص توجہ  
 نہیں دی اور روئے سخن سچ کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! استغاثہ کی پھرتیوں میں بہت سے سقم  
 پائے جاتے ہیں جیسا کہ ابھی ملزم کے طبی معائنے کا ذکر ہوا۔  
 اگر مظلومہ کا طبی معائنہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ جبرمانہ حملے سے  
 گزری ہے یا اسے مذکورہ حملے سے گزارا گیا ہے تو اس سے یہ  
 کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ جبرمانہ حملے کا ارتکاب کرنے والا میرا  
 موکل ہی تھا۔ اس امر کی تصدیق کے لیے ملزم کا طبی معائنہ کرانا  
 بھی ضروری تھا بہر حال، میری معزز عدالت سے استدعا ہے  
 کہ آئندہ پیشی پر اس کیس کی مبینہ مظلومہ کھلید کو عدالت میں  
 پیش کرنے کے لیے استغاثہ کو پابند کیا جائے۔ میں آگلی پیشی پر  
 دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنا چاہتا ہوں۔“

وکیل استغاثہ نے چونک کر میری جانب دیکھا جیسے

میں ابھی کسی تھیلے میں سے کوئی خطرناک کوبرا نکال کر  
 عدالت کے فرش پر چھوڑ دوں گا۔ میں نے وکیل استغاثہ کی  
 حیرت اور ابھمن کو جوڑنے کی لڑک پر مارا اور سچ سے مخاطب  
 ہوتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا.....!“  
 اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ سچ نے  
 اگلی تاریخ دے کر عدالت برناست کر دی۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کھبرے میں  
 اس کیس کی مبینہ شاہدہ کھلید کوشی تھی۔ اس کی عمر پچیس سے  
 زیادہ نظر نہیں آتی تھی۔ اس ذمیت کے جبرمانہ حملوں کا نشانہ  
 بننے والی لڑکیاں اور عورتیں عمدتاً اپنا بیان تحریری شکل میں دائر  
 کراتی ہیں۔ وہ جس قیامت سے گزر چکی ہوتی ہیں اس کے  
 اثرات انہیں لب کشائی کی اجازت نہیں دیتے لیکن کھلید نے  
 جس بہادری اور سہے باکی سے اپنا حقیقی بیان ریکارڈ کرایا تھا  
 اس سے اس کے کردار کی قلبی کھلی تھی۔ بہر حال اس طرح تو  
 ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں.....!

کھلید نے موسم کی مناسبت سے لان کا ایک خوش نما  
 اور دیدہ زیب سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ بھرے بھرے بدن  
 کی مالک ایک حسین عورت تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک  
 خاص نوعیت کی چمک پائی جاتی تھی۔ اس نے اپنے بال  
 جدید انداز میں ترشوار کئے تھے جنہوں نے اس کی کشش  
 میں چار چاند لگا دیے تھے۔ انہی بالوں کی نمائش اور رونمائی  
 کے لیے اس نے دوپٹے کو سر کے بجائے گلے میں ڈال رکھا  
 تھا۔ اس تمام آرائش و زیبائش اور فیشن کا اسے حق تھا لیکن  
 وہ جس معاملے کی سماعت کے لیے عدالت میں پیش ہوئی تھی  
 اس میں احتیاط کی ضرورت تھی۔

وکیل استغاثہ نے منظر ہی جرح کے بعد اسے فارغ  
 کیا تو میں سوال و جواب کے لیے اس کے پاس چلا گیا۔ میں  
 نے بڑے منفرد انداز میں اپنے کام کا آغاز کیا۔

”کھلید صاحبہ! مجھے پتا چلا ہے کہ ملزم آپ کو بری نگاہ  
 سے دیکھا کرتا تھا؟“

”جی..... آپ کو نکل ٹھیک پتا چلا ہے۔“ وہ نفرت  
 بھری نظر سے میرے موکل کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میرا تو  
 جی چاہتا تھا اس کی آنکھیں نکال لوں۔“

”پھر آپ نے ملزم کی نازیبا حرکتوں کے بارے میں  
 اپنے شوہر کو نہیں بتایا تھا؟“ میں نے مظلومہ سے ہمدردی کا  
 عمل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔



بولی۔ "دستک کے جواب میں، میں نے دروازہ کھولا تو یہ سامنے کھڑا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں ایک دیکھا اٹھا رکھا تھا۔ میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔  
"کیا بات ہے؟"

"بائی! میرا فریج صبح سے خراب ہے۔" یہ لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔ "اس دیکھے میں گوشت ہے۔ اگر آپ اسے فریڈر میں رکھ دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔"  
"منظور حسین نے اپنے گھر میں ایک چھوٹا ڈیپ فریڈر بھی رکھا ہوا ہے جو اس کے کاروبار کی ضرورت ہے۔ لکے، کہاں اور پونی کا جو تیار مال بیچ جاتا ہے اسے محفوظ

"نہیں....." اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔  
"میں نے اسے اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کی تھی۔"  
"آپ کی کوشش کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟"

"اس نے میری شرافت کو کمزوری جانا اور کہنے لگی پر اتر آیا۔" وہ طوم کو گھورتے ہوئے بولی۔ "اس نے جب دیکھا کہ میں اس کے ہاتھ نہیں آ رہی تو اس نے منظور حسین کو میرے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ اس نے میری ذات کے حوالے سے ایسی کچھ اچھالی کہ مجھے بتاتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔"

"منظور حسین کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر کتنی شرم آ رہی تھی اس کا مجھے یہ خوبی اندازہ تھا تاہم میں نے "شرع اور شرم" کے معاملات کو بیچ کیے بغیر اس سے کہا۔  
"کھلیے صاحب! جب آپ کو پتا چل گیا تھا کہ طوم اچھے کردار اور اچھی نیت کا مالک نہیں تو پھر آپ کو اسے زیادہ منہ نہیں لگانا چاہیے تھا۔"

"میں اسے کب منہ لگاتی تھی.....!" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"دوقہ کی رات....." میں نے جرح کے سلسلے کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ "آپ طوم کو بلا کر اپنے گھر لے گئی تھیں۔ آپ کو اپنا فریج کھسکا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا تھا۔"

"برگزر نہیں۔" وہ قناعت سے گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "یہ کہانی اسی مکار شخص کی گھڑی ہوئی ہے۔ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔"

"ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔" میں نے پرخیاں انداز میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے، آپ فریج کو کھسکانے کے لیے طوم کو اپنے گھر بلا کر نہیں لائی تھیں؟"  
"جی نہیں!" اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"پھر یہ شخص آپ کے گھر کے اندر کیسے پہنچا؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "پولیس نے اسے آپ کے گھر میں سے گرفتار کیا تھا؟"

"جی ہاں، پولیس نے اسے میرے گھر کے اندر سے گرفتار کیا تھا۔" وہ سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "اور جس تک اس کے گھر میں داخلے کا سوال ہے تو میں یہی کہوں گی کہ میں اس کی جال میں آ گئی تھی۔"

"جال میں آ گئی تھی..... کیا مطلب؟"  
"یہ لگ بھگ ساڑھے دس بجے میرے دروازے پر آیا تھا۔" وہ بڑے اعتماد سے وضاحت کرتے ہوئے

تاریخین مستوحہ ہوں

پچھلے

نہیں

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ ہر چاندلنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

- ☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر پرچا دستیاب ہو۔
- ☆ شہر اور ضلع کے نام۔
- ☆ مکن ہوٹل بک اسٹال، PTCL، موبائل فون نمبر۔

رابطہ اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

63-ف ۱۱۱ سٹیشن ڈسٹری بیوٹرز، اترالی میں کرنل روزگار علی

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com



ہو۔ تم لوگ منظور حسین جیسے اکیلے یوزروں کو شکار کرتے ہو۔ ایسے یوزر جسے جن کے پاس اپنی جائداد وغیرہ ہو۔ یہی تمہارا دھندا ہے۔ طرم کہاب میں ہڈی بن رہا تھا اس لیے تم نے اسے اپنی راہ کا کاٹنا سمجھ کر ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں ملوث کر دیا تا کہ سند ہے پاس اور نہ ہے پاس سبھی بانسری.....!"

ٹھیکہ ہکا بکا مجھے دیکھے۔ پلے جا رہی تھی۔ اس کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کہے۔ اس موقع پر وکیل استغاثہ اس کی مدد کو لگا۔ وہ تیز آواز میں چلایا۔

"آئی بی جیکشن پور آؤ..... میرے فاضل دوست انٹی سیدھی ہاتوں سے مظلومہ کو ہر سانس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔"

"انٹی سیدھی ہاتوں!" میں نے جلالی انداز میں کہا۔

"میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں بڑی احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ میں نے مظلومہ ٹھیکہ پر اچھی خاصی دیر سچ کی ہے۔"

وکیل استغاثہ نے طنز پر لہجے میں کہا۔ "ابھی آپ نے مظلومہ پر جو کچھ اچھالنے کی کوشش کی ہے اس سلسلے میں آپ کے پاس کوئی ثبوت بھی ہے؟"

"بہت مضبوط ثبوت، ہیں میرے پاس۔" میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارے، ہوئے کہا۔ "وقت آنے پر وہ ثبوت عدالت میں پیش کر دیے جائیں گے۔"

"وقت تو آیا ہوا ہے میرے فاضل دوست!" وکیل استغاثہ نے مجھ پر چوٹ کی۔ "عدالت زبانی کلامی دعووں پر ٹکیہ نہیں کرتی۔ اگر آپ کے پاس مظلومہ کے خلاف اس نوعیت کے کوئی ثبوت ہے۔ سامنے لائیں۔"

بچ بڑی توجہ اور دلچسپی سے ہماری نوک جھوک ملاحظہ کر رہا تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ میرے پوائنٹ آف ویو، اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ جب ثبوت کے حوالے سے وکیل استغاثہ نے مجھ پر دباؤ ڈالا تو بچ نے مجھ سے کہا۔

"بیگ صاحب! آپ مظلومہ پر اپنی جرح جاری رکھیں.....!"

"ٹھیکہ بیگم!" میں دوبارہ مظلومہ کی جانب متوجہ ہو گیا اور خامسے جا رہا تھا انداز میں سوال کیا۔ "کیا یہ درست ہے کہ قوع سے صرف چھ ماہ پہلے تم نے منظور حسین نامی ایک یوزر سے شخص سے شادی کی تھی؟"

اس نے اٹھاتے میں گردن ہلا دی۔

میں نے پوچھا۔ "تم ایک خوب صورت اور جوان

کرنے کے لیے ڈیپ فریزر میں ڈال دیا جاتا ہے۔ پتا نہیں، کیا ہوا کہ ان لحاظ میں مجھے طرم پر ترس آ گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس نے مجھے "ہانسی" کہہ کر مخاطب کیا تھا اور وہ بھی بڑی تیز اور شرافت کے ساتھ۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں ہوس کا شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا۔" لکھائی توقف کے بعد اس نے اضافہ کیا۔

"میں نے اس کے ہاتھ سے گوشت والا دیکھ لے لیا۔ میری غلطی کہ میں گھر کا بیرونی دروازہ بند کرنا بھول گئی۔ جب میں دیکھے کہ فریزر میں رکھنے کے بعد چلی تو مجھے عجیب سا محسوس ہوا تاہم میں اندازہ نہیں لگا سکی کہ وہ عجیب کیا ہے۔ میں نے جلدی سے جا کر دروازہ بند کیا اور اپنے بیڈروم میں آ گئی۔ اسی وقت لائٹ چلی گئی پھر مجھے کچھ بھی سوچتے سمجھنے کی مہلت نہ مل سکی۔ کمرے میں اندھیرا ہوتے ہی کسی وحشی مرد نے مجھے اپنی آغوش میں دبوچ لیا۔ میں اپنی بے بسی پر چیخنے چلانے لگی مگر اس پر جیسے شیطان سوار تھا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے مجھے روند ڈالا۔ میں پامال ہو کر رہ گئی۔ اس جنونی نے میری عزت کو تار تار کر دیا....." ہلکی سی سسکاری پر وہ خاموش ہو گئی۔

میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ "آپ کو تاریکی میں یہ کیسے پتا چلا کہ آپ کے ساتھ سپینڈ ز یادتی کا ارتکاب کرنے والا اس کیس کا طرم اور میرا موکل خالد حسین ہی تھا؟"

"میں نے اس کی چالاکی بہت بعد میں سمجھی تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "جب میں اس سے گوشت والا دیکھ لے کر اندر آئی تو یہ بھی وہی قدموں میرے گھر کے اندر داخل ہو گیا تھا پھر مجھے محسوس کرائے پھر یہ بیڈروم میں پہنچ گیا اور جب میں بیڈروم میں داخل ہوئی تو اس نے لائٹ آف کر دی۔ میں یہی سمجھا کہ لائٹ چلی گئی ہے۔ وہ تو جب شاہد بھائی آئے اور انہوں نے میری جینز سن کر لائٹ آن کی تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو گیا....."

"جسہیں جھوٹ بولتے ہوئے ذرا سی بھی شرم نہیں آ رہی؟" میں نے درشت لہجے میں استفسار کیا۔

میرے اچانک بدلتے ہوئے انداز اور طرز تکلم کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں، بکھری ہوئی آواز میں بولی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تم اور تمہارا شاہد بھائی بہت بڑا ڈراما



☆ ایک اسکول میں زسری کی کچھ دوستوں نے بچے کو جوتا پہنارہی تھی۔ جھکے جھکے اس کی کمر بھی درد کر رہی تھی۔ بیسواں بچہ ذرا شرمیلا اور خاموش مسخ تھا۔ جب اسٹانی جوتا پہناتھی تو وہ بڑے سکون سے بولا۔ ”مس خانی یہ جوتے میرے نہیں ہیں۔ اسٹانی کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے مگر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے جوتا اتارا ہی تھا کہ بچہ بولا۔ ”یہ جوتے میرے بھائی کے ہیں، آج امی نے کہا تھا کہ تم پہن دو۔“

مرسلہ: رحیلہ رحمان، سحرات

ہوئے بولی۔ ”سپائی وہی ہے جو میں نے بیان کی ہے۔“  
 ”او کے.....!“ میں نے مصمت آمیز انداز میں کہا  
 پھر تیز لہجے میں دریافت کیا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ آپ ایک بیوہ عورت ہو..... میرا مطلب ہے، منظور حسین سے شادی سے پہلے بیوہ تھیں؟“  
 ”جی..... یہ سچ ہے۔“ اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

”کیا میں آپ کے مرحوم شوہر کا نام جان سکتا ہوں؟“  
 وہ جربز ہوتے ہوئے بولی۔ ”اس کی کیا ضرورت ہے؟“  
 ”اشد ضرورت ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم زبان نہیں کھولو گی تو مجبوراً مجھے زبان کھولنا پڑے گی۔“  
 ”پھر آپ ہی زبان کھولے رکھیں۔“ وہ خالص عورتوں والے چڑچڑ سے پن سے بولا۔ ”اب تک بھی تو آپ ہی بولے جا رہے ہیں۔ ہم عورتیں تو خواہوا بولنے کے معاملے میں بدنام ہیں۔“

”حنیف خان.....!“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تمہارے سابق شوہر کا نام حنیف خان تھا۔ حنیف خان کا تعلق پاک کالونی سے تھا۔ وہ وہاں جنرل اسٹور چلا تا تھا اور ذاتی مکان کا مالک بھی تھا۔ تمہاری حنیف خان سے شادی کوئی ایک سال تک رہی پھر وہ ایک رات اچانک خالق حقیقی سے جا ملا۔ حنیف خان کا کوئی آگے بچھے نہیں تھا لہذا اس کا گھر اور جنرل اسٹور بیچ کر تم اور شاہد علی اعظم بسحق شفٹ ہو گئے۔ کسی نئے بوڑھے تن تہا ذکار کی تلاش میں۔ اس بار تم لوگوں کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی اور جلد ہی منظور حسین تمہاری نظر میں آ گیا۔ اگر یہ کیس عدالت تک نہ پہنچتا تو ایک روز بے چارہ منظور حسین بھی بے بسی کی موت مارا جاتا اور تم لوگ ان کا مکان فروخت کرے، کسی نئی گھر پر روانہ

عورت ہو۔ تمہیں ایک سے ایک رشتہ مل سکتا تھا پھر منظور حسین ہی کیوں؟“  
 ”آج کل پورا آرزو۔“ وہ کیلی استکانہ نے مظلومہ کی حمایت میں کہا۔ ”دیکھ صفائی حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ اس سوال کی کوئی تک نہیں بنتی کہ جوان مظلومہ نے بوڑھے منظور حسین سے کیوں شادی کی۔ کوئی کسی بھی عمر میں کسی سے بھی شادی کر سکتا ہے۔“

”تک بنتی ہے اس سوال کی اور میں اسے بھری عدالت میں سمیت بھی کر دوں گا۔“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا پھر دوئے سخن سچ کھا جانب موڑتے ہوئے اضافہ کیا۔  
 ”جناب عالی! معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ جب تک میں مظلومہ شکیلہ پر اپنی جرح مکمل نہیں کر لیتا، مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ حقیقت کی اصل شکل تک پہنچنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ میں مظلومہ کا اصل روپ عدالت کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔“  
 ”آپ اپنی جرح جاری رکھیں۔“ جج نے ہماری محکم آواز میں کہا۔  
 میں مظلومہ کی جانب بڑھ گیا۔ ”شکیلہ بیگم! میرے سوال کا جواب دو۔“

”یہ شادی شاہد بھائی کی مرضی سے ہوئی تھی۔“ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ہراساں لہجے میں بولی۔ ”شاہد بھائی اکثر منظور حسین کی دکان سے کتے کباب لایا کرتے تھے۔ ان میں اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ بھائی میری شادی کے لیے بھی فکر مند رہتے تھے۔ جب انہوں نے میرے سامنے منظور حسین کا رشتہ رکھا تو میں انکار نہ کر سکی۔ اس طرح یہ شادی ہو گئی۔“

”جبکہ حقیقت یہ ہے کہ شاہد علی نے منظور حسین کو شکار کرنے کے لیے تمہیں آگے بڑھایا تھا۔“ میں نے طنز سے انداز میں کہا۔ ”شاہد نے منظور حسین کے بارے میں اپنی ریسرچ مکمل کرنے کے بعد ہی تمہیں آگے بڑھایا تھا۔ تم ہی منظور حسین کے پاس کتے کباب لینے جا کر کرتی تھیں اور منظور سے بیٹھی بیٹھی باتوں کے علاوہ اپنی بیوی کا رونا بھی روتی رہتی تھیں۔ رفتہ رفتہ منظور حسین کے دل میں تمہارے لیے اہم روی کے جذبات پیدا ہو گئے پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ اہم روی گہری ”ذہنی ہم آہنگی“ میں بدل گئی اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد تم دونوں کی شادی ہو گئی۔“

”آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں اس کا حقیقت سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں۔“ وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے



”بیگ صاحب! عدالت آپ سے اس بات کی وضاحت چاہتی ہے کہ آپ نے کس بنا پر یہ کہا ہے کہ مظلوم ٹکلیہ کبھی بیوہ ہوئی ہی نہیں؟“

”جناب عالی!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”جس عورت کا پہلا شوہر بہ قید حیات ہو، اس نے بھی بیوی کو طلاق دی ہو اور نہ ہی کبھی بیوی نہ خلع لی ہو، ایسی عورت نہ تو مطلقہ اور نہ ہی بیوہ کہلا سکتی ہے۔ میں یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ مظلوم ٹکلیہ کا پہلا شوہر زندہ ہے اور اس کے بہت قریب ہے۔“

”کون ہے وہ شخص؟“ بیج نے سرسراہٹ سے کہا۔

”میں استفسار کیا۔“

”شاہد علی.....!“ میں نے سسنی خیر لہجے میں انکشاف کیا۔

”مگر وہ تو مظلوم کا بھائی ہے؟“ بیج کی حیرت دو چند ہوئی۔

”نہیں جناب عالی!“ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ ان لوگوں کی ملی بھگت ہے۔ ان پر تو بہت سی شاییں صادق آتی ہیں۔“

ایک مرتبہ پھر عدالت میں مخصوص جھنجھٹاٹھ کا شور اٹھا۔ بیج کو اپنا مخصوص ہتھوڑا استعمال کر کے خاموشی کو واپس بلانا پڑا۔ جب حالات معمول پر آگئے تو بیج نے مجھ سے پوچھا۔

”بیگ صاحب! آپ کس بنا پر اتنا بڑا دعویٰ کر رہے ہیں کہ ٹکلیہ شاہد علی کی بیوی ہے؟“

”ہاتھ کلن کو آرتا کیا ہے، پڑھے لکھے کو قاری کیا ہے۔“ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”آپ میرے دعوے پر نہ جائیں۔ میں معزز عدالت کو لیاقت آباد المعروف لالو کھیت کا وہ ایڈریس نوٹ کراتا ہوں جہاں چند سال پہلے ان کی شادی ہوئی تھی۔ ان کے پرانے پڑوسی جی جان سے میرے دعوے کی تصدیق کریں گے۔“

”یہ کیا بکواس ہے.....؟“ وکیل استفسار کی غصیلی آواز ابھری۔

میں نے بڑے جس سے جواب دیا۔ ”یہ بکواس نہیں میرے فاضل دوست یادداشتیہ دیوار ہے۔“

بیج کی آواز ابھری۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔ ”بیگ صاحب! آپ لیاقت آباد والا ایڈریس متعلقہ عدالتی عملے کو نوٹ کرا دیں۔ عدالت اس امر کی تصدیق کرے گی۔“ پھر وہ براہ راست وٹس باکس میں کھڑی ٹکلیہ سے مستفسر ہوا۔

”تم اس بارے میں کیا کہتی ہو.....؟“

ہو جاتے لیکن.....“ میں نے لگائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا۔ یہ کیس جس بیگانہ انجام کو پہنچنے والا ہے اس کے بعد منظور حسین کو تم سے شدید نفرت ہو جائے گی۔ ایک طرف تو یہ عدالت دروغ گوئی کی پاداش میں تمہیں کچھ عرصے کے لیے جیل بھیج دے گی، دوسری جانب منظور حسین تمہیں پہلی فرصت میں طلاق دے دے گا اور اس کیس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ میرا موکل تم پر جب عزت کا مقدمہ بھی کرے گا.....؟“

”ایسا کچھ بھی نہیں ہونے والا۔“ وہ ہاتھ مچا کر بولی تاہم اس کی بات میں زیادہ دم نہیں تھا۔ ”عدالت دونوں طرف کے حقائق کو جاننے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرتی ہے اور..... مجھے یقین ہے فیصلہ اس کیس کا میرے ہی حق میں ہوگا۔“

وہ چند لمحات کے لیے تھکی، ایک افسردہ سی سانس خارج کی پھر بڑے جذباتی لہجے میں بولی۔ ”حنیف خان میرا شوہر تھا۔ اس کی موت کا سبب دل کا دورہ تھا۔ حنیف خان کی موت کے بعد میں بیوہ ہوئی تھی۔ اب میرا پاک کالونی میں رہنے کو دل نہیں چاہتا تھا چنانچہ ہم نے وہ گھر اور اسٹور فروخت کر دیا پھر اعظم بستی میں منتقل ہو گئے۔ آپ خواہ مخواہ اپنی دکالت کے زور پر مجھے ایک فراڈ اور بدکردار عورت ثابت کرنے پر تے ہوئے ہیں۔“

”میں نہیں ٹکلیہ میڈم..... حالات و واقعات تمہیں اور تمہارے شاہد بھائی کو ایک خطرناک سنڈکیٹ ثابت کر رہے ہیں۔“ میں نے بہ آواز بلند کہا پھر روئے سخن بیج کی جانب پھیرتے ہوئے اضافہ کیا۔

”جناب عالی! معزز عدالت کو یہ جان کر یقیناً سخت حیرت ہوگی کہ مظلوم، متاثرہ ٹکلیہ بیگم کبھی بیوہ ہوئی ہی نہیں.....“

میرے اس انکشاف پر عدالت میں ایک شور مچا۔ حاضرین عدالت آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ سب کی نظریں مجھی پر لگی ہوئی تھیں جیسے میں نے کوئی انہونی کہہ دی ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے عدالت کا کراچھلی بازار کا منظر پیش کرنے لگا۔

”آرڈر..... آرڈر.....!“ بیج کی تھکسانہ آواز ابھری۔ ”عدالت کے وقار کا خیال رکھا جائے۔“

عدالت کے کمرے میں بیج کے ”آرڈر“ کے ساتھ ہی گہری خاموشی چھا گئی۔ اسی دبیز خاموشی میں بیج کی دینگ آواز ابھری۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔



وہ کنبہ کی ریٹنگ کو مضبوطی سے تھامے ہوئے بولی۔ ”وکیل صاحب جھوٹ بول رہے ہیں۔ شاہد علی میرے بھائی ہیں۔“ پھر وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔  
 ”یا اللہ! اس جھوٹے وکیل پر تو اپنا قہر نازل فرما۔ یہ مجھے شریف عورت پر کتنے گندے گندے الزام لگا رہا ہے۔ پروردگار! اپنے خلاف ایسی باتیں سننے سے پہلے مجھے موت کیوں نہ آگئی.....“ پھر اس نے باقاعدہ سسکیاں لے کر روتا شروع کر دیا۔

مجھے ٹھیکہ کی ہمت اور ڈھٹائی پر سخت حیرت ہوئی جو سب کچھ اوپرین ہو جانے کے باوجود بھی اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹی ہوئی تھی۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو اب تک کنبہ کے فرش پر ڈیرا بھاگی ہوتی۔

میں نے جج کے حکم کے مطابق لیاقت آباد والے اس گھر کا ایڈریس نوٹ کر لیا جہاں ٹھیکہ اور شاہد علی کی شادی ہوئی تھی۔ یہ میری انتھک محنت اور ریسرچ کا ثمر تھا۔ اس سلسلے میں خالد حسین کے دوست سلطان نے بھی میری بھرپور مدد کی تھی۔ وہ خالد کا سچا اور قطعی دوست تھا۔

”جناب عالی!“ میں نے پُر اعتماد لہجے میں جج کو مخاطب کیا۔ ”حقیقت یہ ہے کہ مظلوم ٹھیکہ اور شاہد علی بنیادی طور پر بھرتا ذہنیت کے حامل ہیں۔ اتفاق سے ان کے ملاپ نے ان کی ذہنی صلاحیتوں کو جلا بخشی اور انہوں نے ایک خطرناک منصوبے کے تحت خود کو بھائی بہن ظاہر کر کے تنہا مالدار بوزخوں کا شکار شروع کر دیا۔ حنیف خان ان کا پہلا نشانہ تھا اور منظور حسین دوسرا لیکن کل اس کے کہ منظور حسین کسی رات زندگی کی بازی ہار جاتا، طرم کا معاملہ بیچ میں آگیا۔ اگر طرم ان کی کھوج میں لگ جاتا تو ان کا بنا بنا یا کھیل خراب ہو سکتا تھا لہذا انہوں نے پہلی فرصت میں طرم کو اپنی راہ سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ طرم کو بھرتا نہ حیا کے کیس میں ملوث کرنے کے لیے ایک جامع منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس روز شاہد، ٹھیکہ کے گھر کے اندر موجود تھا۔

ان دونوں نے میاں بیوی کی حیثیت سے آپس میں مخصوص ”ملاپ“ کیا پھر منصوبے کے مطابق ٹھیکہ فریج کھکانے کے بھانے طرم کو اپنے گھر بلا لائی اور اسے بھانے سے بیزارم میں روک لیا۔ شاہد علی نے منصوبے کو فائل بیچ دینے کے لیے لائسنس آف کر دی، اس کے بعد منظور حسین کے گھر کے اندر جو ڈراما رچایا گیا اسے بھنے کے لیے کسی خاص عمل کی ضرورت نہیں لہذا میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ.....“ میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمبائی توقف

کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔  
 ”آئندہ پیشی پر مظلوم کے اصلی شوہر شاہد علی عرف ”شاہد بھائی“ کو بھی عدالت میں پیش کرنے کے احکامات صادر کیے جائیں تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ دیکھا جاسکے۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی اگلی پیشی پر اپنے موکل کی بے گناہی کو ثابت کرنے کے لیے ایک ایسی شخصیت کو عدالت میں حاضر کروں گا جس کا بیان طرم کی بے گناہی پر مہر تصدیق ثبت کر دے گا اور یہاں تک اس عورت کے کردار کا تعلق ہے.....“ میں نے ڈپٹی پابکس میں کھڑی ٹھیکہ کی جانب اشارہ کیا، پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”اس عورت نے اب تک اتنے زیادہ شرعی اور اخلاقی جرائم کا ارتکاب کر لیا ہے کہ اس کی باقی عمر جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے ہی گزرے گی۔ اللہ کی پناہ..... اس کا شوہر زندہ ہے اور یہ حنیف خان کو لوٹنے کے لیے اس سے شادی کر لیتی ہے پھر کچھ عرصے بعد اس کی بیوہ بن جاتی ہے۔ اپنے اصلی شوہر کے ساتھ ازدواجی تعلقات بھی قائم ہیں اور اس کے ساتھ ہی بیوگی کا سونگ بھی جاری ہے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ منظور حسین سے نکاح کر لیتی ہے..... نکاح بر نکاح اور نکاح اور نکاح..... یہ تو یہ حاسادہ حدود آرومی نہیں کا کیس ہے۔ اس حرام کاری پر تو مظلوم ٹھیکہ کو سزا عام سزا کی سزا سنائی جانا چاہیے.....“

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر ٹھیکہ تورا کر دھرام سے کنبہ کے فرش پر گر گئی اور گہری گہری سانس لینے لگی۔ متفقہ عدالتی عملے کے افراد اسے سنبھالنے کے لیے آگے بڑھے۔ میرے بے درے نفلوں نے ٹھیکہ کے اعصاب کا پکڑ مر کال دیا تھا۔ برداشت اور ڈھٹائی کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ یہ اس کی شکست کا کھلا ثبوت تھا۔

میں نے روئے سخن جج کی طرف پھیرتے ہوئے فاتحانہ انداز میں کہا۔ ”یور آئر! اس مقدمے کا فیصلہ ہو چکا۔ معزز عدالت سے میری پرزور استدعا ہے کہ میرے نوٹ کرائے گئے ایڈریس کی تحقیق اور تفتیش کے ساتھ ہی مظلوم ٹھیکہ اور اس کے بے غیرت شوہر شاہد علی کو بھی شامل تفتیش کر کے حقائق تک رسائی حاصل کرنے کا کوشش کی جائے۔ مجھے امید ہے کہ یہ میاں بیوی اب دروغ گوئی سے کام نہیں لے سکیں گے۔“

جج نے میرے حسبِ مشا انکو آری آفیسر کو ہدایات جاری کیں اور وہ دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت



برخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔

”دی کورٹ از ایڈ جرنل.....!“

☆☆☆

آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل خالد حسین کو اس کیس سے باعزت بری کر دیا۔ ٹھیکہ اور اس کے شوہر شاہد علی کو جب پولیس نے کڑی تفتیش سے گزارا تو انہوں نے فرش پر ناک سے لکیریں لگاتے ہوئے اپنے ایک ایک اگلے پچھلے جرم کا اقرار کر لیا۔ ان کے اقبالی بیانات کے بعد میرے موکل کی بے گناہی میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

خالد حسین کی رہائی کے تین روز بعد وہ مشائی کے ساتھ باجماعت مجھ سے ملنے آیا۔ باجماعت سے مراد یہ ہے کہ اس کے ساتھ سلطان اور صدیق بھی تھے۔ خالد حسین ایک نئی زندگی مل جانے پر بے حد خوش تھا۔ اس نے مجھے مشائی پیش کرتے ہوئے تشکرانہ انداز میں کہا۔

”وکیل صاحب! میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔“

فرط جذبات سے اس کی آواز جھکی ہوئی تھی۔ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”جسبیں سب سے زیادہ احسان مند صدیق صاحب کا ہونا چاہیے۔ اگر یہ تمہاری پشت پناہی نہ کرتے تو وہ ڈائن ٹھیکہ تو تمہیں کھا ہی گئی تھی۔“

”صدیق صاحب تو میرے لیے باپ کی حیثیت رکھتے ہیں وکیل صاحب۔“ وہ عقیدت بھرے انداز میں اپنے سینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”دیے یہ آپ نے ٹھیک ہی کہا ہے..... ٹھیکہ کسی ڈائن سے کم نہیں۔“

”خوش ہو جاؤ کہ اب وہ مکار تمہارے آس پاس کبھی دکھائی نہیں دے گی۔“ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”ان دونوں کے اقبال جرم کے بعد اب کافی عرصے کے لیے ان کا ٹھکانا جیل ہے۔ منظور حسین میری معلومات کے مطابق ٹھیکہ کو طلاق دے چکا ہے لہذا وہ اس کی زندگی سے بھی نکل چکی ہے۔“

”یہ سب آپ کی خوش اور مہربانی سے ممکن ہوا ہے وکیل صاحب!“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ”لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی!“

”کون سی بات؟“ میں نے دریافت کیا۔ ”آپ نے بھری عدالت میں ٹھیکہ کے سابق کالے کرتوتوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے جج صاحب سے کہا تھا

کہ آئندہ پیشی پر آپ ایک ایسی شخصیت کو عدالت میں حاضر کریں گے جس کا بیان میری بے گناہی پر مہر تصدیق ثابت کر دے گا۔ وہ شخصیت کون ہے؟“

”ارے ہار..... وہ تو میں نے ایسے ہی ٹھیکہ کو دہاؤ میں لانے کے لیے کہہ دیا تھا۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”بعض اوقات اس قسم کے داؤ بیچ کا استعمال بھی کرنا پڑتا ہے۔“

وہ مطمئن ہو گیا۔

وہ تینوں تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔

رات کو صدیق صاحب کا فون آ گیا۔ رکی علیک سٹیک کے بعد انہوں نے دستا نہ انداز میں کہا۔ ”بیگ صاحب! میں جانتا ہوں، وہ کون سی شخصیت ہے جسے آپ خالد حسین کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے عدالت میں پیش کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔“

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے پوچھا۔

”ہاں میں، کون ہے؟“

”خالد حسین کی سابق اور اکرام اللہ کی موجودہ بیوی۔“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”میرا اشارہ ٹھیکہ کی طرف ہے۔“

”آپ کا اشارہ درست سمت میں ہے۔“ میں نے کہا۔

صدیق صاحب نے پوچھا۔ ”کیا آپ واقعی ٹھیکہ کو عدالت تک لے آتے؟“

”جب“ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن“ والی صورت حال ہو تو کسی معصوم کی زندگی بچانے کے لیے ایسا زہریلا گھونٹ بھی پینا پڑتا ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر اس دیمک صفت ٹھیکہ کو اس بات کا علم ہوتا کہ خالد حسین کے اندر جرمانہ حملہ کرنے کی صلاحیت ہی موجود نہیں تو وہ ایسی حماقت برگز نہ کرتی۔ جس

اللہ کے بندے کے گھر میں، اس کی آنکھوں کے سامنے پورے پانچ سال تک ہفت پکوان والا دسترخوان سجا رہے اور وہ وہاں سے ایک نوالہ بھی نہ اٹھا سکے تو جرمانہ حملے کا مرتکب کیوں کر ہو سکتا ہے؟“

”ایڈیڈ.....!“ صدیق صاحب نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”آپ ایک قابل اور عظیم وکیل ہیں۔“

”عظیم صرف خدا کی ذات ہے۔“ میں نے صدق دل سے کہا اور اودائی کلمات کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

(تحریر: حسلم بنت)



کوئی والٹروٹ باکس بن گیا۔ اس کے اس کیریئر کا  
 باسک کی تاریخ میں ریکارڈ نہیں ملتا۔ اس کے مخالفین کا  
 کہنا ہے کہ اس نے ریفری کے سر پر ہونٹ توڑ دی تھی  
 کیونکہ ریفری نے مخالف باکسر کو دائیوں سے کاٹنے کے

دینیات کے کالج سے نکل کر میکا کوئی رات  
 بیانیوں کا سیکرٹین بن گیا۔ وہ گھر گھر جا کر راتہ بجان  
 فروخت کرتا۔ یہ کام اسے اس لیے چھوڑنا پڑا کہ وہ مللی  
 مظاہرہ کرنے کی ناقابلِ تخییر عادت میں مبتلا تھا پھر میکا

حضرت انیسویں آبادات کے فوائد اور رسادات کا قصہ

خدا کی قدرت ہے کہ دماغ کی کارکردگی کا وجود نہہر ہلکے ثبوت انسان کے  
 عمل میں ہونے لگتا ہوتا ہے... ایسی ہی ایک صلاحیت کا اظہار اس نے بھی  
 کیا مگر اگلی ہی سوچ نے اسے ماحول کی تباہ کاریوں اور زندگی کی  
 ویرانیوں سے بچالیا اس کے باوجود ایک اذیت نے لحد تک اس کا ساتھ نہ  
 چھوڑا اور یہ سب... اس کے دماغ کی کارفرمائیاں ہی تھیں۔

## دہما کا خیز

ابوضیا اقبال



COPIED FROM WEB



بتائی۔ ”میں نے تین بکتر بند لڑیاں تہاہ کیں۔ ایک موقع پر  
میں نے صرف 63 سیکنڈ میں 77 بم پیچھے۔ یہ شاید عالمی  
ریکارڈ ہے۔“

”تو اسی دوران تمہارا ہاتھ زخمی ہوا ہوگا۔“ میں نے  
قیاس آرائی کی۔

میکا گوئی پریشان نظر آنے لگا لیکن بائیں ہاتھ سے  
میرا دیا ہوا پانچ ڈالر کا نوٹ جیب میں رکھنے کے بعد اس  
کی طبیعت بحال ہو گئی۔ سو ڈر خوش گوار ہو گیا۔ خوش گوار  
آرٹس موڈ..... میں آپ کو بتاؤں جب آرٹس آنکھیں  
مسکرائیں تو جو کس ہو جائے اور جب آرٹس قہقہہ سنا  
دے تو خود کو مسخ کر بیچے..... یا شراب کی ایک بوتل  
سے..... یا آگ بجھانے والے آلے سے۔ اس لیے کہ  
اس قہقہے کے بعد آپ کو ان دونوں میں سے کسی بھی چیز کی  
ضرورت پڑ سکتی ہے۔

”یہ تو.....“ اس نے کہا شروع کیا پھر میرا کوٹ  
بائیں ہاتھ سے تمام کر سر کوٹھی میں بولا۔ ”اپنی ماں کے سر کی  
قسم کھاؤ کہ جو کچھ میں تمہیں بتاؤں گا، تم وہ کسی کو نہیں بتاؤ  
گے۔“

میں نے کہا۔ ”بے لکر ہو، تمہارے معاملے میں  
میرے ہونٹ سلے رہیں گے۔“

”تم نے زبان کھولی تو مجھے تیس سال کی سزا ہو جائے  
گی۔“

”ارے بھائی..... میں کہاں کسی سے بات کرتا  
ہوں۔“

”تو ٹھیک ہے۔ سنو، تم جانتے ہو کہ مجھے ہمیشہ سے  
دھماکے کرنے کا شوق رہا ہے۔“

”مجھ سے زیادہ کون جانے گا یہ بات۔ تم نے ایک  
بار سائیکل پمپ میں ٹن پاؤں بھر کر میری کرسی کے نیچے رکھ  
دیا تھا۔ صرف دھماکے کے شوق میں۔“

”میری بات مت کاٹو، تمہیں معلوم ہے کہ میں خانہ  
جنگی کے زمانے میں ڈبلن شہر تھا۔ وہاں میری بن آئی تھی۔

میری پتلون کی جیب میں ریتا سے گھسی گئی نال والا اعشاریہ  
چار چار ہوتا تھا۔ ٹانگ کے ساتھ ایک ماؤزر بندھا ہوتا تھا  
اور بم..... بموں کی تو کوئی حد ہی نہیں تھی۔ ایک بار میں نے

ایک بم ٹھری بینڈ والے کی ٹھری میں ڈال دیا۔ اب میں  
تمہیں کیا بتاؤں، اس ٹھری کی آواز کا تم تصور نہیں  
کر سکتے..... ہا ہا۔“

اچانک میکا گوئی کو ایک جانا پہچانا... چہرہ نظر آ گیا۔

جرم میں اسے نالہ قرار دے دیا تھا۔ بہر کیف 1909ء  
میں وہ نیواڈا میں نمودار ہوا، جہاں وہ تانبے کی ایک کان  
میں کام کرتا تھا۔ وہاں اس کی صلاحیت کھل کر سامنے آئی  
یعنی دھماکا کرنے کی صلاحیت۔ اس نے آتش گیر مادے  
کو استعمال کرنا سیکھ لیا اور یہ کہ فورمین کے مکان کے  
صرف اگلے حصے کو اڑانے کے لیے مادے کو کس جگہ رکھنا  
چاہیے یا تیل کے ایک ڈرم میں سیاہ پاؤڈر بھر دیا جائے تو  
وہ کتنا نقصان پہنچا سکتا ہے۔

وہ اپنے ساتھ دھماکا خیز ماحول لیے پھرتا تھا۔ وہ  
خالص آرٹس تھا۔ اس کے چہرے پر کشیدگی چھائی رہتی۔  
اس کا مزاج روایتی آرٹس مزاج تھا یعنی وہ شاعری اور  
جنگجویی کا مرکب تھا۔ آرٹس مزاج کی علامت ڈیون  
اوٹینین ہے، جس نے جان ڈوفرنی پر چھپت کر اس کے  
وجود میں پانچ گولیاں اتارنے سے پہلے اپنی یوزمی ماں  
کو زلی کا گلاب نامی ٹیم سٹائی تھی اور جان ڈوفرنی وہ شخص  
ہے جو پریوں کے وجود پر یقین رکھتا تھا اور جس نے ایٹا  
کائف کو برف توڑنے والے سونے سے نقل کیا تھا۔ اس  
کے بعد اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ میکا گوئی آرٹس تھا۔

☆☆☆

جیسے ہی آئرلینڈ میں خانہ جنگی شروع ہوئی، میکا گوئی  
نے کچھ بم اچھالنے کی غرض سے ڈبلن کا رخ کیا۔ اس  
عرصے میں وہ میری نظروں سے اوجھل رہا بلکہ میں اسے  
بھول ہی گیا مگر ایک دن ہولی گن ہار میں میری اس سے  
ملاقات ہو گئی۔

میکا گوئی بہت بدل گیا تھا۔ وہ یوڑھا گلنے لگا تھا۔  
جسم کا گوشت جیسے کھل گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسا  
تاثر تھا جیسے اس کے پیچھے ہدرو میں لگی ہوں۔ اس کے  
علاوہ اس کے داہنے ہاتھ کے ساتھ بھی کوئی گز بڑھی۔ ایسا  
لگتا تھا کہ اس کی ساخت بگڑ گئی ہے۔ وہ شام کی طرح  
پھولا ہوا تھا اور میکا گوئی نے اسے سوزے نما کسی اونچی چیز  
میں لپیٹا ہوا تھا۔

”تم سے دو بارہ مل کر بہت خوشی ہوئی۔“ اس نے  
کہا اور ایک ہی سانس میں مزید کہا۔ ”مجھے پانچ ڈالر  
ادھار دو۔“

میں نے اسے پانچ ڈالر دے دیے پھر گفتگو کا رخ  
انقلاب کی طرف مڑ گیا۔ ”تم ساڈہ انقلاب کے دوران  
تمہاری کارکردگی کیسی رہی؟“ میں نے پوچھا۔

”زبردست۔“ اس نے جواب دیا اور پھر تحصیل



## ذرا مسکرائیے

ہذا اسپتال میں آرٹھروپیدک وارڈ میں زیر علاج شوہر کی فصیحت ....

”اگر آپ کی بیوی کے پاس دو مختلف موبائل نمبرز ہیں تو کبھی بھی میری طرح انہیں ”وائف 1“ اور ”وائف 2“ کے نام سے Save نہ کرنا۔“

جنگ پر جانے سے پہلے پاؤل کنگ نے اپنی خوب صورت بیوی کو ایک کمرے میں بند کیا اور چابی اپنے بہترین دوست ”فرگس“ کو دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں جنگ سے واپس نہ آسکوں تو کمرے کا تالا کھول لینا اور اس سے شادی کر لینا۔“

یہ کہہ کر بادشاہ روانہ ہو گیا۔ آدمی کھٹے کی مسافت کے بعد اس نے محسوس کیا کہ ایک گھڑسوار بہت تیزی سے اس کے پیچھے آرہا ہے۔ نزدیک آنے پر پتا چلا کہ وہ اس کا دوست فرگس ہے۔

پاؤل نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟“ فرگس نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ جواب دیا۔ ”آپ فلف چابی مجھے دے کر آگئے ہیں، پلیز درست چابی دیں۔“

جنگ لیڈر تقریر کرتے ہوئے۔ ”میرے پاس آج جو کچھ ہے آپ فریوں کی وجہ سے ہے۔“ ایک شخص نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک کہتے ہو اور میں نے تو اپنی کچھ چیزیں پہچان بھی لی ہیں۔“

ایک مقرر جھوٹ کے موضوع پر پیکر دے رہا تھا۔ پیکر دینے کے بعد مقرر نے حاضرین سے پوچھا۔ ”ان میں سے کس نے اس کی کتاب کا نواں باب پڑھا ہوا ہے۔“

تقریباً تمام حاضرین نے ہاتھ اٹھا دیے۔ یہ دیکھ کر مقرر نے کہا۔

”میرے مخاطب بالکل صحیح لوگ ہیں کیونکہ میری کتاب کے کل آٹھ باب ہیں۔“

انتخاب۔ ریاض بیٹ، حسن ابدال

ایک ویٹر کا چہرہ..... بس پھر کیا تھا۔ اس نے اٹھ کر ویٹر سے کچھ گفتگو کی۔ اس دوران اس کی رو بہک گئی۔

”اسے دیکھا تم نے۔“ اس نے ویٹر کے جانے کے بعد کہا۔ ”دیکھنے میں کیسا بچوں کی طرح محسوس لگتا ہے لیکن میں نے اپنی ان دو آنکھوں سے اسے چھ آدمیوں کو شوٹ کرتے دیکھا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے، جب ہم نے ڈن ویلز کی بندرگاہ کو پھونکا تھا..... ارے ہاں، میں کیا کہہ رہا تھا دوست؟“

”یہ کہ تمہارا یہ ہاتھ ایک دھماکے میں زخمی ہو گیا تھا۔“ ”ہرگز نہیں، ایسا ہوا ہی نہیں۔ وہ تو معاملہ ہی اور تھا۔“ اس نے تند لہجے میں کہا۔

”جو کچھ بھی تھا، تم مجھے اسی کے متعلق بتا رہے تھے۔“ ”ہاں، میں کہہ رہا تھا کہ میں نے اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ اور کس سنیما پر حملہ کیا۔ کبھے؟ میرے ساتھ فلیش گنی بھی تھا۔ گلس میک گرا بھی تھا اور.....“ ”آگے تو بڑھو۔“

”خیر، سب سے پہلے تو ہم نے بیٹروں کے کچھ ڈبے لیے پھر میں نے انہیں ڈٹ کر ڈائنامیٹ اسٹکس سے بھر دیا۔ میں نے ہر ڈبے کی کیپ میں ایک ڈینٹو فیئر لگا دیا۔ تار باندھے۔ جن پر بیس کیے اور دھاگیں..... کبھے کچھ؟“ ”خوب صورت۔“

”کاش تم وہاں ہوتے اور وہ تماشا دیکھتے۔ میلوں تک کوئی ایک ایسی کھڑکی نہیں تھی جس کے شیشے سلامت ہوں۔ دھماکوں کے بعد کھنٹوں وہاں لمبا برستار ہا۔ سڑکوں پر پھرنے والے آوارہ کتوں نے عادت بتالی تھی کہ منہ کھول کر اپنی پھولی ناگوں پر بیٹتے اور کھانے پینے کی چیزیں خود بخود منہ سے گزر کر ان کے پیٹ میں پہنچ جاتیں۔“

”یعنی تم جانوروں کے لیے مبارک ثابت ہوئے۔“ ”ظاہر ہے، بہر حال ہم وہاں سے کھسک رہے تھے کہ سڑک کے دونوں طرف سے ہمیں فوجی گاڑیاں آتی نظر آئیں۔ چنانچہ ہم ایک مکان میں کھس گئے۔ وہاں سے ہم مکان کی چھت پر پہنچ گئے۔ ہم مقابلہ کرنے کے موڈ میں تھے۔“

”بہت خوب۔“ ”جیسے بس کے کنڈیکٹروں کے پاس قبیلے ہوتے ہیں

نا، میرے پاس ویسے کئی قبیلے تھے جن میں ہم بھرے ہوئے تھے اور ہم سب کے پاس گنیں بھی تھیں۔ ہم نے چھت پر مورچا لگایا۔ کیا تاؤں میں، وہ کیسا قابل دید منظر



پھر مجھے آوازوں سے اندازہ ہوا کہ فوجی تو نیچے کمروں میں  
دندانہ رہے ہیں۔ جس چھت پر میں تھا، اس کے نیچے فوجی مقیم  
ہو گئے تھے۔  
”پھر کیا ہوا؟“

”میں عجیب مشکل میں تھا۔ ہم میری مٹھی میں تھا۔  
میں نہ حرکت کر سکتا تھا اور نہ ہی کوئی آواز نکال سکتا تھا۔ میرا  
بس چلنا تو میں تو سانس بھی روک لیتا۔ کچھ کرتا تو تین سیکنڈ  
میں میرے جوتے اڑ جاتے۔ ہم کی پن میں کھینچ چکا تھا۔“  
”خدا کی پناہ..... پھر تم نے کیا کیا؟“

”کچھ بھی نہیں، مگر وہیں کارہا۔ اس منوں چھت پر  
میرے پانچ دن گزرے۔ سونا تو کھا، میں پلک بھی نہ چپکا  
سکا۔ میرے اعصاب ٹوٹ گئے۔ میں اتنا بے بس تھا کہ کچھ  
بھی نہیں کر سکتا تھا۔“

”پانچ دن.....!“ میں نے حیرت سے کہا۔  
”اور راتیں بھی۔“ اس نے اضافہ کیا۔ ”اور اس پر  
قیامت، موسم بہت خراب تھا۔ جب فوجی وہاں سے نکلے تو  
میرا جسم اکثر کلزی کے تختے کی طرح ہو گیا تھا۔ میں تو  
چھت سے اترا بھی بڑی مشکل سے۔“

”مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ تم بچ نکلے۔“  
”حیرت تو مجھے بھی ہے۔ میری ٹیس اور رگیں تک  
جام ہو گئی تھیں۔ میرے بازوؤں کے عضلات کو جانے کیا  
ہو گیا تھا۔ لگتا تھا سوکھے کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ مجھ سے اپنا  
ہاتھ بھی کھولا نہیں جا رہا تھا۔“ میکا گونی نے اپنی بند دہنی مٹھی  
کو چھتسپایا۔ ”ہم کی پن کے رنگ میں میری انگلی پھنسی ہوئی  
تھی۔ میں اسپرنگ کو کھینچنے پر مجبور تھا۔ اسپرنگ نیچے آتا  
تو ہم پھٹ جاتا اور ہم میری مٹھی میں بند ہو گیا تھا اور میری  
مٹھی کھلنے پر آمادہ نہیں تھی۔“

”پھر کیا ہوا؟“  
”کچھ بھی نہیں درست، کچھ بھی نہیں۔ میں نے خود کو  
اپنی قسمت پر چھوڑ دیا اور اب میں یہاں ہوں۔“  
”اور ہم کا کیا ہوا؟“

”ہم اب تک میرے ہاتھ میں ہے۔“ اس نے اپنے  
سو بے ہوئے داہنے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔ ”لیکن سنو،  
کسی سے اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہ کہنا۔ اگر تم نے زبان  
کھولی تو مجھے بیس سال سے کم کی سزا نہیں ہوگی۔ اے.....  
ایک منٹ رکو تو، تم کہاں کہاں جا رہے ہو۔ اتنی جلدی کیا  
ہے تمہیں؟“



تھا۔ گولیوں کی برسات ایسی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں  
دیتا تھا۔ ہلکی گولی مرنی کو لگی۔ ٹانگوں والی چھت کا معاملہ ایسا  
ہوتا ہے کہ آپ ایک گولی چلا دیں تو وہ گولی ہنٹوں تک ادھر  
سے گھرا کے ادھر اور ادھر سے گھرا کے ادھر پھرتی پھرے گی۔  
سوچو تو..... یہ تو زیادتی ہوئی نا۔ میں اپنے ہم خوبی سے  
استعمال کر رہا تھا لیکن ہم تعداد میں ان سے کم تھے۔ وہ  
دوسری چھت پر چڑھ آئے پھر کیا تھا خوب دو بدو مگر کہ  
آرائی ہوئی۔ ایک چھتی سے دوسری اور دوسری سے تیسری  
تک جنگ ہوتی رہی۔ بڑا مزہ آیا لیکن وہ پیش قدمی کرتے  
رہے اور ہم پسپا ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ میرے پاس  
صرف ایک ہم رہ گیا۔ تعداد ان کی زیادہ تھی۔ ہم میں سے  
پیشتر مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ ایک میں خیریت سے تھا،  
چنانچہ بھاگنے کا سچا بڑا موقع ملا تو میں انہیں دوڑا دیتا۔  
میں اپنا آخری ہم لے چھتیں پھلا نکلا، پھلتا، لڑھکتا پھرا۔  
یہاں تک کہ اپنی سانس مجھے اپنی سانس معلوم نہیں  
ہو رہی تھی۔“

”تو تم بچ نکلے؟“  
”ہاں، کہنا تو بہت آسان ہے۔ میں چھت پر گنر  
کے بائپہٹا سوکتے ہوئے پتے کی طرح کھسا ہوا تھا۔ پیٹ  
کے بل لینا میں موقع کا شکر تھا۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ اچانک  
مجھے بہت سارے فوجی نظر آئے۔ وہ نیچے سڑکوں کی اور  
عمارتوں کی تلاشی لے رہے تھے۔ میں اپنا آخری ہم استعمال  
کرنے کے لیے مناسب ترین موقع کا شکر تھا۔ میں نے  
اپنی انگلی پن کی رنگ میں ڈالی اور ہم کو گرفت میں لے لیا۔  
میں انتظار کرتا رہا پھر جیسے ہی چند فوجی کچھ کی صورت میں  
نظر آئے، میں نے ہم کی پن چھتی اور.....“

میں انتظار کرتا رہا لیکن میکا گونی خاموش رہا بالآخر  
میں نے پوچھا۔ ”تو تم نے ان سب کو ختم کر دیا ہوگا؟“  
”گوئی بھی نہیں مرا۔ میں ہم پیچک ہی نہیں سکا۔  
اچانک سرچ لائٹ ٹاپنے لگی اور مجھے دیکنا پڑ گیا۔ ذرا حرکت  
کرتا تو مارا جاتا۔ میں تو پھنس کر رہ گیا۔ ایک طرف یہ ڈر کہ  
سرچ لائٹ کی روشنی میں دیکھ لیا گیا تو گولی لگے گی۔ دوسری  
طرف یہ خوف کہ چھت سے نہ گر جاؤں اور وہ آنکھوں کو  
چندھادینے والی منوں روشنی..... اس میں یہ ممکن ہی نہیں تھا  
کہ کوئی نارگن نظر آجائے۔“

”پھر تم نے کیا کیا؟“  
”انتظار کے سوا کیا کر سکتا تھا۔ گولیاں تیروں کی طرح  
برس رہی تھیں۔ گھنٹوں بعد وہ لعلتی سرچ لائٹ آف ہوئی اور



## شعبدباز

سلیم انور

بعض لوگوں کی انگلیوں میں ایسا پنر ہوتا ہے کہ کسی کی جیب محفوظ رہتی ہے اور نہ کسی کی تجوری۔ ایسے لوگ بڑی زور زوری سے دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچا کر خوشی محسوس کرتے ہیں اور اس کی خوشیوں کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا جو زمانے سے بہت آگے نکل چکا تھا۔

آنکھوں میں رحول جھونکنے والے ایک شعبدباز کی فنکاریاں



سے سیاتا پن نہیں کر سکے گا۔" ایشلے نے نرا حمار لہجے میں کہا۔ "ہائی داوے، میں اپنا حصہ کیا طلب کروں؟" اس بات پر دراز قامت ایلے پتلے زور رنگت کے حامل گورڈن نے وانت نکالے۔ "اس سے فغنی فغنی کا مطالبہ

"مگر اسے سوچ ملا تو وہ یقیناً تمہیں جل دے جائے گا۔" سلم گورڈن نے ایشلے سے کہا۔ "میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت تیز ہے۔" ایشلے نے اپنا سگریٹ پر سے اجمال دیا۔ "وہ مجھ



لے کر آتا ہوں تاکہ تمہیں مکان کا مکمل خاکہ بنا کر دے دوں۔ تم اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لینا اور اس کاغذ کو ضائع کر دینا۔“

☆☆☆

ایٹلے ٹیکسی سے اتر کر مورگن کے پیچھے چل دیا۔ ایٹ سیونٹی تھریڈ اسٹریٹ پر واقع وہ ایک پرائیویٹ ہاؤس تھا۔ مورگن اس مکان کی براؤن اسٹون کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ایٹلے نے ایک ہاتھ میں سیاہ رنگ کا چڑے کا بیگ تھاما ہوا تھا۔ دروازہ ہلڈر تھوٹھلی کے ٹلر نے کھولا۔ ایٹلے نے اپنے ہونٹ سختی سے کھینچے ہوئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ پکارا گیا تو یہ اس کا دوسرا جرم ہوگا لیکن وہ ایسا ہرگز نہیں ہونے دے گا۔ جیسا کہ مورگن نے اسے بتایا تھا کہ یہ ایک اوپن اینڈسٹ جاب ہے۔

چھوٹے سے ہال روم کے ایک گوشے میں ایک اسٹیج تیار کیا گیا تھا۔ مورگن نے اپنے کام کا آغاز کرتے ہوئے اپنے آلات سیٹ کرنا شروع کر دیے۔ یہ چیزیں سہ پہر ہی میں وہاں پہنچا دی گئی تھیں..... ان میں خرگوشوں کے بچرے، سفید چوہے، شیشوں کے چنے ہوئے لائن دار کیبنٹ وغیرہ شامل تھے۔ وہ ان کاموں کو سپردا کر رہا تھا جبکہ ایٹلے اس کا ہاتھ بنا رہا تھا۔ نو بجے شو کا آغاز ہو گیا۔

ایٹلے نے اپنا بیگ اٹھایا اور سب کوشوں میں گمن پاکر عتیق راستے سے ہال روم سے باہر نکل آیا۔ مکان کا پورا نقشہ اس نے اچھی طرح سے ذہن نشین کیا ہوا تھا۔ وہ نوکروں کے زیر استعمال رہنے کے راستے اوپری منزل تک جا پہنچا۔ کسی نے اسے نہ تو روکا اور نہ ہی کوئی سوال کیا۔ یہ ظاہر تمام نوکر ہال روم میں تھے اور مورگن کے ہاتھ کی صفائی اور شعبہ ہاؤزی کے کمالات دیکھنے میں گمن تھے۔ ایٹلے ایک چوڑی سی ماہداری میں آگے بڑھا جس میں دبیز کالین بچھا ہوا تھا۔ پھر وہ ایک بڑے سے آراستہ بیڈ روم میں داخل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا کمرہ بھی تھا جو کسی خاتون کی خلوت گاہ تھی۔

اس بیڈ روم میں شینڈ والے دو لیپ روشن تھے جن سے کمرے کی ہر شے نمایاں نظر آ رہی تھی۔ ایٹلے نے بیڈ روم کا دروازہ بند کر کے اس کا تالا ہوا دیا اور تیزی سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

اسے فریڈا پرنٹ کا فریم خانے دار الماری کی

کرنا اور دیکھنا کہ وہ تمہیں کیا آفر کرتا ہے اور ہاں، مجھے ضرور بتانا۔“

سات بجے کے قریب ایٹلے نے فوری سکتھ اسٹریٹ ہوٹل میں پروفیسر مورگن کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

”اسلم گورڈن نے تمہارے بارے میں مجھے بتایا تھا۔“ پروفیسر مورگن نے دروازہ بند کرنے کے بعد بیڈ کے کنارے پر ایک جگہ کو درست کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”گورڈن کا کہنا ہے کہ تم اس کام میں مہارت رکھتے ہو۔ تم جانتے ہی ہو کہ منصوبہ کیا ہے۔ اگر تم اس منصوبے میں میرے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہو تو تم اپنے لیے کتنا حصہ لینا چاہو گے؟“

”پچاس فیصد۔“ مورگن نے ایک سگریٹ سلگانے کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا۔

ایٹلے کے ماتند وہ بھی جوان، بنا سنورا اور پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ البتہ اس کے چہرے کے نقوش اور تاثرات میں قدرے درستی اس بات کا اشارہ تھی کہ اس کی زندگی عمل طور پر پھولوں کی بیج تھی ہے۔

”اب تم میرے شریک کار ہو گئے ہو۔ میں چند الفاظ میں آگے کا منصوبہ بیان کرتا ہوں۔ کل شب میں ہلڈر تھوٹھلی کے بچوں کے لیے بیجک شو پیش کرنے جا رہا ہوں۔ تم میرے اسسٹنٹ ہو گے۔ جب میں ہال روم میں کمالات دکھا رہا ہوں گا تو تم اوپری منزل پر واقع بیڈ روم کی تجوری کو بھٹک سے اڑا کر اس کا صفایا کر لینا۔ یہ دو نوک معاملہ ہوگا۔ تم اسے سنبھال کر سکتے۔“

”وہ کس قسم کی تجوری ہے؟“ ایٹلے نے پوچھا۔

”دیوار میں گڑی ہوئی گول تجوری ہے۔ میں نے اس کے بارے میں اس ملازمہ کے بوائے فرینڈ سے تفصیلات حاصل کی ہیں جو کبھی وہاں کام کیا کرتی تھی۔ میں بعد میں تمہیں وہاں کا مکمل خاکہ بنا کر دوں گا۔ یہ ایک آسان کام ہے۔“ گورڈن نے بتایا۔

”میں اپنے اوزار اندر تک کس طرح لے جاؤں گا؟“ ایٹلے نے جانتا چاہا۔

”تم انہیں ایک بیگ میں رکھ کر لانا۔ کوئی بھی تمہیں نہیں روکے گا۔ میں نے بتایا تاکہ تم میرے اسسٹنٹ ہو گے۔ تم دس ٹن کا ٹرک تک لاسکتے ہو اور یہ ہمارے ایکٹ کا حصہ ہوگا۔ تم ٹھہرو، میں کاغذ اور پینسل



منٹ کے اندر یہاں سے نہیں گئے تو میں پولیس کو ٹیلی فون کر دوں گی۔"

ابٹلے نے یہ سن کر ایک گہرا سانس لیا۔ "تم مجھ سے یہ کہہ رہی ہو کہ میں گرفتار ہونے کے بجائے یہاں سے فرار ہو سکتا ہوں؟"

لاڑکی نے اپنا ہاتھ نمایاں طور پر میز پر موجود ٹیلی فون کی جانب بڑھا دیا۔

ابٹلے نے تیزی سے وہ آہستہ آہستہ واپس تجوری کے اندر رکھ دیا پھر ٹیکسی نظروں سے اس لاڑکی کو دیکھتے ہوئے بیٹروم کے دروازے کی جانب لپکا اور تالا کھول کر ایک اچھتی نگاہ اس لاڑکی پر ڈالی۔ وہ لاڑکی بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا ہاتھ بدستور ٹیلی فون پر تھا۔ ابٹلے کچھ کہے بغیر خاموشی سے راہداری میں نکل گیا اور تیزی سے بیڑھیاں اترنے لگا۔

☆☆☆

ایک ہفتے بعد ابٹلے وینٹر گارڈن کے سامنے سے گزر رہا تھا تو سلم گورڈن نے دور سے اسے پکارا۔

جب ابٹلے اس کے پاس پہنچا تو گورڈن گویا ہوا۔ "تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ پروفیسر کے ساتھ تمہارے کام کا کیا نتیجہ رہا۔" ساتھ ہی اس نے ایک قبضہ لگا لیا۔ "تمہارے نہ بتانے کا یہ مطلب تو نہیں کہ..... اس نے تمہیں بل دے دیا؟"

ابٹلے نے ٹٹی میں سر ہلادیا۔

"ہماری بات ہی نہیں تھی۔ اس رات بلڈر تھ فیلٹی نے ہم دونوں کو مات دے دی۔ ہم اپنے منصوبے میں کامیاب نہیں ہو پائے تھے۔"

گورڈن نے اپنی کلائی کی گھڑی کی جانب دیکھا۔ "میرے پوچھنے کی ایک وجہ ہے۔" گورڈن نے کہا۔ "حال ہی میں پروفیسر مورگن شوگر ڈیڑی کی حیثیت سے پہچانا جا رہا ہے۔ وہ گزشتہ شب اپنی بیوی کے ساتھ لندن کے بحری سٹر پر روانہ ہو گیا ہے۔ یہ وہ چھپتی چیز ہے جس کے چکر میں وہ ایک عرصے سے پڑا ہوا تھا۔ شادی سے پہلے وہ کوئی لمبا ہاتھ مارنا چاہتے تھے۔ سرخ زلفوں اور نیلی آنکھوں والی س کی نئی بیوی خاصی افسانہ لڑکی ہے۔" گورڈن نے قبضہ لگاتے ہوئے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟"



بائیں جانب دیوار پر لٹکا دکھائی دیا۔ اس نے فریم اٹھایا تو وہ پوشیدہ دیوار گیر کول تجوری نظر آگئی جس کی نشاندہی مورگن نے کی تھی۔ ابٹلے نے اپنا بیگ کھول کر اس میں سے نمبر چھ کی الیکٹریک ڈرل مشین، لیکن کا ایک صابن اور ربر کے دستانے نکالے۔ اس نے ڈرل مشین کے لمبے تار کا پلگ نیچے ہی سارٹ میں لگا کر جن آن کر دیا اور اپنا کام شروع کر دیا۔

اس نے تجوری کی مرکزی تاب کے اوپر ایک سوراخ کیا اور صابن سے تجوری کے دروازے کے اطراف کے پٹافٹوں کو پڑ کر دیا۔ پھر ایک آئی ڈر اپر کے ذریعے اس نے احتیاط کے ساتھ سوراخ میں ٹائٹڈ کے قطرے چٹکا دیے۔ اس نے ڈیٹے ٹیٹروائٹر سے ڈبل کنکشن بنایا اور ایک چھوٹا سا فرشی قالین اٹھا کر تجوری کے منہ پر دبایا اور پھر ڈیٹے ٹیٹروائٹر کے تار لچ کر دیے۔

ایک ہلکا اور گھٹا سا دھماکا ہوا۔

ابٹلے نے فرشی قالین نیچے گر دیا اور تجوری کا مڑا تارا دروازہ کھول کر اندر رکھا ہوا آنکھوں کی لکڑی کا بنا ہوا زیروں کا چھوٹا بکس باہر نکال لیا۔

وہ اس بکس کو اٹھا کر بیٹھ پر لے گیا اور اسے کھول کر اس میں موجود اشیا کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ بکس میں موجود جواہرات کی چمک دکھ آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔

اتنے میں کمرے کے دوسرے حصے سے ایک آواز

سنائی دی۔

"میں خود بھی حقیقت میں ان جواہرات کو یہاں سے لے جانے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔" اس آواز نے کہا۔ "اس خاص طور پر اپنے میکس اور آنکھوں پر شیفٹ ہے۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتی تو اس بکس کو واپس وہیں رکھ دیتی۔" ابٹلے کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ تیزی سے آواز کی سمت گھوم گیا۔

سرخ زلفوں والی ایک بیاری سی لڑکی خلوت گاہ کے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے سفید رنگ کا ایونگ گاؤن پہنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں گہری نیلی تھیں اور گردن کاخم قابل توجہ تھا۔

پھر وہ لاڑکی چند قدم اندر آگئی۔

"کیا تم نے سنا نہیں کہ میں نے کیا کہا ہے؟ یہ بکس واپس تجوری میں رکھ دو..... اور دفعتاً ہو جاؤ۔ اگر تم دو



## مہفل شہر و سخن



✽ کرشن زخمی..... عمر کوٹ، بھر پارکر  
 مقید کر دیا یہ کہہ کر سانچوں کو سپیروں نے  
 یہ انساں کو انسانوں سے ڈسوانے کا موسم ہے  
 ✽ احمد خان تو حیدری..... پاکستان اسٹیل، کراچی  
 لاریب تیری روح کو تسکین ملے گی  
 تو قرب کے لمحات میں قرآن پڑھا کر  
 آجائے گا اقبال تجھے جینے کا سلیقہ  
 تو سرور کونین کے فرمان پڑھا کر  
 ✽ محمد زریان سلطان..... اردو بازار، کراچی  
 لختِ دل آنسوؤں کی رو میں چلے آتے ہیں  
 کیا تماشا ہے کہ یہاں بہتی ہے سیلاب میں آگ

✽ سید کرامت علی..... اسلام آباد  
 آج لوٹ کر اس کی یاد آئی تو یہ احساس ہوا  
 اتر جائے جو دل میں وہ بھلائے نہیں جاتے  
 ✽ محمد رمضان..... پشاور

میں رعبِ حسن سے ساکت ہوں وہ شرم و حیا سے مہر بہ لب  
 دلوں میں جھجک سی رزقی ہے اظہارِ تمنا کون کرے  
 ✽ اظہر حسین بچا پر..... ہزاری، جتوئی  
 گھاؤ گھٹتے نہ بھی زخمِ شاری کرتے  
 عشق میں ہم بھی اگر وقت گزاری کرتے  
 وقت آیا ہے جدائی کا تو اب سوچتے ہیں  
 تجھ کو اعصاب پہ اتنا بھی نہ طاری کرتے  
 ✽ ڈاکٹر محمد عنصر عباس ہڈالی... خوشاب  
 جس خاک کے ضمیر میں ہو آتشِ چنار  
 ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

✽ مہرین ناز..... حیدرآباد  
 جو اس کے چہرے پہ رنگِ حیا ٹھہر جائے  
 تو سانس، وقت، سمندر، ہوا ٹھہر جائے  
 وہ مسکرائے تو ہنس ہنس پڑیں کئی موسم  
 وہ گنگنائے تو پاؤں صبا ٹھہر جائے

✽ ساگر تلوار..... چشمہ بیراج  
 صبح پھر ہوگی لوگی حادثہ یاد آئے گا  
 شام پھر آئے گی پھر شام سے ٹھہرائیں گے  
 ✽ ریاض بیٹ... حسن ابدال  
 اب میری واپسی کا امکان تو نہیں ہے  
 شاید میں لوٹ آؤں رستے اجال رکھنا  
 ✽ طاہر الدین یگ... میرپور خاص  
 حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک  
 کچھ بڑی بات سمجھتے ہوئے جو مسلمان بھی ایک  
 فرقہ بندی ہے نہیں اور کہیں ذاتیں ہیں  
 کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں  
 ✽ محمد جاوید... تحصیل علی پور  
 کیوں ایسا ہے کہ اعتبار کی ٹوٹی دہلیزوں پر  
 جو بہت ہوں اپنے، اپنے نہیں رہتے



✽ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر..... نبی منڈی سکسکی  
آنکھ اُچی محبت نے انگڑائی لی  
دل کا سودا ہوا چاندنی رات میں  
ان کی نظروں نے کچھ ایسا جاہ کیا  
لٹ گئے ہم تو پہلی ملاقات میں

✽ مدحت..... کراچی

بادلوں نے تیری زلفوں سے گھٹا مانگی ہے  
چاند نے تیرے چہرے سے ضیا مانگی ہے  
مانگ لی شوق نے تیرے ہونٹوں سے سرفی  
مہا نے تیری آنکھوں سے حیا مانگی ہے

✽ شانہ حسن..... لاہور

فراموش کر دیا اپنا ماضی، اس سے کہنا  
جیت لی میں نے بازی، اس سے کہنا  
نہیں آرزو دل کو اس کے پیار کی  
اپنی زندگی میں ہوں راضی، اس سے کہنا

✽ اطہر حسین..... کراچی

انسان کے ہونٹوں پہ تو لگ سکتی ہے مہرین  
خاموش مگر کوئی کہانی نہیں رہتی  
✽ محبوب مصور سومرو..... گوٹھ کھڑی، لاڑکانہ  
دہ پار پہ جانا دعا جیسا لگتا ہے  
اور اس کا مسکراتا ہوا جیسا لگتا ہے

✽ زاہد چودھری..... چھوڑ کینٹ

کتنی مانوس سی صدا ہوتی ہے  
پلٹ کر دیکھو تو ہوا ہوتی ہے  
میں اسے زندگی کی طرح چاہتا ہوں  
زندگی بھی تو بے وفا ہوتی ہے

✽ محمد پونس چودھری... سلطان پورہ، لاہور  
ہم خون کی گتھیں تو بہت دے چکے لیکن  
اسے خاک وطن! قرض ادا کیوں نہیں ہوتا

✽ احمد حسن عرضی خان... قبولہ شریف

یہ گزرتے ہوئے ہل چلے ہیں کہ تیری آنکھیں ہیں  
دن ہے آنسو کی طرح رات ہے کاجل کی طرح

✽ ایم اے فاضل فریدی..... مزنگ

یہ آگ میرا جسم جلا ڈالے گی مگر پھر بھی  
میں اس کو بچانے سے بہت خوفزدہ ہوں

✽ محمد اوریس..... کوئٹہ

تم اچھے وقت آپہنچے وگرنہ ہم تو مر جاتے  
ارادہ ہو چکا اپنا ہم فرقت میں یونگی تھا  
دکھا کر ظہیر کو صورت مجھے کیوں رشک سے مارا  
کہ میں تو مر رہا دیدار کی حسرت میں یونگی تھا

✽ بلقیس قاطرہ..... لاہور

مدت کے بعد حضرتِ ناصح کرم کیا  
فرمائیے مزاج مقدس کا بات چیت  
پر ترک عشق کے لیے ارشاد کچھ نہ ہو  
میں کیا کروں نہیں یہ مرے اس کی بات چیت

✽ عبدالقادر..... سیالکوٹ

دل تو کہتا ہے کہ کہہ دے دل کی اس دلدل سے  
پر حیا مانع سے میں کیونکر کہوں مجبور ہوں  
تجی دھڑکتا ہے نکل جائے نہ منہ سے حرفِ راز  
یار سب ہشیار ہیں اور میں نشے میں چھو ہوں

✽ شرمین جلیل..... راوی پبڈی

نصیب اچھے اگر بلبل کے ہوتے  
تو کیوں پہلو میں کاٹتے گل کے ہوتے  
ہمارے وقت میں فرہاد و مجنوں  
جو ہوتے دن بسر مل جل کے ہوتے

✽ اسماء عبدالغفار انصاری..... لاہور

اجل نامہ آیا تو چھینے لی جانہ طے گی  
جس نے تخلیق کیا اس کی خدائی مار ڈالے گی

✽ کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی

ہم سے تو خاک صحرا کی پھانی نہیں جاتی  
تو کیلی ہرگز نہیں ہے کیوں مجنوں میں کہلاؤں

✽ اوریس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی

یقین کی حد تک اس گماں میں رہتا ہوں  
میں تیری خلوت کے شبستان میں رہتا ہوں

✽ زویب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی  
نہ جانے دل کو وہی کیوں بھاتا ہے  
مر بھر کا جو روگ لگا جاتا ہے

✽ محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ٹاؤن، خاندوال

تجھے خبر ہے تجھے سوچنے کی خاطر  
بہت سے کام کل پہ چھوڑ دیتا ہوں



✽ محمد شہباز اکرم لوئی..... ڈھائی پاک چمن شریف  
 اس کی محبت میں شراکت نہیں قبول کیجئے  
 وہ اگر میرا ہے تو خواب بھی میرے دیکھے  
 ✽ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی  
 اہل دل اور بھی ہیں اہل وفا اور بھی ہیں  
 ایک ہم ہی نہیں ہیں دنیا سے خفا اور بھی ہیں  
 ✽ محمد رشید سیال..... دو بڑی، سکھر  
 ٹوٹ جاتا ہے غریبی میں وہ رشتہ جو خاص ہوتا ہے  
 ہزاروں یار بنتے ہیں جب پیسا پاس ہوتا ہے  
 ✽ رضوان تنولی کریڑوی..... پورنگی ٹاؤن، کراچی  
 آگہ پُرم، اشک زم زم، سانس مدہم، وقت ہے کم  
 وصال راحت، جبر ماتم، آہ ہدم، موت مرہم  
 ✽ احسان سحر... میانوالی  
 کچھ خطائیں بخشیں نہیں جانتیں  
 دل سوچ کر توڑا کرو جاہل  
 ✽ شازیہ کمال..... کراچی  
 درسی بات پر تمباکھی یوں چھوڑ جاتے ہیں  
 محبت کر کے لوگوں سے سنبھالی کیوں نہیں جانی  
 ✽ اعجاز احمد راجیل..... ساہیوال  
 کچھ علم ہے کہ تم نے تو تیسرا بکھیر کر  
 شیرازہ جہاں کو پریشان کر دیا  
 ✽ وقاص حیدر..... لاہور  
 میں تو سائل تھا صدا دے کر گزرتا تھا مجھے  
 تو نے کیوں شام تک بند دوسرے نہ کیا  
 ✽ محمد اشفاق سیال..... شورکوٹ شی  
 سنا ہے شہر میں زخمی دلوں کا میلا ہے  
 چلیں گے ہم بھی مگر پیرہن رفو کر کے!  
 ✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی  
 برتی بارشوں سے بس مجھے اتنی سی انسیت ہے  
 کہ اس طرح کا اک موسم میرے اندر بھی رہتا ہے

✽ عامر علیم..... لاہور  
 آؤ کچھ دیر تذکرہ کر لیں  
 ان دنوں کا جب آپ ہمارے تھے  
 ✽ امداد علی..... میرپور خاص  
 ملاقاتیں نہیں ممکن ہمیں احساس ہے لیکن  
 تمہیں یاد کرتے ہیں، بس اتنا یاد رکھنا  
 ✽ عبدالغفور خان ساغری خٹک... انک  
 ماں تیرے بعد بتا کون لیوں سے اپنے  
 وقت رخصت میرے ماتھے پہ دعا لکھے گا  
 ✽ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی  
 کاش کہ بچپن میں ہی تجھے مانگ لیتے  
 ہر چیز مل جاتی تھی دو آنسو بہانے کے بعد  
 ✽ بشیر احمد بھٹی..... بہاولپور  
 اشارہ تو مدد کا کر رہا تھا ڈوسنے والا  
 مگر یارانِ ساحل نے سلام الوداع سمجھا  
 ✽ امیلی..... کراچی  
 تمہارے ذہن میں جو بھی ہے صاف صاف کہو  
 منافقت کا نشان ہے یہ اگر مگر کتنا  
 ✽ محمد خواجہ..... کورنگی، کراچی  
 کچھ ہمیں بھی موت کی آرزو تھی عشق میں  
 مانتے کچھ آسمان تیری بے دہی سے ہو گئے  
 ✽ محمد یوسف سانول..... نورپور قلعہ، خوشاب  
 دوریاں ہوئیں تو غلط فہمیاں اور بھی بڑھ گئیں  
 پھر اس نے وہ بھی سنا، جو میں نے کہا ہی نہیں  
 ✽ مسز اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ..... خانوال  
 میں لاکھ محترم ہوئی پر ڈھونڈتی رہی  
 لذت جو ترے شہر کی رسوائیوں میں تھی  
 ✽ ناصر علی صدیقی..... رحیم یار خان  
 یہی ہے ناکہیں ہم سے چھڑ جانے کی جلدی ہے  
 کبھی ملنا تمہارے مسٹے کا حل نکالیں گے

محفل شعر و سخن

کوین  
 برائے  
 شماره  
 اپریل  
 2015

نام: \_\_\_\_\_  
 پتا: \_\_\_\_\_



بہت آگے مئی کی کسی اسپتال سے کریم کا فون تھا۔  
 ”ہاں، بڑے میاں نہیں سنھتے ہیں مجھ سے۔“ میں  
 نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ ”یار سب بچہ تیار تھا۔ وہ اسپتال  
 میں داخل بھی ہو گئے تھے۔ رات اچھی گزاری۔ تمہاری امی  
 بھی اسپتال میں ہی تھیں۔ صبح آپریشن سے پہلے دینے والی

”یار، تم سے اتنا سا کام نہیں ہو رہا ہے۔ میرے  
 باپ کی آنکھوں کا آپریشن نہیں کر سکتے ہو۔ کیٹریکٹ ایسی کیا  
 بڑی چیز ہے۔ آدھے گھنٹے کا کام نہیں ہے۔ اتنا بھی قاعدہ  
 نہیں ہے تمہارا۔ ایک بڑے میاں نہیں سنھتے ہیں تم سے۔“  
 فون کی دوسری جانب بہت دور امریکا کے نیویارک سے بھی

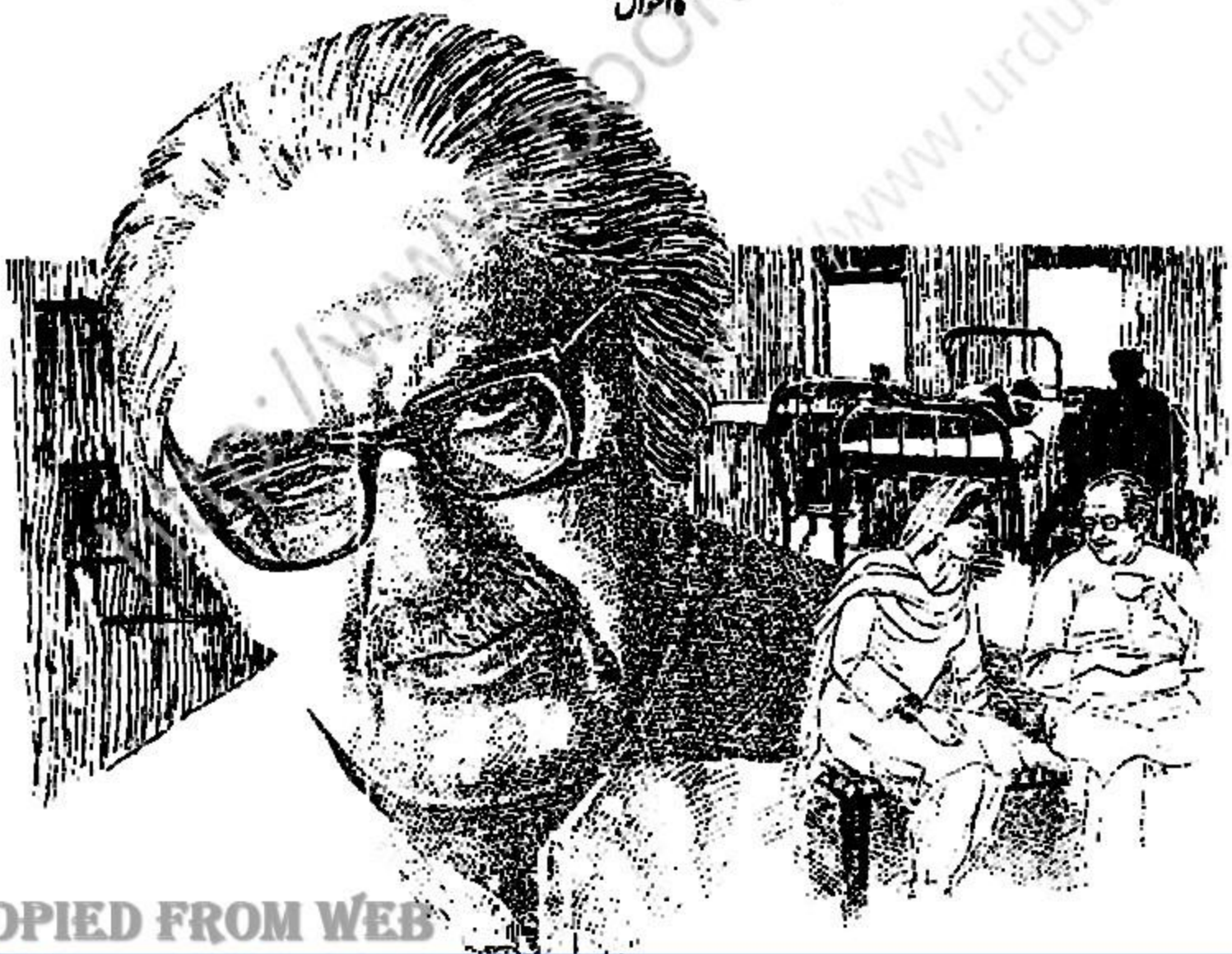
## مجبوریاں

ڈاکٹر شیر شاہ سید

خدا نے جانے کیوں ساری کشش، ساری تڑپ ممتا میں ہی  
 رکھ دی... اسی سبب قربانی کا مجسمہ بنے والدین اپنی عمر  
 تمام کر دیتے ہیں... تھوڑی سی تڑپ اگر اولاد کے دل میں بھی  
 پو تو شاید ماں باپ کو اتنی تکلیفیں نہ چھیلنا پڑیں... وہ جو  
 آنکھوں میں خواب سجائے دیار غیر گیا تو گویا ہمیشہ کے لیے  
 غیر ہو گیا اور اس کی راہ تکتے تکتے بوزھے ماں باپ کی  
 آنکھیں پتھر اگتیں۔

پرویس سردھار نے والے بجر گوشوں کی محتاتوں

کا احوال



COPIED FROM WEB



لندن سے آنے والا سامان کسم سے آسانی سے نکل گیا تھا۔ سرکاری نوکری کے ڈھونڈنے اور ملنے میں انہوں نے مدد کی تھی۔ پھر تھوڑے تھوڑے دنوں میں ان کا سیکریٹری یا ان کے آفس سے فون کر کے کوئی نہ کوئی پوچھتا تھا کہ کوئی کام تو نہیں ہے۔ وہ اور ان کی بیوی بڑے مہربان لوگ تھے۔ پیار سے ملتے اور کوشش کرتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح کام آگے۔ میں آخر کریم کا دوست تھا۔

کریم لندن سے امریکا چلا گیا تھا۔ وہاں ٹریڈنگ کمپنی، پھر ٹینیسی کے ایک اسپتال میں کام کر رہا تھا۔ ٹریڈنگ کے دوران ہی وہ پاکستان آیا اور اس کی شادی اس کے رشتے داروں میں اس کی ہی مرضی سے ہو گئی۔ اس کی شادی کے دوران، میں اور سیری بیوی اس کے خاندان کے اور زیادہ قریب آگئے تھے۔

کریم کی ایک بہن بھی تھی، شازیہ۔ اس کی بھی شادی ایک کارڈیولوجسٹ سے ہوئی تھی جس کے ساتھ وہ کینیڈا میں رہتی تھی۔ کریم کی شادی پر وہ لوگ بھی کینیڈا سے آئے ہوئے تھے۔ کریم کے والدین کو اتنا خوش میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ زندگی سے بھرپور تھا پورا خاندان۔ اس وقت وہ بڑی پوسٹ بر فائر تھے۔ گھر بڑوں کو چاکروں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ کام کرنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ تین نئے جادو کی طرح سے تھے۔

پھر ایک سب کچھ ویسا ہی ہو گیا تھا۔ پہلے کریم اپنی بیوی کو دہن کے ساتھ ٹینیسی چلا گیا پھر شازیہ بھی کینیڈا چلی گئی اور زندگی اپنے معمول پر آ گئی۔ کریم جاتے وقت مجھ سے کہہ گیا تھا کہ بھی تمہارا اس کے گھر کا چکر لگایا کروں۔ کریم نہ بھی کہتا تو شاید میں یہی کرتا۔ اس کے والدین تھے ہی ایسے۔ پیار کرے۔ والے محبت کرنے والے اور خلوص سے بھرے ہوئے۔ بڑی پوسٹ پر ہونے کے باوجود ان میں کوئی بے جا غرور نہیں تھا۔ سیری ان دونوں سے بہت دوستی ہو گئی تھی۔

پھر کریم کے ڈیڑھ ریٹائر ہو گئے اور ان کی زندگی کے فرصت کے دن شروع ہو گئے۔ ریٹائرمنٹ کے شروع کے مہینوں کے بعد وہ دونوں کینیڈا امریکا کے دورے پر نکل گئے تھے۔ تین مہینے کینیڈا رہنے کے بعد انہوں نے تین مہینے ٹینیسی میں گزارے اور جب کراچی واپس آئے تو بہت خوش لگ رہے تھے۔

میں ان کے آنے کے دوسرے دن ہی ملنے گیا تھا۔ بہت اچھا وقت گزارا مگر بہت جلد طبیعت اکتا جاتی ہے۔

دوایں بھی انہیں دے دی گئی تھیں میں نے ان کی ٹینشن اور گھبراہٹ کو دیکھتے ہوئے رات سے ہی تھوڑا ڈاؤن کی زی یام بھی انہیں دے دیا تھا، صبح ہی ان کا آپریشن تھا۔ وہ آپریشن تھمیز بھی آئے تھے اور آپریشن ٹیمیل پر لیٹ بھی گئے تھے لیکن بس بے ہوشی سے تھوڑا سا پہلے نہ جانے کیا ہوا تھا کہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور آپریشن کرانے سے انکار کر دیا۔ سخت شرمندگی کا شکار تھے۔ وہ بار بار اس طرح مجھ سے معذرت کر رہے تھے کہ مجھے بھی شرم آگئی تھی۔ وہ تمہارے بغیر آپریشن نہیں کرائیں گے۔ فون کے اس طرف کراچی سے میں نے کریم کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”یار، میں کیسے آسکتا ہوں؟ سر سے پاؤں تک کام میں پھنسا ہوا ہوں۔ ڈیڈ کو میں نے سمجھا دیا تھا۔ انہوں نے اور امی نے بھی کہا تھا کہ میرے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یار ڈیڈ نے تو کمال کر دیا ہے۔ پتا نہیں حکومت کے کام کیسے کرتے رہے ہیں۔ ایک چھوٹا سا آپریشن نہیں کرا سکتے۔ خود مشکل میں ہیں۔ نہ اخبار بڑھ سکتے ہیں اور نہ دوسرے کام صحیح طریقے سے کر سکتے ہیں مگر آپریشن سے جان جاتی ہے۔ کمال ہے یار، کمال ہے۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا تھا۔ ”اچھا میں پھر فون کروں گا۔“

ایسا پہلی دفعہ نہیں ہوا تھا۔ پہلے بھی دو دفعہ آپریشن کا فیصلہ ہوا تھا اور پھر آپریشن آخر وقت میں نہیں ہو سکا کیونکہ وہ تیار نہیں تھے۔ ان کو ڈر تھا، ایک خوف کہ شاید بے ہوش ہو کر ہوش میں نہ آسکیں، میں زبردستی تو آپریشن نہیں کر سکتا تھا۔

میری کریم سے ملاقات لندن میں ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی اسپتال میں کام کر رہے تھے، میں آنکھوں کے شیعے میں تھا اور وہ مر جری کے شیعے میں کام کر رہا تھا۔ ایک سال تک ہم دونوں نے ساتھ ہی کام کیا تھا۔ میں اپنی تربیت کے آخری مرحلوں میں تھا۔ کریم نے بھی امتحان پاس کر لیے تھے اور امریکا جانے کا امتحان بھی پاس کر کے امریکا جانے کے پروگرام بنا رہا تھا۔ اس کا پاکستان واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ”یار وہ ملک رہنے کے قابل نہیں ہے۔“ یہ اس کا مخصوص جملہ تھا۔

اس کے والد حکومت پاکستان میں بڑے ہیرو کریٹ تھے، گریڈ ایکس یا تیس کے آخر، بہت اچھے انسان تھے وہ۔ جب میں سب کام ختم کر کے پاکستان واپس جا رہا تھا تو کریم نے میرے سامنے اپنے ڈیڈ کو فون کر کے کہا تھا کہ میری مدد کریں۔ انہوں نے مدد بھی کی تھی۔ کراچی پہنچ کر میں انہیں ملا تھا اور میرے سارے کام بڑی تیزی سے ہو گئے تھے۔



### ادب

اردو کے ایک معروف شاعر کو گفتگو کے دوران اپنے برہمنے میں انگریزی کا کوئی نہ کوئی لفظ نکلنے کی عادت تھی..... وہ جب انگریزی کا کوئی نیا لفظ سنتے تو فوراً اپنے کسی ساتھی سے اس کے معنی بھی پوچھ لیتے..... ایک دن دوران گفتگو لٹریچر کا لفظ سنا تو اپنے ساتھی سے پوچھ بیٹھے۔ ”یار! یہ لٹریچر کے کیا معنی ہیں؟“

ساتھی نے جواب دیا۔ ”دب.....“  
اسی شام کافی ہاؤس میں مولانا چراغ حسن حسرت نے شاعر مذکورہ سے کہ۔ ”عزیزم! سنا ہے تم میرے بارے میں بڑی بک بک کرتے رہتے ہو۔“

”مولانا! یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں تو آپ کا بے پناہ ”لٹریچر“ کرتا ہوں۔“ لٹریچر کی یہ ترکیب استعمال سن کر مولانا دم بخور رہ گئے۔

مرسلہ: بخارا، بوج، لوی، بوچستان

### محبوبہ

ایک ڈاکٹر کے پاس ہر تیسرے چوتھے دن ایک صاحب مرہم پٹی کروا۔ نے آجاتے۔ ایک دن ڈاکٹر سے نہ رہا گیا۔ اس نے اسے ڈسپنسر کے پاس بھیجنے سے پہلے پوچھ لیا۔ ”بھئی۔ آخر تم کیا کرتے ہو؟ تمہیں اتنی چومیں کیسے آتی ہیں؟“

وہ صاحب مرد آدھ بھر نہ بولے۔ ”ڈاکٹر صاحب! اب کیا کرنا ہے۔ جو پہلے کر چکا ہوں، اس کی مزا بھگت رہا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

وہ صاحب تھوک نکل کر بولے۔ ”جوڈو کرائے کی ماہر محبوبہ سے شادی۔“

مرسلہ: ریاض، بٹ، احسن ابدال

### تحقیق

ایک تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ ساری ماسیں ظالم نہیں ہوتیں اور نہ ہی ساری سبوسیں مظلوم ہوتی ہیں البتہ شوہروں کی مظلومیت، شفق علیہ ہے۔

مرسلہ: محمد قدرت اللہ نیازی، علیہ مٹاؤن

دہاں پر یوزموں کا کوئی کام نہیں ہے، وہ کب تک اور کتنا ٹھنی وٹرن دیکھ سکتے ہیں۔ نہ کوئی ٹٹے والا ہے اور نہ کوئی بات کرنے والا۔ فون پر کتنا کوئی بات کر سکتا ہے اس کے بعد تو ڈالر لگتے ہیں۔ کینیڈا کی سردی بھی بہت خوف ناک ہے۔ میں نے ڈینس میں ان کے بڑے سے گھر میں ان کے ساتھ چائے پی، انہوں نے میری بیوی کے لیے تحفہ اور بچوں کے لیے چاکلیٹ دیے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ ہر دو سال بعد کریم اور شازیہ پاکستان کا چکر مارتے اور یہی دو تین ہفتے ایسے ہوتے تھے کہ ان کے بڑے گھر میں جیسے روشنی ہی آجاتی تھی، ان کے اپنے بچے نوا سے اور پوتے۔ ان دنوں کی تیاری وہ لوگ سارا سال کرتے رہتے تھے۔ دن گن گن کر ان دونوں کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ کریم کا واپس آنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ٹینیسی میں وہ بہت خوش تھا۔ اچھی آمدنی تھی، کام سے مطمئن تھا بڑا سا گھر اور روزمرہ کی آسائشیں تھیں۔ وہی سب آسائشیں جو امریکا میں ہوتی تھیں۔

”یار گھر یہ سب چیزیں تو یہاں بھی ہیں۔ تم لوگوں کا ماشا اللہ سے بڑا سا گھر ہے۔ تم اچھے سرجن ہو یہاں بھی خوب کما کھاؤ گے۔“

”نہیں یار کر اچھی رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ تم دیکھ رہے ہو، حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ گھر سے نکلنے کے بعد پتا بھی نہیں ہوتا کہ واپسی ہوگی کہ نہیں پھر اسکولوں کالجوں کا حال بگڑتا ہی جا رہا ہے۔ ہم لوگ تو گرامر کے پڑھے ہوئے ہیں لیکن اس زمانے میں گرامر کے علاوہ بھی اسکول تھے اب تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اگر آج بھی جاؤں تو میرے بچوں کے لیے یہاں پر کیا ہے، کچھ بھی تو نہیں ہے۔“

میں ہنس دیا تھا۔ ”اگر حالات پہلے جیسے ہو جائیں تو تم واپس آ جاؤ گے؟“ میں نے سوال کیا تھا۔

وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”شاید نہیں، میں تو اسکول کے زمانے سے امریکا کے خواب دیکھ رہا تھا۔ گرامر اسکول کا ہر بچہ یہی خواب دیکھتا ہے۔ پاکستان میں کون نہیں دیکھتا ہے ہر کوئی دیکھتا ہے چاہے گرامر اسکول کا ہو یا کسی پہلے اسکول کا۔ فرق صرف یہ ہے کہ گرامر اسکول کے بچوں کے خواب پورے ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اس وقت بھی پتا ہوتا تھا کہ امریکا میں فٹ بال اور بیس بال کے چیمپئن کون ہیں اور امریکن چارٹ پر کون سی فلم۔ ہم لوگ امریکا جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے اور اسی لیے امریکا چلے بھی گئے تھے۔“



”پھر حالات کو ذمہ دار ٹھہرانا تو صحیح نہیں ہے۔“ میں نے سوال کیا۔

”ایک طرح سے صحیح ہے لیکن اگر حالات درست ہوتے تو شاید سوچا جاسکتا تھا۔ آخری اور ڈیڑی بھی تو یہاں ہی ہے نا۔۔۔“ اس نے جواب دیا تھا۔ میں دل میں فس دیا کہ دھوکا دے رہے ہو۔ کراچی اپنا مقدمہ ہار چکا ہے۔ کراچی دھوکا کھا چکا ہے۔ کراچی کے بیٹوں نے، کراچی کی بیٹیوں نے شہر سے بے وفائی کی۔ ہر ایک نے کراچی کو توڑا ہے۔ جو کراچی میں رہتے ہیں انہوں نے بھی اور جو کراچی سے بھاگ گئے انہوں نے بھی۔ برنس روڈ پر چھاڑی لگانے والے نے بھی اور تین کوار پر اپارٹمنٹ بنانے والے نے بھی۔ جاہل نے بھی، پڑھے لکھے نے بھی۔ میں نے کچھ کہا نہیں تھا، خاموش رہا تھا۔ یہ کراچی کا نم تھا۔ یہ کراچی کی بات تھی۔ یہ کراچی کا درد تھا۔ یہ کراچی کا نوحہ تھا۔ یہ کراچی کا الیہ تھا۔ ٹینی سی میں رہنے والے کو کیا سمجھ میں آئے گا۔ جس دن ڈیڑی مر جائیں گے اس دن ٹینی سی کا یہ رشتہ بھی ختم ہو جائے گا۔

”یار تم ہی ڈیڑی کو سمجھاؤ اس نے مجھ سے کہا تھا۔“ یہاں کیا کر رہے ہیں، بے کار ہے یہاں رہنا۔ میں نے تو بہت کہا ہے کہ ٹینی سی کا یہ مکان بیچ دیں اور میرے ساتھ ٹینی سی میں رہیں۔ میرے ساتھ، ٹینی سی کے ساتھ اپنے پوتوں پوتیوں کے ساتھ۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا مگر یہ کراچی میں پلے پڑھے تھے یہاں ان کے دوست ہیں، رشتے دار ہیں، ان کا جانا بچانا موسم ہے۔ ٹھیک ہے بارش ہوتی ہے اور پانی کھڑا ہو جاتا ہے یہ تو ان کے بچپن سے ہو رہا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ سخت گرمی میں بجلی چلی جاتی ہے اور ایئر کنڈیشنرز کھٹے بھی بند ہو جاتے ہیں۔ ٹینی سی میں تو ایسا نہیں ہوتا ہوگا۔ یہاں ہوتا ہے یہ تو اس کے عادی ہیں۔ گٹر لائن بند ہو جاتی ہے اور گلی میں پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ کون سی نئی بات ہے اور یہ بھی عجیب نہیں ہے کہ ٹینوں میں پانی آنا بند ہو جاتا ہے اور ٹینوں سے پانی منگنا پڑتا ہے۔ یہ سب باتیں کہنا بے کار تھا۔ میں نے یہ کہا بھی نہیں تھا۔ میں نے تو کہا تھا پہلے کراچی میں قتل نہیں ہوتے تھے۔ پہلے کراچی کے بچے پستول نہیں چلاتے تھے۔ پہلے پدمشاش گھروں میں گھس کر عورتوں، لڑکیوں کی عزت پامال نہیں کرتے تھے۔ پہلے کراچی والے رات کے اندھیرے میں یوزھوں کو مار مار کر انہیں لوتے نہیں تھے۔ اب یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ کیوں آپ یہاں رہے ہیں؟ چلے جائیں، کریم کے پاس، شازبہ کے پاس۔ اب کراچی میں

آپ کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔“ انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا، مسکرائے تھے، خاموش رہے تھے۔ کریم پھر چلا گیا اور شازبہ بھی چلی گئی تھی۔

ایک رات میں ان سے ملنے گیا تو میں نے محسوس کیا تھا کہ بڑھا پان کے قریب آ گیا ہے۔ باتوں باتوں میں کراچی کی بات چل نکلی، حالات اور بھی خراب ہو گئے تھے۔ اب تو ان علاقوں میں بھی گزربز ہو رہی تھی جہاں پہلے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ پان کے اس طرف کلکشن اور ڈینٹس میں بھی ڈاکے پڑنے لگے تھے۔ وہ بہت دکھ سے بولے تھے۔ ”یاد ہے تم نے آپ دن کہا تھا کہ کراچی میں اب کیا نہیں ہوتا۔ ہم جب کراچی آئے تھے تو کچھ نہیں ہوتا تھا۔ سب کچھ اچھا تھا، چھوٹا شہر تھا مگر سب کچھ موجود تھا۔ ہر مذہب کے لوگ، امیر تریب سب رہتے تھے اور ان کو ضرورت کے مطابق چیزیں بھی ملتی تھیں۔ پانی بھی ملتا تھا۔ گٹر لائنیں بند نہیں ہوتی تھیں۔ بارش کا پانی ٹھہرتا نہیں تھا۔ اسکول بند نہیں ہوتے تھے۔ لوگ قتل نہیں ہوتے تھے۔ یہ تو اب ہو رہا ہے، اس لیے ہو رہا ہے کہ کراچی میں ہر فرد نے کراچی سے دھوکا کھا ہے۔ جو پڑھ لکھ گیا ہے وہ کراچی چھوڑ گیا ہے۔ جوان پڑھ۔ پڑھ وہ ان کی نقل کر رہا ہے۔ جو قانون توڑ رہے ہیں ٹریک کے قانون سے بلڈنگ کے قانون تک۔“ انہوں نے بہت دکھ سے کہا تھا۔ ”کراچی ختم ہو جائے گا۔“ میں نے ہلکی دھماکانے کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی دیکھی تھی۔

ایک رات آئی قانون آیا تھا کہ اٹکل کر گئے ہیں۔ میں فوراً انہیں دیکھنے گیا تھا۔ وہ ٹھیک تھے کوئی خاص بات نہیں تھی مگر میں نے کہا کہ میں ان کی آنکھوں کا معائنہ کروں گا۔ مجھے لگا کہ جیسے انہیں دیکھنے میں کوئی تکلیف ہو رہی ہے۔

دوسرے دن میں نے ان کا اپنے کینک میں تفصیلی معائنہ کیا۔ ان کی دونوں آنکھوں میں موتیا تھا۔ انہیں فوری آپریشن کی ضرورت تھی۔ انہوں نے کہا کہ وہ آپریشن کرائیں گے اگر ضرور نا ہے۔

اسی رات میں نے کریم کو فون کر کے بتایا۔ اس نے کہا کہ میں آپریشن کا پلان کروں، وہ خود بھی آ جائے گا۔ میں نے آپریشن پلان کر لیا مگر کریم نہیں آسکا۔ اس کی مصروفیت تھی۔ آپریشن نہیں ہو سکا تھا۔ دوسری دفعہ بھی یہی ہوا تھا۔ کریم اور شازبہ دونوں کے بچوں کے اسکول کا وقت تھا۔ وہ دونوں نہیں آ سکتے تھے۔ آپریشن پھر ملتوی ہو گیا تھا۔ آپریشن اتنا مشکل نہیں تھا کہ ان لوگوں کی موجودگی



مردری تھی۔ میں نے ان کے گھر جا کر انہیں سمجھایا کہ آپریشن کرائیں۔ اگر کریم اور شازیہ نہیں ہیں تو کیا فرق پڑتا ہے، میں تو ہوں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے آپریشن تو میں روز کتنے ہی کرتا ہوں۔ اگر وہ لوگ مصروف ہیں، ان کے بچے اسکولوں میں پھنسے ہوئے ہیں، اگر دونوں میں سے کسی کو بھی چھٹی نہیں ملتی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ پریشان ہوتے رہیں۔

میں نے پھر کریم کو فون کر کے بتایا اور اس دن وہ ہسپتال میں داخل بھی ہو گئے مگر آپریشن تھیز تک جانے کے بعد آپریشن سے انکار کر دیا۔ ان کے چہرے پر وحشت عیاں تھی۔ وہ بار بار ہنسنے جاتے تھے۔ انہوں نے سختی سے میرا ہاتھ پکڑا تھا، ان کے ہاتھ پیسنے میں شراہور تھے۔ انہوں نے بڑی شرمندگی سے کہا تھا کہ نہیں آج آپریشن نہیں کراؤں گا۔ ان کا آپریشن پھر کینسل ہو گیا تھا۔

اسی روز شام کو میں اور نغمہ ان کے گھر گئے۔ گیٹ لوکر نے کھولا۔ ڈینٹس کے اس بڑے سے بنگلے میں ایک عجیب قسم کا سناٹا تھا۔ ہوکا عالم۔ باہر لان میں ہلکی ہلکی روکنی تھی۔ دروازے کو دھکا دے کر ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ بڑے سے لاؤنج کے آخری سرے پر کریم کی امی بیٹی ٹیلی ویژن دیکھ رہی تھیں۔ ہم دونوں کو دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی تھیں، بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ رکھا تھا، نغمہ کو پیار کر کے اپنے ساتھ ہی بٹھالیا تھا۔

انگل کہاں ہیں؟ میں نے سوال ہی کیا تھا کہ وہ لاؤنج کے برابر والے کمرے سے نکلے۔ میں اٹھ کر گیا ان سے ہاتھ ملایا۔ ان کے چہرے پر ابھی تک ایک عجیب قسم کا تاثر تھا جیسے شرمندہ سے ہوں۔ انہوں نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا اور بڑی شرمندگی سے دوبارہ بولے۔ ”مجھے معاف کر دیا ہے نا۔۔۔ تمہیں بہت تکلیف دی ہے میں نے۔ بہت پریشان کیا ہے۔ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔“

مجھے آنسوؤں ہوا تھا۔ تھوڑی سی شرمندگی بھی۔ وہ ایک طرح کے احساس جرم کا شکار تھے اور مجھے ایک عجیب قسم کا احساس ہو رہا تھا۔ میرا ہاتھ پکڑے پکڑے وہ تھوڑی دیر کچھ سوچتے رہے، پھر آہستہ سے مجھے پکڑ کر اسی کمرے میں لے گئے جہاں سے وہ نکل کر آئے تھے۔

”یہ کریم کا کرا تھا اور اس کے برابر میں شازیہ کا کرا ہے، شازیہ نے تو چلے ہی جانا تھا۔ اتنی دور میں نے سوچا نہیں تھا۔ بیٹیاں تو چلی جاتی تھیں مگر کریم کیوں چلا گیا تھا۔ دیکھو ہم نے یہ کرا چھوا تک نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہمیں

یقین تھا کہ وہ آجائے گا۔“  
میں پہلے کبھی اس کمرے میں نہیں آیا تھا۔ بڑا سا بستر تھا جس کے سرہانے ایک بڑا سا پوسٹر تھا۔ بروں اسپرنگ، پھٹی ہوئی جینز پہنے سر کے گرد رومان بانڈ سے منار لیے کھڑا تھا۔ ہاتھ روم کے دروازے پر ایک چمپینزی کی تصویر لگی ہوئی تھی جس کے ہاتھ میں ٹوٹھ برٹش تھا جس پر پیسٹ لگا رہا تھا۔ بستر کے برابر میں پڑھنے کی آہٹ چھوٹی سی ٹیبل تھی جس پر کریم کی پرانی کتابیں سلپتے سے آئی ہوئی تھیں۔ ٹیبل کے اوپر ”بیرالڈ“ کے کسی پرانے ٹائٹل کو پھاڑ کر دیوار پر چپکایا گیا تھا۔ ٹائٹل پر ایک مردہ قاضی کی تصویر تھی جس کے اوپر امن کا نشان لگا ہوا تھا۔ اس ٹائٹل کے ساتھ ہی پاکستان کا ایک جھنڈا بھی ڈرا سا نیچے کر کے لگا ہوا تھا۔ اٹنے ہاتھ کی دیوار پر ایک فریم میں کریم کی بچپن کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ سیدھے ہاتھ کی دیوار پر ایک اور بڑا سا پوسٹر مائیکل جیکسن کا لگا ہوا تھا جس میں اس نے دونوں ہاتھ کریم کی تصویر کی طرف اٹھائے ہوئے تھے یہ اس کی ناچتی ہوئی تصویر تھی۔ پوسٹر کے نیچے موٹا موٹا لکھا ہوا تھا۔ ”آئی ایم بیڈ آئی ایم بیڈ۔“ (I am bad, I am bad) میں نے یہ کرا پہلے نہیں دیکھا تھا۔ بڑے سے گھر نا۔ نیچے کا کرا تھا۔ اب تو کریم کی پہلی منزل کے ایک بڑے سے کمرے میں ٹھہرا تھا۔ میں چاروں طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے ان کی چھتتی ہوئی مضبوطی آواز آئی۔ ”کل میں یہ سارے پوسٹر اتار دوں گا۔ یہ کتابیں رومی میں چلی جائیں گی۔ یہ سائیکل جو کونے میں کھڑی ہے مالی کے بچے کو دے دوں گا۔ یہ چھوٹی چھوٹی سیپوں کا ڈھیر جو میں نے اور کریم نے ساتھ ساتھ کلکشن پر جمع کیا تھا جس کو اس نے کبھی کسی دہاتھ لگانے نہیں دیا تھا، اسے میں سمندر میں دوبارہ پھینک آؤں گا۔ یہ اس کے اسکول کے زمانے کے ڈاک کے ٹکڑوں کا البم بھی رکھنا بے کار ہے۔ یہ گھر کے پرانے اخباروں اور کاغذوں کے ساتھ بک جائے گا۔ یہ کرا اور اس کمرے کی چیزیں اب کوئی معنی نہیں رکھتی ہیں۔ ان سے میرا رشتہ ٹوٹ چکا ہے اور یہ رشتہ ہے جس نے مجھے بار بار تمہارے سامنے شرمندہ کیا ہے۔ تم برسوں میرا آپریشن رکھ لو۔ کریم کو بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس دفعہ تم پریشان نہیں ہو گے۔ میں وہاں سے نہیں بھاگوں گا۔“

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ صحیح کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”آؤ چلو چائے پیتے ہیں۔“





حجی الدین نواب

سولہویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پرچوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوس قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہو یا بلند آسمان کے سات پرے... تہندی ہوائوں کے چھونکے ہو یا باد و باران کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھیوار کا ترنہ اور کبھی بجلی کی چمک، کبھی پھولوں کی شہک، کبھی کائناتوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھری ہیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنا یا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں جھکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تغیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی صربان ہو جائے... جنید ماروی بیت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پہنچ سکتی گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذبوں میں سموٹی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موز پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنڈین لمحات کی لعہ لعہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگہ۔

WWW.PAKSOCIETY.COM









پیداستان ہے وہ جدید کی مادی اور اس کے عاشق مراد علی منگلی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد لاہور، مادی، چاچا جیمرو اور چاچا مٹی کی ساتھ احمدیوں سے ایک گاؤں میں رہتے تھے گاؤں کا دلیر راجست جلالی ایک بددینت انسان تھا جس نے مادی کا ریشہ دوزی جڑ بھونک کے لٹا کر ماکھا تھا۔ چونکہ مادی مراد کی سبک تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہذا وہ اس پر ریشہ نہیں تھی نتیجتاً انہیں کٹھن چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ نوری تعلیم یافتہ تھا دلیر راجست کی کٹھنی گیری کرتا تھا۔ دلیر راجست جلالی اور اس کے بیٹے مراد اپنی ذہنیات کے مالک تھے اور انہوں نے جاہلوں پانے کی خاطر اپنی بیٹی زینکا کی شادی قرآن سے کر دی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک منجلی۔ زینکا نے بغاوت کا راستہ اپنا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہا تئیں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک مدت گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے فاقہ ہو گیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کرپٹی کے ایک مضامنی مطالعے میں گھر آ گئے جہاں مادی اپنے چاچا چاچا مٹی کے ساتھ پہلے ہی آ چکی تھی۔ سہیلی مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چاچا سے ہو گئی جو کہ مبرا آسلی اور بڑا نیکو انسان لیکن وہ بھروسہ کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چاچا نے اپنے ہم شکل کو کہہ کر تیراں ہوا پھر اسے یاد آیا۔ راجست جلالی جو کہ خود بھی مبرا آسلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے مستعار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کہ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زینکا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہو گئی۔ دلیر سے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کر لی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بیچے کے لیے ایک لوگرائی جو کہ زینکا کی کسی قد کاٹھی کی تھی بر باد کر کے لے کر آیا اور اس کا چہرہ بجز اب سے سچ کر کے اسے اپنی بیٹی کا خیر کر کے لے کر لایا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملتا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا اور اہل علم سے اپنی سبک دیکھ کر خود کو شگفتہ بنا دیا تھا۔ محبوب کے سر پرست اس کے والد کے زمانے کے معروف سچے تھے جو اس کے کاروباری معاطات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سیرا کو کھڑی کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران مادی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل ہوا جان سے مرعوب لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور مثال مادی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زینکا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زینکا مراد کے بیچے کو ختم دے کر دوسرے بیچے کی پیدائش کے دوران چل بس لیکن دلیر باپ اور بیٹوں کو نہیں تھی کہ زینکا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں راجست جلالی تھی لیکن مراد سے ملاقات تھی۔ وہ شہر اور بیٹوں سے بھی ہمراہ تھی لہذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس سچے مشورے سے ملوث تھا اور محبوب چاچا نے مادی کی خاطر اس کے مشورے کی بھروی کر دیا تھا۔ ہی باعث اس کی دلیر راجست سے دشمنی ہو گئی۔ یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچ گئی نتیجتاً چاچا نے مستطاب سے کر چلا آیا۔ یوں مادی کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ استغرا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی کھلی کی شادی میں شرکت کے لیے گھر گئی، تاہم محبوب چاچا پواسے پہلا آیا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ لیجنٹ برنارڈ گورڈا کرمانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین لاکھت مرید بھرام اور وہاں آ کر آئے۔ مرید مراد کو ایک مفرد دیکھ کر دل ہار گئی۔ مشورے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب نیک سچے سے ان کا مددگار تھا اور تھی کہ مادی کو محبوب کے اسانات سے بیچے کے لیے جان لو جو کہ فاقہ ہو گئی۔ اس خبر کے بعد دلیر راجست جو کہ خود مراد کی سبک تھیل میں تھے وہاں جبکہ دوسری جانب مادی کی تلاش کا لالچاؤ۔ مراد کو سچے چلر باپ کی مدد سے قتل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی سبک بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد نے سبک تھیل بھانپ کر اسے بھانسا دیتے ہوئے اس کے پیچھے سے فرار ہو گیا۔ جبکہ دوسری جانب مبرا اور سچے صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرید اپنے باپ کے قتل پر بہت شاطرات چائیں چل رہی تھی۔ مگر قسمت کی دیوی مراد پر مہربان تھی جو مرید کے ہاتھوں سے قتل کیا تھا، اتفاق سے راستے میں مادی چاچا اور چاچا اس کے ساتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو گولیاں مرید مادی کو حاکم قتلہ کے چھری کے پاس لے جا رہی ہے لہذا مشکلات سے فرار ہونے والے مراد کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے مادی کے سر میں چوٹ لگی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت مٹی جاتی ہے۔ مراد کو خبر تھی کہ قاتل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے بتا دے اور مادی کے ساتھ قتل سے بچا جائے پر آمادہ کر کے خود مسلمانوں کے پیچھے بند ہو جاتا ہے۔ مرید اور مراد میں فساد برپا ہوا تھا۔ مرید کے پانچ لاکھ مراد کو کسی نہ کسی طرح قتل سے نکال کر لے جاتے ہیں۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں قانون کا فطرتاً ہی مراد برنارڈ مراد کے ہاتھوں مر جاتا ہے۔ مادی کا علاج ہوتا ہے مگر مادی کو محبوب اور مراد دونوں کو لٹک بچا تھی۔ مرید مراد کو بھروسہ میں لے آئی تھی۔ مراد مرید کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر ویو کے ساتھ مل گیا۔ مرید کے راستے میں بھر رکاوٹ بن گیا۔ مرید کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ..... اور مادی کے مددگار میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آ جاتی ہے۔ مراد مرید کے ذریعہ اثر آچکا تھا۔ مادی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کر دیا تاہم مراد نے اسے اپنی پارسیائی کا چھین دلا اور کہا کہ وہ اس اہل سے نکل آئے گا۔ مبرا خاتون نے مراد کے بیچے کو مادی کے ہاں بچھوایا۔ اور مرید وہ وہ وہ IMET لیسر بن گئی تھی مراد کے ساتھ ڈبل گیم چل رہی تھی وہ مراد کو حاصل کر کے اور اس کے ساتھ کھوٹت بنا کر اسے ریشہ دوزیوں کو پیش کرنے والی تھی جس کے بدلے اسے اور اس کے لاپرواہت کو بھاسا کا ڈالہر کی رقم تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ٹینیسن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروائی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے چہرے سے جیسے وہ انسانی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست مبرا لٹک بھئی بھی آ گیا۔ مراد نے اس کی سبک تھیل کر کے اسے اپنے چہرہ سے بدلایا۔ اب مبرا مبرا لٹک بھئی مراد میں گیا تھا۔ مبرا مراد کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے گھبراہٹ میں مبرا کی تعلیم کی اور تئیں مرگرم ہو تئیں۔ مادی کی یادداشت واپس آ گئی تھی۔ اور مرید نے اپنے لاپرواہی کو کٹھنی تھی۔ مراد نے اسے قاتل کر کے اس کی سرجری کروائی اور ایک ایمپلائن لگوا دیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ اب اس کے پاس شناختی چہرہ تھا۔ مبرا نے اپنی یادداشت۔ اس کی یادداشت توڑی اور اسے لے آئی تھی تاہم اس نے ڈاکٹر کو خبر دیا کہ مرید ہونے کا سخت دوسرا تھا۔ اس کا علاج ہونے لگا اور پاکستان کے لیے روانہ ہو چکا تھا اور مرید اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

COPIED FROM WEB WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



ایک خیال آیا کہ مراد ME کے جاسوسوں سے بھی چھپ کر نہیں رہ سکے گا۔ اگر ڈائریکٹر جنرل کو معلوم ہوگا کہ میں ڈاکٹر ٹینیسن کے بیٹے ایمان علی کے پیچھے آئی ہوں تو اس کے جاسوس ایمان علی کو کرید کر اس کے اندر سے مراد کو نکال لیں گے۔

وہ سوچنے لگی۔ 'میں یہ ظاہر نہیں کروں گی کہ ایمان علی کو پکڑنے لندن واپس آئی ہوں۔ پھر بھی یونا کبڈی گزبڈ کرے گا۔ وہ مراد کا ہم شکل بنا ہوا ہے۔ وہاں MET کے علاوہ دوسرے تمام دشمن اس پر نظر رکھیں گے۔ معلوم کرنا چاہیں گے کہ ایک یونا کس طرح مراد کا ہم شکل بن گیا ہے؟' علق پہلوؤں سے سوچتے رہتے پریشان کرنے والی اور باتیں بھی سمجھ میں آتی رہتی ہیں۔ ایک خیال آیا کہ ایسے وقت ایمان علی بھی ان کی نظریں میں رہے گا۔ مراد کی کسی قلعی سے حقیقت کھل سکتی ہے۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا مراد کسی دشمن کے ہتھے چڑھ جائے یا بے خبری میں مارا جائے۔ فی الحال تو اسے سیکورٹی دینے کے لیے جلد سے جلد لندن جانا ضروری ہو گیا تھا۔ اس نے برطانوی سفیر سے فون پر کہا۔ "میں کسی بھی پہلی فلائٹ سے لندن جانا چاہتی ہوں۔ کسی بھی فلائٹ میں ابھی سیٹ اوکے کر ائیں۔"

"میڈم یہی ہوگا۔ میں کوشش کرتا ہوں۔" آدمے کھٹے بعد جواب ملا۔ "میں نے سیٹ اوکے کرادی ہے۔ کل ایک فلائٹ سے اسرائیل کے شہر تل ابیب جاؤ گی وہاں سے لندن کی کنکٹ فلائٹ میں تمہاری سیٹ کنفرم ہوگی۔"

پہلی ہوئی کہ کل رات تک لندن پہنچ جائے گی لیکن یہ بے چینی تھی کہ مراد اس سے پہلے وہاں پہنچ گیا تھا۔ مرینے نے دہلی ائرپورٹ میں ورشا کو دیکھا تھا۔ وہ بڑے عقیم سے ماں کے خلاف مراد کو پکڑنے وہاں آئی تھی۔ اس کے ساتھ تین بیٹے کئے جوان مرد بھی تھے۔ وہ یقیناً جاسوس ہوں گے یا کسی تنظیم سے تعلق رکھنے والے شوٹرز ہوں گے۔

بہر حال مرینے کی طرح وہ بھی ناکام ہوئے تھے۔ وہ بھی جان گئے تھے کہ مراد دو روز پہلے ہی لندن چلا گیا ہے۔ صورت حال یہ تھی کہ وہ بھی ضرور مراد کو وہاں گھیرنے کی کوشش کریں گے، وہ بھی کسی فلائٹ سے لندن جا رہے ہوں گے۔ مرینے یہ چاہتی تھی کہ اس سے پہلے کوئی مراد تک نہ پہنچے۔ جبکہ تمام دشمنوں کو اس کی اگلی منزل کا پتا معلوم ہو گیا تھا۔

وہ اور زیادہ بے چینی میں مبتلا ہو گئی۔ اپنے فون کو

اس نے آنکھیں کھولیں پہلے چند ساعتوں تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں ہے؟ پھر یاد آیا کہ وہ تو ائرپورٹ کی وزیر زلابی میں تھی۔

وہ اچھل کر بیٹھ گئی۔ "یا حیرت...! میں یہاں کیسے آ گئی؟" اس وقت وہ اپنے آرام دہ بیڈ روم میں تھی۔ وقت تماشے دکھاتا ہے۔ ہدلتے ہوئے لمحات میں نام بدل دیتا ہے۔ صورت اور مقام بدل دیتا ہے۔ آنکھیں بند کرو اور پھر کھولو تو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔

یہ فوراً سمجھ میں آ گیا کہ وہی سونے اور جاگنے کا قصہ تھا۔ کبھی دماغ سو جاتا تھا اور وہ غائب دماغ ہو کر خود کو بھول جاتی تھی پھر دماغ جاگتا تو وہ ہوش و حواس میں آ جاتی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ وہ ہوش میں آ کر یہ سوچ کر جھنجھلا گئی کہ ایسے ہی وقت دماغ ناکارہ کیوں ہو گیا تھا؟ جب وہ عبداللہ کبڈی اور ڈاکٹر ٹینیسن کو لندن جانے سے روکنا چاہتی تھی۔

پتا نہیں وہ بیماری کب تک اس پر مسلط رہے والی تھی؟ اس نے ڈاکٹر سے پوچھا تھا۔ ڈاکٹر کا کام ہے تسلی دینا اس نے کہا تھا کہ اسے زود اثر دوا میں دی جا رہی ہیں۔ جلد ہی مہلک دواؤں کا اثر زائل ہو جائے گا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر بڑبڑائی۔ پتا نہیں کب اثر زائل ہوگا۔ مراد عجیب طرح سے دشمنی کرتا آ رہا ہے۔ مجھے اسکی بیماری سے ہاندہ گیا ہے کہ میں پوری طرح ایکشن میں رہنے کے قابل نہیں رہی ہوں۔ غائب دماغ ہو کر جیتی ہوئی بازی ہار جاتی ہوں۔ وہ ہار گئی تھی۔ مراد ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس نے ائرپورٹ میں ذرا قافلے سے جتنی باکی کی باتیں سنی تھیں۔ وہ اپنی بیٹی ورشا سے کہہ رہی تھی۔ "میں نے تمہیں آج کے دھوکے میں رکھ کر مراد کو پرسوں ہی یہاں سے روانہ کر دیا ہے۔"

وہ دھوکا کھا گئی تھی۔ اس نے ائرولینز ایجنسی سے معلوم کیا تھا کہ ڈاکٹر ٹینیسن بونے کبڈی کے علاوہ اپنے بیٹے کے ساتھ آج کی فلائٹ سے لندن جانے والا ہے جبکہ ڈاکٹر کا پتا یعنی مراد دو دن پہلے ہی لندن چلا گیا تھا۔

وہ سنجیدگی سے سوچنے لگی۔ "پورا لندن میرے گھر جیسا ہے اور وہ جیسے میرے گھر میں ہی گیا ہے۔"

وہ پریشانی بھول کر مسکرائی۔ زیر لب بڑبڑائی۔

"ہائے مراد! بہت چالاک بننے ہو۔ بڑی چالاکی دکھا کر گئے ہو۔ اب خود ہی پھنس گئے ہو۔ وہاں مجھ سے چھپ کر نہیں رہ سکو گے۔ میں آج یا کل کسی بھی فلائٹ سے آ رہی ہوں۔"



صورت راتیں گزاری ہیں ان تمام راتوں کی قسم کھا کر کہتی ہوں، میری زندگی میں ایک کو مرد آیا ہے اور وہ تم ہو۔  
وہ بڑے جذبے سے بول رہی تھی۔ "میں تمہاری سلامتی کے لیے جان کی بازی لگاتی رہوں گی۔ تم دیکھو گے کہ کسی دشمن کو تمہارے قریب جھکتے نہیں دوں گی۔"  
"معلوم ہوتا ہے ضمیر بڑی طرح جھنجھوڑ رہا ہے شیک ہے آنے والا وقت بنائے گا کہ تم میرا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کیا کرتی رہو گی۔"

"میں کل رات تک وہاں آؤں گی۔ تم سے دور رہا کروں گی لیکن وعدہ کرو۔ فون پر رابطہ رکھو گے۔"  
"دور رہو گی تو یہ تمہاری دانشمندی ہوگی۔ یہ بتاؤ، کس فلائٹ سے آرہی ہو؟"

"انراٹھیا کی فلائٹ گل ایب تک ہے۔ وہاں سے دوسری فلائٹ میں لندن جاؤں گی۔"

اس وقت ایک باؤی گاڑی نے دروازے پر دستک دی۔ وہ بولی۔ "لیس کم ان۔"

وہ اندر آ کر بڑے دب سے بولا۔ "میڈم! ڈاکٹر سے چارپہچے کا اپائنٹمنٹ ہے۔"

وہ سر ہلا کر بولی۔ "اڑکے۔ جاؤ۔"

باؤی گاڑی چلا گیا۔ وہ فون پر بولی۔ "میں ابھی ایک سرجری کے ماہر کے پاس جا رہی ہوں۔ اپنی اصلی صورت واپس لانا چاہتی ہوں۔ تم نے جو سزا دی ہے، اسے اب ختم کرنے جا رہی ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "ماں! رات گئی بات گئی۔ جو ہو گیا اس پر مٹی ڈالو۔ اپنے اصلی چہرے کے ساتھ لندن آؤ۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ مراد فون بند کر کے سوچنے لگا۔ اس وقت وہ لندن میں نہیں گل ایب میں تھا۔ ڈاکٹر ٹیلی من نے دو روز پہلے اس کے لیے گل ایب تک جانے کی سیٹ کنفرم کرائی تھی۔

ڈاکٹر نے کہا تھا۔ "تم پہلی بار میرے بیٹے کی حیثیت سے میری فیملی کے لوگوں سے وہاں ملو گے۔ لہذا پہلے تمہیں نہیں جانا چاہیے۔ میں کبزی کے ساتھ وہاں پہنچ کر تمہیں فون کروں گا پھر تم گل ایب سے لندن آؤ گے۔"

اگرچہ مراد نے اس فیملی کے تمام افراد کے نام اور چہرے اچھی طرح یاد کر لیے تھے، ان کے بارے میں اور بہت سی اہم معلومات حاصل کی تھیں پھر بھی ڈاکٹر ڈیڈی کے ساتھ رہ کر ان لوگوں سے ملنا مناسب ہوتا۔ لہذا وہ گل ایب پہنچ کر دو چار دنوں کے لیے رک گیا تھا۔

دیکھنے لگی۔ اس نے نمبر بیچ کیے۔ پھر فون کو کان سے لگا کر انتظار کرنے لگی۔ دوسری طرف تیل جا رہی تھی۔ وہ بے چینی سے زیر لب کہہ رہی تھی۔ "مراد کہاں ہو...؟ پلیز اینڈ کرو۔ فون اٹھاؤ۔ فارگا ڈیسک مجھ سے باتیں کرو۔"

اس کی بے چینی ختم گئی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی آواز سنائی دی۔ "ہاں، یونو؟ معلوم ہوتا ہے، ہوش میں ہو۔ غائب و ماغ ہوتی تو کال نہ کرتی۔ خود کو بھولی رہتیں۔"

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سرد آہ بھرتے ہوئے بولی۔ "ہائے مراد...! کیسے کیسے مظالم ڈھاتے ہو۔ پہلے مجھے شیم مردہ کر کے سکھر کے اسپتال میں پہنچایا۔ دوسری بار بیچ بازار میں بے لباس کر کے تنہا چھوڑ دیا۔ تیسری بار میکرو فلم چھین کر مجھے نقصان پہنچایا اور اس بار مجھے ذہنی مریض بنا دیا۔"

وہ ہائے کے انداز میں سانس لیتے ہوئے بولی۔ "مجھے ہر بار یہی لگا کہ جان سے مار ڈالو گے یا نفرت سے بھی میرا منہ بھی نہیں دیکھو گے لیکن یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تم مجھے اپنے دل سے نہیں نکال سکو گے۔ میں درست کہہ رہی ہوں نا؟"

اس نے کہا۔ "یونو! تمہیں سن رہا ہوں۔"

وہ بولی۔ "تمہارے دل میں بھی چور ہے۔ تم ہر بار مجھے زندہ چھوڑ دیتے ہو۔ میں بھی ڈھیٹ ہوں۔ میرا یہ دل ہے کہ تم سے مات کھاتے رہنا چاہتا ہے۔"

مراد نے کہا۔ "ہاں تم بہت اچھی ہو لیکن سر کا سودا کرنے والی سے صرف نفرت ہی کی جاتی ہے۔"

"مجھ سے کوئی قسم لے لو۔ تم نے مجھے ہر بار زندہ چھوڑ کر میرے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا ہے۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ پتا نہیں اب تمہارے دل میں جگہ بنا سکوں گی یا نہیں؟" پھر وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "آئندہ تم مجھ پر اعتماد کرو یا نہ کرو۔ میں تمہاری باؤی گاڑی بن کر رہوں گی۔ دشمنوں کو تمہارے سائے تک بھی نہیں چھینے دوں گی۔"

وہ عاجزی سے بولی۔ "میری یہ بات مانو مراد! تم نے لندن جا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ ریڈ الٹ، ڈنجرس ریکٹ اور نہ جانے کتنی ہی دشمنیں وہاں تمہارے قریب ہوں گی۔ مجھے اپنے ڈیپارٹمنٹ والوں سے اندیشہ ہے۔ میرے MET ڈیپارٹمنٹ کے جاسوس تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ تمہیں پہچاننے کے لیے تمہارے آس پاس جھکتے رہیں گے۔"

وہ بولا۔ "میٹ ڈیپارٹمنٹ کی سب سے خطرناک افسر تم ہو اور تم تو میرا تپا چہرہ بھی پہنچاتی ہو۔ یہی دشمن تو تم ہی ہو۔"

"مجھ پر اعتماد نہ کرو۔ میں نے تمہارے ساتھ جتنی خوب



ہو گئے۔ مراد نے فوراً ہی پوچھا۔ ”تم ایمان علی ہو؟“  
اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟“  
وہ بولا۔ ”تم ڈاکٹر مئی سن کے بیٹے ہو؟“  
”ہاں، کیا تم انڈیا سے آئے ہو؟“  
مراد نے مسکرا کر کہا۔ ”ہاں، میں بھی ڈاکٹر مئی سن کا  
بیٹا ایمان علی ہوں۔“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“  
مراد مزے لے رہا تھا۔ ”میں پہلے ڈیڑی کی طرح  
جیسا ہی تھا۔ پھر میں نے یہ دین قبول کر لیا ہے۔ پہلے میرا نام  
روبن سن تھا۔ تمہارا بھی یہی نام تھا؟“  
”ہاں، مگر تم حیران کر رہے ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”یہاں جس مجبور کے آگے سجدہ کرنے آئے ہو، وہ  
یہی کرتا ہے، جو کبھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ وہ دکھاتا ہے۔“  
وہ اس کے شانے کو تھپ تھپ کر بولا۔ ”نی الحال حیرانی کو  
بھول جاؤ۔ نماز پوری کر لو۔ بعد میں باتیں ہوں گی۔“  
شدید حیرانی ہو اور تجسس پیچھا نہ چھوڑے تو نماز بھی  
پوری توجہ سے نہیں ہوتی۔ ایمان علی بار بار عبادت میں دل  
لگا رہا تھا لیکن حیرانی ذہن پر مسلط ہو گئی تھی۔ وہ ان لمحات  
میں بھول گیا تھا کہ اس کا باپ پلاسٹک سرجری کا ماہر ہے،  
چہرے بدل دیتا ہے۔

وہ نماز کے بعد مسجد کے قرن میں آ کر بیٹھ گئے۔ ایمان علی  
نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ایسا لگ رہا ہے جیسے  
میں آئینے کے سامنے ہوں اور اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔“  
مراد نے پوچھا۔ ”کیا ہماری دنیا میں ہم شکل نہیں ہوتے؟“  
وہ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ”بھی بھئی سننے میں آتا  
ہے۔ میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔“

”کیا محض ہم شکل ہونے پر حیران ہو؟“  
”نہیں۔ حیرانی یہ ہے کہ تم بھی میری طرح کسی ڈاکٹر  
مئی سن کے بیٹے ہو اور تمہارا نام بھی ایمان علی ہے۔“  
وہ بری طرح الجھ گیا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا  
ہے؟ تم کہتے ہو کہ تمہارا نام بھی ایمان علی تھا اور تم نے دین  
اسلام قبول کر کے اپنا نام ایمان علی رکھا ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، میں جموٹ بول رہا ہوں؟“  
”تم مسجد میں بیٹھے ہو۔ تمہیں جموٹا نہیں کہوں گا، لیکن  
میرا خیال ہے، تم میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو اور  
مجھ سے بہت کچھ چھپا کر تفرقہ کر رہے ہو۔“  
”ہاں۔ میں تمہارے بارے میں... جانتا ہوں۔“

اگر تم کچھ اور بتاؤ گے تو پھر میں اصل بات بتاؤں گا۔“

ایک ایمانی جذبہ یہ تھا کہ وہاں جانے کا موقع ملا ہے تو  
وہ بیت المقدس کی تمام چھوٹی بڑی مسجدوں میں نمازیں  
پڑھے گا اور زیادہ سے زیادہ وقت وہاں گزارے گا۔

اب اتفاقاً یہ ہو رہا تھا کہ مرید کو براہ راست لندن  
جانے کے لیے کوئی فلائٹ نہیں ملی تھی۔ وہ وہلی سے گل ایبیب  
اور گل ایبیب سے لندن جانے والی تھی۔ یعنی مراد جہاں  
عارضی قیام کر رہا تھا وہاں پہنچنے والی تھی۔ یہی تقدیر کا تماشا  
تھا۔ دونوں کے ستارے ٹکرا رہے تھے۔ ویسے یہ اطمینان تھا  
کہ اس سے سامنا نہیں ہوگا کیونکہ وہ گل ایبیب سے دور قبلہ  
اول میں عبادت کر رہا تھا اور ڈاکٹر ڈیڑی کی کال آنے تک  
وہیں رہنے والا تھا۔

وہ بڑے جذبے سے اپنے بارے میں سوچنے  
لگا۔ جب سے اس نے دل سے یہ عہد کیا تھا کہ گناہوں سے  
دور رہنے کے لیے پاک صاف رہے گا اور پانچوں وقت کی  
نمازیں پڑھتا رہے گا۔ تب سے اس کی زندگی میں ایک  
مخصوص ہی اور نامعلوم ہی روحانی تبدیلی آئی تھی۔

وہ بے پور سے اب تک آزمائش کے کئی مراحل سے  
گزر چکا تھا۔ کئی حسیناؤں کی تمہائیوں میں آ کر بھی گناہوں  
سے دور رہا تھا۔ جب بھی اس نے آخری فیصلہ کیا کہ مر جائے  
گا لیکن حوا کی بیٹی کو بدعتی سے ہاتھ نہیں لگائے گا۔ تب ہی  
اس نے قدرت کا کرشمہ اور تقدیر کا تماشا دیکھا تھا، جس  
مرحلے پر گناہوں سے بچتا ناممکن ہو گیا تھا وہاں نماز نے  
اسے ممکن بنا دیا تھا۔

کتنے ہی لوگ بڑی دل چسپی سے نمازیں پڑھتے ہیں  
لیکن ان کے مسائل حل نہیں ہوتے۔ کیونکہ نماز تقاضا کرتی  
ہے، نیک اعمال کا اور یہ کہ نمازی اپنا عہد آپ کرے اور مراد  
یہی کرتا آرہا تھا۔ نماز کے ساتھ ساتھ اپنی توجہ ارادی سے  
اپنے اعمال درست کرتا آرہا تھا۔ اسے دلی آسودگی حاصل ہو  
رہی تھی اور وہ رفتہ رفتہ اپنی مازوی تک پہنچنے ہی والا تھا۔

اس وقت وہ مسجد عمر بن خطاب میں ظہر کی نماز ادا کر رہا  
تھا۔ اللہ تعالیٰ کی شان نرالی ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ابھی نماز  
پڑھتے پڑھتے کیا ہونے والا ہے؟ یہ وہ جگہ ہے، جہاں روحانی  
سکون حاصل ہوتا ہے۔ وہ مسجد میں نمازیوں کے درمیان تھا۔  
احتیاط پڑھنے کے بعد اس نے دائیں طرف منہ... پھیرا  
تو ایک دم چونک گیا۔ اسے اپنے برابر اپنا ہم شکل ایمان علی نظر  
آ رہا تھا۔ وہ بھی نماز کی حالت میں تھا اور سلام پھیر رہا تھا۔ وہ  
بھی اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

وہ دونوں یکجہت ذرا گھوم کر ایک دوسرے کے روبرو



اس نے قائل ہو کر سر ہلایا۔ مراد نے کہا۔ ”تمہیں اپنی نظروں کے سامنے دیکھتے رہنے کے لیے بڑے جذبے سے میرے چہرے پر تمہارا یہ چہرہ بتایا ہے۔“

اس نے چند لمحوں تک مراد کے چہرے کو دیکھا پھر پوچھا۔ ”ہر شخص کو اپنے پیدا کی چہرے سے محبت ہوتی ہے وہ بار بار آئینے میں خود کو دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ کیا تمہیں اپنے پیدا کی چہرے سے محبت نہیں تھی؟ یا چہرہ بدلنے کی کوئی خاص وجہ ہے۔“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ یہ سمجھ لو کہ میں نے حالات سے مجبور ہو کر ایسا کیا ہے۔“

”پھر تو یہ لمبی کہانی یقیناً دلچسپ ہوگی۔ تم میرے اندر جھنسن پیدا کر رہے ہو۔“

مراد سکرانے لگا۔ وہ بولا۔ ”تم میرا چہرہ اپنا کر ڈیڑھ کی زندگی میں میری کمی پوری کر رہے ہو۔ ہم ایک ہی چہرے کے رشتے سے آپس میں بھائی ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کے حالات سے پوری طرح واقف ہونا چاہیے۔“

”دوست کہتے ہو۔ بے شک ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہونا چاہیے۔“

وہ عاجزی سے بولا۔ ”پلیز اپنی ہسٹری سناؤ۔ میرے بارے میں بھی جو حالات کرو گے میں جواب دیتا رہوں گا۔“

مراد نے کہا۔ ”لحج کا وقت گزر چکا ہے اور مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ کسی ہوٹل میں چل کر کھا لیں گے اور میں اپنی روواؤ سنا تا جاؤں گا۔“

وہ بولا۔ ”ہوٹل میں کیوں؟ میرے گھر چلو، یہاں ایک کرائے کے مکان میں رہتا ہوں۔ تمہیں اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھلاؤں گا۔“

وہ اس کے ساتھ بھان ملے کے مکان میں آ گیا، راستے میں اپنی ہسٹری سنا تا رہا۔ کھانے کے دوران بھی اس کی روواؤ جاری رہی۔ وہ بڑی توجہ اور حیرانی سے سن رہا تھا۔

جب مراد خاموش ہوا تو اس نے کہا۔ ”بڑی عجیب زندگی گزار رہے ہو۔ جرائم کی دلدل میں دھنستے جا رہے ہو اور محبت کے پھول کھلاتے جا رہے ہو۔ میں دعا کروں گا کہ جلد ہی اپنی مادی کے پاس پہنچ جاؤ۔“

وہ کھانے کے بعد بولا۔ ”ایک بات کہوں؟“

”ہاں کہو؟“

”تمہاری ایک بات کا یقین نہیں آ رہا ہے۔“

”میں تمہیں اپنے بارے میں کیا بتاؤں؟“

”یہی کہ تم دین اسلام قبول کرنے کے بعد باپ کو چھوڑ کر کیوں چلے گئے؟“

وہ تھوڑی دیر تک سر جھکائے چپ رہا، پھر بولا۔ ”جب میں نے دین قبول کیا تو ڈیڑھ ہی نے کہا۔ تم میرے لیے مر چکے ہو۔ میرے گھر سے نکل جاؤ۔ میں نے سوچا۔ واقعی ان کا عیسائی بیٹا رہا، سن ان کے لیے مر چکا ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ مجھے عیسائی باپ کے گھر میں نہیں رہنا چاہیے۔“

مراد نے پوچھا۔ ”تمہارے دل نے کیسے گوارا کیا کہ ایک بوڑھے باپ کو تمہارا چھوڑ کر چلے جاؤ؟“

”ڈیڑھ ایسے بھی بوڑھے نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں دفع ہو جاؤں گا تو وہ دوسری شادی کر لیں گے۔ کئی بیٹوں کے باپ بن کر دکھائیں گے۔ میں نے سوچا کہ ڈیڑھ نے میری خاطر دوسری شادی نہیں کی تھی۔ اچھا ہے، اب کریں گے تو ان کی زندگی میں خوشگوار تبدیلیاں آ جائیں گی۔“

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ ”میں مسلمان ہو گیا۔ ہم باپ بیٹے کی زندگی گزارنے کے طور پر تھے الگ ہو گئے۔ مجھے الگ ہو جانا چاہیے تھا۔ لہذا وہاں سے چلا آیا۔“

اس نے ذرا ترک کر کہا۔ ”میں انہیں بہت چاہتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ وہ ابھی اولاد پیدا کرنے کے قائل ہیں۔“

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”مجھے یہ اطمینان ہے کہ ان کی دولت اور جائیداد انہوں سے لحد تک ہے وہ مجھ جیسے جوان بیٹے کے محتاج نہیں ہیں۔ میں نے سوچا، خدا نہ کرے جب وہ محتاج ہوں گے، بڑھاپے میں بے یار و مددگار ہوں گے تو ان کی خدمت کے لیے واپس آ جاؤں گا۔“

”ایک دو برس نہیں پانچ برس گزر چکے ہیں۔ اس طویل عرصے میں تم نے بھی ان کی خبر نہیں لی۔“

”اسکی بات نہیں ہے۔ ڈیڑھ میری جان ہیں۔ میں ان کی خیریت معلوم کرتا رہتا ہوں۔ پچھلے دو مہینوں سے اسرائیل میں نئے کاروبار کے باعث مصروف رہا۔ ان کی خیریت معلوم نہ کر سکا۔ ورتہ اثر یا جاتا آتا رہتا ہوں اور دور سے انہیں دیکھ لیتا ہوں۔ مجھے ان کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں۔ میں مطمئن ہو کر وہاں سے چلا آتا ہوں۔“

مراد نے کہا۔ ”وہ میرے بھی ڈیڑھ ہیں۔ میں ان کا منہ بولا بیٹا ہوں۔ تم نہیں جانتے وہ تمہیں اپنی آخری پونجی کی طرح شدت سے چاہتے ہیں۔ ان کی محبت کا اندازہ اس طرح کر سکتے ہو کہ انہوں نے تمہارے جانے کے بعد بھی دوسری شادی نہیں کی۔“



میں ان کی خبر رکھتا ہوں۔ پھر یہ کہ تم میری کمی پوری کر رہے ہو۔ خدا نخواستہ وہ بیمار ہوں۔ تم یا کسی وجہ سے انہیں میری ضرورت ہوگی تو میں ان کے پاس پہنچ جاؤں گا۔“  
وہ دونوں باتیں کر رہے تھے پھر انہوں نے عصر کی نماز پڑھی اور ایمان علی اسے اپنی کار میں بٹھا کر گھومتا رہا۔ ہوٹل سے اس کا سامان اٹھا کر بولا۔ ”تم میرے ساتھ رہو گے پھر جب بھی امراتل آؤ گے تو سیدھے میرے پاس آیا کرو گے؟“

مراد نے کہا۔ ”کیا میں ڈیڑی کو کال کروں؟ باپ سے باتیں کرنے کو دل چاہے گا؟“  
وہ بولا۔ ”نہیں مراد! ایک عیسائی باپ اور ایک مسلمان بیٹا اپنے اپنے دین اور اپنی اپنی تہذیب کے مطابق الگ الگ زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمیں اسی طرح گزارنے دو۔ ایک بات جو تمہیں نہیں بتانی وہ ابھی بتاتا ہوں۔“  
مراد نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ ”جب انہوں نے مجھے گھر سے نکالا تھا، تب میں نے کہا تھا۔ میں جا رہا ہوں۔ اب اسی وقت آپ کا منہ دیکھوں گا جب آپ میرا وین قبول کر لیں گے۔ اگر بچے سے محبت ہے تو بچے کی راہ پر چلیں۔ ورنہ باپ بیٹے ہم سفر نہیں بن سکیں گے۔“  
”میرے دوست! ہمارا دین یہ نہیں کہتا کہ خون کے بنیادی رشتوں کو کاٹ دو۔“

وہ بولا۔ ”ایمان ایک نہ ہو تو دل بے ایمان ہو جاتے ہیں۔ خون کے رشتے محض رسمی لگتے ہیں۔“  
مراد نے بحث نہیں کی۔ اس وقت حقیقت معلوم ہوئی کہ بیٹا عیسائی باپ کا منہ کیوں نہیں دیکھتا ہے اور باپ تھا کہ اپنے بچے سے شدید محبت کرنے کے باوجود اپنے مذہب سے پھرنا کیس چاہتا تھا۔

نماز عشا کے بعد ایمان علی اسے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ کھانے کے دوران بولا۔ ”بھئی ہاتھوں سے نکاتا ہوں بھئی ہوٹل میں کھالیتا ہوں۔ کوئی خوب صورت گھر والی نہیں مل رہی ہے۔ پچھلے چار مہینوں سے کنوارا ہوں اور گناہوں سے کتراتا آ رہا ہوں۔“

مراد نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ”تجربہ ہے کوئی لڑکی کیوں نہیں مل رہی ہے؟“

اس نے کہا۔ ”ملتی ہی نہیں، یہاں سے مل ایب تک عیسائی اور یہودی لڑکیاں بہت ہیں لیکن بہت فکرت ہیں۔ ہر وقت کئی بوائے فرینڈز رکھتی ہیں۔ میں ایسی لڑکیوں سے دور بھاگتا ہوں۔ یہ کبھت اوپر سے سدا بہار اور اندر

مراد نے پوچھا۔ ”کس بات کا؟“  
”بھئی کہ حسین عورتیں تمہاری تنہائی میں آتی رہیں اور تم نے ہاتھ نہیں لگایا۔ عورت حسین ہو، جوان ہو اور اداؤں سے بھری ہو۔ پاگل بنا دیتی ہوتی۔۔۔۔۔“  
مراد نے پوچھا۔ ”تو۔۔۔۔۔؟“

”میں تو پھسل جاتا ہوں۔ حسین عورتیں میری کمزوری ہیں۔ تم نے اپنی کوئی بات نہیں چھپائی۔ میں بھی نہیں چھپا رہا۔“

”تم یا تو فطرتاً حسن پرست ہو یا تم نے حسین عورتوں کو اپنی کمزوری بنا لیا ہے۔ میری طرح تو تیرا ارادی سے کام لوگے تو آسانی سے پاک دامن رہ سکو گے۔ تمہارا صحیح علاج یہ ہے کہ شادی کر لو۔ کسی شریف زاوی کو لائف پارٹنر بنا لو پھر گناہوں سے بچتے رہو گے۔“

”خدا کا شکر ہے، اب تک گناہوں سے بچتا آ رہا ہوں۔ پچھلے پانچ برسوں میں چھ عیناؤں سے شادیاں کر کے طلاق دے چکا ہوں۔“

مراد نے اسے تعجب سے دیکھا پھر پوچھا۔ ”یہ کیا بات ہوئی؟ شادیاں کرتے رہے اور طلاق دیتے رہے؟“  
وہ شادی از دوامی زندگی کو کھیل تماشا بنانے والی باتیں کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”وہ یکے بعد دیگرے میری زندگی میں آتی رہیں۔ انہوں نے خود ہی پہلے سے کہہ دیا کہ از دوامی زندگی سے دل بھر جائے گا یا مزاج بدل جائے گا تو علیحدگی اختیار کر لیں گی۔“

پھر اس نے کہا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ ایسی عورتوں کی طرح میرا مزاج بھی ایسا ہی ہوتا جا رہا ہے۔ میں کسی ایک عورت کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا۔“

مراد نے کہا۔ ”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ کسی ایک عورت کے ساتھ کیوں نہیں رہ سکتے؟“

”کیا کروں؟ کبھت عورتیں بھی میرے مزاج کے مطابق ملتی ہیں۔ تم میں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ تم اپنی ماروی کے سوا کسی کو منہ نہیں لگاؤ گے اور میں اسے منگودہ بنا تا ہوں جو بعد میں منہ پھیر لے۔“

مراد اسے سمجھتے ہوئے کہنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اسے پھر کسی وقت سمجھانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ”یہ کیا عورتوں کی باتیں لے بیٹھے ہو۔ ان کا ذکر چھوڑو۔ اپنے ڈیڑی کی بات کرو۔ کیا ان سے ملنے کو جی نہیں چاہتا؟“

وہ بولا۔ ”جوانی میں عورتوں کی باتیں نہیں کریں گے تو پھر کب کریں گے؟ ڈیڑی آرام سے زندگی گزار رہے ہیں۔



سے بیمار ہوتی ہیں۔ کوئی نہ کوئی بیماری چھوڑ جاتی ہیں۔“  
 اس نے اپنی تین انگلیوں کو گنتے ہوئے کہا۔ ”ان چار  
 مہینوں میں تین بیوی لڑکیاں پسند آئیں لیکن وہ کورٹ  
 میرٹ کے لیے راضی نہیں ہوئیں۔ ہائے...! کیا تاکوں کسی  
 کافر: دالی حسینا میں گھس۔“  
 ارادے پختے ہوئے کہا۔ ”تمہارے حال پر نہیں  
 آرہی ہے، بے شک تم گناہ نہیں کرتے ہو لیکن گناہوں سے  
 بچنے کا یہ طریقہ غلط ہے کہ کسی کو عارضی طور پر منکوحہ بناؤ پھر  
 کچھ عرصہ گزار کر اس سے غلطی کی اختیار کر لو۔“  
 ”اگر میں کسی عورت کی زندگی برباد کروں تو میرا  
 طریقہ کار غلط ہے۔ اگر عارضی ازدواجی رشتہ باہمی  
 رضامندی سے ہوتا ہے تو غلط نہیں ہے۔ اس کا سب سے اہم  
 پہلو یہ ہے کہ ہم گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔“  
 ”انسانی فطرت کو سمجھو۔ آدمی جب ایک غلطی کرتا  
 ہے تو ایف کے بعد دوسری غلطیاں کرنے کے لیے طرح  
 طرح کی ویلیس پیش کرتا ہے۔ ایمان کا تقاضا ہے کہ اپنا  
 محاسب آپ کرو۔ اپنے آپ کو درست نہ سمجھا کرو۔“  
 ”میری تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ میں غلطی نہیں کر  
 رہا ہوں۔“  
 ”میں نہیں کہہ سکتا تم کہاں تک درست ہو۔ بہتر ہے،  
 علمائے دین سے فتویٰ حاصل کرو۔“  
 ”چلو کر لوں گا۔ پلیز یہ روک ٹوک دالی باتیں نہ  
 کرو۔ ایک تو یونہی چار مہینوں سے کنوارا بیٹھا ہوا ہوں۔“  
 مراد نے کہا۔ ”شام کو مرید آرہی ہے۔ اسے دیکھو  
 گے تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔ دیوانے ہو جاؤ گے۔“  
 ”ارے یار! تم نے کہا تھا کہ اس کے ساتھ گناہ گار  
 بننے کے بعد ہی توبہ کی ہے۔ اس کے بعد کسی کو ہاتھ نہیں  
 لگایا ہے۔“  
 مراد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں ارادے کا  
 پکا ہوں۔ جب فیصلہ کر لیا کہ گناہوں سے بچنا ہے تو پھر فرج  
 رہا ہوں۔“  
 پھر وہ ایک ذرا بے بسی سے بولا۔ ”خدا معاف  
 کرے۔ کبھی کبھی بے اختیار اسے یاد کرنے لگتا ہوں اس کی  
 پاؤں لینگوتج ایسی ہے کہ پاگل کر دیتی ہے خدا کا شکر ہے کہ  
 وہ بے وفا ثابت ہو رہی ہے اور میں اس سے نفرت کرنے  
 لگا ہوں۔“  
 ”یعنی اب کبھی اسے ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔“  
 ”میں اپنی توبہ ارادی سے کہتا ہوں کبھی اسے اپنی

تہائی میں آنے نہیں دوں گا۔“  
 ”اس کا مطلب ہے، کل وہ آئے گی تو میں اسے  
 ٹریپ کروں گا اور تمہیں اعتراض نہیں ہوگا۔ یار...! اپنی  
 بات کرو میں نہیں چاہتا کہ ہماری دوستی پر حرف آئے۔“  
 اس نے فراخ دلی سے مسکرا کر کہا۔ ”وہ میری کوئی  
 خریدی ہوئی چیز نہیں ہے۔ تم اسے ہزار بار ٹریپ کرو لیکن  
 نہیں کر سکو گے وہ کہتی ہے کہ اسے میرے سوا کوئی زیر نہیں  
 کر سکتے گا۔“  
 ”یہ تو چیلنج کرنے والی بات ہے... ایسا کیا ہے کہ  
 اسے تم زیر کر سکتے ہو، ہم نہیں کر سکتے۔“  
 ”اس کے مزاج میں جارحیت اور بربریت ہے۔ وہ  
 بہت ہی خطرناک فائزر ہے۔“  
 اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہے ہو؟ وہ  
 فائزر ہے...؟ اور وہ بھی خطرناک...؟“  
 ”میں نے اسے کئی بار شکست دی ہے، تب ہی وہ  
 میرے پیچھے پاگل ہو کر دوڑتی رہتی ہے۔“  
 ایمان علی نے اپنے دونوں کانوں کو پکڑ کر کہا۔ ”ایسی  
 حسینہ تمہیں ہی مبارک ہو۔ میں پھول کو پھول کی نزاکت  
 سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ لات جوتے اور اٹھا بیچ سے  
 سارا رو مانس غارت ہو جاتا ہے۔“  
 ”چلو اچھا ہے، اس کی طلب سے باز آرہے ہو، لیکن  
 میرا ایک کام کرو۔“  
 ”ضرور کروں گا، یو۔“  
 ”میں شاید کل تک لندن چلا جاؤں۔ یہ چاہتا ہوں  
 کہ جب تک لندن سے پاکستان نہ جاؤں تب تک مرید  
 یہاں گل ایب میں رہے، تم اسے دو چار دنوں تک یہاں  
 روک سکو گے۔“  
 ”میں کیسے روک سوں گا؟“  
 ”تمہیں اس سے کچھ کہنا نہیں ہوگا۔ کل وہ آئے گی تو  
 دور سے اپنی ایک جھلک سے دکھانا اور گم ہو جانا۔ وہ تمہیں  
 مراد کچھ کر چھچھا کرے گی۔ اگر چالاکي دکھا سکو تو اسے  
 پورے اسرائیل میں اپنے پیچھے دوڑاتے رہو۔“  
 وہ بولا۔ ”ایک حسینہ کے ساتھ یہ بڑا دلچسپ کھیل ہوگا  
 لیکن وہ ہمیں نہیں تو مجھے پکڑ ہی لے گی۔“  
 ”کوئی بات نہیں، تم اس سے صاف صاف کہہ دو گے  
 کہ مراد علی منگی نہیں ہو۔ ایمان علی ہو۔“  
 ”وہ یقین نہیں کرے گی۔“  
 ”ہاں۔ یہی سمجھے گی کہ میں تمہارے چہرے کے



نہیں آ رہا تھا کہ گمشدہ بیٹے کی آواز سن رہا ہے۔  
اسے گم ہوئے تقریباً چھ برس ہو رہے تھے۔ یقین  
کیسے آتا کہ مراد کی آواز سننے سننے اچانک بیٹے کی آواز سن  
رہا ہے۔

اس نے جذبات سے مظلوم ہو کر کپکپاتی ہوئی آواز  
میں پوچھا۔ ”بیٹے ایمان.....“ اسے فطرتی کا احساس ہوا۔ وہ  
جلدی سے بولا۔ ”بیٹے ایمان.....“ یہ تم بول رہے ہو؟“ وہ  
کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ہاں تم ہی ہو۔ میں تمہاری آواز  
تمہارا لب و لہجہ کبھی بھول نہیں سکوں گا۔“

اس نے آواز دی۔ ”مراد! تم کہاں ہو؟ مجھے یقین  
دلادو کہ میرا بیٹا تمہارے فون سے بول رہا ہے؟“  
ایمان علی نے کہا۔ ”مراد میرے پاس بیٹھا ہے، میں  
اس کے فون سے بول رہا ہوں۔ مجھے ابھی جواب دیں میری  
خواہش پوری کر رہے ہیں یا نہیں؟“

باپ اُبھن میں پڑ گیا۔ بیٹے نے کہا۔ ”اگر آپ  
باتیں بنا میں گئے مجھے نالانہ کی کوشش کریں گے تو فون بند  
ہونے کے بعد پھر کبھی میری آواز نہیں سن سکیں گے۔ میں یہ  
شہر یہ ملک چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلا جاؤں گا۔“  
”نہیں بیٹے! ایسا نہ کرو۔ اب میں تمہیں گم ہونے نہیں  
دوں گا۔ تمہارے بغیر نہیں چیلوں گا۔“

”تو پھر بولیں میری صورت دیکھنے کے لیے کیا  
کریں گے؟“

اس کی آواز سنائی دنی۔ ”آہ کیا کروں گا؟ بیٹے...!  
مجھے صرف دو دنوں کی مہلت دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔  
تمہارے سامنے کلمہ پڑھ کر تمہیں سینے سے لگاؤں گا۔ مجھے  
اپنی کچھ مجبوریوں سے نمٹنے کا وقت دو۔“

”اوکے ڈیڈ! میں آپ کی مجبوریوں کو سمجھتا ہوں۔  
اب سے ٹھیک اڑتالیس گھنٹے بعد فون پر پہلے آپ کے منہ  
سے کلمہ سنوں گا۔ پھر آپ سے بات کروں گا۔“  
یہ کہہ کر اس نے فون مراد کو دے دیا۔ اس نے کہا۔

”ڈیڈ! میں مراد بول رہا ہوں۔ دیکھیے آپ نے مجھے پتا بنایا  
اور میں نے آپ کے بیٹے کو ڈھونڈ نکالا۔“  
ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”بیٹے! وہ تل ایب میں ہی رہے گا  
نہیں؟“ کہیں گم تو نہیں ہو جائے؟“

”نہیں ڈیڈ! آپ اطمینان رکھیں۔ ایمان علی نے  
ایک مسلمان کی زبان سے وعدہ کیا ہے، آپ اس کی ولی  
خواہش پوری کریں گے تو یہ دو دنوں تک نہیں رہے گا۔“  
مراد نے دعائیہ انداز میں کہا۔ ”اللہ تعالیٰ آپ کو

بچھے چھپا ہوا ہوں۔ خود کو اس سے بھی چھپا رہا ہوں۔ اس  
کے ساتھ کسی طرح بھی مکمل تماشا کرتے ہوئے یہاں اسے  
رکنے پر مجبور کرنا ہی ہوگا۔“

ایک سینہ سے مکمل تماشا کرنے کی بات تھی اس لیے  
وہ راضی ہو گیا۔ ایسے ہی وقت ڈاکٹر ٹینیسن نے فون پر اس  
سے پوچھا۔ ”کیا تل ایب میں ہو؟“

مراد نے ایمان علی کو دیکھتے ہوئے فون پر کہا۔ ”میں  
ڈیڈ! کیا آپ لندن پہنچ گئے ہیں؟“  
”ہاں تم کل ہی کسی فلائٹ سے چلے آؤ۔“

”اوکے۔ کسی بھی فلائٹ میں سیٹ کنفرم ہوگی تو  
میں آپ کو اطلاع دوں گا۔ کیا لندن پہنچ کر آپ کو پتا یاد  
آ رہا ہے؟“

ایمان علی گہری سنجیدگی اور محبت سے مراد کے فون کو  
یوں دیکھنے لگا جیسے ایک مدت کے بعد باپ کو دیکھ رہا ہو۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ”ہاں بیٹے! میرے ایمان علی کی  
بہت سی یادیں اس شہر سے وابستہ ہیں۔ پتا نہیں، وہ کہاں  
ہوگا؟ یہاں ائر پورٹ پر اترتے ہی میری آنکھوں میں  
آنسو آگئے تھے۔“

مراد نے فون کا والیوم بڑھا دیا تھا۔ ایمان علی کے  
قریب کھٹک کر اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ رہا  
تھا۔ ادھر باپ بڑے جذبے سے اپنے اندر جھپکی ہوئی محبت  
کو اجاگر کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”میرا روبن سن... میرا  
ایمان اسی شہر میں پیدا ہوا تھا۔ اس امید پر آیا ہوں کہ شاید  
وہ نظر آجائے۔“

وہ ذرا چپ ہوا پھر ایک مرد آہ بھر کر بولا۔ ”بیٹے  
مراد! یہ میری عمر کا آخری دور ہے۔ میں مرنے سے پہلے  
اسے ایک بار دیکھ کر کیلجے سے لگانا چاہتا ہوں۔“

ایمان علی یکبارگی تڑپ گیا۔ باپ کا لہجہ تیزی سے  
رگوں میں گردش کرنے لگا تھا۔ اس نے مراد سے فون چھین  
لیا۔ مراد بے اختیار مسکرانے لگا۔

وہ فون کو اپنے کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ ”کیوں  
ایسی جذباتی اور تڑپا دینے والی باتیں کر رہے ہیں؟ بیٹے سے  
اتنی ہی محبت ہے تو اس کی بات کیوں نہیں مان لیتے؟  
”گم آن ڈیڈ...! آپ ابھی بولیں۔ کلمہ پڑھیں  
گے؟ میں ابھی آپ کے پاس چلا آؤں گا۔ خدا کی قسم کسی بھی  
پہلی فلائٹ سے آ جاؤں گا۔“

دوسری طرف ڈاکٹر ٹینیسن پر سکتہ طاری ہو گیا  
تھا۔ اس کے دیدے پھل گئے تھے۔ منہ کھل گیا تھا۔ یقین



کتاب رکھیں گا باب کھل رہا تھا۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑے شوق سے پوچھا۔ ”کیا وہ ایسا بے مثال ہے؟ کون ہے وہ؟ انڈیا میں کہاں رہتی ہے؟“

”میں نے اپنی رود دستانے وقت چھٹی بائی اور ورشا کا ذکر کیا تھا۔ کیا تمہیں یاد ہے؟“

وہ بولا۔ ”ہاں یارا وہ قدرت کا عجیب تماشا ہوا تھا۔ وہ چھپ کر تمہارا اچھا کرتی۔ سوئی رات کو تنہائی میں آئی تھی۔ تمہیں بلیک میل کر رہی تھی۔ تم مجبور ہو رہے تھے ایسے میں اس کی جوانی خون کے آنسو رونے لگی۔“

یہ کہتے ہوئے وہ پٹنے لگا پھر لپٹائے ہوئے انداز میں بولا۔ ”کیا واقعی وہ بہت حسین ہے؟“

”وہ اتنی حسین اور پرشش ہے کہ سیناؤں کے میلے میں سب سے نمایاں دکھائی دیتی ہے۔“ وہ اس کی طرف تھک کر بولا۔ ”میں تمہیں گناہوں سے بچانا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ تمہارے حراج کے مطابق ہوگی۔ تمہارے دل میں سما جائے گی۔ اسے دیکھنے کے بعد تم عارضی شادی خانہ آبادی سے باز آ جاؤ گے۔ ہمیشہ کے لیے اس کے ہو کر رہ جاؤ گے۔“

”پھر تو مجھے انڈیا جانا ہی ہوگا۔“

”جانے کی جلدی نہ کرنا۔ پہلے تمہیں میرا کام کرنا ہے۔ کل مرینہ یہاں آ رہی ہے۔“

”مرینہ.....!“ وہ غل میں تکتے ہوئے بولا۔ ”تم تو اس کے حسن کی بھی تعریفیں کر رہے تھے۔“

”ہماری دنیا میں حسن بھر پڑا ہے جو بھی حسین ہے، اس کی تعریف کرنی ہی پڑتی ہے۔“

اس وقت اس کے دماغ میں دو سینا میں سمائی ہوئی تھیں۔ اس نے مراد کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔ ”یہ بتاؤ مرینہ اور ورشا میں کون زبردست ہے؟“

”مرینہ کے حسن میں بارود بھری ہے اور ورشا پھولوں بھری ہے۔ کسی کو کسی سے کتر نہیں کہا جاسکتا مگر ہاں ورشا اس لیے برتر لگے گی کہ بھی ان بچڑ ہے۔ تقدیر نے تمہارے انتظار میں اسے سنبھال کر رکھا ہے۔“

”پھر تو میں کل ہی.....“ وہ بولتے بولتے رک گیا۔ پھر ذرا مایوسی سے بولا۔ ”جلدی نہیں جاسکتا۔ تمہارے کام نے انکا دیا ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”میرے یار...! صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ ابھی مرینہ کی طرف توجہ دو۔“

وہ ایمان علی کو مرینہ کے حلق اور کئی اہم باتیں

حوصلہ اور ایمان عطا فرمائے۔ آپ فون پر کلر پڑھیں گے تو وہ کھلی فلائٹ سے آپ کے پاس چلا آئے گا۔ اب میں فون بند کر کے لندن جانے والی کسی فلائٹ میں سیٹ حاصل کرنے جا رہا ہوں۔“

اس نے فون بند کر کے ایمان علی کو دیکھا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ میں گم تھا۔ مراد سے نظریں نہیں تو وہ مایوسی سے بولا۔ ”ڈیڈی اپنا مذہب نہیں چھوڑیں گے۔“

”وہ تمہاری خاطر اپنے اندر خود سے لڑتے رہیں گے۔“

اس نے کہا۔ ”وہ کوئی کٹر عیسائی نہیں ہیں لیکن لندن میں ان کے بے شمار دوست احباب، عزیز واقارب عیسائی ہیں۔ وہاں عیسائی کی حیثیت سے ان کا ایک سوشل اسٹیٹس ہے۔ وہ اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی سوسائٹی سے نکل کر مسلمان ہونے کی جرأت نہیں کریں گے۔“

”ایسا ہے تو انہوں نے دو دنوں کی مہلت کیوں لی ہے؟“

”انہوں نے اپنے آپ سے لڑنے اور میری طرف آنے کے لیے وقت لیا ہے۔ دو دنوں تک ان کے اندر شدید جنگ جاری رہے گی۔ پھر وہ بیٹے کو ہار جائیں گے۔ اپنی سوسائٹی میں جو نیک نامی ہے اسے بحال رکھیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”کچھ بھی ہو۔ تم دو دنوں کے بعد ایک بار ضرور ان سے فون پر بات کرو گے۔ ہو سکتا ہے تمہاری خاطر ان کی زبان پر کلر آئی جائے۔“

”میں وعدے کے مطابق ضرور ان سے رابطہ کروں گا اور ان کے لیے ہر نماز کے بعد دعائیں مانگتا رہوں گا۔“

وہ دونوں تھوڑی دیر تک خاموش رہے پھر وہ اپنے مزاج کے مطابق بولا۔ ”اس خشک موضوع پر بہت سی باتیں ہو گئیں۔ اب بس کرو۔ کتاب رکھیں گا کوئی خوب صورت باب کھولو۔“

مراد سوچ رہا تھا۔ یہ دو دنوں بعد باب سے مایوس ہو کر پھر کہیں چلا جائے گا۔ اسے نظروں میں رکھنے کے لیے کسی سینہ کی زلفوں سے باندھ کر رکھنا چاہیے پھر یہ کہیں گے نہیں ہوگا۔

ایمان علی نے پوچھا۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“

وہ خیالات سے چونک کر بولا۔ ”تم حسن کے شیدائی ہو لیکن جو حسن میں دیکھ چکا ہوں وہ ابھی تم نے نہیں دیکھا ہے۔ انڈیا میں ایک ایسی حسین لڑکی ہے، جسے دیکھو گے تو میرا دعوئی ہے اس کے دیوانے ہو جاؤ گے۔ لڑکیوں کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دو گے۔ اسی کے ہو کر رہ جاؤ گے۔“

مراد نے کہا۔ ”میرے یار...! صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ ابھی مرینہ کی طرف توجہ دو۔“

وہ ایمان علی کو مرینہ کے حلق اور کئی اہم باتیں

حوصلہ اور ایمان عطا فرمائے۔ آپ فون پر کلر پڑھیں گے تو وہ کھلی فلائٹ سے آپ کے پاس چلا آئے گا۔ اب میں فون بند کر کے لندن جانے والی کسی فلائٹ میں سیٹ حاصل کرنے جا رہا ہوں۔“

اس نے فون بند کر کے ایمان علی کو دیکھا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ میں گم تھا۔ مراد سے نظریں نہیں تو وہ مایوسی سے بولا۔ ”ڈیڈی اپنا مذہب نہیں چھوڑیں گے۔“

”وہ تمہاری خاطر اپنے اندر خود سے لڑتے رہیں گے۔“

اس نے کہا۔ ”وہ کوئی کٹر عیسائی نہیں ہیں لیکن لندن میں ان کے بے شمار دوست احباب، عزیز واقارب عیسائی ہیں۔ وہاں عیسائی کی حیثیت سے ان کا ایک سوشل اسٹیٹس ہے۔ وہ اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی سوسائٹی سے نکل کر مسلمان ہونے کی جرأت نہیں کریں گے۔“

”ایسا ہے تو انہوں نے دو دنوں کی مہلت کیوں لی ہے؟“

”انہوں نے اپنے آپ سے لڑنے اور میری طرف آنے کے لیے وقت لیا ہے۔ دو دنوں تک ان کے اندر شدید جنگ جاری رہے گی۔ پھر وہ بیٹے کو ہار جائیں گے۔ اپنی سوسائٹی میں جو نیک نامی ہے اسے بحال رکھیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”کچھ بھی ہو۔ تم دو دنوں کے بعد ایک بار ضرور ان سے فون پر بات کرو گے۔ ہو سکتا ہے تمہاری خاطر ان کی زبان پر کلر آئی جائے۔“



بتانے لگا۔ ایسے وقت کاٹنگ ٹون نے اسے پکارا۔ اس نے فون اٹھا کر ٹھگی سی اسکرین کو دیکھا۔ ماسٹر کو یو اسے یاد کر رہا تھا۔ اس نے ٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ "نیس ماسٹر...؟"

اسے بلال عرف نے کی آواز سنائی دی۔ "میں بلا بول رہا ہوں۔ ابھی ماسٹر کے سامنے کھڑا ہوا ہوں۔"

مراد نے پوچھا۔ "خیریت تو ہے پتے؟ تم نے ماسٹر کو شکایت کا سوچ تو نہیں دیا ہے؟"

"شکایت کسی؟ میں تو ماسٹر سے انعام حاصل کر رہا ہوں۔ تمہیں یہ خوش خبری سنانے کے لیے فون کیا ہے کہ میری ٹریٹنگ مکمل ہو گئی ہے۔ میں یہاں ٹریٹنگ حاصل کرنے والوں میں سب سے آگے نکل گیا ہوں۔"

"بہت مبارک ہو۔ تم نے ماسٹر کے سامنے یہ ثابت کر دیا ہے کہ میں نے انہیں زبردست کام کا آدمی دیا ہے۔"

"ماسٹر تو تمہارے فین ہیں۔ اب میری بھی تقریبات کرنے لگے ہیں۔ لو ان سے باتیں کرو۔"

ماسٹر کو یو کی آواز سنائی دی۔ "ویل ڈن مراد! تم نے پتے کی صورت میں ایک دوسرا زبردست مراد دیا ہے۔ میں نے پتے کی ایسی جگہ تقرری کی ہے، جہاں یہ میرے اور تمہارے دشمنوں کی نیندیں حرام کر دے گا۔"

اس نے بتایا کہ وہ پتے کو لندن بھیج رہا ہے۔ پھر اس نے پوچھا۔ "مجھے اپنا پروگرام بتاؤ، تم لندن کب جا رہے ہو؟ اسرائیل میں کب تک رہو گے؟"

مراد کے سامنے مرینہ کی صورت ابھر آئی۔ وہ آنے والی تھی۔ اسے گھاس نہ ڈالنے کے باوجود وہ غیر شعوری طور پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "ماسٹر...! ڈیڈی لندن پہنچ کر مجھے کال کریں گے، جب وہاں جاؤں گا۔ وہ میرے لیے نئی جگہ ہے۔ وہاں نئے مسائل ہوں گے۔ شاید کل یا پرسوں تک جا سکوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ جب تک دشمن تم سے دور ہیں۔ تم بھی انہیں نظر انداز کرتے ہوئے آرام سے رہو۔"

ماسٹر سے رابطہ ختم ہو گیا۔ اس نے سوچا۔ 'دشمن دور نہیں رہیں گے۔ وہ تو موت کی طرح پیچھے لگے رہتے ہیں۔'

سے دہلی گئی تھی۔ پھر کہیں گم ہو گئی تھی۔ اس شہر میں صرف مراد کو ہی نہیں اسے بھی تلاش کیا جا رہا تھا۔ اسے تلاش کرنے والے نہیں جانتے تھے کہ مراد نے اس کا چہرہ تبدیل کر دیا تھا۔ وہ اسے دہلی میں دیکھتے ہوئے بھی پہچان نہیں پائے تھے۔

پھر موجودہ سفر کرنے سے پہلے ہی اس نے چہرے کی سرجری کرائی تھی اور اپنے اصلی چہرے کے ساتھ ظاہر ہو گئی تھی۔ وہ اکثر ہیرا پھیری کے باعث حواس پر چھا جاتی تھی۔ دشمنوں میں کھٹلی پیدا ہو گئی تھی، کہ وہ کہاں کم رہنے کے بعد دہلی واپس آئی ہے؟

MET ڈیپارٹمنٹ سے جاسوس اپنے ہی تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اچانک پھر لندن واپس جا رہی ہے۔ یوں یقین سے سوچا جا رہا تھا کہ مراد بھی کسی بیس میں اس کے ساتھ رہے گا یا آگے جا کر وہ کہیں مرینہ سے ملنے والا ہے۔

لنڈن اور جاسوس اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اس جہاز میں اس کے ہم سفر تھے۔ مرینہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کے ان جاسوسوں کو نہیں پہچانتی تھی۔ اس کے باوجود ان میں سے ایک کو تاڑ لیا تھا۔ دوسرے جاسوس کا تعلق ریڈارٹ سے تھا۔ ائر پورٹ سے جہاز کے اندر آنے تک اس جاسوس کی حرکات و سکنات ایسی تھیں کہ وہ بھی مرینہ کی نظروں میں آ گیا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ ان جاسوسوں نے اپنے دیگر ساتھیوں سے فون پر رابطہ رکھا ہوگا۔ یہ خبر آسان سے ذہن پر کھینچی گئی ہوگی کہ وہ ہوائی جہاز سے آرہی ہے۔

وہ سب اپنے اپنے طور پر محتاط رہ کر ہالوں میں سفر کر رہے تھے۔ ہوائی سفر کے آغاز اور اختتام میں اتنی سختی سے چیکنگ ہوتی ہے کہ کوئی ایک ننھا سا ہتھیار بھی چھپا کر نہیں لے جا سکتا لیکن کسٹم چیکنگ کے بعد باہر آتے ہی مختلف تنظیمیں اپنے اپنے جاسوس اور شوٹرز تک خطرناک اسلحہ پہنچا دیتی ہیں۔

وہ جل ایب پہنچ گئی۔ پھر کسٹم چیکنگ سے گزر کر وزیرز لابی میں آئی تو ایک شخص نے اس کے مطلوبہ ہتھیاروں کے ساتھ ہلٹس سے بھرا ہوا ایک بیگ دیا پھر کچھ کہے سے انہیوں چلا گیا جیسے اسے جاننا نہ ہو۔

ایسے ہی وقت مرینہ، مراد کو دیکھ کر چونک گئی۔ وہ اسے ایمان علی کے بہرہ میں پہچانتی تھی اور وہ ایمان علی مسافروں کی بھیڑ میں سے زرتا ہوا اس کی طرف انجانے میں رہا تھا پھر اچانک ہی دوسری طرف مڑ گیا۔ اس عمارت سے باہر جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

مرینہ اس وقت طیارے میں تھی۔ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے جیسے سو رہی تھی لیکن ذہن جاگ رہا تھا اور دشمنوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ یہ تمام دشمن تنظیموں کے جاسوس جانتے تھے کہ وہ مراد سے ملنے کے لیے لندن

سپنس ڈائجسٹ



وہ جاگتی اور بھاگتی رہے گی۔  
 ”اب مجھے کہاں جانا چاہیے۔ وہ کہاں ہوگی؟“  
 وہ دونوں مسجد سے کچھ فاصلے پر کار کی آگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مراد چاہتا تھا وہ ابھی رہے۔ تل ایب سے باہر نہ جائے۔ اس نے اپنے فون کی سم بدلتے ہوئے کہا۔ ”ابھی معلوم ہو جائے گا۔“

اس نے مرینہ کے نمبر بیچ کیے اور واٹس ایپ کی پوری طرح کھول دیا۔ تھوڑی دیر تک ادھر تیل جاتی رہی پھر مرینہ کی پرجوش آواز سنائی دی۔ ”ہائے مرینہ کی جان! کتنا ترپاتے ہو۔ سچ بولو، فون کیوں بند رکھا تھا؟“

”میری مجبوری ہے۔ ابھی پھر بند کر دوں گا۔“  
 ”مجبوری کیا ہے، مجھے بتاؤ۔ میں دور کر دوں گی۔“  
 ”تم اپنی بات کرو۔ تم نے کہا تھا پہلے کسی فلائٹ سے تل ایب جاؤ گی پھر وہاں سے لندن جاؤ گی۔ میرا خیال ہے تم ابھی تل ایب میں ہو۔“

”تمہارا خیال درست ہے۔ یہ بتاؤ تم کہاں ہو؟“  
 ”میں تو لندن میں ہوں۔“

”جھوٹے کہیں کے۔ مجھ سے کیوں چھپ رہے ہو؟ جب میں وعدہ کر چکی ہوں کہ بیماری مرضی کے خلاف قریب نہیں آؤں گی۔ ہم آئندہ بیاہے اور احقاد سے لٹے رہیں گے تو پھر مجھ سے آنکھ چھولی کیوں کھیل رہے ہو۔ سچ بولو ابھی کہاں ہو؟“

”تم بولو کہ تم کہاں ہو؟“  
 ”میں شیرن میں ہوں اور سوچ رہی ہوں کہ تمہیں ڈھونڈنے کے لیے کہاں جاؤں؟“

اس نے پوچھا۔ ”مجھے ڈھونڈنے کے لیے؟“  
 پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں لندن میں ہوں اور تم مجھے وہاں ڈھونڈنا چاہتی ہو؟“

وہ اس کا جواب سن کر مایوس ہو گئی۔ اس سے شکایت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ابھی بیاہے بھری ادا کیں اسے سناڑ نہیں کر سکتی تھیں اور وہ اپنے اس نبوٹ بولنے والے کا چچا بھی نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ وہ ایک مرد آہ بھر کر بڑے احقاد سے بولی۔ ”مرینہ کی جان! تم تل ایب میں ہو۔“

وہ جیسے پریشان ہو کر بولا۔ ”یہ۔ گنگ کیا کہہ رہی ہو؟ گنگ کیا تم خواب میں مجھے وہاں دیکھ رہی ہو؟“  
 ”پلیز مراد! مجھ سے نہ چھپو۔ میں نے یہاں تمہیں اتر پورٹ پر دیکھا ہے۔“

مراد نے فون بند کرتے ہوئے ایمان علی سے کہا۔

وہ پیروں والی ایپلی کو کھینچتی ہوئی ادھر جانے لگی۔ عورتوں مردوں اور بچوں کی ایسی بھیڑ تھی کہ اسے رک رک کر آگے بڑھنے کا موقع مل رہا تھا۔ ایمان علی دو بار اس جھوم میں گم ہو کر نظر آیا پھر تیسری بار دکھائی نہیں دیا۔

وہ عمارت کے باہر آ کر دو رنگ نظریں دوڑانے لگی۔ وہ ایک جگہ چھپ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ فطرتاً حسن پرست تھا۔ دل میں کہہ رہا تھا۔ ”زبردست ہے، بہت ہی اسٹارٹ اور پرکشش ہے۔ آنکھ چھولی کھینچنے کا مزہ آئے گا۔“

مراد نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ ایک خطرناک فائزر ہے۔ یہ بات یاد تھی۔ اس نے دور سے مرینہ کو دیکھ کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے رب نے یہ کیا تم کیا ہے؟ ایسے تروتازہ پھول میں بارود بھری ہے۔ مجھے قحط رہنا ہوگا۔“

مرینہ نے فون نکال کر مراد کے نمبر بیچ کیے۔ معلوم ہوا کہ اس کا فون بند ہے۔ اس نے دوسرے نمبر بیچ کیے پھر ناکامی ہو گئی۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ کیا کرے؟ اتنے جھوم میں اسے آواز بھی نہ دے سکی۔ دل جھل جھل کر کہہ رہا تھا۔ ڈھونڈنے سے رت پل جاتا ہے۔ اسے ڈھونڈو...“

اور وہ اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ بڑی دیر تک بھٹکنے کے بعد اس نے ڈائریکٹر جنرل کو فون پر مخاطب کیا۔ ”سر! میں ابھی تل ایب پہنچی ہوں، یہاں دو چار دن رکنا چاہتی ہوں۔ آپ یہاں اپنے سفیر سے بولیں کہ میرے قیام کے سلسلے میں کسی طرح کی قانونی رکاوٹ نہ ہو۔“

ڈائریکٹر جنرل خوش ہو گیا کہ اب وہ چھپ نہیں رہی تھی۔ غور و فکر کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”میں ابھی فون کرتا ہوں۔ وہاں تمہیں ہر طرح کی سہولتیں حاصل ہوں گی۔“

اس نے مرینہ سے رابطہ ختم کر کے اس جاسوس کو فون پر مخاطب کیا جو مرینہ کے پیچھے دہلی سے چلا آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”مرینہ نے اچانک ہی وہاں رکنے کا پروگرام بنایا ہے۔ یقیناً اپنے پیار سے وہیں ملاقاتیں کرے گی۔ اس پر نظر رکھو۔ وہاں ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے اور جاسوس ہیں۔ وہ کسی وقت تم سے رابطہ کریں گے۔“

عشا کا وقت ہو گیا تھا۔ ایمان علی اسے اپنی تلاش میں لگا کر ایک مسجد میں آ گیا۔ وہاں مراد موجود تھا۔ دونوں نماز ادا کرنے کے بعد کار میں آ کر بیٹھ گئے۔ ایمان علی نے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، وہ مجھے تلاش کر رہی ہوگی؟“

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”یہ سوچ کر مزہ آ رہا ہے کہ آج اس کی نیند اڑ جائے گی، جب تک اسے نظر نہیں آؤ گے



”میں سم بدل رہا ہوں۔ وہ کہے گی کہ میں اس کی نظروں میں آ گیا ہوں۔ اس لیے پھر اکرون بند کر دیا ہے۔“

”اب کیا ارادہ ہے؟“

”اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ہمیں ابھی کھانا کھانا ہے اور گہری نیند سونا ہے۔ کل صبح دس بجے کی فلائٹ سے مجھے لندن جانا ہے۔ اس کے بعد چاہوں گا کہ تم پھر کہیں اسے اپنی جھلک دکھا کر چھپ جاؤ۔ کسی بھی طرح اسے دو چار دنوں تک یہاں سے جانے نہ دو۔“

”میں کوشش کروں گا۔ ابھی کہیں چل کر پیٹ بھرتے ہیں۔“

وہ کار اشارت کر کے وہاں سے جانے لگے۔ مرینہ ہوٹل کے کمرے میں تھی۔ مراد نے اچانک رابطہ ختم کر دیا تھا۔ دو بارہ اس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اس نے اپنے چود کو پکڑ لیا ہے اسی لیے اس نے فوراً ہی فون بند کر دیا تھا۔

اس کی آواز سننے کے بعد وہ سکون سے نہیں رہ سکتی تھی۔ سوچ رہی تھی، ہوٹل میں بیٹھے رہنے سے وہ نہیں لے گا۔ اسے جا کر پکڑنا ہوگا لیکن کہاں جائے؟

ایک خیال آیا کہ وہ نمازیں بہت پڑھتا ہے۔ اس لیے ایب اور حید میں معلوم کرنا ہوگا کہ مسجدیں کہاں کہاں ہیں؟ وہ ادھر کہیں نثر آ سکتا ہے اور مسلمان نسلی کے مخلوں میں بھی تلاش کرنا ہوگا۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی، اپنے بیٹھ بیگ میں سے سائیکس لگے ہوئے ریوالور کو نکال کر چیک کیا۔ دو بھرے ہوئے میگزین رکھے۔ پھر بیگ کو شانے سے لٹکا کر ہوٹل سے باہر آ گئی۔

ہوٹل کے اندر اور باہر گانڈ گھومتے پھرتے ہیں۔ بیرونی ملکوں سے آنے والوں کو اپنی راہنمائی میں پورے شہر کی سیر کراتے ہیں۔ یار کو ڈھونڈنے کے لیے ایک گانڈ ضروری تھا۔ وہ اسے مسلمان فیملیز میں لے جا سکتا تھا۔

وہ اپنی ریخڈ کار کے پاس آئی تو ایک گانڈ نے آکر پوچھا۔ ”میڈم! میں ایک مستند اور رجسٹرڈ گانڈ ہوں۔ اس لیے ایب اور حید کے پتے پتے سے واقف ہوں۔ ان شہروں کی تاریخی حیثیت بھی جانتا ہوں۔ پلیز میری خدمات حاصل کریں۔“

مرینہ نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ”اس شہر میں کتنی مسجدیں ہیں؟“

”کیا آپ مسلمان ہیں؟“

وہ بولی۔ ”ہاں مسلمان ہوں۔“

”الحمد للہ، میں بھی مسلمان ہوں۔ کبھی اس شہر میں تین مسجدیں تھیں، شہید کر دی گئیں۔ حید میں ایک مسجد ہے۔ حید دور نہیں ہے۔ یہاں سے ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔“

مرینہ نے پوچھا۔ ”کیا ان دو شہروں میں مسلمانوں کی الگ آبادی ہے؟“

”نہیں مسلمانوں کو ٹکبا ہو کر رہنے نہیں دیا جاتا، ہر مسلمان کے مکان کے آگے پیچھے، دائیں بائیں یہودیوں اور عیسائیوں کے مکانات ضرور ہوتے ہیں۔ یہ اسرائیلی حکمرانوں کی سیاسی حکمت عملی ہے۔ کیا آپ کو سیاست سے دلچسپی ہے؟“

”نہیں۔ یہ بتاؤ یہاں مسلمانوں کے ریٹورنٹ ہوں گے جہاں ذبح کیے ہوئے جانوروں کا گوشت پکا جاتا ہے؟“

”جی ہاں، کل ایب میں چار اور حید میں ایک ریٹورنٹ ہے۔ آپ کو وہیں کسی ہوٹل میں حلال کھانا چاہیے۔“

وہ اسٹریٹنگ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”آؤ بیٹھو، مجھے ان ہونٹوں کی طرف لے چلو۔“

وہ دوسری طرف سے آکر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار آگے بڑھ گئی۔ وہ بولا۔ ”میرا نام نظام ہے۔ آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ دو آدمی آپ کے پیچھے لگے ہیں۔“

مرینہ نے چونک کر سے دیکھا۔ پھر عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم نے ان دونوں کو کیسے تاز لیا؟ کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ میرے ہی پیچھے ہیں؟“

”ابھی ایک گھنٹا پہلے آپ ہوٹل میں آئی تھیں تو وہ دونوں ہوٹل کے اندر وزیر لابی میں جا کر بیٹھ گئے تھے۔ میں وہاں ایک مسافر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بالکل قریب ہی ایک صوفے پر تھے۔ ان میں سے ایک آپ کی طرف دیکھ کر کہہ رہا تھا۔“ اس نے یہاں کرا لیا ہے۔ مراد چھپ کر اس کمرے میں ملنے آئے گا۔“

یہ اسکا اطلاع تھی کہ اس نے تعریفی نظروں سے گانڈ کو دیکھا پھر کہا۔ ”تھینک یو نظام! تم نے اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ تم میرے مزاج اور میرے مطلب کے آدمی ہو۔“

وہ عقب نما آئینے میں دیکھنے لگی۔ ہوٹل سے ایک موٹر سائیکل پر دو سوار چلے آ رہے تھے اور وہ مسلسل تعاقب میں تھے۔

اس نے پوچھا۔ ”نظام! کیا انہوں نے تمہیں میری کار میں بیٹھے ہوئے دیکھا ہوگا؟“

”جب میں اس کو ر میں بیٹھ رہا تھا۔ تب میں نے



ان کی قبر تک انہیں دوڑانے والی تھی۔  
وہ کار سے نکل کر ان پر گولیاں چلانے لگی۔ پہلے  
صرف انہیں زخمی کرنا چاہتی تھی۔ فائرنگ شروع ہوتے ہی  
بھگدڑ مچ گئی۔ دکانیں بند ہونے لگیں۔ بھاگنے والی عورتیں،  
مرد، بچے اور بوڑھے ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔ وہ  
دونوں بھی ٹکراتے ہوئے گرتے پڑتے جا رہے تھے۔

کئی ہولٹوں کے سامنے کھانے پینے والوں کے لیے  
میزیں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ وہیں ایک میز پر مراد اور  
ایمان ملی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ انہوں نے دور ایک کار کو  
موٹر سائیکل سے ٹکراتے دیکھا۔ ٹکرا کر گرنے والوں کو  
احتجاج کرنا چاہیے تھا، لیکن وہ مجرموں کی طرح بھاگ رہے  
تھے۔

جب ان دونوں نے مرینہ کو کار سے نکل کر فائر کرتے  
ہوئے دیکھا۔ مراد نے کہا: "ایمان! تم مرینہ کی نظروں  
میں نہ آؤ۔ ہوٹل کے اندر جا کر چھپ جاؤ۔"

ہانگ سے گر کر بھاگنے والے مراد کی طرف آرہے  
تھے اور بار بار لوگوں سے ٹکراتے تھے۔ ایک بھاگنے والا  
جب قریب سے گزرا تو مراد نے اس کی ٹانگ پر ٹانگ  
ماری۔ وہ اچھل کر اوندھے منہ گرا، دوسرے کے منہ پر اس  
کا ایک گھونسا پڑا۔ وہ دوسری طرف گھوم کر چل گیا۔ چند  
ساتوں تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ آگے بھاگ رہا تھا  
پھر پیچھے کیسے گھوم گیا؟

مرینہ نے ان کے گرے ہوئے ریوالور اٹھا کر ان  
کے پیچھے دوڑ لگائی تو اسے مراد نظر آ گیا۔ اس کے اندر جیسے  
کھلی بھر مٹی۔ جہاں موت کا بازار گرم تھا وہاں اچانک ہی  
زندگی کا سماجی ٹل گیا تھا۔ اس نے خوشی سے چیخنے ہوئے کہا۔  
"ایمان! میں آرہی ہوں، میرے پاس اسلحہ ہے۔"

وہ بولتے بولتے اچانک لاکھڑا کر زمین پر گر پڑی۔  
فائر کی آواز کے ساتھ ایک گولی اس کے ہاتھ پر آ کر لگی  
تھی۔ یاد کو پانے کی خوشی مٹ گیا پڑ گئی تھی۔ ہاتھ سے پستول  
چھوٹ گیا تھا۔

پھر کئی ستوں سے فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔  
یہ معلوم ہوا کہ مرینہ کا پیچھا کرنے والے صرف دو دشمن نہیں  
تھے جانے کتنے چھپ کر چاہ آئے تھے۔ انہیں یقین ہو گیا  
تھا کہ مرینہ ہوٹل سے نکل کر جہاں جا رہی ہے، وہاں مراد  
ضرور ہوگا۔

بارود اور لہو کا برکھیل، ادا کے لیے ہی تھا۔  
وہ زمین پر لڑھکتی ہوئی، فٹ پاتھ سے گزرتی ہوئی

ہوٹل کے بائیں طرف سے موٹر سائیکل میں انہیں آتے  
دیکھا تھا۔ میں یقین سے کہتا ہوں انہوں نے مجھے آپ کے  
ساتھ نہیں دیکھا تھا۔"

"اور میں یقین سے کہتی ہوں، وہ ابھی تم پر گولیاں  
چلا میں گے۔ یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میرے ساتھ مراد بیٹھا  
ہوا ہے۔"

وہ بولا۔ "میں بچنے کی کوشش کروں گا۔ یہاں سیٹ  
کے نیچے دیک کر بیٹھنے کی جگہ ہے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "تم روزی کمانے میرے  
پاس آئے ہو لیکن موت بھی ساتھ آئی ہے۔"

وہ بڑی بے باکی سے بولا۔ "موت پیدا ہوتے ہی  
ساتھ لگ جاتی ہے پھر تمام عمر ساتھ چلتی رہتی ہے۔"

"میں نہیں چاہتی تم حرام موت مرو۔ ابھی آگے کہیں  
جیسے ہی گاڑی روکوں تم فوراً دروازہ کھول کر باہر دوڑتے  
ہوئے لوگوں کی بھڑ میں گم ہو جانا۔"

"شکر یہ میڈم! ہم فلسطینی بزدل نہیں ہیں۔ پیدا  
ہوتے ہی گولیاں چلنے کی اور بم دھماکوں کی آوازیں سنتے  
ہیں اور اب تک سنتے اور جھپٹتے چلے آ رہے ہیں۔"

وہ اپنی سیٹ پر نیچے کی طرف ٹھکتے ہوئے بولا۔  
"دعہ کریں اگر میں فوج جاؤں گا تو آپ مجھے کچھ زیادہ  
انعام دیں گی۔"

"میں تمہارے دونوں ہاتھ لوٹوں سے بھردوں گی۔  
ہوشیار اور قریب آرہے ہیں۔"

نظام کنٹرول سے اور پہنچے ہو کر بیٹھ گیا۔ موٹر سائیکل  
قریب آرہی تھی۔ مرینہ نے انہیں گولیاں چلانے کا موقع  
نہیں دیا۔ اس نے کار کی رفتار بڑھائی تو انہوں نے بھی  
رفتار اور بڑھا دی۔ یہ مرینہ نے جھانسا دیا تھا۔ اس نے  
اچانک رفتار سست کی تو موٹر سائیکل آگے نکل گئی۔

اس طرح وہ آگے جا کر کار کے سامنے آگئے۔  
پھر اس سے پہلے کہ وہ پیچھے آ کر فائر کرتے، مرینہ نے  
یکبارگی رفتار بڑھا کر موٹر سائیکل کو لکر ماری۔ ایسا حملہ ان کی  
توقع کے خلاف تھا۔ وہ دونوں ہانگ سے اچھل کر سڑک پر  
اور فٹ پاتھ پر گرے پھر وہاں سے لڑھکتے ہوئے ڈرا دور  
تک چلے گئے۔

ان کے ہاتھوں سے اسلحہ چھوٹ گیا تھا، ان کی توجان  
پر بن آئی تھی۔ وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ادھر  
ادھر نظریں دوڑائیں۔ ان کے ریوالور اور پستول دکھائی  
نہیں دیے۔ مرینہ جانتی تھی کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ وہ تو



وہ پتا نہیں کیا شخص تھا۔ وہ خطرناک بلا اس کے لیے پاگل ہو جاتی تھی۔ ادھر حملہ کرنے والوں میں دو مرچکے تھے اور وہ بائیک والے دونوں شوٹرز فٹ پاتھ اور سڑک پر زخمی پڑے تھے۔ پولیس کی گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی آگئی تھیں۔

لاؤڈ اسپیکر سے کہا جا رہا تھا۔ ”ہم وارننگ دے رہے ہیں، فائرنگ بند کرو اور ہتھیار چھینک کر سامنے آ جاؤ۔ پولیس نے پورے علاقے کو گھیر لیا ہے۔ یہاں سے کوئی نکل کر نہیں جائے گا۔“

مرینہ کی نظروں سے دور ایک شوٹر محاصرہ توڑ کر بھاگتا چاہتا تھا۔ اسے گولی مار دی گئی۔ آخری شوٹر نے چیخ کر کہا۔ ”میں ہتھیار چھینک کر آ رہا ہوں۔ مجھ پر گولی نہ چلائی جائے۔“

فائرنگ بند ہو چکی تھی۔ میدان جنگ سرد ہو رہا تھا۔ بڑی دیر سے گولی نہیں چل رہی تھی۔ سبھی گھبراہٹ میں بھاگتے ہوئے آگئے، جہاں مرینہ ہوٹل میں بچی ہوئی تھی۔ اس نے پولیس انسپکٹر کو آئی ڈی کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”آئی ایم مرینہ دلاور اے میٹ آفیسر فرام لندن ہیڈ آفس۔“

پولیس انسپکٹر نے اس سے مصافحہ کیا۔ وہ بولی۔ ”یہاں ایک شخص میری مدد کر رہا تھا۔ ساتھ والے ہوٹل کے سامنے چھپا ہوا دشمنوں کی فائرنگ کا جواب فائرنگ سے دے رہا تھا۔“

انسپکٹر نے کہا۔ ”میں ابھی اسی ہوٹل سے آ رہا ہوں۔ وہاں ایسا کوئی شخص نہیں ہے جس کے پاس اسلحہ ہو۔ آپ خود چل کر دیکھ سکتی ہیں۔ ہم نے ہر ایک کی تلاش کر لی ہے۔“

وہ پولیس والوں کے ساتھ چلتی ہوئی اس ہوٹل کے سامنے آئی۔ ”میز اور کرسیاں الٹی ہوئی تھیں۔ مراد نے انہیں ڈھال بنایا تھا۔ اب وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہوٹل والوں نے کہا کہ وہ پچھلے دروازے سے نکل چلا گیا ہے۔“

وہ دوڑتی ہوئی پچھلے دروازے سے باہر آئی ادھر ایک ٹنگ گلی کے ساتھ رہائشی مکانات تھے لوگ آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بھنبلا گئی، کیسا ہر جاتی تھا۔ پاس آتے آتے پھر دور ہو گیا تھا۔

پولیس انسپکٹر نے آکر پوچھا۔ ”پتا نہیں کون تھا؟ سب نے دیکھا ہے اس نے بڑی جی داری سے مقابلہ کیا تھا۔“ وہ بولی۔ ”ہاں۔ وہ میری مدد کرتا تو میں تباہی ماری جاتی۔“ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ مراد مجبور ہو کر اس سے ملے

ایک ہوٹل کے اندر آئی پھر فوراً ہی کمر بیٹ سے دوسری گن نکال لی۔ وہ کئی ہتھیاروں کو زیور کی طرح ہین کر رہنے کی عادی تھی۔

اس نے ہوٹل کی چوکھٹ پر لیٹے ہی لیٹے مراد کی طرف دیکھا، وہ وہاں سے دور فٹ پاتھ کی میز اور کرسیوں کے پیچھے زمین پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ وقفے وقفے سے فائرنگ ہو رہی تھی اور وہ نہتا تھا۔ مرینہ نے آواز دی۔ ”ایمان! یہ لو.....“

یہ کہتے ہی اس نے ایک ریوالور کو اس کی طرف پھینکا۔ وہ ریوالور زمین پر پھسلتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ اس نے اسے اٹھایا پھر ایک میز کو گرا کر اسے اپنے سامنے دیوار بنا لیا۔ اپنے دائیں بائیں سے کرسیاں کھینچ کر اپنے اوپر ڈال لیں اب کوئی گولی سپر می آ کر اسے نکلنے والی نہیں تھی۔

اس نے آگے بھاڑ بھاڑ کر دور تک نظریں دوڑائیں۔ دوسری طرف کے فٹ پاتھ کے ساتھ جو دکانیں تھیں، وہاں سے ایک شوٹر گولیاں چلا رہا تھا۔ اس نے مرینہ کو ایک ہوٹل کی چوکھٹ پر اوندھے منہ لیٹے ہوئے دیکھا پھر اس کا نشانہ لیا۔ اسی لمحے میں مراد نے اسے نشانے پر رکھ کر ایک ہی گولی سے اسے اڑا دیا۔ ایک طویل عرصے سے دن رات ہتھیار پکڑتے پکڑتے یہ مہارت حاصل ہو گئی تھی۔

دوسرا شخص ایک دکان کی چھت کے سرے پر آ کر مراد کی طرف گولیاں چلانے لگا۔ وہ تمام گولیاں آتور ہی تھیں لیکن میز اور کرسیوں سے ٹکرا کر اپنی سمت بدل رہی تھیں۔

اب وہ گدھا گاڑی والا اناڑی نہیں تھا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑتے ہوئے بھی سچ نشانہ لیتا تھا۔ کوئی سا بھی ہتھیار ہو اس کے ہاتھوں میں آ کر کھلوتا بن جاتا تھا۔ اس نے ریوالور کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر جیم کر نشانہ لیا۔ چھت کے سرے سے ایک نیچے ہوئے دشمن کی آخری چیخ سنائی دی۔ وہ اوپر سے گرتا ہوا، دکان کے نیچے پر سے لڑھکتا ہوا فٹ پاتھ پر آ کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔ مرینہ نے مراد کی طرف ایک ہوائی بوسہ اچھالتے ہوئے کہا۔ ”جیو میرے بار! مرینہ تم پر یونہی نہیں مرتی ہے۔“

وہ نہیں جان سکتی تھی کہ جس ایمان علی کا چھپا کر رہی تھی، وہ بدل گیا ہے۔ وہ اس پر صدمے واری ہوتی ہوئی ہوٹل کے اندر آگئی۔ اسی لمحے میں ایک گولی آ کر چوکھٹ سے گرائی۔ اگر وہ پیچھے بننے میں ایک ساعت کی بھی دیر کرتی تو مراد کو بوسہ دینا مہنگا پڑ جاتا۔ وہ گولی اس کا بوسہ لے چکی ہوئی۔



جنگی کہانیوں آپ سٹیوں جنگ سٹیوں کے مثال مجموعہ



مارچ 2015

کی جھلکیاں

استاد احمد

اردو ادب کی ایک اہم شخصیت کا زندگی نامہ

خزانہ

دنیا بھر میں ادھر ادھر مد فون خزانوں کا تذکرہ

بیتنم سنگم کمال

خبرداران بدنام ترین شہرور سے دور ہیں

ایضاً سبانا

اس نے چھوٹے بھائی کو دل بھر کر ستایا جو اپنا چھوٹے نے بھی وار کر دیا جس سے وہ عمر بھر تلملا رہا ہے گا۔ ایک سبق بھری سچ بیانی

بیتنم سنگم کمال

مرحوم علی سفیان آفاقی کی تخری تحریر سے

آپ محفوظ رکھنا پسند کریں گے



عربی سرگزشت "سراب" جس کے سچ و خم نے قارئین کو مسحور کر رکھا ہے۔ دنیا بھر سے دلچسپ و معلومات بھرے قصے، سبق آموز واقعات اور دل کو چھو لینے والی سچ جانیاں

آج ہی نزدیکی جنگ اسٹال پر اپنے شمارہ مختص کرالیں

خاص شمارہ... ہر شمارہ، خاص شمارہ... ہر شمارہ، خاص شمارہ

خیر چلا گیا ہے۔ وہاں رہتا تو پولیس تھانے کے چکر میں پڑ جاتا اور یوں دشمنوں کی نظروں میں آجاتا۔ اب تک کسی نے اسے ایمان علی کے بہروپ میں نہیں پہچانا تھا۔ صرف مرید پہچانتی تھی اور پہچان کر بھی دھوکا کھا رہی تھی۔ وہ ایمان علی کے درمیان ہینک رہی تھی۔ وہ اسے تلاش کرنے ہوٹل سے نکلی تھی اور صحیح منزل تک آپہنچی تھی لیکن دشمنوں کی ندادت نے منزل کو پھر اس سے دور کر دیا تھا۔ گائڈ نظام نے آکر کہا۔ "میڈم! میرے لیے کیا حکم ہے؟"

مرید نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ "تم بہت اچھے ہو اور دلیر بھی ہو، لیکن میرے ساتھ گائڈ بن کر رہو گے تو تمہاری شامت آجائے گی۔ مجھ سے دور ہی رہو۔" اس نے گائڈ کو پانچ سو ڈالر روپے۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ "میں محطرات سے ڈرتا نہیں ہوں۔ اگر آپ ساتھ رکھنا چاہیں تو حاضر ہوں۔"

اس نے نظام کو دیکھتے ہوئے سوچا پھر کہا۔ "ابھی ایک شخص مجھ پر حملہ کرنے والوں پر گولیاں چلا رہا تھا۔ میرے لیے قاسٹ کر رہا تھا۔ تم نے اسے دیکھا ہوگا؟" "میں دور سے چھپ کر دیکھ رہا تھا۔" "کیا اسے صورت سے پہچان سکو گے؟"

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "وہ بہت دور تھا، پھر وہ میز اور کرسیوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ میں اسے پہچان نہیں سکوں گا۔"

وہ ڈراما ایس ہوئی پھر بولی۔ "اس کا نام ایمان علی ہے وہ دہلی سے آیا ہے اسے لندن جانا ہے۔ پتا نہیں یہاں کیوں رک گیا ہے۔ اگر تم اسے تلاش کرو گے اور مجھے اس کے بارے میں اطلاع دو گے تو تمہیں ایک ہزار ڈالروں کی۔" وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "میں اسے جی جان سے ڈھونڈ نکالوں گا۔"

وہ پھر ایک بار مراد کے قریب ہونے کے لیے اندر ہی اندر بچل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "کسی بھی طرح اس کے کسی پتے ٹھکانے پر پہنچاؤ گے تو میں پانچ ہزار ڈالر بھی دوں گی۔"

"پھر تو میں اسے صبح تک ڈھونڈ نکالوں گا۔" "وہ پکا نمازی ہے۔ مسجدوں کے آس پاس ضرور ملے گا۔ مسلمانوں کے ہوٹلوں میں کھانے کے لیے جاتا ہوگا۔"

"مجھ گیا میڈم! میں اسے یہاں کے تمام مسلم گھرانوں میں بھی تلاش کروں گا۔"



وہ اپنی ریاضت کار میں آکر بیٹھ گئی۔ دل اس پر اٹک گیا تھا۔ اس نے کار اسٹارٹ کرنے سے پہلے فون پر مراد سے رابطہ کرنا چاہا۔ اس کے دونوں نمبر بچے کے پتا چلا کہ وہ دونوں نمبر بند ہیں۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس سے کتنا برا ہے۔ اس سے یہ کہہ چکا تھا کہ وہ اس کے سر کا سودا کرنے والوں میں سے ایک ہے اس کی کمینگی کا ثبوت فرنیچ لیگنٹج کے ذریعے مل چکا تھا۔

وہ آسانی سے اس پر بھروسہ کرنے والا نہیں تھا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی ہتھیالیوں پر اٹکا رہے بھی رکھ کر قسم کھائے گی تب بھی اس پر اعتماد نہیں کرے گا۔ ہاں، کبھی اس کی محبت اور وفاداری کا ثبوت ملے گا تب اس سے ضرور دوستی کرے گا اور تب تک اس سے دور رہا کرے گا۔

وہ کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے جاتے ہوئے زیر لب بڑبڑانے لگی۔ ”وہ اسی لیے مجھ سے ملے بغیر چلا گیا ہے۔ فون کی سم بھی بدل دی ہے۔ لیکن ایک بات ہے مجھ سے دور رہنے کے باوجود میرا دیوانہ ہے۔ مجھے دل و جان سے چاہتا ہے، ابھی اس نے میری ہی خاطر حملہ آوروں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ میں اسے جلد ہی مثالوں کی۔ کسی بھی طرح پھر اس کے دل میں جگہ بنا لوں گی۔“

وہ بہت ہی ضدی اور مضبوط قوت ارادی والی عورت تھی۔ مرتے دم تک اس کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔

☆☆☆

گانڈ نظام انرپورٹ میں کام کرنے والے چند اہم افراد سے شناسائی اور دوستی رکھتا تھا۔ اس نے ایک جنیئر افسر سے کہا۔ ”دوروز پہلے ایمان علی نام کا ایک شخص دہلی سے یہاں آیا تھا۔ کیا یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اسے یہاں کتنے دنوں تک قیام کی اجازت ملی ہوگی؟“

افسر نے پوچھا۔ ”یہ جاسوسی کیوں کر رہے ہو اور کس کے لیے کر رہے ہو؟“

نظام نے کہا۔ ”پھاری ایک خاتون اس کے عشق میں جلا ہے۔ اسے تلاش کر رہی ہے۔ میں اس سے ٹکی کرنا چاہتا ہوں۔“

اس افسر نے عارضی قیام کرنے والے مسافروں کے متعلق معلومات حاصل کیں تو پتا چلا، وہ دہلی سے آنے والا ایمان علی دوسرے دن صبح دس بجے کی فلائٹ سے لندن چلا جائے گا۔

نظام نے فوراً ہی مرینہ سے فون پر کہا۔ ”میڈم آپ کے لیے ایک اہم اطلاع ہے۔ وہ ایمان علی کل دس بجے کی

فلائٹ سے لندن جانے والا ہے۔“

”کیا واقعی؟“ اس نے بے چینی سے پوچھا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ وہ کل یہاں سے چلا جائے گا؟“

”میری اطلاع نامعلوم نہیں ہوگی۔ آپ اپنے ذرائع سے معلوم کر سکتی ہیں۔ کل لندن جانے والے مسافروں کی فہرست میں ایمان علی کا بھی نام ہے۔“

”تھیک یو نظام! تمہارے ایک ہزار ڈالرز بچے ہو گئے۔ اگر وہ مجھے مل جائے گا میں اس سے باتیں کر سکوں گی تو تمہیں پانچ ہزار ڈالرز ضرور دوں گی۔“

اس نے سفارت خانے کے ذریعے معلوم کیا نظام کی اطلاع درست تھی۔ وہ سوچنے لگی۔ ”مراد کو لندن ہی جانا تھا۔ پتا نہیں یہاں تین دنوں کے لیے کیوں رک گیا تھا۔ کل انرپورٹ پر اسے پکڑوں گی تو وہ حیران رہ جائے گا۔“

وہ اسے پکڑنے کے خیال سے مسکرانے لگی۔ ”یقین سے سوچنے لگی۔“ وہ مجھ سے فون پر بات کرتا ہے تو کل رو برو بھی بات کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔“

وہ اپنے دھوکے ہوئے دل کی جگہ ہاتھ رکھ کر مسکرانے لگی۔ ”مراد مجھ سے یونہی کتراتا ہے۔ میں اس کے دل میں ٹھسی ہوئی ہوں۔ آج اس نے حملہ کرنے والوں سے میری خاطر جنگ لڑی ہے۔ ہائے مراد! تم پر قربان ہو جاؤں۔ مجھ سے ایک ہار نہ لو۔“

دوسرے دن ملنے کی بے چینی تھی۔ اس نے وہ رات سوتے جاتے گزار دی۔ دوسری صبح پانچ بجے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ریڈ الرٹ، ڈنچرس ریکٹ اور دوسری تنظیموں نے اس ہونٹ کے ملازموں کو اچھی خاصی رقم دی تھی۔ وہ اس کے لیے خبری کر رہے تھے۔ صبح چھ بجے ان ملازموں نے اطلاع دی کہ مرینہ نے ناشتے کا آرڈر دیا ہے۔

اس اطلاع سے سب ہی چو کئے ہو گئے۔ یہ بات کچھ میں آئی کہ وہ پتا نہیں کب سے جاگ رہی ہے اور مراد سے رابطہ رکھتی آرہی ہے۔ نئی صبح ناشتا کرنے والی ابھی ضرور کہیں باہر جائے گی۔

پھر تو سب ہی اٹھ بیٹھے۔ بستر چھوڑ کر اپنے سارا سامان سے، ہتھیاروں سے لیس ہو کر گاڑیاں دوڑاتے ہوئے ہونٹ کے آس پاس پہنچ گئے۔

مراد اور ایمان علی نے ملے کیا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے دور رہیں گے۔ اس کے وہاں سے روانہ ہونے تک ایک دوسرے سے فون کے ذریعے رابطہ رکھیں گے۔

ایک تو وہ ہم شکل تھے۔ لوگ انہیں حیرانی اور دلچسپی



میں یہاں ہوں اور پھول انڈیا میں کھل رہا ہے۔ میں تمہاری مرینہ کو یہاں زیادہ سے زیادہ تین دنوں تک روکوں گا۔ اس کے بعد دوبارہ مشرق کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔“

مرینہ تیزی سے کارڈرائیو کر رہی تھی۔ جلد سے جلد مراد کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔ ایسے ہی وقت وہ آگے جانے والی ٹھنک گئی۔ کھڑکی کے باہر اس کی نظر تھی۔ اس نے حیرانی سے دیکھا۔ دوسری سڑک کے بیٹروں پر وہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے حیران ہو کر کار کی رفتار سست کی۔ اسے ابھی طرح دیکھا۔ پوری طرح یقین کیا کہ وہ ایمان علی کے بہروپ میں مراد ہی ہو سکتا تھا۔

وہ فون پر باتیں کرتا ہوا اسٹریٹنگ سیٹ پر بیٹھ رہا تھا۔ مرینہ ٹریفک کے جھوم میں چیخ کر اسے پکارتی تو آواز وہاں تک نہ جاتی اور وہ اپنی کار فوراً ادھر نہیں لے جاسکتی تھی۔ دن دے پر تھی۔

اسے آگے کہیں کٹ ملتا تو س راستے پر جاسکتی تھی۔ وہ تڑپ گئی۔ اس کے سامنے مراد گاڑی اشارت کر کے جا رہا تھا۔ وہ رفتار بڑھاتی ہوئی آگے کسی کٹ یا موڑ کی طرف جانے لگی۔

وہ پیچھے بھاگتے بھاگتے اسے پکڑ نہیں سکتی تھی۔ وہ آگے جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنے فریبی یا روکار میں بیٹھ کر کسی اور راستے پر جاتے دیکھا تھا۔ یعنی وہ انرپورٹ پر نہیں جا رہا تھا۔ جبکہ فلائٹ کی روانگی کا وقت ہو رہا تھا۔

وہ اگلے کٹ پر اپنی گاڑی کو اس سڑک پر لے آئی۔ تیز رفتاری سے سیدھی سڑک پر جانے لگی لیکن مشکل یہ تھی کہ سڑکیں صرف سیدھی نہیں جاتیں۔ اکثر دائیں بائیں سے کئی سڑکوں کی شاخیں نکلتی رہتی ہیں۔

اس نے ایک جگہ رک کر پریشان ہو کر سوچا۔ کدھر جائے، دائیں یا بائیں؟ یا پھر سیدھی دوڑتی رہے۔ پتا نہیں وہ کتنی دور نکل گیا ہوگا؟ جانے کہاں گیا ہوگا؟

اس نے فون نکال کر راپہ کیا۔ خلاف توقع مراد کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو، کیا تمہیں زندگی نہیں آتی۔ صبح ہوتے ہی کال کر رہی ہو۔“

وہ بولی۔ ”بہت پہلے ہی صبح ہو چکی ہے۔ آٹھ بج کر تیس منٹ ہو چکے ہیں اور تمہاری بس بچے کی فلائٹ ہے۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”اوگاڈ! تم یہ تک جانتی ہو کہ میں دس بجے کی فلائٹ سے جانے والا ہوں؟“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”میری دیوانگی کا اندازہ کرو کہ تمہیں

سے دیکھتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ اچانک کہیں مرینہ سے سامنا ہو سکتا تھا۔ اس سے کسی بھی طرح یہ حیرت انگیز حقیقت چھپانا چاہتے تھے کہ گل ایبیب میں ایک نہیں دو ایمان علی ہیں۔ ابھی وہ دونوں اسے بھٹکانے کے سلسلے میں کامیاب ہو رہے تھے۔ اور وہ ایک وقت میں ایک ہی ایمان علی کو دیکھ کر دھوکا کھاتی چلی آ رہی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ مرینہ انرپورٹ جانے کے لیے ہوٹل سے نکلی تو کتنے ہی انجانے دشمن اس کی کار سے فاصلہ رکھ کر تعاقب کرنے لگے۔ وہ اناڑی نہیں تھی۔ تعاقب کرنے والوں کو ان کے طریقہ کار سے تاثر ہی تھی۔

نظام نے فون پر کہا۔ ”میڈم! میں انرپورٹ پر ہوں لیکن ایمان علی کو صورت سے نہیں پہچانتا ہوں۔ وہ یہاں موجود ہوگا۔ آپ جلدی آنے کی کوشش کریں۔“

وہ تعاقب کرنے والوں پر نظر رکھتی ہوئی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی ہوئی بولی۔ ”میں آ رہی ہوں۔ راستے میں ہوں۔“

اس نے فون بند کر کے کار کی رفتار بڑھا دی۔ ایمان علی ایک بیٹروں پر پہنچنے میں ٹھکیا تھا۔ اس نے مراد سے فون پر پوچھا۔ ”کیا انرپورٹ پہنچ گئے ہو؟“

مراد نے جواب دیا۔ ”ابھی پہنچا ہوں۔ کسٹم چیکنگ سے گزرنے کے بعد اندر جاؤں گا۔ تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟ مجھ سے تو کبھی چھپ کر نہیں رہو گے؟“

”کبھی نہیں۔ ڈیڑھی کلمہ پڑھیں یا نہ پڑھیں، میں ان سے ملوں یا نہ ملوں لیکن تم سے چھپ کر نہیں رہوں گا۔ فون پر ہمارا رابطہ رہے گا اور ہم ضرورت کے وقت ملنے رہیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”خدا تمہیں خوش رکھے اور تمہیں سلامتی دے اور مرینہ کو تمہارے پیچھے دوڑا تا رہے۔“

اس بات پر دونوں ہنسنے لگے۔ پھر ایمان علی نے کہا۔ ”سلامتی کیسے ملے گی؟ تم تو یہاں سے جا رہے ہو اور میرے پیچھے مرینہ کو اور جانے کتنے دشمنوں کو لگا چکے ہو۔“

وہ یقین سے بولا۔ ”جب تک وہاں مرینہ رہے گی کسی دشمن کو تمہارے سامنے تک پہنچنے نہیں دے گی۔ اپنے حراج کے مطابق رومانک باتیں سوچو۔ ایک حسین ڈیجیل دو شیزہ ہندوستان میں پیدا ہو کر تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“

اس نے ایمان علی کا اسٹریٹنگ انڈیا کی طرف گھما دیا۔ وہ اسی طرح پہلا کراسے اپنے کام کے قابل بنا سکتا تھا۔ وہ واقعی خیال رقیبی میں گم ہو کر بولا۔ ”ورشا..... ہائے!



کتنی شدت سے چاہتی ہوں۔“

”ہاں، مگر تمہاری معلومات درست ہونے کے باوجود غلط ہوئیں۔ میں جانے والا تھا۔ اب نہیں جا رہا ہوں ایک ضروری کام سے رک گیا ہوں۔“

”یہی میں دیکھ رہی ہوں۔ تم ائرپورٹ کے بجائے سی پورٹ کی طرف جا رہے تھے۔“

عجیب حالات تھے کہ وہ صحیح معلومات بھی حاصل کر رہی تھی اور ان دونوں کے درمیان جھگ بھی رہی تھی۔ کامیاب ہوتے ہوتے ناکامی کے موڑ پر آگئی تھی۔

ایمان علی نے شدید حیرانی سے کہا۔ ”بائی گاڈ.....! تم مجھے حیران کر رہی ہو۔ یہ بھی جانتی ہو کہ میں ابھی کن راستوں سے گزر رہا ہوں؟“

وہ قانع کے انداز میں ہنسنے لگی۔ پھر فون کو دیکھا وہ بند ہو گیا تھا۔ مراد نے حیرانی سے رابطہ ختم کر دیا تھا۔ مرید کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ابھی ایک فلائٹ سے جا رہا ہے۔

اب وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ایمان علی اسے بھٹکانے میں کہاں تک کامیاب رہے گا۔ اس نے فوراً ہی ایمان سے فون پر پوچھا۔ ”کیا تم سی پورٹ کی طرف جا رہے ہو؟“

اس نے پوچھا۔ ”ہاں، تم کیسے جانتے ہو؟“

”میں نہیں جانتا۔ وہ بلائے جان ہم سے زیادہ جانتی ہے۔ تمہارے پیچھے لگی ہے۔ اسے کسی طرح ڈانچ دو۔“

”نو پرائیم۔ ابھی اسے بھٹکاؤں گا۔“

وہ اپنی کار کو ایک جگہ روک کر اسے لاک کر کے پھرتی سے ایک گلی میں ٹھس گیا۔ تیزی سے دوڑنے کے انداز میں چلتا ہوا دوسری سڑک پر پہنچ گیا۔ پھر وہاں سے ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر جانے لگا۔ اس نے پچھلی سیٹ پر آرام سے بیٹھے ہوئے فون پر ریٹنڈ کار والوں سے کہا۔ ”پلیز مسٹر...! اسی پورٹ روڈ پر آپ کی کار کھڑی ہے۔ اسے لے جائیں۔ میں ابھی آ کر دوسری کار لے جاؤں گا۔“

وہ بڑی بھاگ دوڑ کے بعد کامیاب ہو گئے۔ مرید اپنی ذہانت اور حاضر دماغی کے باوجود ایمان علی کے پیچھے بھاگتی رہ گئی اور وہ جہاز میں آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ادھر یہ جا رہا تھا۔ ادھر ایمان علی کم ہو گیا تھا۔ اور وہ ان دونوں کے درمیان جھگ رہی تھی اور صرف وہی نہیں اس کے پیچھے اور بھی کئی دشمن بیٹھ کر پھونکتے جا رہے تھے۔

جہاز نضا میں بلند ہو کر پرواز کر رہا تھا۔ وہ آرام سے سیٹ کی پشت سے ٹک لگائے مسافروں کے درمیان تہا بیٹھا ہوا تھا۔ ویسے انکروں پر چلنے والوں کو آرام کہاں متا

ہے؟ ایک مصیبت جاتی ہے تو دوسری شامت آ جاتی ہے۔ ستارے گردش میں ہوں اور خطرے کی گھنٹی سنائی نہ دیتی ہو تو بے خبری میں معنوم نہیں ہوتا کہ آرام حرام ہو گیا ہے۔ ایک یا ایک سے زیادہ دشمن بھی ہم سفر ہیں۔ وہاں ایک ایسا شخص تھا، جو اس کے تمام دشمنوں کا باپ تھا۔ اسی نے مراد کے سر کی قیمت پچاس لاکھ ڈالر لگائی تھی اور بے بے شمار دشمنوں کو اس کے پیچھے لگا دیا تھا اور وہ تھا سنڈیکٹ ریڈ الرٹ کا سربراہ۔ مسکی براؤن۔

مراد جہاں بیٹھا ہوا تھا وہیں آگے والی سیٹ پر وہ اپنے ایک دست راست کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ وہ دشمن ابھی یہ نہیں جانتا تھا کہ جس کی ہلاکت کا وہ تھمتی ہے، وہ خطرناک دشمن پیچھے ہی ایک سیٹ پر موجود ہے۔ مراد کی زندگی اسے بہت گھنٹی پڑ رہی تھی۔ جہاں جہاں اس کی موجودگی کا شبہ ہوتا تھا وہاں اس کے شوٹرز اور جاسوس پہنچ جاتے تھے۔ یہی تو قدرت کا تماشا ہے کہ اسے اس کی موجودگی کا شبہ نہیں ہو رہا تھا۔

مسکی براؤن بہت نقصان اٹھا رہا تھا لیکن جرائم کی دنیا میں صرف ایک اکیلے شخص سے مات کھا کر اپنی ناک بچنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہر آنے والے دن یہ یقین ہوتا تھا کہ مراد آج ضرور مارا جائے گا، جو لاکھوں ڈالر خرچ ہو رہے ہیں، ان کے نتیجے میں ایک نہ ایک دن تو ضرور کامیابی حاصل ہوگی۔

اب تو دوسری تنظیموں کے سربراہ اور شوٹرز بھی ضد میں آ گئے تھے کہ ایسی کیا بات ہے کہ وہ ہتھے نہیں چڑھ رہا اور مارا نہیں جا رہا۔ وہ ان تمام مجرموں کے برسوں کے تجربات کے لیے چیخ مچ گیا تھا۔

مسکی براؤن اپنے دست راست مارٹن واگر سے باتیں کر رہا تھا۔ دوسری قطار میں اس کی بیوی، ایک جوان بیٹی، دو جوان بیٹے اور ایک چار برس کی خوب صورت سی گڑیا جیسی بیٹی تھی۔

گویا اس کا پورا خاندان وہاں موجود تھا۔ جہاز کے پرسکون ماحول میں پھول کھلنے کی توقع نہیں تھی۔ ذہر کھلنے کے آثار تھے۔ مراد نے اس پیاری سی ہارنی ڈول کو پیار سے ڈرا پیکار اور وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس آگئی۔

ایمان علی کے بہرہ میں وہ بھی ہے انتہا خوب رو ہو گیا تھا۔ صرف بیٹی ہی اس کی طرف گھنی ہوئی نہیں آئی بلکہ اس کی ماں، بہن اور دونوں بھائی بھی اسے تقریبی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ہارنی ڈول کو اس کی گود میں دیکھ کر مسکرا



میڈونا مراد کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے بولی۔ ”یہ ہماری بارہنی تم سے بہت متاثر ہوئی ہے۔ بہت شریر ہے۔ تمہیں پریشان تو نہیں کر رہی ہے؟“  
وہ بولا۔ ”ناٹ ایٹ آل۔ بہت پیاری اور مصوم ہے۔ میں اس کی باتوں سے انجوائے کر رہا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے یہ چلتی پھرتی اور یوتی ہونا گڑیا ہمیشہ میرے پاس رہے۔“

ماں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ یہ ہمیں بہت پریشان کرتی ہے۔“  
بارہنی نے اپنی تھی بانہیں مراد کی گردن میں ڈال کر اسے چومتے ہوئے کہا۔ ”میرے بابا مجھے اسی طرح چوم کر کہتے ہیں آئی لو۔ میں بھی تم کو آئی لو پوکتی ہوں۔“

مراد نے کہا۔ ”میری تھی گڑیا آئی لو پوٹو۔“  
میڈونا نے چھوٹی بہن کو گلے لگ کر پیار کرتے دیکھا تو دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔ ”میرا نام میڈونا ہے سب مجھے ڈریم گرل کہتے ہیں۔“

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مراد نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”کوئی شک نہیں ہے۔ تم اتنی خوب صورت ہو کہ تمہیں ڈریم گرل ہی کہنا چاہیے۔“

وہ چاہتی تھی کہ مصافحہ طویل ہو جائے۔ ایسی مضبوط مردانہ گرفت تھی کہ وہ اور زیادہ گرفتار ہوئی تھی۔ اس کی توقع کے خلاف مراد نے جلد ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

ماں نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام مارٹھا ہے۔۔۔ سزا مار تھا براؤن۔ یہ اگلی سیٹ پر میرے ہز بیٹہ کی براؤن بیٹھے ہیں۔“

نام ایسا تھا کہ مراد کے ذہن کو آپک جھٹکا سا لگا۔ اس نے چونک کر اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا۔ وہ سر گھمائے اپنے دست راست سے باتیں کر رہا تھا۔ سرگھمانے کی وجہ سے چہرہ کسی حد تک نظر آرہا تھا۔

یہ عجیب سی بات تھی کہ اس نے اپنے سب سے بد بدترین دشمن کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ اب اسے دیکھ کر پہچان نہیں سکتا تھا اور یقین سے کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہی خطرناک شخص ہے۔

اس نے سوچا۔ ”یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ وہی ہو۔ براؤن ہو۔ دنیا میں اس نام کے کتنے ہی لوگ ہوں گے۔ یہ میری بے پروائی ہے۔ مجھے کبھی اس کی کوئی تصویر تو دیکھنی تھی۔“  
اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سوچا۔

بعض اوقات عجیب حالات درپیش ہوتے ہیں۔ جو پورا خاندان اس کے لہو کا پیا سا تھا، وہ انجانے میں اسے پسند کر رہا تھا۔ ایک تھی سی ہنگی نے ان کے درمیان ایک ذرا سی اپناہت پیدا کر دی تھی۔ وہ جانی دشمن کی ایک مصوم سی ہنگی تھی لیکن جو بائیس برس کی تھی، وہ بھی پہلی نظر میں ایمان علی کی خوب روئی اور اساتذہ پر دل ہار گئی تھی۔ اس جوان ہنگی کو سب ہی ڈریم گرل کہتے تھے اور واقعی وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اسے خوابوں میں آنے والی حینہ کہا جاسکتا تھا۔ ڈریم گرل نے اپنی ماں کے قریب جھک کر سرگوشی میں کہا۔ ”مام اتم دیکھ رہی ہوں، یہ کتنا ونڈم ہے میرا دل کھنچا جا رہا ہے۔ پلیز اس سے دوستی بڑھائیں۔“

ماں نے سرگھما کر مراد کی طرف دیکھا۔ پھر کہا۔ ”ہوں۔ ونڈم اور اساتذہ تو ہے۔“  
پھر وہ بیٹی کو تھمبی انداز میں بولی۔ ”تم بہت جلد باز ہو۔ خبردار اسے آئیڈیل اور لائف پارٹنر بنانے کی جلدی نہ کرنا۔“

”مام! پہلے اس سے فری تو ہونے دیں۔ محل کر اس سے باتیں کروں گی پھر سوچوں گی کہ کیا کرنا ہے؟“  
مام کے دو جوان بیٹے مراد کے ساتھ والی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ اس نے ایک بیٹے کو اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ ہاں سے اٹھ کر قریب آ کر بولا۔ ”یس مام؟“  
وہ بولی۔ ”تم دونوں یہاں آ کر بیٹھو۔ میں میڈونا کے ساتھ وہاں جاؤں گی۔“

وہ بہن کو بے زاری سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھ گیا۔ یہ اس ونڈم سے فلرٹ کرے گی۔“  
ماں نے سختی سے کہا۔ ”لو آگریمینٹس۔ اپنے بھائی کو بھی یہاں بلاؤ۔“

بیٹوں نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ ماں اور بہنوں کی سیٹوں پر آ گئے۔ ماں اور بیٹی مراد کے پاس آئیں۔ بارہنی ڈول پہلے ہی مراد سے لگی ہوئی پیاری پیاری باتیں کر رہی تھی۔ میک براؤن نے اپنے فیکل میمز کو سنیں بدلتے دیکھا تو پہلی بار اس کی آنکھوں نے مراد کو بھی دیکھا۔

اسے کہتے ہیں، قسمت کا کھیل، وہ جس کا لہو اچھالنا چاہتا تھا، اسے اپنی آنکھوں سے بیوی اور بیٹی کے قریب دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں اس بات کی اہمیت نہیں تھی کہ اس کے بیوی بچے کسی اجنبی مسافر میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ وہ اس وقت اپنے دست راست سے مراد کے متعلق



”بھوگی اپنا بناؤ گی تو میں ہمیشہ اپنا بن کر رہوں گا۔“  
 وہ خوشی سے کھل گئی۔ اپنی تعریف سننے کی عادی تھی۔  
 اس نے پوچھا۔ ”کیا میں اچھی لگتی ہوں؟“  
 ”اچھی سے بھی زیادہ اچھی لگتی ہو۔ ایک تو تم ویسے ہی  
 حسین ہو۔ لیکن جانے کیسی کشش ہے تمہارے اندر کہ بڑی  
 دیر سے تمہاری طرف کھنچا جا رہا ہوں۔“  
 ”میں بھی تمہیں دیکھتے ہی تمہارے ہارے میں  
 سوچنے لگی ہوں۔ پہلی ملاقات میں ایک دوسرے کو کبھی بغیر  
 نہ محبت کی جاتی ہے، نہ شادی کی جاتی ہے۔“  
 وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”یہ سمجھو کہ شادی  
 کے بعد ہی کوئی اپنا کہلاتا ہے۔ جو میرا جیون ساتھی ہوگا اسی  
 کو پرستل ہائیں بتاؤں گی۔“  
 وہ بولا۔ ”محبت سچی ہو تو شادی کے بغیر بھی اعتماد اور  
 اپنا پن قائم ہو جاتا ہے۔“

وہ باپ کی طرف ایک نظر ڈال کر بولی۔ ”لیکن پاپا  
 کہتے ہیں کہ میں جسے پسند کروں گی اسی سے شادی کریں  
 گے۔ لیکن شادی سے پہلے داماد کو اپنا راز دار بنا لیا جائے گا  
 اور اسے اپنے گھر کے معاملات بتائے جائیں گے۔“  
 مراد نے کہا۔ ”بھرتو ہماری بات نہیں بنے گی۔ کسی  
 لڑکی کے ساتھ پوری زندگی گزارنے سے پہلے اس کے  
 مزاج کو، عادات کو اور اس کے فیملی بیک گراؤنڈ کو سمجھنا بہت  
 ضروری ہوتا ہے۔“

اس نے قائل ہو کر سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ”ابھی تم اپنے  
 اور اپنے باپ اور بھائیوں کے بارے میں کچھ نہیں چھپاؤ گی  
 تو لندن پہنچنے ہی تم سے شادی کروں گا۔ ورنہ اس سفر کے  
 اختتام پر ہماری یہ اپنایت بھی ختم ہو جائے گی۔“ وہ سوچ  
 میں پڑ گئی۔ مراد نے پٹا کو چومتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس گڑیا  
 سے بچھڑنے کا بہت دکھ ہوگا اور...“ وہ ایک مرد آہ بھر کر  
 بولا۔ ”اور... تم سے بھی بچھڑنا ہی ہوگا۔“

میڈوٹا نے بے اختیار اپنا ہاتھ مراد کے ہاتھ پر رکھا جیسے  
 بچھڑنے والے کو پکڑ رہی ہو۔ مراد نے کہا۔ ”تمہارے پاپا کہتے  
 تھے۔ کسی کو داماد بنانے کے بعد اپنا راز دار بنا لیں گے۔ یہ تو کوئی  
 بات نہ ہوئی، کیا وہ دل دہننے کے بعد راز فاش نہیں کرے گا؟  
 ان کے اعتماد کو دھوکا نہیں دے گا؟“

”نہیں...“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ”میرے  
 پاپا صرف اعتماد قائم رکھنے والوں کے لیے بہت اچھے ہیں۔  
 وہ دھوکا دینے والوں کے لیے موت بن جاتے ہیں۔ میں  
 تمہیں یقین دلاتی ہوں تم داماد بن کر ایک بیٹے کی طرح ان

یہاں موبائل فون استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ میں  
 طیارے سے اترتے ہی ماسٹر کو بولو سے کہوں گا کہ وہ میرے  
 موبائل فون پر مکی براؤن کی تصویر Send کر دے۔“  
 وہ سوچ رہا تھا۔ ”یا خدا.....! اگر یہ وہی ہے تو میں  
 اس وقت سب سے بڑے دشمن کے بالکل قریب ہوں۔  
 ریڈ الٹ کے سربراہ مکی البرٹ نے مجھے ہلاک کرنے کے  
 لیے شوٹرز کو میرے پیچھے لگایا تھا۔ اسے تو میں نے اس کے  
 بہنوئی برنارڈ کی طرح جہنم میں پہنچا دیا۔ ان بہنوئی اور  
 سالے کے بعد یہ دوسرا سالہ مکی براؤن سربراہ بن کر  
 میرے پیچھے پڑا ہے۔“

ماں بیٹی اسے اپنی باتوں میں الجھا رہی تھیں اور وہ  
 سوچ رہا تھا۔ ”مجھ سے دشمنی کی ابتدا اسی خاندان نے کی ہے  
 اور شاید اسی خاندان کی عورتوں اور بچوں کے درمیان ابھی  
 پیشا ہوں۔“

اس نے ہارٹی ڈول کو پیار سے سہلاتے ہوئے  
 سوچا۔ ”یہ بیٹی بہت ہی معصوم، بہت ہی پیاری ہے خدا  
 کرے اس کا باپ میرا دشمن نہ ہو۔ یہ کوئی اور مکی براؤن  
 ہو۔ ورنہ ایک معصوم بیٹی کو یتیم بناتے ہوئے مجھے بڑی  
 تکلیف ہوگی۔“

وہ خیالات سے چونک گیا۔ میڈوٹا اس کی طرف جھگی  
 ہوئی کہہ رہی تھی۔ ”تم نے جواب نہیں دیا؟“

وہ بولا۔ ”سوری میرا دھیان دوسری طرف تھا۔“  
 میڈوٹا نے اپنا سوال دہرایا۔ اس نے جواب دیا۔  
 ”میں لندن میں رہتا ہوں۔ ویسے انڈین شہری بھی ہوں۔  
 کیا تم بھی لندن میں رہتی ہو؟“

وہ بولی۔ ”میں اپنی ماں اور ہارٹی کے ساتھ لندن  
 میں رہتی ہوں۔ میرے پاپا اور دونوں بھائی سسلی میں  
 رہتے ہیں۔“

مراد کا ہاتھ ٹھنکا۔ ریڈ الٹ کا ہیڈ کوارٹر سسلی میں تھا۔  
 اس نے پوچھا۔ ”تمہارے پاپا اور بھائی کیا کرتے ہیں؟“  
 وہ بڑے فخر سے بولی۔ ”بہت بڑے بزنس مین  
 ہیں۔ ایک سپورٹرز اور اسپورٹرز ہیں۔“

اس نے پوچھا۔ ”بائی دا وے کس قسم کا مال  
 ایکسپورٹ اور امپورٹ کرتے ہیں؟“

وہ ایک ادا سے سکراتے ہوئے بولی۔ ”یہ نہیں بتاؤں  
 گی۔ کچھ پرستل باتیں صرف انہوں کو بتائی جاتی ہیں۔“

مراد نے اپنے مزاج کے خلاف عاشقانہ انداز میں  
 اسے دیکھا پھر اس کے قریب جھک کر کہا۔ ”اگر اپنا



لگا کر ایک کس کر کے وہ اس فیملی کے اور جانی دشمن کے بہت سے راز معلوم کر سکتا تھا۔

بہت بڑی کامیابی حاصل کرنے کے لیے صرف ایک چھوٹا سا مطالبہ پورا کرنا تھا لیکن دل میں ایمان تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا گناہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ ”کیسی باتیں کر رہی ہو۔ میں یہاں سب کے سامنے ایسا نہیں کر سکتا گا۔“

وہ ہنس پڑی۔ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”کیا ہو تم...؟ لڑکیاں نہیں شرماتیں۔ تم شرم رہے ہو۔“

”سوری۔ یہ میرے مزاج کے خلاف ہے۔ ہمارے دین میں شرم و حیا کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ تم نہیں سمجھو گی، دین و ایمان کے بغیر انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔“

”او گاڈ... اتم تو سی مذہبی پیشوا کی طرح بول رہے ہو۔“ پھر وہ اس سے لگ کر بولی۔ ”ہم جوان ہیں۔ جوانی کی باتیں کرو۔ میں مانتی ہوں شرم و حیا لازمی ہے لیکن مجھ سے محبت ہے تو میرا دل رکھو۔ ٹھپ کر بیار کر لو۔“

مراد نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔ ”کوئی نہیں دیکھے گا۔ میں ابھی اٹھ کر ٹوائلٹ کی طرف جاؤں گی۔ تم چند سیکنڈ کے بعد وہاں آ جانا۔ وہاں ہم جتنا بھی وقت گزار سکتے ہیں گزار لیں گے۔“

وہ کیا بات ہے۔ شیطان جب بہکاتا ہے تو گناہ پر عمل کرنے کے راستے بھی دکھاتا ہے اور طور طریقے بھی سمجھاتا ہے۔ وہ بولا۔ ”میں تمہیں یہ بتا دوں کہ میں مسلمان ہوں۔ ہم ان مسلمانوں میں سے ہیں جو شادی سے پہلے کسی لڑکی کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔“

”پلیز میری بات مان لو۔ مجھے صرف سینے سے لگا کر بیار کرو گے تو تمہارے ایمان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“

”پہنچے گا۔ ایک چھوٹی سی غلطی کے بعد پھر غلطیوں کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے تم ابھی مجھے رازدار نہ بناؤ۔ جب تمہارے بزرگ ایک مسلمان کو اپنا داماد بنانے پر راضی ہو جائیں، تب میں شادی کے بعد ہر از بن جاؤں گا۔“

وہ مایوس ہو گئی۔ اس وقت یہ خواہش دل میں چل رہی تھی کہ کسی طرح اس کی دھڑکنوں سے لگ جائے اور مراد نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کے باپ کی حقیقت فوراً ہی معلوم کرنا ضروری نہیں ہے۔ طیارے سے اترنے کے بعد وہ ماسٹر کو بوسے کی برائڈن کی تصویر حاصل کر لے گا۔

کا احتیاط قائم رکھو گے تو وہ تمہیں سر پر بٹھاتے رہیں گے۔“ مراد کو یہ اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنے جانی دشمن کی فیملی میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے کہا۔ ”میں اپنے اصولوں کے مطابق ہی تمہیں لائف پارٹنر بنا سکوں گا۔ چلو کوئی بات نہیں۔ ہم اس سفر کے اختتام تک دوست رہیں گے پھر ایسے پھینچ جائیں گے جیسے کبھی نہیں ملے تھے۔“

اس کا ہاتھ مراد کے ہاتھ پر تھا۔ اس نے مضبوطی سے اسے پکڑ لیا۔ وہ ایمان علی جیسے پنڈت سم جوان مرد کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کن آنکھوں سے ماں کو دیکھا۔ وہ کھڑکی کے پاس بادلوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ مراد کی طرف جھٹک کر وحشی سرگوشی میں بولی۔ ”میں ابھی سب کچھ بتاؤں گی تو مجھ سے شادی کرو گے؟“

”تم آج یا کل جب بھی کہو گی شادی کروں گا۔“

”تم یہ بات پاپا کو نہیں بولو گے کہ میں نے شادی سے پہلے تمہیں رازدار بنا لیا ہے؟“

”میں ان سے، تمہاری ماں سے اور بھائیوں سے ایسی کوئی بات نہیں کہوں گا۔ مجھے تمہاری شدید محبت کا اندازہ ہو رہا ہے۔ تم مجھ سے شادی کرنے کے لیے مجھ پر اندھا اعتماد کر رہی ہو۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”شکریہ۔ اس سے بڑی بات کیا ہوگی کہ تم میرے سچے جذباتوں کو اور میرے پیار کی گہرائی کو سمجھ رہے ہو۔ میری ایک بات مانو پھر میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔“

”تمہاری بات ضرور مانوں گا۔ یوں۔“

”ابھی مجھے اپنے سینے سے، اپنے دل سے لگا کر ایک کس کرو۔ مجھے سب کے سامنے تمہیں دلاؤ کہ تم بھی مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہو۔“

مغربی تہذیب میں جوان لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو سر عام پٹھتے ہیں۔ یہ ان کی نظروں میں بے حیائی نہیں ہے۔ ان کے خیال کے مطابق وہ سر عام دنیا والوں کو اپنے پیار کے رشتے کا گواہ بناتے ہیں۔

وہ بھی جہاز میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اور اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو بتانا چاہتی تھی کہ مراد سے پروپوز کر چکا ہے۔

وہ الجھ گیا۔ پھر وہی گناہ کی دعوت تھی۔ دعوت قبول کرنے کے لیے یہ کہا جاسکتا تھا کہ رات کالی کرنے اور منہ کالا کرنے والا مطالبہ نہیں تھا۔ وہ صرف دھڑکنوں سے لگ کر دل میں اتر جانے والا ایک بوسہ طلب کر رہی تھی۔

دل کو سمجھایا جاسکتا تھا کہ یہ صرف بدن سے بدن کو



کر لیا ہے۔ اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“  
 ”اوگاڈا اتنی ہی بات کے لیے تم نے اتنی ساری باتیں  
 سنا ڈالیں۔ شادی یہاں تو نہیں ہو جائے گی۔ تمہیں گھر چل کر  
 اس سنا۔ پر پلٹنا چاہیے۔“

”پاپا! میں جیٹ مگنی اور ہٹ بیوا چاہتی  
 ہوں۔ یہاں سے لندن پہنچ کر شادی ہوگی۔“

باپ نے حیرانی سے کہا۔ ”تم تو ہوا کے گھوڑے پر سوار  
 ہو اور لندن پہنچ کر کس سے شادی کرو گی؟ لڑکا کہاں ہے؟“

اس نے ایک انگوٹھے سے پیچھے کی طرف اشارہ  
 کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ میرا آئیڈیل ہے۔ ہمارے پیچھے بیٹھا  
 ہے۔ پلیز ابھی اسی وقت بات پتلی کر لیں۔“

نیکی براؤن نے سر گھما کر مراد کو دیکھا۔ وہ اب سے  
 پہلے بھی اس پر نظر ڈال چکا تھا۔ اس نے بیٹی سے پوچھا۔

”کون ہے یہ؟ تم اسے کب سے جانتی ہو؟“

”ابھی اسی جہاز میں اسے دیکھا ہے۔ یہ ایک نکا  
 مسلمان ہے۔ اس نے آج تک کسی لڑکی کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔“

میرا ہاتھ بھی شادی کے بعد پکڑے گا۔ مجھے ایسا ہی لائف  
 پارٹنر چاہیے۔ یہ کسی بھی حسین عورت کو گھاس نہیں ڈالتا ہے۔“

باپ نے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ یہ تمام اہم  
 باتیں میں معلوم کر لوں گا۔ کیا یہ جانتا ہے۔ ہم یہودی ہیں؟“

”میرا خیال ہے جانتا ہوگا۔“  
 وہ مراد کے متعلق ناگواری سے سوچ رہا تھا۔ اپنے

دشمن کو نہیں پہچان رہا تھا اور نہ پہچاننے کے باوجود اسے پسند  
 نہیں کر رہا تھا۔

اس نے کہا۔ ”نہیں بیٹی! اسے ابھی معلوم ہونا چاہیے  
 کہ ہم یہودی ہیں۔ جو کفر مسلمان ہوتے ہیں وہ یہودی  
 عورتوں سے شادی نہیں کرتے۔“

”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے پاپا! میں مسلمان ہو جاؤں گی۔“

باپ نے سختی سے کہا۔ ”کیوں اس مت کرو، اپنے باپ  
 دادا کے دین سے پھرنے کی بات کر رہی ہو۔ شرم نہیں آتی؟“

تم میرا طعنے جانتی ہو؟“  
 ”جانتی ہوں۔ میں اس کی خاطر دین اسلام قبول  
 کروں گی تو آپ مجھے گولی مار دیں گے۔“

”میں اپنی بیٹی کو مزائے موت نہیں دوں گا۔“ وہ سرد  
 لہجے میں بولا۔ ”جس کے لیے تم اپنے دین سے پھر لو گی اسے  
 گولی مار دوں گا۔“

وہ ایسا کہتے وقت مراد کو تیز چبھتی ہوئی نظروں سے  
 دیکھ رہا تھا۔ وہ باپ جینی سے دور تھا۔ ان کی باتیں نہیں سن

سکتی تھیں۔

فی الحال یہ ابھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ وہی اس کا  
 جانی دشمن نیکی براؤن ہے۔ سفر کے اختتام تک جانے  
 انجانے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کوئی بھی کسی کو زندگی کے  
 اختتام تک پہنچا سکتا تھا یا پھر کچھ بھی نہ ہوتا۔ سب اپنے اپنے  
 گھر چلے جاتے۔

وہ مراد کو بڑی تلک سے دیکھ رہی تھی پھر اس نے کہا۔  
 ”تم ایک گہرو جوان ہو۔ لڑکیاں تم پر مرتی ہوں گی۔ کیا تم  
 نے آج تک کسی کو ہاتھ نہیں لگایا ہے؟ مجھے یہ بالکل فطرت  
 کے خلاف لگ رہا ہے۔ یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم اب تک  
 کنوارے ہو۔“

وہ بولا۔ ”آئیڈیل سے جھوٹ نہیں کہتا ہوگا کہ تم کس  
 قدر حسین اور پرکشش ہو۔ یقین کرو، میرا دل تمہاری طرف  
 کھینچا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود میں تمہیں ہاتھ لگانے سے  
 انکار کر رہا ہوں۔ اسی طرح پہلے بھی کئی حسین اور جوان  
 لڑکیوں سے دور رہا ہوں۔“

”پھر تو تم بہترین شو ہر ثابت ہو گے۔ مجھے یقین ہو گیا  
 ہے دنیا کی حسین ترین لڑکیوں پر بھی مجھے ترجیح دیتے  
 رہو گے۔ میں ابھی پاپا سے بات کر دوں گی۔“

اس نے اگلی سیٹ کی طرف جھک کر کہا۔ ”پاپا! میں  
 آپ کے پاس آ کر ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

وہ بولا۔ ”باپ کی جان! میں ضروری باتیں کر رہا  
 ہوں۔ تم سے گھر میں باتیں ہوں گی۔“

”میں آپ کی ضروری باتیں جانتی ہوں۔ وہ کینٹ  
 مراد آپ کے سر پر سوار رہتا ہے۔ ایک مدت کے بعد ہم  
 یہاں آئے تھے تو آپ ملنے آ گئے۔ بعد میں پتا چلا کہ آپ کو  
 گل بیب میں مرینڈ کی آمد کا پتا چلا تھا۔ آپ اس کے پیچھے  
 مراد کو پکڑنے اور گولی مارنے آئے تھے۔ میں آپ سے  
 پوچھتی ہوں پاپا! آپ کی زندگی میں ہماری کوئی اہمیت ہے  
 بھی یا نہیں؟ کیا آپ ابھی تھوڑا سا وقت مجھے نہیں دے  
 سکتے؟ میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔“

باپ نے کہا۔ ”میری لاؤٹی بولتی ہے تو چپ ہونا بھول  
 جاتی ہے۔ جسٹ اے منت میں ابھی تمہیں بلاتا ہوں۔“

نیکی براؤن نے اپنے دست راست سے اور شیر  
 خاص سے کہا کہ وہ پچھلی سیٹوں پر چلے جائیں، وہ دونوں  
 فوراً وہاں سے اٹھ گئے۔ وہ ان کی جگہ چلی گئی۔ باپ نے  
 اس کی پیشانی کو چوم کر کہا۔ ”ہاں بولو۔ تمہاری ضروری باتیں  
 کیا ہیں؟“

وہ بولی۔ ”میں نے اپنے لیے ایک لائف پارٹنر پز



تمہاری رہنمائی ہے گی جب تم ہمارا مذہب قبول کرو گے اور میرے یہودی داماد کہلاؤ گے۔“

”سوری، میں دین اسلام سے نہیں پھروں گا۔“  
”جب تم باپ کے مذہب سے پھر سکتے ہو تو اسلام سے بھی پھر سکتے ہو۔“

”میرے اللہ نے میری پہچان مجھے دے دی ہے۔ یہ مرتے دم تک رہے گی۔“

میڈونا نے کہا۔ ”پاپا! آپ ایمان سے مذہبی معاملے میں نہ بولیں۔ مجھے ایک مسلمان جیون سائیکس منظور ہے۔“  
”مجھے منظور نہیں ہے۔“ وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”سنو ایمان! اگر یہ تمہاری شریک حیات نہ بنی تو روٹی رہے گی اور میں اس کے آنسو دیکھ نہیں سکتا۔ رلانے والوں کو خاک میں ملا دیتا ہوں۔“

مراد نے اسے گہری سنجیدگی سے دیکھا۔ ابھی کچھ بولنا ضروری نہیں تھا۔ دشمن طاقت کے ضرور میں اچھل رہا ہو تو چپ رہ کر اسے خوش فہمی میں جتلا کر نادانستہی اور حکمت عملی ہے۔ اس نے بیٹی کو تھپک کر کہا۔ ”میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دوں گا۔ تم ذرا صبر سے دو چار دنوں تک انتظار کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ ایک نئے بعد یہ تمہارا یہودی شوہر اور میرا یہودی داماد بن جائے گا۔“

مراد مسکرانے لگا۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”نو پاپا! میں جبر و تشدد نہیں چاہوں گی۔“

مراد نے اس کے ہاتھ کو تھپک کر کہا۔ ”اپنے باپ سے بحث نہ کرو، انتظار کرو اور دیکھو کہ یہ مجھے یہودی کیسے بتائیں گے؟“

وہ وہاں سے اٹھ کر پچھلی سیٹ کی طرف آ کر مارتما سے بولا۔ ”پلیز آپ اپنے شوہر اور بیٹی کے پاس جائیں۔“  
وہ اٹھ کر بیٹی کے پاس آئی پھر شوہر سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“  
مراد کی خاموشی کے باعث سکی براؤن خوش تھی میں جتلا ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میرے چیخ کرنے سے وہ اندر ہی اندر سہم گیا ہے۔ دھونس میں آ گیا ہے۔ میں ایک نئے کے اندر اسے اپنا یہودی داماد بنا لوں گا۔“

وہ سسلی کا بے تاج بادشاہ تھا۔ یورپ میں عجموں کی اتحادی خطیموں نے اسے اور ضرور بنا دیا تھا۔ کسی کی زندگی بچھین لینا کسی کا مذہب بدل دینا اس کے لیے بچوں کا کھیل تھا۔

مارتما نے خوش ہو کر کہا۔ ”چلو اچھا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میری بیٹی جو چاہتی ہے آپ وہ لا کر اس کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ جوان بھی اس کے پیچھے دم ہلاتا پھرے گا۔“

رہا تھا لیکن اس کی چستی ہوئی نظروں نے سمجھا دیا کہ اسے محتاط رہنا چاہیے۔

وہ باپ کو سمجھانے منانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ ”پلیز پاپا! شادی کے بعد بیٹیاں پرانی ہو جاتی ہیں۔ میں اس سے شادی کروں گی تو آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں گے۔ میں آپ سے دور چلی جاؤں گی۔ جب آپ بلائیں گے تو دوڑی چلی آؤں گی۔“

”میں نے تمہاری پرورش اس لیے لاڈ پیار سے نہیں کی ہے کہ ایک دن پرانی کروں۔ یہ اپنی ڈائری میں لکھ لو کہ تم بھی پرانی نہیں ہوگی۔ وہ اپنے گھر والوں سے پرانا ہو کر میرا گھر داماد بن کر رہے گا۔ تم اپنا مذہب نہیں چھوڑو گی وہ مسلمان اب یہودی بنے گا۔ تم اسے دل دجان سے پسند کر رہی ہو۔ باقی باتیں مجھ پر چھوڑ دو۔“

پھر اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”مارتما! تم پیچھے جاؤ اور اس جوان کو یہاں بھیج دو۔“

اس نے گویا حکم دیا تھا۔ فوراً اٹھیل کی گئی۔ سینیٹس تبدیل ہو گئیں، مارتما پیچھے آ گئی۔ مراد، میڈونا اور سکی براؤن کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

دو جاتی دشمن پہلی بار ایک دوسرے کے برابر ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کے درمیان صرف ایک بالشت کا فاصلہ تھا۔ سکی براؤن نے پہلے تو اسے توجہ سے دیکھا پھر پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ایمان علی۔ میں مسلمان ہوں اور میرے ڈیڈی جیسا ہی ہیں۔ میرے مسلمان ہونے پر ڈیڈی نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔ اب ان سے صلح ہو گئی ہے۔“

اس نے ناگواری سے مراد کو دیکھا پھر پوچھا۔ ”تم نے اپنے باپ دادا کا مذہب کیوں چھوڑ دیا؟“

”میں نے اپنا نام ایمان علی رکھا ہے۔ میرا ایمان مجھے دین اسلام کی طرف لے گیا۔ میں نے اسے قبول کر لیا۔“

”کیا تم میری بیٹی سے محبت کرتے ہو؟“  
”آپ کی بیٹی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ مجھے ابھی محبت تو نہیں ہوئی ہے لیکن میں پسند کرتا ہوں۔ کس میڈونا ایسی ہیں کہ جو انہیں دیکھے گا چاہنے لگے گا۔“

”کیا تم میری بیٹی سے شادی کرو گے؟“  
”انکار نہیں کروں گا، لیکن لندن پہنچ کر سوچوں گا۔“

ڈیڈی سے مشورہ کروں گا۔“  
”تم باپ بیٹے جو بھی فیصلہ کرو، میری بیٹی اسی وقت



میڈوٹا چپ تھی۔ وہ باب کے پیارے بھریے انداز کو اور ایک جاہل برادری کی سفاکی کو خوب سمجھتی تھی۔ باب ہر ل میں ایمان علی کو بیٹی کی جھولی میں لاکر ڈالنے والا تھا۔ بیٹی اس کے ارادے سے اسے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ یہ سوچ کر چپ تھی کہ جیسے بھی ہو اس کی آرزو پوری ہوگی۔ وہ ایمان علی کی شریک حیات بن جائے گی۔

مراد نے لندن پہنچ کر طیارے سے باہر آتے ہی ماسٹر ویو سے فون پر کہا۔ ”میں سکی برادری کا صورت آشنا ہونا چاہتا ہوں۔ آپ فوراً اس کی تصویر میرے فون پر Send کریں۔“

ماسٹر نے کہا۔ ”میں نے آج تک سکی برادری کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ اس سے پہلے اس کا بھائی سکی الہرٹ ریڈ الہرٹ کا سربراہ تھا۔ اس کی تصویر میرے پاس تھی۔ تم نے اسے ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد یہ سکی برادری سربراہ بن گیا۔ میں اب تک اس کی تصویر حاصل نہ کر سکا۔“ اس نے کہا۔ ”ماسٹر! ابھی ایک سکی برادری میرے قریب ہے۔ میں تصدیق کرنا چاہتا ہوں کیا یہ وہی میرے سر کی قیمت لگانے والا دشمن ہے۔“

ماسٹر یہ سن کر لرز گیا کہ مراد اپنے جانی دشمن کے قریب ہے۔ شاید مارا جا سکتا ہے اور اس خوشی سے بھی لرز گیا کہ مراد اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

وہ تڑپ کر بولا۔ ”مراد تم اس کے قریب ہو اور وہ زندہ ہے...؟ ابھی تک سانس لے رہا ہے...؟“

”پہلے تصدیق تو ہو کہ سکی میرا دشمن ہے؟ پھر یہ کہ یہاں سر عام گولی چلانے کی غلطی نہیں کروں گا۔ ایسا کروں گا تو چاروں طرف سے گھیر لیا جاؤں گا۔ آپ یہ بتائیں کہ سکی کی تصویر کہاں سے حاصل ہو سکتی ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”لندن کے میٹ ڈیپارٹمنٹ کے ریکارڈز میں اس کی تصویر ہوگی۔ مرینڈ سے کہو وہ اپنے ذرائع استعمال کر کے وہاں سے حاصل کر لے گی۔“

وہ فون بند کر کے سوچ میں پڑ گیا۔ سکی برادری ہیج ہال سے اپنا سامان لینے پھر کسٹم چیکنگ سے گزرنے کے لیے اپنی ٹیکسی کے ساتھ آگے آگے جا رہا تھا۔ مرینڈ مراد کے دو فون نمبر جانتی تھی۔ مراد نے ان میں سے ایک سم ایمان علی کو دے کر کہا تھا۔ ”اسے رکھو، بھی ضرورت کے وقت مراد بن کر اس سم سے بول سکو گے۔“

اس وقت مرینڈ کی مدد حاصل کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس نے ایمان علی سے فون پر کہا۔ ”اپنے فون میں میری سم

لگاؤ اور اس سے بولو کہ تم سکی برادری کی تصویر دیکھنا چاہتے ہو۔ MET ڈیپارٹمنٹ میں تمام بدنام زمانہ مجرموں کی تصویریں اور ان کی ہسٹری موجود رہتی ہے۔ تم اس کی ہسٹری نہیں چاہتے ہو۔ صرف تصویر دیکھنا چاہتے ہو۔ اسے فوراً ایک تصویر تمہارے فون پر Send کرنا چاہیے۔ جیسے ہی وہ تصویر تمہیں ملے، تم اسے میرے فون پر Send کر دو۔“

اس نے پوچھا۔ ”یہ کیا پتھر ہے میرے بھائی؟“ مراد نے کہا۔ ”میں یہاں سے مرینڈ کو کال کروں گا تو وہ کوڈ نمبر سے معلوم کر لے گی کہ میں لندن سے بول رہا ہوں۔“

”آل رائٹ میں ابھی اسے کال کرتا ہوں۔“ ایمان علی نے مراد سے رابطہ قائم کر کے فون کی سم بدلی۔ پھر مرینڈ کو کال کی۔ وہ رابطہ ہونے پر بولی۔ ”مراد! کیوں پریشان کرتے ہو۔ میں نے صبح آٹھ بجے تمہیں ہی پورٹ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد تم کتنے چھپ گئے۔“

مراد نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”میں تم سے آنکھ پھولی نہیں کھیل رہا ہوں۔ اپنے اہم معاملات میں کہیں مصروف ہوں۔ ویسے بھی تم سے کہہ چکا ہوں، تم نے میرا اعتماد کو دبا دیا ہے۔ جب تک پہلے کی طرح اعتماد بحال نہیں ہوگا، میں تم سے دور رہوں گا۔“

”میں پھر سے تمہارا اعتماد حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہوں گی لیکن پلیز مجھ سے منہ پھیر کر نہ جایا کرو۔“

”میں زیادہ باتیں نہیں کروں گا۔ ابھی ایک ضرورت سے مجبور ہو کر رابطہ کیا ہے۔ میں سکی برادری کو اس کے چہرے سے پہچانا چاہتا ہوں۔ کیا تم اس کی کوئی تصویر Send کر سکتی ہو؟“

”میں اپنے ڈیپارٹمنٹ والوں سے ابھی معلوم کرتی ہوں۔ اگر ہمارے ریکارڈز روم میں اس کی ہسٹری فائل ہوگی تو تصویریں بھی ہوں گی۔“

”تم ڈیپارٹمنٹ والوں سے معلوم کرو۔ میں آدھے گھنٹے بعد کال کروں گا۔“

وہ بولی۔ ”جسٹ اے منٹ۔ فون بند نہ کرنا۔ اگر تصویر مل جائے گی تو میں اسے لے کر تمہارے پاس ڈوں گی۔“

”سوری۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ مجھ سے ملنے کی بات نہ کرو۔ تصویر سو بائل فون پر Send کرو۔“

”پلیز مراد! میں آؤں گی۔ تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔ فاصلہ رکھ کر باتیں کروں گی پھر مل جاؤں گی۔“

ایمان علی سوچنے لگا۔ اس نے پہلی بار مرینڈ کو کال ایسی



کے انزپرٹ میں دور سے دیکھا تھا۔ ایسا اجلا تھمہر، ہوا سا حسن تھا۔ ایسی اکیلی اور ستوانی چال چلتی تھی کہ دل نے کرہلی جاتی تھی۔ اس وقت اسے قریب سے دیکھنے کو دل چل گیا۔

اس نے کہا۔ ”میں تم سے فاصلہ رکھ کر سلتا ہوں۔ لیکن ہمارے ملنے کا نتیجہ تم ابھی طرح جانتی ہو۔ دشمن ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔“

”میں جانتی ہوں، ایسا ہوگا۔ پہلے میں تصویر حاصل کروں گی پھر تمہیں بتاؤں گی کہ ہم کہاں سلامتی سے ملاقات کر سکتے ہیں۔“

دونوں نے یہ طے کر لیا کہ کسی محفوظ جگہ ملاقات کریں گے۔

ایمان علی کو یوں لگ رہا تھا کہ بڑے دنوں کے بعد ایک حسینہ سے ملاقات ہونے والی ہے اور وہ اس کے ساتھ کچھ رومانٹک لمحات گزارنے والا ہے۔ پرانی کہادت ہے کہ گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف آتا ہے۔ ایمان علی کی شامت آ رہی تھی وہ ایک خطرناک بلا کی طرف جا رہا تھا۔

میکی براؤن اپنی بیٹی کی خوشیاں پوری کرنے کے لیے یہ طے کر چکا تھا کہ ایمان علی (مراد) کو اپنا داماد بنائے گا اور اس سے پہلے اسے یہودی بنائے گا۔ مراد نے بڑے سکون سے اور خاموشی سے اس کا یہ پیشہ قبول کیا تھا۔ میکی اسے داماد بنانے سے پہلے اس کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا لہذا اس نے وزیر زلازل میں ڈاکٹر نمینی سن سے ملاقات کی۔ مراد نے کہا۔ ”یہ میرے ڈیڈی ہیں اور ڈیڈی یہ مسز میکی براؤن ہیں۔“

ڈاکٹر دشمن میکی براؤن کا نام سن کر چونک گیا۔ مراد نے اسے آنکھ ماری۔ اشارے سے سمجھایا کہ وہ کسی طرح کی چیرائی اور پریشانی ظاہر نہ کرے۔ پھر اس نے دشمن کی پوری ٹیلی سے ڈاکٹر کو متعارف کرایا۔ میکی براؤن نے کہا۔ ”مسز نمینی سن! میں اسی بفتح میں ان کی شادی کروینا چاہتا ہوں۔ شادی بہت دھوم دھام سے ہوگی۔ آپ کے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ ابھی سے تیاریاں شروع کر دیں۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”مسز براؤن! آپ تو شادی کی بات ایسے کر رہے ہیں جیسے حکم دے رہے ہوں۔ مجھ سے بھی پوچھنا چاہیے کہ میں اتنی جلدی بھولا نا چاہتا ہوں یا نہیں؟“ وہ ڈاکٹر نمینی سن کو حقارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں کسی سے نہیں پوچھتا۔ جو حکم دیتا ہوں اس کی تعمیل ضرور ہوتی ہے۔“

اس نے دور تک ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ”ذرا اپنے

چاروں طرف دیکھیں۔ سیکھ رہی گاؤں کی دردیوں میں قہرناک شوہر کی فوق ہمیشہ میرے چاروں طرف رہتی ہے۔“ وہ بجا کر بولا۔ ”ابھی تم دونوں کا تو یہ تمہارے بیٹے کو یہاں سے گن پوائنٹ پر لے جائیں گے۔“

مراد نے مصغفعا جازبی سے کہا۔ ”مسز براؤن! آپ ناراض نہ ہوں۔ ڈیڈی نہیں جانتے آپ کون ہیں۔ میں جان گیا ہوں۔ شادی اسی طرح ہوگی جس طرح آپ چاہتے ہیں۔“

وہ خوش ہو کر مراد کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”میں ایسا ہی تابعدار داماد چاہتا تھا۔ یہ مجھے مل گیا ہے۔“

وہ کچھ اور بولنا چاہتا تھا لیکن بونے مراد کو دیکھ کر چونک گیا۔ وہ بونا قد اور لوتوں کی بھیل میں نظر نہیں آیا۔ پھر ان کے درمیان سے گزرتا ہوا مراد کے سامنے آ کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ”ہائے ایمان علی! ہم تمہیں لندن میں خوش آمدید کہتے ہیں۔“

میکی نے گرجدار آواز میں کہا۔ ”تم۔ مراد علی سنگی... تم... تم وہی ہو۔ میرے غیر کہہ رہے تھے کہ تم انڈیا کے شہر دہلی میں ہو لیکن مراد نہیں ہو۔ مراد اچانک بونا نہیں ہو سکتا۔ یہ کیا چکر ہے؟ تم بونے کیسے ہوئے؟ یہاں کیسے آ گئے؟“

عبداللہ کبڈی نے کہا۔ ”جیسے سب آتے ہیں ویسے ہی میں بھی ہوا کی جہاز سے کھڑکی آیا ہوں۔“

مراد نے کہا۔ ”یہ عبداللہ کبڈی ہے۔ میرے بچپن کا دوست ہے۔ یہ بونے چارہ مراد کا ہم شکل ہو کر مصیبت میں پڑ گیا ہے۔ پتا نہیں کتنے نجانے لوگ اس کے بارے میں چھان بین کرتے رہتے ہیں کہ یہ مراد سے بھی یا نہیں؟“

میکی براؤن نے بونے کو سر جھکا کر دیکھا۔ پھر کہا۔ ”بڑے موقع سے ہاتھ تھے ہوئیں تمہیں لے جاؤں گا۔ تمہارے چہرے کی ابھی طرح جانچ پڑتال کراؤں گا۔ ہو سکتا ہے مراد کے بونے ہونے کا کاراز مظلوم ہو جائے۔“

اس نے مسلح گاؤں کو حکم دیا۔ ”اس بونے کو اٹھا کر گاڑی میں ڈال دو اور ہمارے اڈے پر اسے پہنچا دو۔“

مراد نے کہا۔ ”تیز اسے زبردستی نہ لے جائیں۔ یہ میرا جبری یار ہے۔ میرے استقبال کے لیے یہاں آیا ہے۔“

وہ بولا۔ ”زیادہ مت بولو۔ ورنہ تمہیں بھی باپ سے جدا کر کے لے جاؤں گا۔ تم جاؤ اور شادی کی تیاریاں کرو۔“

”میں اپنے دوست کے بغیر شادی کی تیاریاں نہیں کروں گا۔ آپ اس کے ساتھ مجھے بھی لے چلیں۔“



دیدے پھیل کر ساکت ہو گئے۔

دوسروں کا لبو اچھالنے والے باپ کا کلیجا صد سے پھٹ گیا۔ وہ اس کے ساتھ زمین پر گر کر اس سے لپٹ کر چلیں مارنے لگا۔ "رونی! میرے بچے! نہیں تم نہیں مرد گے۔"

سخت سیکورٹی میں رہنے والا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ موت اچانک آ کر جوان بچے کو لے جائے گی۔ یہ فرور خاک میں مل گیا کہ موت دوسروں کے لیے ہے ہمارے لیے نہیں۔ ماں بھی اپنی چھاتی کھتی ہوئی دوڑتی ہوئی آ کر بیٹے کی لاش سے لپٹ گئی۔ کئی سٹیم گارڈز نے انہیں گھیرے میں لے لیا تھا۔ اندازہ کر رہے تھے کہ گولی کس سمت سے آئی ہے وہ سب کسی نا دیدہ شوز کو دھمکانے کے لیے ہوا کی فائر کر رہے تھے۔ وہاں بھگدڑ مچ گئی تھی، دوسری سمتوں سے بھی جوا با فائرنگ ہو سکتی تھی لیکن نہیں ہو رہی تھی۔ میڈونا اور مراد فائرنگ سے بچنے کے لیے کار کے اندر چھپے ہوئے تھے۔ وہ بھائی کی ہلاکت پر مراد سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسے مراد سے بڑی دیر تک لپٹے رہنے کا موقع مل رہا تھا۔

اچانک مراد نے چیخ کر پوچھا۔ "باربی کہاں ہے؟" میڈونا بھی پریشان ہو کر کار کے باہر دوڑ نکلی دیکھنے لگی۔ دور اس کے ماں باپ اور گارڈز رونی براؤن کی لاش کو اٹھا کر ایک دیوار کی آڑ میں لے گئے تھے۔

مراد کار سے نکل کر دوڑتا ہوا ادھر گیا۔ باربی اپنے ماں باپ کے پاس بھی نہیں تھی۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ ان لمحات میں مراد کو ولی صدقہ پہنچ رہا تھا۔ وہ چیخ کر تمام گارڈز سے بولا۔ "باربی کہاں ہے؟ اسے ڈھونڈو۔"

ماں باپ کا ایک صدمہ اور بڑھ گیا۔ تھی گڑیا نظر نہیں آ رہی تھی۔ مراد نے سکی سے کہا۔ "مجھے گن اور گاڑی دو۔ تمہارے دشمن اسے لے جا رہے ہیں۔"

عبداللہ کبڈی نے کہا۔ "وہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ مجھے بھی ایک گن دو۔"

وہ بیٹے کی لاش سے پاس سے اٹھ کر گارڈز سے بولا۔ "اوگاڈا! یہ کیا ہو رہا ہے؟ انہیں گن دو اور فوراً چلو۔ وہ ابھی دور نہیں گئے ہوں گے۔ تم آن ہری اپ۔"

وہ مراد اور کبڈی سے ساتھ دوڑتا ہوا ایک گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ ایک گارڈ نے ان دونوں کو اسلحہ دیا۔ ڈرائیور گاڑی اسٹارٹ کر کے تیزی سے آگے جانے لگا۔ مراد اور کبڈی پچھلی سیٹوں پر تھے۔

وہ اسے گھور کر بولا۔ "میں اسے صرف چھ گھنٹے اپنے ایک اڈے میں رکھوں گا۔ یہ مراد کی منگی ثابت نہ ہوا تو اسے تمہارے پاس پہنچا دیا جائے گا۔"

مراد نے کہا۔ "تو پھر میں بھی چھ گھنٹے تک اپنے دوست کے ساتھ رہوں گا۔"

"ہرگز نہیں۔ میں جو حکم دے رہا ہوں اس پر عمل کرو۔"

"آپ خراخواہ تھی رہے ہیں۔ جب میں آپ کے تمام احکامات کی تعمیل کر رہا ہوں تو مجھے خدی اور ہائی نہ بتائیں۔"

سکی براؤن نے حقارت سے کہا۔ "اچھا تو تم مجھ سے بغاوت بھی کر سکتے ہو؟ کیا پدی اور کیا پدی کا شور با۔"

پھر اس نے گارڈز کو حکم دیا۔ "اسے بھی لے چلو۔"

مراد نے ڈاکٹر کے شانے کو تھپک کر کہا۔ "ڈیڈ! آپ پریشان نہ ہوں گے۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔"

ڈاکٹر یعنی سن کو مراد پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ دل ہی دل میں دعا کیں مانگنے لگا۔ "اوگاڈا! ان کی مدد فرما....."

ڈاکٹر کی پریشانی یہ تھی کہ مراد اور عبداللہ کبڈی کے لیے لندن تھی جگہ تھی۔ وہ وہاں کھل کر ہر جگہ دشمنوں سے موت کی آنکھ بھولی نہیں کھیل سکتے تھے۔

ایسے وقت تھی سی باربی ڈول دوڑتی ہوئی آ کر مراد کے قدموں سے لپٹ گئی تھی۔ اس نے اسے اٹھا کر بازوؤں میں لے کر پیار کیا۔ وہ بولی۔ "تم مجھے چھوڑ کے تو نہیں جاؤ گے۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "میری گڑیا...! میں نہیں جا رہا ہوں۔ تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔"

میڈونا نے کہا۔ "پاپا! ہم ان کے ساتھ کار میں بیٹھیں گے۔"

مارتھانے بھی یہی کہا۔ سکی نے بونے کو اور مراد کو دیکھ کر کہا۔ "یہ میرا ہونے والا دام ہے۔ اس کے ساتھ چلو لیکن یہ یونا میری گاڑی میں بیٹھے گا۔"

مراد اس کی تھیل کے ساتھ ایک کار کی طرف جانے لگا۔ باربی اس کی گود سے اتر کر دوڑتی ہوئی کار کی طرف جانے لگی۔ عبداللہ کبڈی اس وقت سکی براؤن اور اس کے دو جوان بیٹوں کے ساتھ دوسری گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔

ایسے ہی وقت ان کی شامت آ گئی۔ ایک گولی بہت ہی خاموشی سے آ کر سکی کے جوان بیٹے کو لگی۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکل۔ وہ گرتے گرتے باپ سے لپٹ گیا، اس کے



اب ماتم کرو اور سوچو کہ یہ موت کا فرشتہ پہلے ہاتھ نہیں آیا تو اب کیسے آئے گا؟“  
 میکی نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“  
 ”میں ہوں تمہارا بچا اس لاک ڈال مراد علی منگی۔“  
 وہ حیرت سے چیخ پڑا۔ ”مراد.....! تم مراد علی منگی ہو؟“  
 مراد اور کبڈی ایک دم سے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔  
 ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھ کر فون کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگے۔ یہ حیران ہونے کی بات تھی۔ کوئی خود کو مراد علی منگی کہہ رہا تھا یعنی وہ کوئی دشمنوں کے گروہ سے نہیں تھا۔ مراد کا سماجی اور دوست تھا اور اس کے دشمنوں کا دشمن تھا۔

میکی براؤن کہہ رہا تھا۔ ”تم نے اپنی یہاں موجودگی ظاہر کی ہے۔ اب میں محتاط رہوں گا۔ اب تم میری کسی اولاد تک پہنچ نہیں پاؤ گے۔ اب میری طرف آنے سے پہلے کفن پہن کر آنا۔“

وہ دوسری طرف سے بولا۔ ”ابے او چیخ کرنے والے! ابھی تیری منگی کو کفن پہنا کر بھیج دوں؟“  
 ”اپنی بیوی کا فون نمبر بول۔ میں اس سے بات کروں گا۔“

”تم صرف مجھ سے بات کرو گے۔“  
 ”اگر فوراً نمبر نہ دیا تو فون پر بیٹی کی آخری چیخ سنے گا۔“  
 وہ مجبور ہو گیا۔ اس نے نمبر بتائے۔ اس کے ساتھ ہی رابطہ ختم ہو گیا۔ دوسری طرف اس کی وائف مار تھانے کال اٹینڈ کی۔ اسے ایک اجنبی کی آواز سنائی دی۔ ”تمہاری گڑیا میرے پاس ہے۔“

وہ میڈونا سے لگی بیٹھی تھی۔ بیٹے کی ہلاکت پر آنسو بہا رہی تھی۔ فوراً ہی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ تڑپ کر بولی۔ ”تم کون ہو؟ کیوں میری معصوم بیٹی کو لے گئے ہو؟ وہ کہاں ہے؟ مجھے اس کی آواز سناؤ۔“

”آواز سن لو گی۔ تم لہو اچھالنے والی فیملی کی اماں جان ہو۔ یہ بولو کہ جوان بیٹے کی حرام موت کیسی لگی؟“  
 وہ چیخ کر بولی۔ ”ایک ماں کی کوکھ اچھالنے والے تم انسان نہیں درندے ہو۔“

”ایسے ہی وقت یہ حساب کرو کہ تمہارے شوہر اور بیٹوں نے اب تک کتنی ماؤں کی کوکھ اجاڑی ہیں؟“  
 اسے چپ لگ گئی۔ وہ بولا۔ ”میں مراد علی منگی بول رہا ہوں۔ برنارڈ میرے ملک کا ایک اہم راز چرانے آیا تھا۔ میں نے اسے جہنم میں پہنچ دیا۔ اس کے بعد تمہارے بد معاش

میکی براؤن ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر غصے سے بڑبڑا رہا تھا۔ ”اس شہر میں آج تک کسی نے مجھ پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کی۔ آہ میرا بیٹا رونی میری آنکھوں کے سامنے مارا گیا ہے۔ وہ دشمن مجھ سے ٹھپ نہیں سکے گا۔ میں اسے کٹے کی موت ماروں گا۔“

وہ کسی نا دیدہ دشمن کو چیلنج کر رہا تھا۔ لاشوری طور پر اپنی گلست کو تسلیم کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ کون میری گڑیا بیٹی کو لے گیا ہے؟ کون اتنی دلیری دکھا رہا ہے؟ میں اسے ایسی موت ماروں گا کہ مجھ سے دشمنی کرنے والے اس کا انجام دیکھ کر حیرت حاصل کریں گے۔“

مراد جہاز میں سفر کرنے کے دوران بڑی خاموشی سے میکی براؤن کے فرور کو اور اس کی فرعونیت کو برداشت کرتا آ رہا تھا۔ وہ اسے ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس مفروضہ کو زندہ رکھ کر فروروں سے بدتر بنانا چاہتا تھا۔

اس نے یہ سوچ رکھا تھا کہ آج یا کل کسی وقت بھی موقع پا کر باربی کو اغوا کرے گا تو وہ فی الحال اسے داماد بنانا اور بیوہ بنانا بھول جائے گا۔ پھر اپنے جانی دشمن کو دشمنی کا مزہ چکھانے کے لیے پہلے اس کے کسی بے کی لاش گرائے گا۔

اس نے بہت کچھ سوچا تھا لیکن اس سے پہلے کوئی اور اس کا دشمن آ گیا تھا اور وہ وہی کر رہا تھا جو مراد نے سوچا تھا۔  
 میکی کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ وہ بیٹے کے صدمے سے نڈھال ہو رہا تھا۔ اس نے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔ جن کو دبا یا تو آواز آئی۔ ”اپنی بیٹی کی زندہ واپسی چاہتا ہے یا اس کی بھی لاش بھیج دوں؟“

وہ تڑپ کر بولا۔ ”وہ معصوم بیٹی ہے اسے ہاتھ نہ لگانا میری دشمنی بہت مہنگی پڑے گی۔“

اس نے پوچھا۔ ”ابھی کسے مہنگی پڑ رہی ہے؟ رسی جل گئی پر ہل نہیں گئے۔ ساری اکڑ دھری کی دھری رہ جائے گی۔ آج ایک بیٹا گیا ہے کل دوسرا جائے گا۔ تمہارے سنڈکیٹ چلانے والے دونوں بازوؤں میں سے ایک ٹوٹ گیا ہے۔ دوسرا بھی جائے گا پھر تم رہ جاؤ گے۔ تمہارے سامنے بیوی اور جوان بیٹی بھی جائے گی، آخر میں تمہارے باری آئے گی۔“

وہ چیخ کر بولا۔ ”کون ہو تم؟ میں تمہاری ماں کی قبر سے بھی تمہیں نکال لاؤں گا پھر ایسی موت دوں گا کہ.....“  
 وہ بات کاٹ کر بولا۔ ”شیخ علی کی طرح ہوائی عمل نہ بناؤ۔ حساب کرو کہ اب تک اپنے کتنے شوٹروں کو میرے ہاتھوں ہلاک کرانے کے بعد بیٹے کی لاش تک پہنچے ہو



خاندان کے تمام جیلے میری جان کے پیچھے پڑ گئے۔  
 وہ ایک ذرا رک کر بولا۔ "میرے سر کی قیمت بچاؤ  
 لاکھ ڈالرز لگائی گئی ہے۔ کیا میری ماں نے مجھے تکلیف سے  
 جہنم نہیں دیا ہے، ایک تم ہی دنیا میں اکیلی ماں ہو جس کے  
 بیٹوں کے سر کی قیمت کوئی نہیں لگائے گا؟ دیکھو تمہارا بیٹا کتنا  
 گیا گزرا تھا۔ کسی نے اس کی قیمت نہیں لگائی۔ وہ صرف  
 ایک لاکھ کی قیمت پر مارا گیا ہے۔"  
 وہ بالکل ساکت ہو کر اس کی باتیں سن رہی تھی۔ شاید  
 اسے دوسری ماؤں کے دکھ کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ فون پر بول رہا تھا۔ "اس بیٹے کے لیے جلدی سے  
 رو دو کہ فارغ ہو جاؤ۔ کل دوسرے کے لیے ماتم کرنا ہے۔"  
 وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ چیخ کر بولی۔ "نہیں  
 بیٹے! نہیں۔ بس کرو اس کی جان نہ لینا۔ میں یہ صدمہ  
 برداشت نہیں کر سکتی گی میرا دم نکل جائے گا۔"  
 "کہنا تمہارا شوہر اپنے دوسرے بیٹے کی سلامتی کے  
 لیے مجھ سے دشمنی سے باز آ جائے گا؟ میں اپنے اس سوال کا  
 جواب جانتا ہوں۔ وہ اپنے بہنوئی برنارڈ کا اپنے بھائی کیسی  
 البرٹ کا انتقام ضرور لے گا اور اپنے بچوں کی ہلاکت پر  
 تمہیں رونے کے لیے چھوڑ دے گا۔ وہ کتا ہے اس کی دم  
 ہمیشہ بڑھی رہے گی۔"

ماں نے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میزونا! یہ فون پر  
 مراد بول رہا ہے اور سچ بول رہا ہے۔ تمہارے پاپا کے بھائی  
 اور بہنوئی مرچکے ہیں۔ ان ہلاک ہونے والوں کا انتقام لینے  
 کے لیے وہ اپنے زندہ بیٹوں کو داؤ پر لگا رہے ہیں۔ میں کیا  
 کروں؟ دوسرے بیٹے کو کہاں چھپاؤں؟"  
 مراد نے کہا۔ "تم اپنے شوہر کی عقل کا ماتم کرتی رہو۔  
 میں تم سے کہہ دوں کہ میں سلی براؤن کے خاندان کے کسی  
 مرد کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ صرف تم ماں اور دو بیٹیاں  
 سلامت رہو گی۔ تمہاری گزیا بیٹی زندہ ہے تم اپنے بیٹلے میں  
 پہنچو گی تو وہ تمہیں ہنسی کھیلتی ہے گی۔"

وہ شکر یہ کے الفاظ ادا کرنا چاہتی تھی لیکن ادھر سے  
 فون بند ہو گیا۔ مار تھانے فوراً ہی بیٹلے کا ٹیل فون نمبر سچ کیا۔  
 تھوڑی دیر میں ایک ملازم کی آواز سنائی دی۔ مار تھانے  
 پوچھا۔ "کیا ہماری بیٹی باربی وہاں ہے؟"  
 ملازم نے کہا۔ "بس میڈم! ایک منٹ کار میں آیا تھا۔ وہ  
 بے بی کوچ کیدار کے پاس مین گیٹ پر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔"  
 مار تھانے خوشی کے مارے میڈونا سے پتہ کر رونے لگی۔

☆☆☆

مرینہ نے اپنے ڈیپارٹمنٹ سے سلی براؤن کی  
 تصویر حاصل کر لی تھی۔ اگرچہ اس کی ضرورت نہیں رہی  
 تھی۔ مراد نے اس مفروضہ جان و حمن کو اچھی طرح پہچان لیا  
 تھا۔ ویسے وہ تصویر مرینہ اور ایمان علی کی ملاقات کا ذریعہ  
 بن رہی تھی۔

ایمان علی نے فون پر پوچھا۔ "کیا تصویر مل گئی؟"  
 "ہاں، یہ تصویر میرے فون میں ہے۔ تمہیں  
 Send کر سکتی ہوں لیکن نہیں کروں گی۔ تصویر مل جائے  
 گی تو پھر تم مجھ سے نہیں ملو گے۔"

مرینہ سے دور رہتا تھا اور اس سے ملنے کی بھی خواہش  
 تھی۔ اس نے کہا۔ "جہاں کہو گی ملنے آ جاؤں گا۔ لیکن پہلے  
 بھی کہہ چکا ہوں تمہارے پیچھے دشمن بھی چلے آئیں گے۔"  
 وہ بولی۔ "بڑی مصیبت ہے۔ وہ سبھی جانتے ہیں کہ  
 میرے ہی ذریعے تمہاری شرگ تک پہنچی تکتے ہیں۔ اس ہوٹل  
 کے اندر اور باہر کئی جا سوس دن رات مجھے نظروں میں رکھتے  
 ہیں۔ میں ہوٹل سے نکلتی ہوں تو وہ پیچھے پڑ جاتے ہیں۔"  
 "پھر ملاقات کیسے ہو گی؟"

"کانٹوں میں گلاب کھلتا ہے۔ ہم بھی کانٹوں سے  
 گزرتے ہوئے کہیں ملیں گے۔"  
 "پھر جہاں ملیں گے وہاں بھی دشمن ہوں گے۔"  
 "تم ہمارے ملک کے سفارت خانے میں آ جاؤ۔  
 وہاں کئی ضرورت مند جاتے آتے رہتے ہیں۔ تم بھی جاؤ  
 وہاں تمہیں رازداری سے کسی کمرے میں بٹھایا جائے گا پھر  
 میں تمہا وہاں آؤں گی اور وہاں سے تمہا واپس جاؤں گی تو  
 دشمنوں کو مایوسی ہو گی۔"

"میں کس طرح وہاں سے واپس آؤں گی؟"  
 "جس طرح کئی ضرورت مند وہاں جاتے ہیں اور  
 آتے ہیں اسی طرح تم بھی واپس آؤ گے تو کوئی تم پر شبہ نہیں  
 کرے گا۔"

یہ طے ہو گیا کہ ملاقات کے لیے سفارت خانہ محفوظ  
 رہے گا۔ مرینہ نے برطانیہ کے سفیر سے کہا۔ "آپ کے آفس  
 میں ایک شخص ایمان علی آئے گا۔ تھوڑی دیر بعد میں آؤں گی،  
 ہم جس کمرے میں ملاقات کریں گے، وہاں اور کوئی نہ آئے،  
 تمام سکیورٹی گارڈز کو حتماً رہنے کی تاکید کریں۔"

اس کی ہدایات پر عمل کیا گیا۔ پلاننگ کے مطابق  
 پہلے ایمان علی وہاں گیا۔ اسے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔  
 تھوڑی دیر تک انتظار کرنے کے بعد مرینہ آ گئی۔  
 اور ایسے آئی جیسے خزاں میں بہا آتی ہے۔ وہ بچھلے



میں تصویر ترانسفر کر دی۔ اسے تصویر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے ایک نظر اسے دیکھا پھر فون کو جیب میں رکھ لیا۔ دلچسپی سامنے والی میں تھی۔ مشکل یہ تھی کہ محبت کی اور لگاؤ کی باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ فی الحال یہی قسمت تھا کہ وہ لگا ہوں کے سامنے تھی اور دل میں پھول کھلا رہی تھی۔ جہاں بارود کی بو ہو، وہاں خوشبو نہیں ٹھہرتی۔ مرینہ کو یہ خوش نہیں تھی کہ اس کے ملکی سفارت خانے میں دشمنوں کا کوئی مخبر نہیں ہوگا۔ جبکہ شیطان کے چیلے ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ یہ خبر باہر تک پہنچ گئی کہ وہ ایک گھر سے کسی شخص سے تمہائی میں باتیں کر رہی ہے۔ پھر تو بھرمانہ دستور کے مطابق جو ہونا تھا وہی ہوا۔

یکماری کمرے کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ تراتری گونجتی ہوئی فائرنگ ہوئی۔ مرینہ تو ایسی جھوٹیشن کی عادی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ صوفوں کے درمیان فرش کی طرف چھلانگ لگاتی ہوئی گر پڑی۔ ایک لمحہ ضائع کے بغیر جوانی فائرنگ کی۔ ایسے وقت ایک گولی ایمان علی کو آ کر لگی۔ وہ صو۔ سے لڑھک کر فرش پر پڑنے لگا۔

مرینہ کی فائرنگ کے باعث ایک شوٹر مارا گیا۔ دوسرے نے اندر آنے کی ہمت نہیں کی۔ واپس بھاگنے لگا۔ اس نے اپنے پار دلدار کو گولی لگتے دیکھی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ مراد جی دار ہے۔ گولی کمانے کے باوجود اٹھ کر دشمنوں پر گولیاں چلائے گا لیکن وہ بے حارہ ایمان علی ایسے خطرناک کھیل کا عادی نہیں تھا۔ فرش پر لرنے کے بعد پھرتا اٹھ سکا۔

مرینہ دونوں ہاتھوں میں ریلواری پکڑے اندھا رہا۔ فائر کرتی ہوئی چلتی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔ "ستو! کینیو! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

اس کی طوفانی فائرنگ سے دو شوٹرز مارے گئے۔ باقی فرار ہو گئے۔ سسج سکیورٹی گارڈز بھی گولیاں چلا رہے تھے۔ وہ دوڑتی ہوئی ایمان علی کے پاس آئی۔ اس کی پہلی کی طرف سے خون بہ رہا تھا۔ وہ بالکل بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔

وہ اسے دیکھنے اور جھنجھوڑنے لگی۔ "مراد! حوصلہ کرو! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ ایک ہی گولی لگی ہے، تم تو گولیاں کھا کر بھی ٹرتے رہتے ہو۔ اٹھو مراد۔۔۔!"  
دوسری گولی گارڈز دوڑتے ہوئے آئے۔ وہ بولی۔  
"اسے فوراً اٹھاؤ، گاڑی میں ڈالو میں اسے اسپتال لے جاؤں گی۔"

کئی مہینوں سے نزاں رسیدہ تھا۔ کوئی معشوق اس کی تمہائی میں نہیں آئی تھی اب آئی تو وہ بھول گیا کہ بندوق کی گولی آئی ہے۔ وہ اسے ڈارک گلر کے بلاؤز اور اسکرٹ میں دیکھ کر سحر زدہ ہو رہا تھا۔ آدمی سمجھ نہیں پاتا کہ موت میں کتنی کشش ہوتی ہے۔ وہ قریب آئی پھر ذرا فاصلہ رکھ کر بولی۔ "میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گی۔ تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔ تمہارے دل میں ابھی رہش ہے۔ میں ایک غلطی کر کے پچھتا رہی ہوں۔"

مراد نے ایمان علی کو سمجھایا تھا کہ کبھی مرینہ سے سامنا ہو تو رو مانگ نہ ہونا۔ گہری سنجیدگی اختیار کے رہنا۔ آہ۔۔۔! مگر وہ خوبصورت بلاکتے پیار سے بول رہی تھی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر اور قریب ہو کر بولی۔ "مراد۔۔۔! میں فاصلہ رکھوں گی مگر دل نہیں مان رہا ہے۔"

ایمان کا بے ایمان دل بھی نہیں مان رہا تھا۔ وہ بول رہی تھی۔ "میرا جوان ہیں اور ایک مدت کے بعد تمہائی میں مل رہے ہیں۔ فارگا ڈیک۔ ایک بار۔ صرف ایک بار اپنی دھڑکتوں سے لگا لو۔"

ایک بھر پور حسینہ دعوت دے رہی تھی۔ وہ ہواؤں میں اڑنے لگا۔ اس وقت وہ خوشبوؤں میں بسی ہوئی ایسی اچھوتی دوشیزہ دکھائی دے رہی تھی جسے اب تک کسی نے ہاتھ نہ لگا ماہو۔ وہ ہاتھ آنے کے لیے سیدھی ایمان علی کے پاس آگئی تھی۔

اب تبدیلی یہ آئی تھی کہ مرینہ پہلی بار اپنے مراد کو بڑی چاہت سے بڑی لمن سے دیکھ رہی تھی۔ اندر سے خوش ہو رہی تھی کہ وہ تمام شکایتیں بھول کر پھر اس کی طرف مائل ہو رہا ہے۔

وہ اس عاشق کے سامنے اھر سے اھر چلتی ہوئی خود کو مختلف زاویوں سے دکھاتے ہوئے بولی۔ "کیسی لگ رہی ہوں؟" ایمان علی کو اچانک مراد کی باتیں یاد آئیں۔ محفل نے سمجھایا وہ قریب ہونا چاہتی ہے تم دور ہو جاؤ۔ وہ کشش میں رہ کر اسے نکلنے لگا۔ اس نے پوچھا۔ "اس طرح مجھے کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا سوچ رہے ہو؟"

وہ جھکتے ہوئے بولا۔ "خدا نے عورت کو ایسا بنایا ہے کہ اسے دیکھتے ہی عابد اور زاہد اپنی توبہ توڑ دیتے ہیں لیکن میری توبہ نہیں ٹوٹے گی۔ میں تم سے فاصلہ رکھوں گا۔ یہاں سامنے بیٹھو اور مجھے کسی براؤن کی تصویر دکھاؤ بلکہ اسے میرے فون میں ابھی اسی وقت Send کرو۔"  
مرینہ نے ایک صوفے پر بیٹھ کر ایمان علی کے فون



ملنے لگی تھیں۔“

وہ بولی۔ ”ہاں، میں سمجھ رہی تھی کہ وہ مراد ہے لیکن یہ کوئی اور ہے اور مراد کے دھوکے میں ایک گولی کھا چکا ہے۔ یہ بڑی مصیبت میں پڑ گیا ہے۔ آئندہ بھی دشمن اسے مراد سمجھتے رہیں گے۔“

جان انتھونی نے کہا۔ ”ڈونٹ ڈری۔ یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ یہ خیر تیزی سے پھیل رہی ہے کہ مراد لندن میں ہے۔“

”کیا واقعی؟“

”یہ سچ ہے۔ اس نے نیکی براؤن کے ایک بیٹے رونی براؤن کو گولی ماری ہے۔ یہ ریڈارٹ والے کئی خطرناک تنظیموں کے اتحادی ہیں۔ مراد کو یہاں نیکی براؤن کی قوت کا اندازہ نہیں ہے۔ وہ مرنے کے لیے لندن آیا ہے۔“

”یہ کیسے معلوم ہوا کہ مراد نے ہی نیکی براؤن کے بیٹے کو گولی ماری ہے؟“

”خود مراد نے نیکی سے فون پر کہا ہے اور یہ کہ جلد ہی اس کے دوسرے بیٹے جنکی براؤن کو بھی مار ڈالے گا۔ یہاں تمام تنظیموں کے جاسوس اور شوڈرز حرکت میں آگئے ہیں اور مراد کو ہونٹتے پھر رہے ہیں۔“

یہ پیچیدہ اطلاع تھی کہ مراد لندن میں ہے اور وہ تمام دشمنوں کو وہاں اپنے پیچھے دوڑا رہا ہے۔ مرینڈ تیزی سے چلتی ہوئی ایمر جیسی وارڈ میں آئی۔ ایمان علی کی مرہم مٹی ہو چکی تھی۔ وہ ہوش میں آ گیا تھا۔ اسے ایک کمرے میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ جب وارڈ یوازہ کمرے سے چلے گئے تو مرینڈ نے قریب آ کر اسے گھورتے ہوئے دیکھا۔ وہ بڑی نقاہت سے بولا۔ ”اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟“

وہ سخت لہجے میں بولی۔ ”تم مراد نہیں ہو، پھر مراد میں کرمجھ سے کیوں مل رہے تھے؟“

”میں کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔ زیادہ باتیں نہیں کر سکوں گا۔ جو پوچھنا ہے وہ مراد سے پوچھو۔“

”وہ اپنے فون کی تم بدل دیتا ہے۔ مجھ سے رابطہ نہیں ہوتا۔“

”میں ابھی بات کر تا ہوں۔“

وہ اپنے فون پر اس سے رابطہ کرنے لگا۔ مرینڈ نے پوچھا۔ ”کیا وہ ابھی لندن میں ہے؟“

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ”ہاں۔“ پھر اپنے فون پر بولا۔ ”کیا ابھی کہیں تھا؟“

مراد نے کہا۔ ”ہاں، جو کہنا چاہتے ہو، کہہ سکتے ہو۔“

”مجھے گولی لگی تھی۔ میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ مرینڈ

گارڈز اسے اٹھا کر دوڑتے ہوئے ایک بڑی سی ویگن کار میں لے آئے۔ اسے ایک سیٹ پر لٹا دیا۔ مرینڈ سیٹوں کے درمیان اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کی بے ہوشی نے پریشان کر دیا تھا۔

گاڑی تیز رفتاری سے دوڑی جا رہی تھی۔ ایمان علی بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ موت سے لڑنے والے کو حیرانی سے غرورہ حالت میں دیکھ رہی تھی۔ اس نے مراد کو گولیوں سے چھلنی ہوتے اور دشمنوں سے لڑتے دیکھا تھا۔ اب وہی مراد صرف ایک گولی کھا کر بے ہوش ہو گیا تھا، جبکہ گولی پسلیوں سے لگ کر گزر گئی تھی۔ اسے بے ہوشی سے ہوش میں رہنا چاہیے تھا۔

وہ اس کے چہرے کو چھو کر سوچنے لگی۔ یہ مراد ہی ہے۔ دہلی کے ایک فارم ہاؤس میں اس نے مراد کو اسی چہرے کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس سے مقابلہ کیا تھا اور کیا شیر مرد ہے۔

اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ ”یہ یہ وہی مراد ہے لیکن اتنا کمزور کیسے ہو گیا ہے؟“

اس نے ایمان علی کے سینے پر سر رکھ کر دل کی دھڑکتیں سنیں۔ اپنا چہرہ اس کے چہرے سے لگا کر اس کی گردن تک پہنچی۔ اس کے سینے کی مہک کو اپنی سانسوں میں کھینچنے لگی۔ بس آگہی کے وہی لمحات تھے۔ پردہ اٹھنے لگا۔ اپنے مرد کے سینے میں بھیگنے والی کبھی دھوکا نہیں کھاتی۔ وہ فوراً ہی پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ اب یقین سے کہہ سکتی تھی کہ وہ مراد نہیں ہے۔

اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ ”اسی چہرے والے نے فارم ہاؤس میں اس سے قاتل کی تھی۔ کسی اور کی مجال نہیں تھی کہ اسے شکست دے کر نکل جاتا۔ پھر یہ کہ اسی چہرے والے نے پچھلی رات ہونٹوں کے سامنے حملہ آوروں سے مقابلہ کیا تھا۔ کیا وہ جوان دلیر مرد بھی تھا؟“

وہ ابھرتی ہوئی نظروں سے ایمان علی کو دیکھ رہی تھی۔ بہت سی باتیں الجھا رہی تھیں اس کے ہاوجود اپنے مرد کی تنہائیوں سے گزرنے والی اسے مراد ماننے کو تیار نہیں تھی۔ وہ اسے لے کر اسپتال پہنچی۔ ڈاکٹر اس کی مرہم مٹی کرنے لگا۔ وہ دشمنوں کی طرف سے محتاط تھی۔ دو سال گارڈز اس کے ساتھ تھے۔ اس نے ڈائریکٹر جنرل جان انتھونی کو فون پر مخاطب کیا۔ وہ بولا۔ ”مرینڈ! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ ابھی مجھے اطلاع ملی ہے کہ ہمارے سفارت خانے میں غضب کی فائرنگ ہوتی رہی ہے۔ تم کسی شخص سے وہاں



مجھے اسپتال لے کر آئی ہے۔ بھید کھل گیا ہے۔ تمہارا ٹانگہ نہیں چلے گا۔ میں مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ اب تمام دشمن مجھے مراد سمجھتے رہیں گے۔ آج ایک گولی نے اسپتال پہنچایا ہے کل دوسری گولی قبرستان پہنچا دے گی۔“

مراد نے کہا۔ ”میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میرے دوست! یہ کیا ہو گیا؟ میں تمہاری حفاظت اور سلامتی کے لیے جان لڑا دوں گا۔ مرید سے بات کراؤ۔“

اس نے فون مرید کی طرف بڑھایا۔ وہ اسے لے کر کان سے لگا کر بولی۔ ”مراد! کیوں ایسے ٹانگہ کر کے مجھے پریشان کر رہے ہو۔ تم نے اس بچارے کو بھی مصیبتوں میں ڈال دیا ہے۔“

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”اپنے گریبان میں جھانک کر خود سے پوچھو۔ تمہیں اپنی بے وقافی اور دوغلا پن معلوم ہوگا۔ اگر تم میرے سر کا سودا کرنے دہلی نہ آتے تو میں تم سے دشمنی نہ کرتا۔ تمہاری ایسی کہنگی کے باوجود میں نے تمہیں زندہ چھوڑ دیا۔ صرف اس لیے کہ کئی بار میرے برے وقت میں کام آچکی ہو۔“

”پلیز مراد! مجھے شرمندہ نہ کرو، میں آئندہ بھی تمہارے کام آتی رہوں گی۔ جو غلطی مجھ سے ہو چکی ہے اس کی تلافی کرتی رہوں گی۔ تم جلد ہی پھر سے مجھ پر بھروسہ کرنے لگو گے۔“

”میں تم سے دور رہنے کے لیے یہ ٹانگہ کھیل رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں میرے دشمن کا بیٹا ایمان علی اسپتال پہنچ گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں جب تک اس کا علاج ہو رہا ہے اور جب تک اس کا زخم نہیں بھر جاتا تم محافظ بن کر اس کے ساتھ رہو۔ اگر وہ دشمنوں کے ہاتھوں مارا جائے گا تو میں اپنے آپ کو بھی معاف نہیں کروں گا۔“

”تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو؟“

”میں اس کا ہم شکل نہ بننا۔ تم سے دور رہنے کے لیے اسے استعمال نہ کرتا تو اس پر یہ مصیبتیں بھی نہ آتیں۔“

”ٹھیک ہے میں اس کی حفاظت کروں گی لیکن لندن آنے کو دل چل رہا ہے۔ وہاں تم ایک ہو اور دشمن ہزار ہیں۔ مجھے تمہارے ساتھ رہنا چاہیے۔“

”میں نے سبکی براؤن کے بیٹے کو جہنم میں پہنچایا ہے۔ مجرموں کی دنیا میں گھنٹی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ لوگ مجھے ڈھونڈتے رہیں گے اور میں چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

جس نے بھی دشمن کے بیٹے کو گولی ماری تھی وہ مراد کا

نام استعمال کر رہا تھا۔ اس نے مراد کی احوال مرید سے بھی کہہ رہا تھا کہ اسی نے وہ واردات کی ہے۔ وہ فون پر کہہ رہا تھا۔ ”دشمن اس دھوکے میں رہیں گے کہ میں لندن ہی میں ہوں۔ تم سے بھی کہہ رہا ہوں۔ یہاں آؤ گی تو مجھے نہیں پاؤ گی۔ تمہیں ایمان علی کو سیکھ رتی دینی ہوگی۔“

”تم جو کہو گے وہ کروں گی۔ پلیز میری بات مانو ایمان علی کی فکر نہ کرو۔ یہاں دشمنوں کو اپنی غلطی معلوم ہو گئی ہوگی کہ تم یہاں نہیں لندن میں ہو۔ تمام کھیاں اڑ کر ادھر جا رہی ہوں گی۔“

اس نے مراد کو مطمئن کرنے اور اپنی بات منوانے کے لیے کہا۔ ”ایمان علی کے سر سے خطرہ نکل رہا ہے آئندہ بالکل نکل جائے گا۔ پلیز صرف اتنا بتا دو کہ لندن سے کہاں جاؤ گے؟ کیا ماروی کے پاس...؟“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”تم پھر میرے پیچھے آؤ گی۔“

”وعدہ کرتی ہوں پچھا نہیں کروں گی۔ پلیز۔ سچ پوچھو؟“

وہ بولا۔ ”ہاں کل تک یہاں سے نکل جاؤں گا۔ تمہیں وارننگ دے رہا ہوں۔ میرے پیچھے پاکستان آؤ گی تو پھر سے دشمنی مول لو گی اور اس بار تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”میں تمہارے اور مارون کے درمیان دیوار نہیں بنوں گی۔ یہ وعدہ کرو کہ ہر دوسرے تیسرے دن مجھ سے فون پر باتیں کرو گے۔“

”میں نے ماروی سے کہا ہے کہ تم سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تمہارے اطمینان کے لیے وہاں اس سے چھپ کر رہنے میں ایک بار باتیں کر لوں گا۔“

”چلو یہی سبھی بس اتنا چاہتی ہوں کہ اس کے پاس جا کر مجھے نہ بھولو۔ فون پر ہی سبھی ضرور مجھے یاد کرو۔“

مراد نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ ڈاکٹر ٹینیسن کے ہنگلے میں اس کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اسے آرام سے بیٹھ کر اچھا وقت گزارنا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ شامیں آفتابیں آتی جاتی رہتی تھیں۔

عبداللہ کبڈی نے چائے کا ایک گھونٹ پی کر کہا۔ ”یہ کون ہو سکتا ہے جس نے خود کو مراد کہہ کر اتنی بڑی واردات کی ہے۔ سبکی براؤن کے بیٹے کو تباہ آڑا دیا۔ جو کام تمہیں کرنا تھا وہ کر رہا ہے۔“

وہ ایک گھونٹ طاق سے اُتارتے ہوئے بولا۔ ”مجھے اندازہ ہے کہ وہ کون ہے۔ میں اس کے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”سبکی براؤن نے تمہیں اچھی طرح



رہائش کے تمام احراجات وہی برداشت کر رہا ہوگا؟“  
 ”ہاں اس نے کہا ہے کہ سٹی کے پورے خاندان کو  
 خاک میں ملانے تک مجھے اسی شہر میں رہنا ہے اور دشمنوں کو تم  
 سے دور رکھنے کے لیے مجھے یہاں مراد علی منگی کہانا ہے۔“  
 ”خدا کا شکر ہے۔ ماہر میرا بہت خیال رکھتا  
 ہے۔ مجھے ماروی تک پہنچانے کے لیے یہاں تمہیں مراد بن  
 کر رہنے کو کہہ رہا ہے۔ اب میں اطمینان سے پاکستان  
 جاسکوں گا۔“

”یار...! یہ بھئی مجھ سے اون چھین رہی ہے۔ پہلے تم  
 ہی اس سے بات کرو۔“

بشری عرف ملی کی آواز سنائی دی۔ ”بھائی جان! السلام  
 علیکم۔ آپ کی مہربانیوں سے ہم کیا تھے کیا ہو گئے ہیں۔  
 کہاں سے کہاں آگئے ہیں۔ پہلے کراچی شہر کے پسماندہ  
 علاقے میں تھے آج لندن کے ایک مٹھے اپارٹمنٹ میں  
 آگئے ہیں۔ میں نے تو کار چاٹی بھی سیکھ لی ہے۔ تھوڑی  
 انگریزی بولنے لگی ہوں۔ ایک مہینے میں فر فر بولنے لگوں گی۔“  
 بے کی آواز سنائی دی۔ ”ارے اسے بھی کچھ بولنے  
 دے۔ آپ ہی بولتی چلی جا رہی ہے۔“

وہ بولی۔ ”تو چپ کر۔۔ بھائی جان کو یہ تو معلوم ہونا  
 چاہیے کہ میں ان کی مہربانیوں سے کتنی شاندار زندگی گزار  
 رہی ہوں۔ ہم دونوں دو کوڑی کے تھے۔ آج ہمیں ڈالرز  
 اور ہنڈلز رہے ہیں۔“

مراد نے سنتے ہوئے کہا۔ ”خوش رہو بشری! ابھی تم جو  
 کچھ بھی ہو، وہ بے کی محنت اور نہارت سے ہو۔ میں نے تو اس  
 کے مزاج کے مطابق اسے صحیح جگہ پہنچایا تھا۔ میری دعا ہے کہ تم  
 دونوں شاد و آباور ہو اور بھلنے پھولنے رہو۔ شادی کے بعد بھلنے  
 پھولنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر مال بچے ہوتے رہیں۔“

وہ سنتے ہوئے بولی۔ ”یہ دعا یاد رکھوں گی۔ آپ کی  
 شادی کے بعد ماروی کو سب دعا میں دوں گی۔“ مراد ہنسنے  
 لگا۔ وہ بولی۔ ”بھائی جان! میں کہہ نہیں سکتی کہ آپ سے سننے  
 کے لیے کتنی بے چین ہوں لیکن کہتا ہے کہ ہمیں آپ  
 سے دور بنا چاہیے۔“

”ہاں درست کہتا ہے۔ جب حالات سازگار ہوں  
 گے تو ہم ضرور کہیں ملیں گے۔“

بے نے اس سے فون لے کر کہا۔ ”یہ بتاؤ پاکستان  
 کب جا رہے ہو؟“

”تم نے یہاں آکر میری جگہ لے کر مشکل آسان  
 کر دی ہے۔ میں کل ہی کسی فلائٹ سے جانے کی کوشش

کرتا تھا اگر آج اس کا بیٹا مارا نہ جا۔ اس کے گھر میں باہر  
 نہ ہوتا تو وہ تمہیں داماد بنانے تک یہاں میرے پاس آنے  
 نہ دیتا۔“

کہنی نے کہا۔ ”وہ تو مجھے بھی پکڑ کر لے جا رہا تھا۔  
 اب وہ دوسرے بیٹے کی سلامتی کی فکر میں ہوگا۔“

وہ چائے کا مزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”مراد...! وہ کوئی  
 بھی ہو۔ اس نے مراد بن کر ہمیں بھی سبکی براؤن کی دھنسی  
 سے فی الحال دور کر دیا ہے۔ وہ کبھی تمہیں داماد بنانا بھول  
 گیا ہوگا۔ یہ اچھا موقع ہے ہمیں کسی بھی فلائٹ سے پاکستان  
 جانا چاہیے۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں  
 تھا کہ یہاں آتے ہی سبکی براؤن تمہارے پیچھے پڑ جائے  
 گا۔ ہمیں واپس جانا چاہیے۔ میں انڈیا جاؤں گا تم دونوں  
 پاکستان چلے جاؤ۔“

مراد تو اسی میں ماروی کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔  
 یہ دیکھ رہا تھا کہ وہاں جانے سے پہلے حالات اسے الجھاتے  
 جا رہے تھے۔ برتنے دن کوئی نئی بات کوئی نئی الجھن پیدا  
 ہو جاتی تھی۔ یہ اندیشہ تھا کہ آئندہ حالات اور بدتر ہوں گے،  
 ناموافق ہوئے تو وہ دو تاریخ سے پہلے ماروی کی دہلیز تک  
 نہیں پہنچ سکے گا۔

فون سے رنگ فون ابھرنے لگی۔ مراد نے ننگی سی  
 اسکرین کو دیکھا۔ ایک نیا انجانا نمبر تھا۔ اس نے فون دبا کر  
 اسے کان سے لگایا۔ پھر بولا۔ ”ہیلو کون؟“

دوسری طرف سے ملی کی میاؤں سنائی دی۔ آواز  
 آئی۔ ”یہ میری ملی ہے سلام کر رہی ہے۔“

پھر ایک بے کی فراہٹ سنائی دی۔ آواز آئی ”اور یہ  
 تو بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ تمہارا ہے۔“

مراد نے سنتے ہوئے کہا۔ ”میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ  
 مراد علی منگی کا روٹی تم ہی ادا کر رہے ہو۔“

ڈاکٹر اور کہنی چونک کر فون کی طرف دیکھنے  
 لگے۔ بے نے پوچھا۔ ”یہ بتاؤ، میں نے کیسی ٹریکنگ  
 حاصل کی ہے؟“

”زبردست۔ تم نے سبکی براؤن کے بیٹے کو آڑا کر  
 پورے جرائم کی دنیا میں گھمٹلی پیدا کر دی ہے۔“

اس نے کہا۔ ”ہمارا ماسٹر کو یو یو سبکی خاندان کا دشمن  
 ہے۔ روٹی براؤن کے مرڈر پر خوشی سے تاج رہا ہے۔ اس  
 نے مجھے ایک لاکھ۔ چھ لاکھ انعام کے طور پر دیے ہیں۔“

مراد نے کہا۔ ”ماہر دل والا ہے۔ یہاں تمہاری



کردوں گا۔ سنیں نہ جائیں گی تو تمہیں اطلاع دوں گا۔“  
 وہ بولا۔ ”میں نے بونے مراد کا بہت چرچا سنا ہے، کیا  
 وہ لندن میں رہے گا؟“  
 ”نہیں میرے ساتھ جائے گا۔ میں عبداللہ کبڑی  
 اور اپنے ڈائریکٹوریٹ سے تمہیں متعارف کراؤں گا۔  
 تمہیں ان سے اچھی طرح واقف ہو جانا چاہیے۔ پہلے میں  
 سنیں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں پھر ان سے بات  
 کراؤں گا۔“  
 اس سے رابطہ ختم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ماروی  
 نکالوں کے سامنے آئی۔ وہ اپنے گھر کی دہلیز پر کھڑی تھی۔  
 بے چینی سے خشک تھی۔ آہٹ پہ کان تھے در پہ نظر تھی۔ دل  
 دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا۔ ”شباب آگے نہیں تاب اب  
 جدائی کی...“

☆☆☆

ماروی خوشی سے اچھل پڑی۔ مراد فون پر کہہ رہا تھا  
 کہ وہ شام کی فلائٹ سے آرہا ہے، وہ خوشی سے جموم کر  
 بولی۔ ”سچ کہہ رہے ہوں؟ ابھی کہاں ہو؟“  
 ”میں لندن میں ہوں۔ جہاز ایک گھنٹے بعد یہاں سے  
 پرواز کرے گا۔ میں وہاں شام چار بجے تک پہنچوں گا۔“  
 وہ فون کو منہ کے قریب لا کر دھکی سرگوشی میں بولی۔  
 ”کیا اسی پلاننگ کے مطابق آرہے ہو؟“  
 وہ بولا۔ ”ہاں۔ تم اپنے سامنے ایک بونے مراد کو  
 دیکھو گی۔ میں مراد کے دوست اور باڈی گارڈ کی حیثیت  
 سے آرہا ہوں میرا نام ایمان علی ہوگا۔ یہ یاد ہے نا کہ تمہیں  
 کیا کرنا ہے؟“  
 ”مجھے سب یاد ہے۔ میں ائرپورٹ پر تمہیں ریسیو کرنے  
 نہیں آؤں گی۔ محبوب اور معروف صاحب حیران ہونے کے  
 لیے وہاں جائیں گے اور بونے مراد کو دیکھیں گے۔“  
 یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔ ”میرا جی چاہتا ہے، زور زور سے  
 قہقہے لگاؤں، ہائے مراد! کتنے انتظار کے بعد آرہے ہو۔“  
 وہ بولا۔ ”جہاز کی روانگی کا وقت ہو رہا ہے میں فون  
 بند کر رہا ہوں۔ پاکستان پہنچ کر کال کروں گا۔“  
 اس نے اپنے فون کو دیکھا۔ وہ بند ہو گیا۔ وہ دوڑتی  
 ہوئی اپنے کمرے سے نکل کر منی کے پاس آئی وہ ننھے شہزاد کا  
 لباس بدل رہی تھی۔ وہ منی سے لپٹ کر بولی۔ ”چاہی! ہائے  
 چاہی! مراد آرہا ہے۔ وہ آج ہی شام وہاں آجائے گا۔“  
 منی نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”کیا اس نے فون کیا ہے؟“  
 ”ہاں۔“ اس نے چاہی کو چھوڑ کر شہزاد کو بینہ سے اٹھا

کر چوتھے ہوئے کہا۔ ”تمہارے بابا آرہے ہیں۔ وہ تمہیں  
 سینے سے لگا کر یہاں چنی لیں گے۔“  
 منی اسے دیکھ رہی تھی اور سسٹرار ہی تھی۔ اس نے منی  
 کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ ”اے لینے ائرپورٹ کون جائے  
 گا؟ محبوب کو تو اطلاع دو۔“  
 وہ شہزاد کو چاہی کی گود میں دے کر دوڑتی ہوئی اپنے  
 کمرے میں آئی پھر فون کو اٹھا کر محبوب کے نمبر پہنچ گئے۔  
 رابطہ ہونے پر محبوب کی آواز سنائی دی۔ ”محبوب کی جان!  
 کیسی ہو؟“

”میں بہت خوش ہوں۔ یا اللہ! کیا بتاؤں! آج تو  
 میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔“  
 ”تم خوش ہوتی ہو تو میری عید ہو جاتی ہے، بائی  
 دادے آج کس بات پر اتنی خوش ہو؟“  
 ”آج مراد آرہا ہے۔ آج ہی شام کی فلائٹ سے  
 آرہا ہے۔“

محبوب جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ ماروی کی جو خوشی  
 اس کے لیے عید ہو رہی تھی اچانک ماتمی ہو گئی۔ وہ اسے  
 لندن کی فلائٹ کے بارے میں بتا رہی تھی پھر اس نے  
 پوچھا۔ ”آپ اسے ریسیو کرنے جائیں گے نا؟“  
 وہ ذرا اٹک کر بولا۔ ”آں۔ ہاں۔ ضرور جاؤں گا وہ  
 ایک طویل عرصے کے بعد آرہا ہے۔ ضرور جانا  
 چاہیے۔ میں اس کا استقبال کروں گا۔ اسے گلے لگاؤں گا۔“  
 یہ خوب جانتا تھا کہ کس دل سے گلے لگائے  
 گا۔ ماروی کہہ رہی تھی۔ ”میں جانتی ہوں معروف صاحب  
 کو بھی ائرپورٹ پر لے جائیں۔ بڑی بڑی بستوں کو دیکھ کر  
 مراد بہت خوش ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں معروف صاحب کے ساتھ اسے  
 ریسیو کرنے جاؤں گا لیکن ہم اسے کیسے پہچانیں گے؟ وہ تو  
 یہاں چہرہ بدل کر آئے گا۔“  
 ”نہیں۔ وہ کسی بہرہ میں نہیں ہوگا۔ اپنے اصلی  
 چہرے کے ساتھ آئے گا۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟ اس کے نام  
 گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو چکا ہے۔ پولیس اسے دیکھتے ہی  
 گرفتار کرنے گی۔“  
 واقعی یہ یقین کرنے والی بات نہیں تھی کہ وہ اصلی  
 چہرے کے ساتھ آرہا ہے۔ صرف دشمن ہی نہیں قانون کے  
 محافظ بھی اس کے جانی دشمن تھے۔ وہ کسی حال میں بھی اپنی  
 زندگی اصلی چہرے کے ساتھ گزار نہیں سکتا تھا۔



اگر پورٹ سے یہاں لائیں گے۔“  
 ”اطمینان رکھو۔ آج تم اس سے ضرور ملو گی۔ میں  
 اسے سیکر رتی دوں گا۔ پولیس والوں کی نظروں سے بچا کر  
 اسے کلرڈ شیشوں کی کار میں چھپا کر لائیں گا۔“  
 محبوب نے رابطہ قائم ہونے کے بعد اٹلی جنس کے  
 افسر حاد صدیقی سے فون پر کہا۔ ”ج لندن سے آنے والی  
 چار بچے کی فلائٹ سے مراد آ رہا ہے۔“

حاد نے کہا۔ ”اچھا، وہ لندن پہنچا ہوا تھا؟ وہاں سے  
 آ رہا ہے؟ معلوم ہوتا ہے بڑے۔ ہے ہاتھ مار رہا ہے۔“  
 ”نہی میں سوچ رہا ہوں۔ وہ بڑی دولت کما رہا  
 ہے۔ تب ہی یہاں سے انڈیا گیا۔ انڈیا سے اور نہ جانے  
 کتنے ملکوں میں رہنے کے بعد لندن گیا ہے۔ وہ لاکھوں  
 ڈالرز کے اخراجات کہاں سے پورے کر رہا ہوگا؟“

حاد نے کہا۔ ”سیدھے سادے کاروبار سے اتنی  
 دولت حاصل نہیں ہوتی۔ مجرمانہ زندگی گزارنے والے  
 بڑے بڑے ہاتھ مارتے ہیں اور بڑی عبرت ناک موت  
 مرتے بھی ہیں۔“

”ہم سوچ رہے تھے کہ وہ چھپنے کے لیے چہرہ بدل کر  
 آئے گا، ماروی نے ابھی بتایا ہے کہ وہ کسی روپ بہروپ  
 کے بغیر آ رہا ہے اور یہ یقین ہے کہ یہاں اسے گرفتار نہیں کیا  
 جائے گا۔“

حاد نے کہا۔ ”وہ کچھ زیادہ ہی خوش فہمی میں مبتلا ہو  
 گیا ہے۔“

”میں نہیں چاہتا کہ اسے اگر پورٹ پر ہی گرفتار کیا  
 جائے۔ میں اسے ماروی کے پاس لے جاؤں گا۔ کچھ ایسا  
 کرو۔ آج اسے گرفتار نہ کیا جائے۔“

”اسکی کوئی بات ہوگی تو میں ایک دن کے لیے اس کی  
 گرفتاری کو ٹال دوں گا۔“

محبوب کے اندر یہ کھلبلی تھی کہ مراد کی موجودگی سے  
 شادی ملتوی نہ ہو جائے۔ اس نے کہا۔ ”میں بہت ٹینشن میں  
 ہوں۔ فرض کرو، وہ ثابت کروے کہ مجرمانہ زندگی چھوڑ چکا  
 ہے تو تم کیسے ثابت کرو گے کہ وہ آج بھی مجرم ہے؟“

وہ بے چینی سے پہلو بولتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو حاد!  
 اس کے مجرم اور گناہ گار ہونے سے ہی ماروی میری دلہن بن  
 سکے گی۔“

”آپ اطمینان رکھیں۔ ہم پہلے کچھ روز اسے ڈھیل  
 دیں گے۔ پھر حقیقت چمکتی ہے اسے اسے مجرم ثابت کر دیں  
 گے۔ یہ سب دو تاریخ سے پہلے ہی ہوگا۔“

ماروی نے کہا۔ ”میں نے اپنے خدشات ظاہر کیے  
 تھے لیکن مراد کو کسی طرح کا اندیشہ نہیں ہے۔ اس نے یقین  
 سے کہا ہے کہ وہ کسی قانونی گرفت میں نہیں آئے گا۔“

محبوب نے کہا۔ ”تجربہ ہے۔ اس کی خود اعتمادی مجھ  
 میں نہیں آرہی ہے۔ ماروی! ابھی کال کر سکتی ہو تو اسے  
 سمجھاؤ وہ بہت بڑا خطرہ مول لے کر یہاں آ رہا ہے۔“

”میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔ لیکن وہ اپنے معاملے میں  
 بہت پراعتماد ہے۔ میری نہیں سن رہا ہے۔ میں دعا کریں تاکہ  
 رہی ہوں کہ پولیس والوں کا سایہ بھی اس پر نہ پڑے۔“

پھر وہ بڑی اہمیت سے بولی۔ ”محبوب صاحب!  
 خدانخواستہ وہ گرفتار ہوگا تو آپ لیں نا۔ آپ اس کا مقدمہ  
 لڑیں گے۔“

”ہاں، ضرور۔ میں اس کا مقدمہ لڑوں گا۔ ویسے تم پر شرط  
 پارگنی ہو۔ وہ ثابت نہیں کر سکے گا کہ اب مجرم نہیں رہا ہے۔“  
 ”پلیز۔ ابھی یہ باتیں نہ کریں۔“

”میں اپنے اطمینان کے لیے تمہیں سمجھا رہا ہوں  
 عدالت کے فیصلے تک وہ مجرم ہی کہلائے گا اور فیصلہ تو برسوں  
 میں ہوگا۔ اس سے پہلے ابھی ایک نئے بعد دو تاریخ کو ہماری  
 شادی ہو جائے گی۔“

ماروی جتنی خوش تھی، اتنی ہی اداس ہو گئی۔ شرائط کے  
 مطابق مراد دو تاریخ سے پہلے ثابت نہیں کر سکے گا کہ جرائم  
 کی دنیا سے نکل آیا ہے اور آئندہ ایک بے داغ اور

پارساسا آدمی کی طرح امن و امان سے رہنے والا ہے۔ شرائط  
 کے مطابق اسے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ گناہوں سے باز آ چکا  
 ہے۔ اب مرینہ سے یا کسی بھی عورت سے اس کا کوئی تعلق  
 نہیں ہے اور وہ کسی ثبوت اور معترف گواہوں کے بغیر اپنی

پارسانی ثابت نہیں کر سکے گا۔ اس کا دل ڈوبنے  
 لگا۔ خوشیوں پر پریشانیوں حادی ہو رہی تھی۔ وہ فون پر کچھ  
 بول نہیں پاری تھی۔

محبوب نے کہا۔ ”ماروی! تم چپ ہو، ابھی طرح  
 سمجھ رہی ہو کہ تمہیں مراد کی حمایت میں ناکامی ہو رہی ہے۔  
 میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اب بھی کہہ رہا ہوں کہ میری دلہن  
 بننے کے لیے خود کو ذہنی طور پر آمادہ کرنی رہو۔ اب پورے

سات دن رہ گئے ہیں۔“  
 اس نے ایک لمبی سانس کھینچی جیسے مراد کو اپنے اندر  
 جذب کر رہی ہو۔ وہ دل توڑنے والی باتیں سننا نہیں چاہتی  
 تھی۔ اس نے کہا۔ ”دو تاریخ ابھی دور ہے۔ مجھے آج خوش  
 ہونے دیں۔ میں شام کو انتظار کروں گی۔ آپ اسے



دل کا بوجھ کم ہو رہا ہے۔ میں کچھ تمہیں کرنا چاہتی ہوں۔“  
 ”آؤ بیٹھو۔ آج تو خوب باتیں کرو، وقت کاٹنے نہیں  
 کٹ رہا ہے۔ تم سے باتیں کرنی رہوں گی تو وقت جلدی  
 گزر جائے گا۔“

سمیرا نے کہا۔ ”تم کتنی خوش ہو ماروی! میں دعا میں  
 مانگتی آرہی ہوں کہ مراد کی ہو۔ مراد کی ہی رہو۔“ پھر اس  
 نے ماروی کا ہاتھ تھام کر بڑے ڈکھ سے پوچھا۔ ”دو تاریخ  
 کو کیا ہوگا؟“

ماروی نے سر جھکا لیا۔ تموڑی دیر چپ رہی، پھر  
 بولی۔ ”مراد آرہا ہے۔ وہ چنان ہے۔ مجھے حوصلہ مل رہا  
 ہے۔ وہ کسی حال میں مجھے پرٹی نہیں ہونے دے گا۔ اس  
 کے آگے میں کچھ نہیں جانتی کہ ہونے والا ہے۔“

”ماروی! وہ آتے ہی خطرات سے دوچار ہوگا۔  
 قانون کے محافظوں سے چھپ کر نہیں رہ سکے گا۔ کیا تم اپنے  
 حالات کے تاریک پہلوؤں کو دیکھ رہی ہو؟ کچھ رہی ہو؟“  
 ”میرے دیکھنے بکھنے سے حالات نہیں بدلیں گے۔ کیا  
 نصیب ہے کہ خوشیاں اور مصدات ایک ساتھ مل رہے ہیں۔ جو  
 ہونا ہے، وہ آج کل میں سامنے آئی جائے گا۔“

جو ہونے والا ہے، وہ جلد یا بدیر ہونی جاتا ہے۔  
 ماروی کا جو وقت نہیں گزر رہا تھا، وہ بھی گزر گیا لندن سے  
 آنے والا طیارہ دن دے پر اتر گیا۔ محبوب اور معروف  
 اسے ریسیو کرنے آئے تھے۔

معروف تجلی نے کہا۔ ”تم ناحق ٹینشن میں ہو۔ اگر وہ  
 واقعی اصلی چہرے کے ساتھ آرہا ہے تو ہمارے ساتھ کوشی  
 تک پہنچ نہیں پائے گا۔ پولیس اسے لے جائے گی۔“

محبوب نے کہا۔ ”میں ایسا نہیں چاہتا۔ ماروی بہت  
 خوش ہے۔ میں نے حماد سے کہا ہے کہ آج اسے پولیس نہ  
 پکڑے۔ کل گرفتار کرنے کوئی بات نہیں...“

وہ باتیں کرتے ہوئے وقت گزار رہے تھے۔ جہاز  
 سے اترنے والے مسافر کسٹم ڈیپنگ سے گزر کر باہر آرہے  
 تھے۔ مراد بھی اپنے سامان کی ٹرالی دکھینا ہوا آرہا تھا۔  
 عبداللہ کبڈی اس قدر ایمان علی (مراد) کے پیچھے ہونے  
 کے باعث دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

مراد نے محبوب کے قریب آ کر ٹرالی روکی تو کبڈی  
 نے اس کے پیچھے سے آگے آ کر کہا۔ ”سامیں! اسلام علیکم!“  
 محبوب اور معروف اسے دیکھتے ہی شدید حیرانی کے  
 باعث ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ دونوں کے دماغوں کو جھکا  
 پہنچا تھا۔

”تھینک یو حماد!“ اس نے فون بند کر دیا۔ بڑی بے  
 چینی سے سر جھکا کر سوچنے لگا۔ جیسے جیسے دو تاریخ قریب آرہی  
 تھی، ایسا اندیشہ بڑھتا جا رہا تھا کہ رقیب بہت ہی ہنڈی ہے ہزار  
 رکاوٹوں کے باوجود تک میں ہینگ ڈالنے آجائے گا۔

وہ اٹھ کر ادھر سے ادھر ٹھٹھنے لگا۔ دماغ میں شور مچاتے  
 ہوئے خیالات کی یلغار تھی۔ اگر ماروی دو تاریخ کو اس کی  
 دلہن نہیں مکی تو کیا ہوگا؟ وہ اس کے عشق میں مسلسل ناکامیاں  
 برداشت کرتا آرہا تھا۔ اب قوت برداشت جواب دے چکی  
 تھی۔ اب اسے ایک ذرا ہیرا پھیری سے حاصل کرنا چاہتا  
 تھا۔ وہ اپنی اعلیٰ ظرفی اور نیک طبیعت کے مطابق مراد کو  
 نقصان نہیں پہنچاتا۔ تاہم وہ خود کے ساتھ یہ طے کرنے والا  
 تھا کہ پہلے مراد کو مجرم ثابت کر کے جیل میں پہنچایا جائے۔ دو  
 تاریخ کو ماروی سے نکاح پڑھایا جائے۔ پھر دیانتداری  
 سے مقدمہ لڑتے ہوئے ثابت کیا جائے کہ وہ نہ تو مجرم ہے اور  
 نہ ہی اس نے عالی جناب کو قتل کیا ہے۔ وہ دشمن بھی تھا اور  
 دوست بھی..... رقیب بھی تھا اور حبیب بھی جہاں بے

انتہا دولت ہو اور اعلیٰ جنس والے ساتھ ہوں وہاں سچے  
 جھوٹے ثبوت اور گواہوں کے ذریعے مقدمہ جیت لیا جاتا  
 ہے۔ محبوب نے یہ یقین کر لیا تھا کہ مراد کو بعد میں عدالت  
 سے باعزت طور پر بری کرالے گا۔ وہ ایک طویل مدت کے  
 بعد رقیب بن کر یہ قدم اٹھا رہا تھا اور پہلی بار اپنے اندر چپ  
 چاپ یہ تسلیم کر رہا تھا کہ وہ اب تک اپنی ماروی کو احسانات  
 کی زنجیروں میں جکڑتا آیا ہے۔ آخر وہ بھی انسان تھا۔

آخر کب تک شرافت اور دیانت داری سے دل جیتنے  
 کی کوششیں کرتا رہتا؟

ماروی کے اندر ایسی خوشیاں بھر گئی تھیں کہ وہ سکون  
 سے ایک جگہ بیٹھ نہیں پارہی تھی۔ مراد کے سامنے جانے کے  
 لیے بھی ایک لباس پسند کر رہی تھی۔ بھی دوسرا۔ سچ میں نہیں  
 آرہا تھا، کیا ہے؟

دو پہر کو سمیرا آئی۔ اس نے کہا۔ ”ماروی! میں  
 شرمندگی کے باعث تمہارے پاس نہیں آتی ہوں۔ ابھی  
 بہت بڑی خوش خبری سن کر آئی ہوں۔ مبارک ہو ماروی!  
 تمہارا مراد آرہا ہے۔“

ماروی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”میں  
 نے جسہیں اسی دن معاف کر دیا تھا۔ تم آگئیں یہ اچھا کیا۔ وہ  
 گھٹنے بعد مراد آنے والا ہے۔ اب میں تمہیں ڈنر کے بعد ہی  
 جانے دوں گی۔“

وہ بولی۔ ”تمہارے اس یار بھرے روڈے سے میرے



ہیں اور میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ میرا نام ایمان علی ہے۔“  
وہ کبڑی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں  
میرے فادر اور کئی چشم دید گواہ ہیں۔ لیک بیک بیک جاننے  
والے دوچ ڈاکٹر نے اسے یونایتا کر اس پر ظلم بھی کیا ہے۔“

وہ ایک ڈرا تو قف سے بولا۔ ”اور یہ عجیب سی بات  
ہے کہ اس پر ظلم تو ہوائے ساتھ ہی تنگی بھی ہوتی ہے۔“  
معروف نے ناگواری سے کہا۔ ”یہ کیا بات ہوئی جو  
بیک وقت تنگی اور ظلم کیسے ہو گیا؟“

”تنگی اس طرح کہ آپ کوئی دشمن اسے مراد علی منگی  
تسلیم نہیں کرتا۔ اسے مجرموں کی دنیا سے نجات مل گئی ہے  
اب یہ اسے کون ہاتھ بھی نہیں لگاتا ہے۔“  
وہ چیخ کے انداز میں بولا۔ ”آپ دیکھیں گے کہ  
یہاں قانون کے محافظ یہ ثابت نہیں کر سکیں گے کہ یہی مطلوبہ  
مجرم مراد علی منگی ہے کیا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ اس طرح  
جادوگر نے اس کے ساتھ تنگی کی ہے؟“

مراد اور معروف نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔  
مراد نے کہا۔ ”اور اس پر ظلم یہ ہونے والا ہے کہ یہاں اس  
کے اپنے بھی اسے مراد تسلیم نہیں کریں گے۔“

کبڑی نے کہا۔ ”میں اپنی ماروی کے متعلق سوچتا  
رہا۔ یہاں آنے سے کترانا رہا۔ مجھے کسی کی پروا نہیں  
ہے۔ صرف اسی کا خیال بار بار آتا ہے وہ مجھے دیکھے گی تو  
بچپن کی محبت فنا ہو جائے گی۔“

یہ بات محبوب کے دل میں تھی۔ اس کے دل نے اور  
دماغ نے کہا۔ ”اللہ کرے یہ مراد ہی ہو۔“  
اسے مراد تسلیم کرنے سے ہی بات بننے والی تھی، اس  
نے سوچا۔ ”میں ابھی اسے آزماؤں گا۔ خدا کرے ماروی  
بھی اسے یونایتا ہونے کے باوجود تسلیم کر لے۔“

کبڑی نے مراد کی لطف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔  
”یہ میرا جبری یار ہے۔ اس نے مجھے حوصلہ دیا ہے کہ مجھے  
یہاں آکر ماروی سے ملنا چاہیے۔ بچپن کی محبت پائیدار ہوتی  
ہے۔ ماروی مجھے دیکھ کر مت نہیں پھیرے گی۔“

محبوب اور معروف نے ایک دوسرے کو دیکھا۔  
دونوں کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ یہ سنہری موقع  
ہے۔ اسے ماروی کے سامنے لے جانا چاہیے۔  
انہیں پورا یقین تھا کہ وہ اسے دیکھتے ہی دور بھاگے  
گی۔ بچپن کی محبت کا مطالبہ یہ پرگز۔ تاکہ ماروی اسے  
تسلیم کر کے اسے گود میں لٹا کر عشق کرنا شروع کر دیتی۔

محبوب نے کبڑی سے پوچھا۔ ”کیا تم بتا سکتے ہو  
میرے فادر اور کئی چشم دید گواہ ہیں۔ لیک بیک بیک جاننے  
والے دوچ ڈاکٹر نے اسے یونایتا کر اس پر ظلم بھی کیا ہے۔“  
وہ ایک ڈرا تو قف سے بولا۔ ”اور یہ عجیب سی بات  
ہے کہ اس پر ظلم تو ہوائے ساتھ ہی تنگی بھی ہوتی ہے۔“  
معروف نے ناگواری سے کہا۔ ”یہ کیا بات ہوئی جو  
بیک وقت تنگی اور ظلم کیسے ہو گیا؟“  
”تنگی اس طرح کہ آپ کوئی دشمن اسے مراد علی منگی  
تسلیم نہیں کرتا۔ اسے مجرموں کی دنیا سے نجات مل گئی ہے  
اب یہ اسے کون ہاتھ بھی نہیں لگاتا ہے۔“  
وہ چیخ کے انداز میں بولا۔ ”آپ دیکھیں گے کہ  
یہاں قانون کے محافظ یہ ثابت نہیں کر سکیں گے کہ یہی مطلوبہ  
مجرم مراد علی منگی ہے کیا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ اس طرح  
جادوگر نے اس کے ساتھ تنگی کی ہے؟“  
مراد اور معروف نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔  
مراد نے کہا۔ ”اور اس پر ظلم یہ ہونے والا ہے کہ یہاں اس  
کے اپنے بھی اسے مراد تسلیم نہیں کریں گے۔“  
کبڑی نے کہا۔ ”میں اپنی ماروی کے متعلق سوچتا  
رہا۔ یہاں آنے سے کترانا رہا۔ مجھے کسی کی پروا نہیں  
ہے۔ صرف اسی کا خیال بار بار آتا ہے وہ مجھے دیکھے گی تو  
بچپن کی محبت فنا ہو جائے گی۔“  
یہ بات محبوب کے دل میں تھی۔ اس کے دل نے اور  
دماغ نے کہا۔ ”اللہ کرے یہ مراد ہی ہو۔“  
اسے مراد تسلیم کرنے سے ہی بات بننے والی تھی، اس  
نے سوچا۔ ”میں ابھی اسے آزماؤں گا۔ خدا کرے ماروی  
بھی اسے یونایتا ہونے کے باوجود تسلیم کر لے۔“  
کبڑی نے مراد کی لطف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔  
”یہ میرا جبری یار ہے۔ اس نے مجھے حوصلہ دیا ہے کہ مجھے  
یہاں آکر ماروی سے ملنا چاہیے۔ بچپن کی محبت پائیدار ہوتی  
ہے۔ ماروی مجھے دیکھ کر مت نہیں پھیرے گی۔“  
محبوب اور معروف نے ایک دوسرے کو دیکھا۔  
دونوں کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ یہ سنہری موقع  
ہے۔ اسے ماروی کے سامنے لے جانا چاہیے۔  
انہیں پورا یقین تھا کہ وہ اسے دیکھتے ہی دور بھاگے  
گی۔ بچپن کی محبت کا مطالبہ یہ پرگز۔ تاکہ ماروی اسے  
تسلیم کر کے اسے گود میں لٹا کر عشق کرنا شروع کر دیتی۔

محبوب نے کبڑی سے پوچھا۔ ”کیا تم بتا سکتے ہو

کبڑی نے محبوب کے سامنے مصافحے کے لیے ہاتھ  
بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتا تھا آپ سب مجھے دیکھتے  
ہی حیران رہ جائیں گے۔ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی  
یقین نہیں کریں گے۔“

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ”میں خود اپنا ماتم کرتا رہا  
ہوں۔ پہاڑ جیسا تھا سکر کر یونایتا ہوا ہوں۔“  
محبوب نے اپنے ہم شکل سے مصافحہ نہیں کیا تھا  
اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ معروف نے کہا۔  
”تم مراد کے ہم شکل ہو اور خود کو مراد کہہ رہے ہو لیکن مراد  
نہیں ہو سکتے۔“

وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر بولا۔ ”میں ایک ناقابل انکار  
حقیقت ہوں۔ آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔“  
معروف نے کہا۔ ”یہ ناممکن ہے۔ کوئی چھوٹ سے  
گھٹ کر تین چار فٹ کا نہیں ہو سکتا۔ ایسا آج تک نہیں ہوا۔  
ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔“

وہ بولا۔ ”جیسا کبھی نہیں ہوتا ویسا کبھی بھی ہو جاتا ہے  
اور جب ہو جاتا ہے تو اسے قدرت کا تماشا کہتے ہیں۔“  
وہ محبوب سے بولا۔ ”سامیں... آپ سب انکار  
کرتے رہیں گے۔ تب بھی یہ تماشا آنکھوں کے سامنے  
رہے گا۔“

معروف نے کہا۔ ”مقل جنجوڑ رہی ہے۔ پوچھ رہی  
ہے ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“  
وہ بولا۔ ”معروف صاحب! آپ نہیں مانیں گے۔  
ایسا کالے جادو سے ہو گیا ہے۔ ایک شیطان صفت جادوگر  
نے مجھے یہ تماشا بنا دیا ہے۔“

”ہم جادو کو نہیں مانتے۔ عدالت بھی نہیں مانے گی۔“  
”اچھا ہے۔ عدالت نہ مانے اس طرح مجھے مفرور  
مجرم مراد علی منگی تسلیم نہیں کیا جاسکے گا۔ اسی اعتماد سے میں  
یہاں آیا ہوں۔“

محبوب نے کہا۔ ”تم ہانگل مراد کے لہجے میں بول  
رہے ہو۔ صورت شکل بھی وہی ہے لیکن کون آج کے دور میں  
یقین کرے گا کہ یوں ہانگی سے چوہے بن گئے ہو؟“  
”کسی کے یقین نہ کرنے سے اور آپ کے بھی یقین  
نہ کرنے سے میں مراد ہوں۔ مراد ہی رہوں گا۔“

مراد ڈرائی کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے محبوب سے اور  
معروف سے مصافحہ کرتے ہوئے خالص برطانوی  
انگریزوں کے لہجے میں کہا۔ ”مسٹر! یہ میرا جبری دوست  
ہے۔ میں ڈاکٹر ٹیٹا من کا بیٹا ہوں۔ میرے ڈینی جیسا

ہے۔ میں ڈاکٹر ٹیٹا من کا بیٹا ہوں۔ میرے ڈینی جیسا

ہے۔ میں ڈاکٹر ٹیٹا من کا بیٹا ہوں۔ میرے ڈینی جیسا



قد آور اور پاؤی بندر ہے لیکن مراد اسکی روانی سے انگریزی نہیں بول سکتا جیسے یہ بول رہا ہے۔  
اس نے کبڑی سے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“  
”یہ ایمان علی ہے۔ یہ دوست بھی ہے اور محسن بھی ہے۔ میں انڈیا میں دشمنوں سے چھپتا پھرتا تھا۔ وہاں اسی نے پناہ دی۔ ہم دن رات ساتھ رہتے تھے۔ ہم نے عہد کیا ہے کہ آئندہ بھی ساتھ رہیں گے۔ اسی لیے یہ میرے ساتھ آیا ہے۔“

مراد نے پچھلی سیٹ سے کبڑی کو کہا۔ ”لیکن، ساں ساتھ رہنا مناسب نہیں ہے۔ اگر ماروی نے تمہیں مراد تسلیم نہ کیا تو تم یہاں ان پر بوجھ بنے رہو گے مجھے کسی ہوٹل میں رہنا چاہیے۔“

کبڑی نے کہا۔ ”ہرگز نہیں۔ تمہارے مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ میں تمہیں ہوٹل میں نہیں رہنے دوں گا۔“  
مراد نے اس سے کہا۔ ”مراد موجودہ پوزیشن کو سمجھو ابھی وہاں جا کر تم بڑی مشکلات سے دوچار ہوتے رہو گے۔“  
کبڑی نے کہا۔ ”اور تم مجھے مشکلات میں چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ نہیں ایمان علی! ہرگز نہیں! ہم جہاں رہیں گے جس حال میں رہیں گے ساتھ رہیں گے۔“

معروف نے کہا۔ ”تم لوگ رہائش کے معاملے کو اہمیت نہ دو بائی داوے مسٹر ایمان علی تم نے دیا رفریم میں دن رات مراد کا ساتھ دیا ہے۔ یہاں بھی ساتھ رہو گے۔ ہم مراد کے ساتھ ہی تمہاری رہائش کا انتظام بھی کریں گے۔“  
مراد اور کبڑی اسی لیے جان بوجھ کر بحث کر رہے تھے کہ ایک ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے ان کی رہائش کا انتظام ہو جائے۔ کبڑی نے محبوب سے کہا۔ ”میں سوچ رہا ہوں مجھے اچانک ماروی کے سامنے نہیں جانا چاہیے۔ آپ گاڑی روکیں اور پہلے فون پر ماروی کو بتائیں کہ میں کیا سے کیا ہو گیا ہوں؟ دیکھنے والوں سے لیے تمنا شاہن گیا ہوں۔“  
محبوب نے کہا۔ ”تم تاق پریشان ہو رہے ہو۔ ماروی کو فون پر بتانا مناسب نہیں ہے۔“

پھر محبوب نے دل میں کہا۔ ”جس طرح اچانک تمہیں دیکھتے ہی ہمیں شاک پہنچا ہے۔ اسی طرح ماروی کو زبردست دماغی صدمہ پہنچنا چاہیے۔ اب تو یہ یقین ہو گیا ہے کہ یہ مراد ہے اور وہ بھی اسے مراد تسلیم کر لے گی۔“  
محبوب ایسے مطمئن ہوا جیسے ماروی کے نام کی لائٹری اس کے نام نکل آئی ہو۔ اب وہ ذرا بھی پریشان اور فکر مند نہیں تھا۔ یہ پورا یقین ہو گیا کہ بونے مراد کو دیکھنے

ہماری پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟“  
کبڑی نے کہا۔ ”سول اسپتال کے چھ اور ایک بوتیک کے سامنے اس وقت موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔“  
وہ بتانے لگا کہ دونوں ہم شکل پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھ کر کس طرح حیران ہوئے تھے اور ان کے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں؟ پھر انہوں نے دوسرے دن تین گوار کے سامنے ملاقات کی تھی۔ وہاں سے ایک فلیٹ میں گئے تھے۔ مراد نے محبوب کو زینٹا کی کہانی سنا کر یقین دلایا تھا کہ وہ زینٹا کا قاتل نہیں ہے۔

محبوب نے اس سے اور کئی طرح کے سوالات کیے۔ اسے صحیح جوابات مل رہے تھے۔ معروف نے کہا۔ ”تم میرے ساتھ اسلام آباد گئے تھے؟“

وہ بولا۔ ”آپ کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ اکیلا فرین میں پنڈی گیا تھا، وہاں ریوے اسٹیشن سے ہم رگہ گئے تھے۔“  
وہ دونوں اس سے گزری ہوئی باتیں پوچھ رہے تھے، اس کا جواب سن کر یقین ہو گیا کہ وہ مراد ہی ہے۔ معروف نے محبوب کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ ”یہ مراد نہ بھی ہو تو ہماری بلا سے۔ تقدیر تم پر مہمان ہے۔ اسے لے چلو پھر اس کے لیے ماروی کی نگرانی دیکھو۔ اب تو وہ دل و جان سے تمہاری منگولہ بنے گی۔“

محبوب اندر ہی اندر مسرتوں سے بھر گیا تھا۔ اس نے کبڑی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں ماننا پڑے گا کہ تم ہی مراد ہو۔ تم میری اور مراد کی وہ باتیں بول رہے ہو جو صرف مراد جانتا تھا۔ گھر چلو، وہاں چائیا، چاچا اور ماروی تمہارا صحیح امتحان لیں گے، وہ مراد کو پہچن سے جانتے ہیں۔“  
کبڑی نے محبوب سے اور قریب ہو کر بولا۔ ”یہ دیکھتا آرہا ہوں کہ پہلے سب ہی انکار کرتے ہیں پھر مجھے مراد تسلیم کر لیتے ہیں۔ ابھی گھر جاؤں گا تو سب ہی مان لیں گے۔ لیکن ماروی...؟ وہ بھی تسلیم کر لے گی لیکن میں اس کے قاتل نہیں رہا ہوں۔ اس سے بہت اونچا تھا۔ اب برابر بھی نہیں رہا ہوں۔“

کبڑی نے سرد آہ بھری۔ محبوب نے اپنی مسرتوں کو چھپاتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہوئے کہا۔ ”دل چھوٹا نہ کرو۔ چلو اس کا سامنا کرو۔ بچپن کی محبت دل سے نہیں جاتی۔“  
وہ دونوں کار کی اگلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ معروف اور مراد پچھلی سیٹ پر آ گئے۔ وہ دونوں انگلیوں کی تکیوں میں بول رہے تھے۔ محبوب نے عقب نما آئینے میں مراد کو دیکھ کر کار آگے بڑھاتے ہوئے سوچا۔ ”یہ بالکل مراد کی طرح



دہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "نہیں۔ آپ کسی بونے کو مراد بنا کر لائے ہیں؟ آپ کیوں تماشا کر رہے ہیں؟" کبڑی نے سر اٹھا کر ماروی کو صدمے سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں سچ سچ تماشا بن گیا ہوں۔ میں فون پر تم سے باتیں کرتا رہا۔ لیکن یہ بتانے کا حوصلہ نہ ہوا کہ ایک عالم جادو کرنے اپنے شیطانی عمل سے میرے اس ظاہری وجود کو آدھا کر دیا ہے۔"

وہ سینے سے بولی۔ "تو اس مت کرو۔ میرا مراد پہاڑ تھا۔ آسمان کو جسے لیتا تھا۔ تمہاری طرح تنکا نہیں تھا۔" چاہتی اور چاہا اس کے قریب آ کر اسے ثنوتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ چاہتی نے کہا۔ "میں مانتی ہوں کالے جادو سے کسی کو مار ڈالا جاتا ہے کسی کو پانچ اور کسی کو بونا بنا دیا جاتا ہے۔"

چاہنے کہا۔ "یہ جاننے کے باوجود مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ تمہارے ماں باپ نے تمہیں یہ بتایا تھا کہ جب تم پیدا ہوئے تھے تو تمہاری دانی ماں کون تھی؟"

کبڑی نے آگے بڑھ کر چاہتی کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "میں چاہتی کے ہاتھوں میں پیدا ہوا تھا۔ میری مرحوم اماں نے بتایا تھا کہ چاہتی نے ہی میرا نام مراد رکھا تھا۔"

نتی چاہتی حیرانی سے ہاں ہاں کے انداز میں سر ہلانے لگی۔ میرا حیرانی اور بے چینی سے بھی بونے مراد کو اور بھی ماروی کی حیرانی اور پریشانی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ حسد کرنا بھول کر بونے کو سنجیدگی سے دیکھ رہی تھی۔

وہ بونا چاہتی اور چاہنے کے ساتھ گزارنے والی زندگی کی ایسی باتیں بتا رہا تھا، جو صرف مراد ہی جانتا تھا۔

وہ دونوں بوڑھے اس سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے اور وہ سچ جوابات دے رہا تھا۔ ادھر مراد اور ماروی کی نظریں بار بار مل رہی تھیں۔ اس نے سب کی نظریں بچا کر ماروی کو آنکھ ماری تو وہ ذرا ہی دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر اپنی مسکراہٹ کو چھپانے لگی۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہی اس کا مراد ہے۔

ادھر چاہتی اور چاہنے کو بھی یقین ہو گیا۔ انہوں نے بونے کو مراد تسلیم کر لیا اور یہ تو کرنا ہی تھا۔ مراد اور ماروی نے انہیں بھی اپنا راز دار بنا رکھا تھا۔ وہ سب بڑی کامیابی سے سوچے سمجھے ہوئے ڈرامے کو پہلے کر رہے تھے۔

چاہتی گھٹنے ٹیک کر بونے کو گلے لگا کر رو رہی تھی۔ "ہائے میرے بچے! تم ہی ہمارے مراد ہو۔ ہائے ہائے تم کیسے تھک مینا تھے آج ہمیں گلے لگانے کے لیے گلے

کے بعد وہ خود ہی محبوب کی طرف کشاں کشاں چلی آئے گی۔ اس کی منکوحہ بن جائے گی۔"

اس نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے بونے مراد کو کن انہیوں سے دیکھا پھر سوچا۔ ماروی کے عشق کا بخار اتر جائے گا۔ وہ اس سے محبت اور ہمدردی کرے گی لیکن بھولے سے بھی اسے اپنا مجازی خدا بنانے کی بات نہیں سوچے گی۔ ٹھیکس گاڈ...! وہ دو تاریخ سے پہلے ہی میری منکوحہ بن جائے گی۔"

وہ کار کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو کر پورچ میں رک گئی۔ وہ چاروں کار سے باہر آئے۔ محبوب نے کہا۔ "معروف صاحب! آپ پہلے جائیں اور اطلاع دیں کہ مراد آ رہا ہے۔"

معروف اور مراد پہلے دروازہ کھول کر اندر آئے۔ ڈرائنگ روم میں ماروی، کبیرا، چاہتی اور چاہنے بیٹھے ہوئے تھے۔ مراد نے اندر آتے ہی ماروی کو دیکھا۔ ماروی نے بھی اسے دیکھا۔ دل نے کہا۔ "یہی میرا مراد ہے۔ وہی تم، وہی جسامت، میرے پیار کی خوشبو، مجھے مل رہی ہے۔"

معروف نے کہا۔ "مراد آ رہا ہے لیکن ماروی! ایک چونکا دینے والی بات ہے۔ پلیز اسے دیکھ کر اپنے دل و دماغ پر قابو رکھو گی۔ تمہیں صدمہ پہنچنے والا ہے۔"

ماروی صونے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "معروف صاحب! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے صدمہ کیوں پہنچے گا؟" وہ دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "کہاں ہے وہ؟ اندر کیوں نہیں آ رہا ہے؟ میں جا کر اسے دیکھتی ہوں۔"

وہ باہر جانے کے لیے آگے بڑھی۔ پھر ششک گئی۔ وہ محبوب کے ساتھ اندر آ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر سب ہی حیرت سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے سامنے محبوب اور مراد دو ہم شکل تھے۔ وہ پہلے بھی انہیں دیکھ چکے تھے لیکن اب ایک قد آور تھا اور وہ مراد بونا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ برسوں سے جسے قد آور دیکھتے آ رہے تھے، اسے آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں کر سکتے تھے کہ وہ چاند کی طرح گھٹ گیا ہے۔

ماروی نے پریشان ہو کر تقریباً چیخنے کے انداز میں پوچھا۔ "مراد کہاں ہے؟"

کبڑی سر جھکائے کھڑا تھا۔ محبوب نے کہا۔ "ماروی! دل مضبوط کرو۔ یہی تمہارا ہمارا مراد ہے۔"

وہ صدمے سے پیچھے ہٹ کر بولی۔ "نہیں، یہ کیا مذاق ہے؟"



فیک رہی ہوں۔“

مرچکا ہے۔ ہم نے دوسرے دو بڑے جادوگروں کو بڑی رخصتیں دیں۔ انہوں نے اپنے تمام جادو منتر آزمائے۔ یہ ویسے کا ویسا ہی رہا۔ سچ کہتے ہیں، نقدیر میں جو لکھ دیا جاتا ہے، اسے کوئی بدل نہیں سکتا۔“

ایک جادوگر اور چیتکا دکھانے والے تاحترک مہاراج کے متعلق جو کہانی گزری گئی تھی اس کہانی کو مراد بڑے دلچسپ انداز میں سنانے لگا۔ وہ سب حیرانی سے سن رہے تھے۔ کبڑی خود کو مراد ثابت کر رہا تھا۔ اس لیے یقین کر رہے تھے کہ اسے کالے جادو کے ذریعے بونا بنا دیا گیا ہے۔

مٹی چاہتی ہے کہا۔“ ہائے کیا میرا مراد ساری عمر ایسا ہی رہے گا؟ کچھن سے ماروی کو دلہن بنانے کے خواب دیکھتا آیا ہے۔ اب یہ بے جوڑ شادی تو ہو نہیں سکے گی۔“

مراد نے کہا۔“ یہ مجھے اپنا دوست اور بھائی کہتا ہے دن رات مجھے اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ میری ہر بات مانتا ہے۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا ہے کہ اب ماروی کا خیال دل سے نکال دے۔ اب شاید ماروی ہی اسے سمجھا دے گی۔“

مراد محبوب کی اندرونی مسرتوں کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔“ میں نے اسے سمجھایا ہے کہ حالات سے سمجھوتا کرو۔ ماروی تم سے اب بھی محبت کرے گی لیکن اس محبت کے پیچھے بھر ردی ہوگی۔ دو تمہیں بے جا رہے گی۔ لیکن ایک بونے کی دلہن بن کر کبھی تمہارا نہیں بنے گی۔“

معروف نے کہا۔“ یہ سیدھی سی بات ایک بچے کی بھی سمجھ میں آ جائے گی، اسے بھی سمجھ لینا چاہیے۔“

مراد نے کہا۔“ لیکن وہ تو ماروی کا دیوانہ ہے۔ کہتا ہے، ماروی اسے ہر حال میں قبول کر لے گی۔ اب تو بس وہی اسے اپنا اور اس کا فرق سمجھائے گی۔“

مٹی نے کہا۔“ میں اپنے میں اس سے بات کروں گی۔ اب وہ ایسا نادان بھی نہیں ہے۔ بچپن سے میری بات مانتا آیا ہے۔ عقل کی بات اس کی سمجھ میں آ جائے گی۔“

مراد نے کہا۔“ اگرچہ وہ بونا بن کر نقصان میں رہا ہے لیکن دوسرے پہلوؤں سے اسے فائدہ بھی پہنچ رہا ہے۔“

وہ محبوب سے بولا۔“ اس گھر سے باہر کسی کو معلوم نہ ہو کہ یہ مراد علی منگی ہے۔ پویس اور اٹلی جنس والے کسی طرح ثابت نہیں کر سکیں گے کہ یہ وہی عالی جناب کا قاتل مراد ہے۔ یہ یہاں عبداللہ کبڑی کے نام سے آیا ہے۔ یہ گھر سے باہر کسی کے سامنے تسلیم نہیں کرے گا کہ یہ مراد ہے۔“

معروف نے کہا۔“ بے شک۔ اب یہ قانون کی گرفت میں نہیں آئے گا۔ کون اسے مراد علی منگی ثابت نہیں

سمیرا، محبوب اور معروف انہیں دیکھ رہے تھے۔ ماروی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔“ چاہتی! کیا آپ کو پوری طرح یقین ہو گیا ہے؟ کیا جادو سے ایسا ہو سکتا ہے؟“

وہ فرش سے اٹھ کر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔“ ہاں بیٹی! یہ ہمارا مراد ہے۔ تم جادوؤں نے پر یقین کر دیا نہ کرو۔ یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ یہ کسی شک و شبہ کے بغیر ہمارا مراد ہے۔“

”جب تم کہہ رہی ہو تو میں بھی اس سے ایسی باتیں پوچھوں گی، جو صرف مراد ہی جانتا ہے۔ پھر ہمارے درمیان کو ڈور ڈز ہیں۔ انہیں بھی مراد کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“

پھر اس نے کبڑی سے پوچھا۔“ اگر تم مراد ہو تو ہمارے درمیان ہونے والی خفیہ باتیں بتاؤ گے؟“

کبڑی نے کہا۔“ ہاں جو پوچھو گی جواب دوں گا۔ مگر وہ باتیں سب کے سامنے کہنا مناسب نہیں ہے۔“

ماروی نے کہا۔“ میرے ساتھ آؤ، میں تمہاری اصلیت معلوم کروں گی۔“

وہ ڈرائنگ روم کے باہر لاونچ کی طرف جانے لگی۔ عبداللہ کبڑی اس کے پیچھے چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتا ہوا جانے لگا۔ یوں لگ رہا تھا بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلنا چاہا ہو۔ معروف مٹی نے زیر لب مسکرا کر محبوب کو دیکھا۔

محبوب کی خوشیوں کا ٹھکانا نہیں تھا۔ سب ہی دیکھ رہے تھے مراد اور ماروی بے جوڑ ہو گئے تھے۔ نہ ایک دوسرے کے عاشق و معشوق ہو سکتے تھے۔ نہ میاں بیوی بن سکتے تھے۔ محبوب کی یہ حالت تھی کہ اگر تمہا ہوتا تو خوشی کے مارے تاپنے لگتا۔

معروف نے مراد سے کہا۔“ مسز ایمان علی ہمارے ساتھ آپ بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ آئیں بیٹھیں۔“

مراد ان کے ساتھ ایک صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ معروف نے کہا۔“ چاہتی اور چاہنے تسلیم کر لیا ہے۔ یہ واقعی مراد ہے۔ جو سچ ہے اسے ماننا پڑتا ہے۔ ابھی ماروی بھی تسلیم کر لے گی۔“

محبوب نے کہا۔“ اس بے چارے کے ساتھ کیا ہو گیا ہے؟ اس پر جتنا بھی آنسو کریں، اس کی حالت پر جتنا بھی ماتم کریں، اسے اپنے قدم کی طرف نہیں آئے گا۔“

سمیرا نے کہا۔“ جس ظالم جادوگر نے ایسا کیا ہے، وہی اپنے جادو کا توڑ کر کے اسے پہلی حالت میں لاسکتا ہے۔“

مراد نے کہا۔“ وہ جادوگر اب اس دنیا میں نہیں ہے۔“



بچھسے دروازے سے دو قدم کے فاصلے پر انگیسی کا دروازہ ہے۔ میں آسانی سے وہاں جا کر مراد سے مل سکوں گی۔  
 ”لیکن یہ سنسڈ کب تک رہے گا؟ تم دونوں از دو اجی زندگی سب شروع کرو گے؟“

”مراد نے مجھے فون پر کہا ہے کہ فی الحال مجھے محبوب کی دہن بننے سے روکنا ہے۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ مجرموں کی دنیا سے نکل آیا ہے۔ مریدہ بھی اس کی زندگی سے نکل گئی ہے۔“  
 کبڑی نے کہا۔ ”ماروی! یہ تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کے دل میں خدا کا خوف ہے وہ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتا ہے۔ اب تک کئی عورتیں اس کی تنہائی میں آئیں لیکن اسے گناہ گار نہ بنا سکیں۔“

”میں اپنے مراد کو اچھی طرح جانتی ہوں وہ جو ارادہ کر لیتا ہے اس پر سختی سے عمل کرتا ہے یکن محبوب اسے پارسی تسلیم نہیں کریں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ ابھی کیا کر سکتے ہیں۔“  
 وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے بیڈروم میں گئی۔ وہاں نضا شہزاد کھلونوں سے کھیل رہا تھا وہ اسے بازوؤں میں اٹھا کر کبڑی کے پاس لا کر بولی۔ ”یہ مراد کا بیٹا ہے۔ اب میں اس حد سے سے رونا شروع کرتی ہوں کہ تم ہی میرے مراد ہو مگر ہونے ہو گئے ہو۔“

اس نے اپنے پرس میں سے گھیسرین کی ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔ اس کا ایک قطرہ آنکھوں میں کا جل کی طرح لگایا جائے تو دھاروں آنسو بہنے لگتے ہیں۔ مراد نے بھی ایک قطرہ لگایا۔

پھر ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے سب ہی لوگ چونک کر سر گھما کر ایک سمت دیکھنے لگے۔ ٹی وی لاؤنج سے ماروی کے دھاڑیں مار مار کر رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ یہ کبھی نہیں آیا کہ وہ کیوں رورہی ہے؟

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل کر لاؤنج میں آئے پھر ان دونوں سے دور ہی رک گئے۔ کبڑی سر جھکائے کھڑا تھا۔ ماروی گھٹنے ٹیک کر اس کے برابر ہو کر روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”تم ہی مراد ہو۔ مجھے ماننا پڑے گا۔ میں حقیقت سے انکار نہیں کر سکوں گی۔ تم ہی میرے مراد ہو۔“

حسرت انگیز واقعات، سحر انگیز نعمات اور  
 سنسی خنز کردیں انہا کی ذنجبب داستان  
 کتاب دیدار حیات، کلیے باد ملاحظہ فرمائیے

کر کے گائین، ایک اہم سوال پیدا ہوگا کہ یہ مراد کب سے تو ماروی اور چاہتا چاہا کے پاس کیوں آیا ہے۔ ان سے ہونے کبڑی کا کیا رشتہ ہے؟  
 یہ سوچنے کی بات تھی۔ واقعی یہ اہم سوال سب ہی کے ذہن میں آئے گا کہ وہ یونہی اگر مراد نہیں ہے تو ماروی سے رشتے اور رشتہ جوڑنے کیوں آیا ہے؟

وہ سب سوچ رہے تھے۔ اپنے اپنے غور پر سوچنے لگے۔ میرا نے کہا۔ ”میں نے بہت عرصہ بعد مراد کو دیکھا ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ ایک پہلو سے یہ اچھا ہے کہ اب یہ مجرم نہیں کہلائے گا اور اب بھرانہ زندگی نہیں گزارے گا۔“ وہ بولی۔ ”محبوب صاحب! یہ امن و امان سے یہاں شریفانہ زندگی گزار سکے گا۔ آپ کوئی ایسی تدبیر کریں جس کے نتیجے میں یہ دشمنوں سے اور قانون کے محافظوں سے دور اس چھت کے نیچے نیک رہے۔“

مٹی چاہتا اور جھرد چاہا انگریزی نہیں سمجھتے تھے۔ معروف نے محبوب کے کان کے پاس جھک کر بہت ہی دہمی آواز میں کہا۔ ”یہ یونہی تمہارا رقیب ہونے کے باوجود راستے کی دیوار نہیں رہا۔ ماروی تو اب صرف تمہاری ہے۔ اس رقیب سے دل کھول کر ہمدردی کرو۔ ہم ایسی تدبیر کریں گے کہ یہ ہمیشہ یہاں رہے گا اور پولیس کو اس پر مراد ہونے کا بھی شبہ نہ ہوگا۔“

وہ سب سوچنے لگے۔ ابھی کچھ عرصے تک کوئی دیکھنے نہ آتا کہ وہاں کوئی یونہی مراد آیا ہے۔ وہ یونہی گھر سے باہر نہ جاتا لیکن آئندہ کبھی پولیس انکوائری ہو سکتی تھی۔ پولیس اور انکی جنس والوں کے لیے وہ سوالیہ نشان بن سکتا تھا۔

ادھر ٹی وی لاؤنج میں ماروی کبڑی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے کبڑی سے کوئی سوال نہیں کرنا تھا اور نہ ہی کوڈورڈز معلوم کرنے تھے۔ اس نے لاؤنج میں آتے ہی کبڑی سے پوچھا۔ ”وہ جو تمہارے ساتھ آیا ہے وہی مراد ہے نا؟“

وہ سر ہلا کر بولا۔ ”ہاں وہ ایمان علی کے نام سے یہاں آیا ہے۔ اگر اسے قریب رکھنا چاہتی ہو اس سے چھب کر ملنا چاہتی ہو تو اسی کو بھی میں میرے ساتھ اس کی ہائینس کا انتظام کروں۔“

وہ بولی۔ ”میں نے اور چاہتا چاہنے سوچی لیکن یہ مراد کو اپنے قریب اسی چھت کے نیچے رکھنے کے لیے کیا کرنا ہوگا۔ تم نے یہاں آتے ہوئے دیکھا ہوگا اس کو بھی سے ہمت ایک ایسی ہے وہ خاص مہملوں کے لیے ہے۔ کوئی سے





## روایت

پارہ نمبر

رسم و رواج اور روایتوں کی پاسداری اچھی بات سہی مگر... کبھی کبھی کچھ روایتیں بہت خوفناک ہوتی ہیں۔ وہ بھی ایک ایسی ہی روایت کا پایندہ تھا اور اسے اگلی نسلوں میں منتقل کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کا ماحول تباہ ہونے سے بچ جائے یہ اور بات کہ اسے اپنی کوششوں میں نفع فیصد کامیابی ملی۔

بھیتوں کی حفاظت کے لیے خون کی ہونٹا لیتے

حاجب انداز

تیلی فون کی تھنی کی آواز سن کر وہ ساری خوشی اور سرشاری غارت ہو گئی جو چند لمحے قبل ایلی کی قربت سے نصیب ہوئی تھی۔ ایک بچے کی پیدائش اور کام کی مصروفیت کے سبب ہم دونوں کو قربت کے لمحات بہت کم میسر آتے تھے۔ دونوں ہی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور اس طرز کے محبت گزارنے کے لیے پہلے سے وقت ملے کر ہوتا تھا۔ اس کے باوجود کوئی نہ کوئی گریز ہوجاتی۔ میں ہسٹری میں رہنا کا انداز رہ رہتا تھا۔ اس کی سامگی نیچر پاؤں کرین کا فن آ گیا۔ وہ اس انگلش نیچر کے بارے میں جاننا چاہ رہی تھی جس نے حال ہی میں اسٹون جوائن کیا تھا۔ کیونکہ ایلی بھی انگلش پڑھاتی تھی۔ اس سے پاؤں کا خیال تھا کہ اس کے پاس سننے انگلش نیچر کے بارے میں باتوں کا



”اس میں ڈونا کا بھی کچھ نہ کچھ تصور تھا۔ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بھتی ہے۔ اگر وہ حوصلہ افزائی نہ کرتی تو وہ کبھی اسے اس تعلق پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔“

یہ کہہ کر میں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ”مجھے جانا ہے تھوڑی دیر بعد سیل فون پر کال کروں گا تاکہ سٹڈی کی تیند خراب نہ ہو۔“

”خدا حافظ۔ اپنا خیال رکھنا۔“ ایسی ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔

الویرون کی آبادی تقریباً پانچ ہزار نفوس پر مشتمل تھی اور یہ مشی گن جمیل سے شمال کی جانب 53 میل کے فاصلے پر تھا۔ رات کے وقت انکا ڈاک اسٹورز اور شراب خانوں کے علاوہ تمام دکانیں بند ہو جاتی تھیں اور مکان بھی اندھیرے میں ڈوب جاتے تھے۔ ڈیڑی، کاؤنٹی شہر تھے۔ انہوں نے اطلاع ملتے ہی وہاں ایسیوٹیس منگوائی ہوگی اور اس کے ساتھ ہی کاؤنٹی کے میڈیکل ایگزامینر کو بھی بلا لیا ہوگا۔ وہ ایک درمیانی عمر کا سیاہ فام ڈاکٹر تھا جسے علاقہ کی گوری اکثریت نے مکمل طور پر قبول نہیں کیا تھا لیکن میں سے پسند کرتا تھا۔ میرا تعلق بھی تینے کے دفتر سے تھا اور میں وہاں سرائیوں کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ شکاگو پولیس اکیڈمی سے فارغ ہونے اور کرمنالوجی میں چار کورس کرنے کے بعد مجھے یہ ذمے داری سونپی گئی تھی۔ اس طرح خوش قسمتی سے مجھے قانون نافذ کرنے والے ادارے میں کام کرنے کا موقع مل گیا۔ ورنہ میں کسی زمانے میں خاصا قانون شکن واقع ہوا تھا، منشیات، غیر محتاط ڈرائیونگ، چھوٹے موٹے جھگڑے اور دو سال کے دوران ڈیڑی کی حوالات میں دس روز کی قید میرے ریکارڈ کا حصہ تھی۔ یہ ایسی ہی تھی جس نے مجھے اس ماحول سے نجات دلوائی۔ بہرہ دونوں اسکول کے زمانہ سے ہی محبت کرنے لگے تھے پھر اس نے میری سٹریٹ نوشی سے بیزاری کا اظہار کر دیا۔ گریجویٹیشن کرنے کے چار سال بعد مجھے پتا چلا کہ ڈیڑی کو کینسر ہو گیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ شراب نوشی ترک کر دوں گا لیکن میں اس پر قائم نہ رہ سکا۔ بُرائی شکاگو سے واپس آئی اور اس کے مجبور کرنے پر مجھے شراب چھوڑنی پڑی۔

موتح واردات پر پہنچ کر میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ میرے دائیں جانب دریا تھا اور پورے چاند کی روشنی نے اس کے پانی کو دوڑھمایا بنا دیا تھا۔ ایسیوٹیس پہنچ چکی تھی اور اس کے پیچھے کئی کاریں قطار میں کھڑی تھیں۔ مجھے دور سے ہی ڈیڑی نظر آگئے جو ایک پولیس والے سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اپنی گاڑی چٹان کے نیچے کھڑی کی اور ایسیوٹیس کی طرف چل پڑا۔ مجھے دیکھتے ہی پولیس والا لانت

بہت سا ذخیرہ ہوگا۔ وہ اور دوسری لمچہ ز حال ہی میں چھینیاں گزار کر واپس آیا تھا۔ ان سب کی گھنٹے کا موضوع بروس ہیٹرز ہی تھا۔ لگتا تھا کہ وہ سب ہی اس کی مردانہ وجاہت پر مرثی تھیں اور اس سے فلرٹ کرنے کی خواہش مند تھیں۔ ایسی نے فون بند کر کے قبضہ لگا لیا اور مجھ سے لپٹتے ہوئے بولی۔ ”سوری ڈیر! اس نے مجھے ہاتوں میں لگا لیا۔ اگر میں اس سے واقف نہ ہوتی تو یہی سمجھتی کہ وہ غیر شادی شدہ ہے۔ وہ اپنی باتوں سے ایسا ہی ظاہر کر رہی تھی۔“

مجھے ان فضول باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی میں ان قسمتی کلمات کو اس طرح ضائع کرنے کے موڈ میں تھا۔ اس لیے میں نے سنی ان سنی کر دی پھر وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سن کر میں نے کروٹ بدلی اور جاہا کہ ایسی کو جگائے بغیر ریسیور اٹھا لوں لیکن میری یہ کوشش ناکام رہی۔ وہ بھی جاگ گئی اور سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی پریشانی بجا تھی۔ ایک پولیس آفیسر کی بیوی ہونے کے ناتے وہ جان سکتی تھی کہ رات گئے آنے والے اس فون کال کا مطلب کیا ہو سکتا ہے لیکن وہ فون ڈیڑی کا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے ”مجھے ابھی ابھی فون پر اطلاع ملی ہے کہ ڈیڑی ٹیلی مارا گیا۔“

”ہاں ایسا۔ وہ کیسے؟“

”فی الحال اتنا ہی پتا سکتا ہوں کہ اس کی لاش دریا کی طرف جانے والی سڑک پر چٹان کے نیچے ملی ہے۔ ڈنک ہانکس وہاں سے موٹر سائیکل پر گزر رہا تھا کہ اس کی نظر اس پر پڑی۔ اس نے پانچ منٹ پہلے فون کر کے مجھے بتایا ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں دس منٹ میں وہاں پہنچ رہی ہوں۔“

ایسی بستر سے اٹھی اور تیزی سے چلتی ہوئی بینروم کے دروازے تک گئی۔ گوکہ ہماری بیٹی سٹڈی چھ سال کی ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود ایسی رات میں تین چار مرتبہ اٹھ کر اسے دیکھنے جاتی جیسے وہ اب بھی ننھی سی بچی ہو۔

میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ ایسی واپس آئی اور میرا ہاتھ پکارتے ہوئے بولی۔ ”کون مر گیا؟“

”ڈیڑی! میں نے آہنگی سے کہا۔“ ڈنک ہانکس نے چند منٹ پہلے اس کی لاش دریا کو جانے والی سڑک کے کنارے دیکھی ہے۔ فی الحال اتنا ہی مفہوم ہو سکا ہے۔“

وہ پیچھے لپٹتے ہوئے بولی۔ ”لگتا ہے اسے کسی نے قتل کیا ہے اور یہ کام کسی ایسی شادی شدہ عورت کا بھی ہو سکتا ہے جس سے وہ فلرٹ کر رہا ہو۔ شاید مجھے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے لیکن وہ ایسا ہی تھا۔ اس نے میری بہترین سہیلی کی ازدواجی زندگی تباہ کر دی۔“



انداز میں تفتیش کرنے پر مجبور تھے، دوسری بات ہمیں یہ بتائی گئی کہ زیادہ تر سراسر رساں اپنے طور پر موقع داروات کا بخور چاترہ لیتے ہیں اور نلے والے شبتوں کا باریک بینی سے مطالعہ کر کے انہیں دستاویزی شکل میں لے آتے ہیں تاکہ وقت آنے پر سرکاری وکیل کو ان سے مدلل سکے۔ اسی دوران میرا جوش کھٹو بھی آگیا۔ میں نے اس کے ساتھ مل کر اس جگہ کا معائنہ کیا جہاں نلی رہا کرتا تھا لیکن وہاں سے ہمیں کوئی قابل اعتراض ثبوت نہ مل سکا۔ اس کے دفتر کی دیوار کے ساتھ تین درجن سے زیادہ تصویریں رکھی ہوئی تھیں لیکن وہاں کوئی ایسا انتہار یا بروشر نہیں ملا جو نلی نے بنایا ہو جبکہ وہ اپنے آپ کو کمرشل آرٹسٹ کہا کرتا تھا۔ جب ہم مکان کے پچھلے حصے کی طرف گئے تو ڈیڑی عقیب محن میں ایک بڑی تاریخ کے ذریعے کچھ تلاش کر رہے تھے۔ ان کے منہ میں پائپ لگا ہوا تھا جبکہ ان کے کینسر کی تشخیص ہو چکی تھی۔ میں اور مہنا انہیں چہرہ ماہ تک تمباکو نوشی سے باز رکھنے میں کامیاب رہے لیکن انہوں نے آہستہ آہستہ دوبارہ یہ عادت اپنائی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ باقاعدگی سے سائیکل چلاتے ہیں۔ اس لیے ان کی صحت کو کوئی خطرہ نہیں۔

میں اور جوش بھی اپنی چھوٹی چھوٹی تاریخوں کے ساتھ تلاشی کے عمل میں شامل ہو گئے۔ خزاں رسیدہ گھاس پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ اسی دوران میری تاریخ کی روشنی گھاس پر پڑی۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ وہ ایک ریٹینیکلر تھا جو سائیکل کے پچھلے حصے میں لگایا جاتا ہے اور روشنی پڑنے سے اس کا سرخ رنگ دکھنے لگتا ہے۔ جوش چتا ہوا میرے پاس آیا اور بولا۔ ”کیا تمہیں کوئی چیز ملی ہے؟“

”نہیں“ میں نے چپے سے وہ ریٹینیکلر اپنی جراب میں ڈال لیا اور بولا۔ ”میری پانیاں گر گئی تھیں، انہیں ہی اٹھا رہا تھا۔ تمہیں کچھ پتا چلا؟“

”صرف چند پیڑ کے ڈبے۔ لگتا ہے کہ ان کے بغیر وہ ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا تھا۔“

ہم دونوں مکان کی طرف واپس آگئے جہاں میرے ڈیڑی ڈاکٹر تھامس سے باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے ایک نظر مکان پر ڈالی اور بولا۔ ”اس کی موت اس طرح واضح نہیں ہوئی جیسا میں سمجھ رہا تھا۔“

”تم کیا کہتا چاہ رہے ہو؟“ ڈیڑی نے چونکتے ہوئے کہا۔

”وہ گزشتہ ایک سال سے میرا مریض تھا۔ شراب

”ہائے نیم! اچھا ہوا کہ تم آگئے۔“

اس کا نام سولیون تھا اور ہم دونوں ایک ہی ٹیم کی طرف سے فٹ بال کھیلتے تھے۔ ڈیڑی کی مجھ پر نظر پڑی تو بولے۔

”ڈاکٹر لاش کا معائنہ کر رہا ہے۔“

”اس ڈاکٹر سے کوئی امید رکھنا بے کار ہے۔“

سولیون منہ بناتے ہوئے بولا۔ وہ بھی ان لوگوں میں شامل تھا جو یقین کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے کہ کوئی سیاہ فام اچھا ڈاکٹر بھی ہو سکتا ہے۔“

”تم سمجھتے ہو کہ تم اور تمہارا عملہ اس طرح قتل کی وجہ اور طریقہ جاننے میں کامیاب ہو سکتے ہو۔“ میں نے جل کر کہا۔

”میرا خیال ہے کہ تم دونوں کو اس وقت تک فضول باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے جب تک ہم یہ نہ جان لیں کہ یہاں کیا واقعہ پیش آچکا ہے۔“

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا لاش تک گیا اور اس کے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ اس کا سر بری طرح چمک گیا تھا۔ اس کی سیاہ ڈاڑھی پر خون کی چمک رہی تھی۔ نلی خود بھی کمرشل آرٹسٹ تھا لیکن وہ اپنے آپ کو مصور کہلوانا پسند کرتا تھا۔ وہ باقاعدگی سے مقامی لائبریری میں بیٹھ کر دیا کرتا اور زیادہ وقت دین گوف کے بارے میں باتیں کرتا رہتا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک دن لوگ اس کے کام کا موازنہ اس کے استاد سے کریں گے جبکہ میرے خیال میں ایسا نہیں تھا۔ اگر وہ سخی خور اور دلکش شخصیت کا مالک نہ ہوتا تو کوئی بھی شادی شدہ عورت اس کی طرف دیکھنا پسند نہ کرتی۔

سولیون میرے قریب آ کر بولا۔ ”تمہارے ڈیڑی کو چٹان کے پاس سے تین بیڑ کی بوتلیں ملی ہیں۔ یقیناً وہ یہاں بیٹھ کر پل رہا ہوگا۔ وہ ہمیشہ نشے میں چور رہتا تھا۔ میں نے اکثر اسے دوپہر کے وقت آدھے کپڑوں میں دیکھا ہے۔ حیرت ہے کہ اس جیسے شخص کو عورتیں کس طرح برداشت کر لیتی تھیں۔“

ڈیڑی ہمارے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ”نیم! تم اپنا کام جاری رکھو۔ میرے خیال میں یہ ایک حادثہ ہے لیکن جب تک تم اپنی رائے نہیں بتاؤ گے۔ میں اسے فائل نہیں کروں گا۔“

☆☆☆

میں نے اکیڑی میں رہ کر جرائم کی تحقیق کے جدید طریقوں اور آلات کے بارے میں بہت کچھ سیکھا تھا لیکن ہمارے وسائل محدود تھے اور اس مختصر بجٹ میں ان آلات کا حصول ممکن نہیں تھا لہذا اس طرح کے کیسز میں ہم روایتی



رینٹورنٹ حسب معمول گاؤں سے بھرا ہوا تھا۔ ڈیڑی سب سے آخری بوتھ میں بیٹھے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے اپنے لیے آرڈر دیا اور ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔ اسی دوران ٹیلی کا ڈرامہ چل گیا۔ میں نے کہا۔

”میں نے آپ کی میز پر پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھی تھی۔“

”ہاں! ہم اسی بیچ پر پہنچے ہیں کہ یہ حادثاتی موت ہے۔“

”گویا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ وہ شراب کے نشے میں اونچائی سے نیچے گرا تھا؟“

”پینتالیس فٹ کی بلندی سے گرنے والا شخص زندہ نہیں بچ سکتا۔ گرنے وقت اس کا سر زمین سے ٹکرایا تھا۔“

”یہ بھی تو ممکن ہے کہ کسی نے اسے چٹان سے دھکا دیا ہو؟“

”تم نے تو پوسٹ مارٹم کی۔ رپورٹ پڑھی ہے۔“

”لیکن اس سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ خود گرا ہے یا اسے دھکا دیا گیا تھا۔“

ڈیڑی نے غصے سے مجھے دیکھا اور بولے۔ ”میں اپنی رپورٹ مکمل کرنے والا ہوں اور میری نظر میں یہ ایک حادثاتی موت ہے۔ جو لوگ اسے جانتے ہیں، انہیں اس بارے میں کوئی شبہ نہیں ہوگا۔ صرف میرے سراغ رساں بیٹے کے علاوہ۔“

میں نے اپنی جیب سے وہ ریفلکٹر نکالا اور میز پر رکھ دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ ڈیڑی نے، چونکتے ہوئے کہا۔

”سائیکل کا ریفلکٹر۔“ میں نے بھی سپاٹ لہجے میں کہا۔

”وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں لیکن اس میں ایسی کیا خاص بات ہے جو تم مجھے بتانا چاہتے ہو۔“

”یہ بھی عام ریفلکٹر جیسا ہے۔ لال رنگ کا گول۔ جب اس پر روشنی پڑتی ہے تو چمکنے لگتا ہے، البتہ اس میں ایک خرابی ہے کہ یہ درمیان سے کرپک ہو گیا ہے۔“

”مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔“ ڈیڑی الجھتے ہوئے بولے۔

”آپ کی سائیکل کا ریفلکٹر بھی تو ایسا ہی ہے۔ درمیان سے ٹوٹا ہوا۔“

”ٹھیک ہے لیکن اس سے تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟“

”کچھ نہیں ڈیڑی۔ میں صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ گزشتہ شب یہ ریفلکٹر مجھے ٹیلی کے گھر کے باہر پائن کے درختوں کے پاس پڑا ہوا ملا تھا۔ حیرت ہے کہ آپ وہاں گئے اور مجھے نہیں بتایا۔“

”میں اپنی سائیکل پر پورے قہرے قہرے کاچرنگا ہوں۔ یہ میرے فرائض میں شامل ہے۔ یہ ریفلکٹر کئی دن پہلے گھس گرا گیا تھا لیکن مجھے اس بارے میں وضاحت پیش

نے اس کے جگر کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اسے بحالی مرکز میں جانے کا مشورہ دیا تھا لیکن اس نے میری ایک نہیں سنی۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی جیکٹ کی زپ بند کی اور بولا۔ ”مجھے اب چلنا چاہیے۔“

اس کے جانے کے بعد ڈیڑی بولے۔ ”کیم! مجھے افسوس ہے کہ تمہیں بستر چھوڑ کر آنا پڑا لیکن مجبوری تھی۔“ پھر انہوں نے جوش کو مخاطب کر کے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم معمول کے مطابق گشت جاری رکھو۔ ہم بھی چلتے ہیں۔“

کاری طرف آتے ہوئے ڈیڑی نے غور سے میری طرف دیکھا اور بولے۔ ”تم ٹھیک تو ہو؟“

”ہاں۔ بس کچھ تھکن سی محسوس کر رہا ہوں۔“

”تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ کچھ پریشان لگ رہے ہو۔ گھر پر سب ٹھیک ہے نا؟“

”یہ آپ نے کیسے اندازہ لگالیا کہ گھر پر کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے؟“

وہ چلتے چلتے رک گئے اور غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”میں نے تو یونہی ایک عام سی بات پوچھی تھی لیکن تم ناراض ہو گئے۔ اگر کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو تو مجھے بتا دو۔“

وہ غلطی پر تھے۔ میں نے ساری زندگی انہیں بے وقوف بنایا تھا پھر اب کیوں نہ بناتا۔ میں نے مسکین سی صورت بناتے ہوئے کہا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ڈیڑی! ہمارے درمیان آؤٹ ڈور مونر خریدنے پر جھگڑا چل رہا ہے لیکن ایسی پیسوں کا بہانہ بنا رہی ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ ڈیڑی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں بھی ایسی کی طرح بچت کے مطابق چلتا ہوں لیکن تم ہمیشہ سے اپنی ماں جیسے ہو۔ تمہارے نزدیک بچت محض کاغذ پر لکھا جاتا ہے اور بعد میں اس کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ میرے خیال میں تمہاری موجودہ موثر بھی ٹھیک کام نہ رہی ہے۔“

☆☆☆

دوسری صبح میں گاؤں نئی گیا۔ مجھے ایک مقدمہ میں گواہی دینی تھی۔ میں نے ایک ڈرائیور کو نشے کی حالت میں گرفتار کیا جس نے اپنی کار ایک مکان سے نکل کر اسے خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر آفس پہنچا تو ٹیچ ٹائم ہو گیا تھا۔ میں سیدھا اس کھبے کی جانب بڑھ گیا جہاں ڈیڑی اپنی سائیکل باندھتے تھے لیکن وہ ٹیچ کے لیے جا چکے تھے۔ ٹی کا



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”اس ریفلیکٹر کو غور سے دیکھیں ڈیڑی۔ کسی طرح بھی نہیں لگتا کہ یہ کئی دنوں سے وہاں پڑا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے لگا ہوا گوند اب بھی اس قابل ہے کہ اگر اسے زور سے دبا کر لگایا جائے تو یہ دوبارہ چپک جائے گا۔ کل صبح بارش بھی ہوئی اور رات کو اوس بھی پڑی۔ اس صورت میں یہ گوند چند گھنٹوں میں ہی بے کار ہو جاتا۔“

میرے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بوتھ سے چلے گئے اور میں سوچتا رہ گیا کہ کیا وہ اسی صبح غلط کام کر رہا ہوں۔

اس روز کے بعد میں نے ڈیڑی کے سامنے ریفلیکٹر کا ذکر نہیں کیا۔ میرا خیال تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ خود ہی مجھے حقیقت بتا دیں گے۔ ممکن ہے کہ وہ ریفلیکٹر کئی روز سے وہاں پڑا ہوا ہو۔ اس واقعہ کے چند روز بعد ڈیڑی اور می ہارے گھر ڈنر پر آئے۔ ان کی موجودگی میں سٹڈی مجھے اور ایچی کو نظر انداز کر دیتی تھی۔ وہ بھی سٹڈی سے بے حد پیار کرتے تھے۔ کھانے کے بعد میں اور ڈیڑی اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے نکل پڑے۔ ان دنوں بارش اور برف باری کا سلسلہ جاری تھا اور اس کی وجہ سے سڑکوں پر چھوٹے بڑے ٹریک حادثات ہورہے تھے۔ ایسے ہی ایک حادثہ کی وجہ سے وہ تصویریں میرے ہاتھ لگ گئیں۔

میں اس رات دفتر میں تنہا بیٹھا کمپیوٹر پر کام کر رہا تھا جبکہ ڈیڑی گشت پر تھے۔ کام کے دوران مجھے کچھ کاغذات کی ضرورت پیش آئی جو ڈیڑی کی دراز میں رکھے ہوئے تھے۔ میں نے وہ کاغذات نکالے اور دراز بند کرنے ہی والا تھا کہ میری نظر ایک تصویر پر پڑی جس کا ایک کونا کاغذات کے ڈبیر میں سے نظر آ رہا تھا۔ میں نے وہ تصویر نکال لی۔ وہاں چار تصویریں اور بھی تھیں۔ میں اپنی میز پر گیا اور کافی دیر تک حیرت سے آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھتا رہا۔ یہ تصویریں اس ڈیجیٹل کیمرے سے لی گئی تھیں جو می نے ڈیڑی کو ان کی گزشتہ سالگرہ پر تحفے میں دیا تھا۔ ان تصویروں میں تنلی کے ساتھ دو عورتیں نظر آ رہی تھیں جو شادی شدہ ہونے کے باوجود اپنے شوہروں سے بے وفائی کی مرتکب ہورہی تھیں۔

میں ڈیڑی سے تنہائی میں ان تصویروں کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن اس کا موقع نہیں مل رہا تھا پھر ایک دن میں نے ان کے سامنے یہ ذکر پھیڑ ہی دیا۔ پہلے تو انہوں نے نالنا چاہا لیکن میرے اصرار پر مجبور ہو گئے اور بولے۔ ”گازی میں بیٹھ جاؤ۔ یہ جگہ ان باتوں کے لیے

مناسب نہیں ہے۔“

میں، ان کے برابر والی بیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا۔ ”ڈیڑی۔ آپ نے اس کا چھپا کیا اور اسے مار دیا۔“

ڈیڑی نے پہلو بدلا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”پہلے میری بات سن لو۔ اس کے بعد فیصلہ کرنا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔“

”میں سن رہا ہوں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ آپ نے ہی اسے مارا ہے اور یہ سنا میرے لیے آسان نہ ہوگا۔“

”میں جانتا ہوں کیم، لیکن کم از کم میری بات تو سن لو۔“ انہوں نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔ ”تمہارے دادا کو شرف پہنچے ہوئے چند سال ہی ہوئے تھے کہ اس دوران یہاں گل کی تین وارداتیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک شراب خانے میں ہونے والی لڑائی کے نتیجے میں مارا گیا جبکہ دو عورتوں کو ان کے شوہروں نے بد چلتی کے شبھے میں قتل کر دیا۔ ان عورتوں نے بلاؤنٹ نامی ایک کار سینٹرین سے ناجائز تعلقات استوار کر رکھے تھے۔ تمہارے دادا کو اس کا بڑا دکھ تھا کہ اس شخص کی وجہ سے دو خاندان تباہ ہو گئے اور وہ کسی دوسری عورت کی تلاش میں دندناتا پھرتا رہا تھا۔ ایک دن انہوں نے بلاؤنٹ کو اپنے بہترین دوست کی بیوی کے ساتھ دیکھ لیا۔ انہیں بلاؤنٹ پر بہت غصہ آیا جو پورے قصبے کا ماحول شراب کر رہا تھا۔ کچھ دن بعد ایک اور واقعہ پیش آیا جب ٹی کے ریسٹورنٹ میں ایک عورت کا اس کے شوہر کے ساتھ زبردست جھگڑا ہوا۔ بلاؤنٹ اس عورت کے گرد بھی منڈلا رہا تھا اور یہی بات اس عورت کے شوہر کو ناگوار گزری۔ اس کے دو دن بعد ہی بلاؤنٹ دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا جو یقیناً ایک حادثہ ہی تھا۔“

”دادا نے اسے مار دیا۔“

”دوسرا دادا اس کے چند برسوں بعد پیش آیا۔ وہ ایک چند معروف موسیقار میں سے تھا اور جھیل کے کنارے گا بھا کر کچھ کما لیتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے فن سے عورتوں کو رجھانا شروع کر دیا۔ جب اس کی وجہ سے تین خاندان تباہ ہوئے تو تمہارے دادا سے برداشت نہ ہو سکا اور ایک صبح وہ موسیقار اپنے گھر میں مردہ پایا گیا۔ اتنے رات میں کسی وقت ایک ٹرک گٹار کے ذریعے برنی جھنکا لگا اور وہ ختم ہو گیا۔“

”یہ کارنامہ بھی دادا نے ہی انجام دیا؟“

”پھر سارہ میک بین نامی عورت یہاں آئی۔ وہ



”سٹڈی، جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ تمہاری بس آنے میں صرف دس منٹ رہ گئے ہیں۔ میں تمہارا بیگ تیار کرتی ہوں۔“  
 میں نے ان دونوں کے جانے کے بعد ہلکا سا ناشتا کیا۔ اسی اثنا میں ایکی واپس آگئی اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اگر میرے پاس وقت ہوتا تو ضرور تمہاری پریشانی کی وجہ جاننے کی کوشش کرتی لیکن معلوم ہے کہ اس میں کافی دیر لگ جائے گی۔ اس کے لیے مجھے شام کا انتظار کرنا ہوگا۔ میں نے صاف شب کے قریب نہیں تین مرتبہ بستر سے اٹھتے دیکھا ہے اور ناشتے کی میز پر بھی تم خلا میں نظر میں جمائے ہوئے تھے۔ میرے لیے یہ پریشانی کی بات ہے لیکن مجبوری ہے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے ہم اس پر متکون نہیں کر سکتے۔“

مجھے اپنی سوچ پر شرمندگی ہونے لگی۔ نیلی بھی تو شادی شدہ عورتوں کا چچا کیا کرتا تھا اور ایسی کئی مرتبہ رات کو دیر سے واپس آئی۔ وہ بیٹا۔ یہی کہا کرتی تھی کہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی تھی اور بعد میں وہ لوگ چیز اٹھانے چلے گئے تھے۔ میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ایکی مجھے ہمیشہ کی طرح مصحوم اور پاکیزہ لگی۔ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور اپنے کام پر روانہ ہوئی۔

دفتر جاتے ہوئے میں اپنے آپ کو کسی بھی ناخوشگوار صورت حال سے ٹھنسنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح ڈیڈی کا سامنا کر پاؤں گا۔ انہوں نے ایک آدمی کا ٹل کروا دیا تھا اور یہ ڈسے داری بھی مجھ پر ڈال دی تھی کہ انہیں پکڑا دوں، اس روز بھی وہ کورٹ گئے ہوئے تھے۔ اس لیے ان کی واپسی گیارہ بجے تک ہوئی۔ انہوں نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر تھرماس کھولا اور اس میں سے کافی نکال کر پینے لگے۔ کچھ دیر خاموش رہی پھر وہ کھٹکھٹاتے ہوئے بولے۔

”کیا تم نے بھی سوچا ہے، کرایہ تمہیں چھوڑ کر جاسکتی ہے؟“  
 یہ وہی تکلیف دہ سوچ تھی جو صبح ناشتے کی میز پر مجھے تنگ کر رہی تھی۔ ”آپ کو یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“  
 ”ذرا سوچو کہ اگر تمہارا ایکی علیحدہ ہو گئے تو سٹڈی کا کیا ہوگا؟“

”وہ پہلے بھی کہیں نہیں گئی اور نہ آئندہ مجھے چھوڑ کر جائے گی اور نہ ہی میں اسے چھوڑنے والا ہوں۔ ہم نے ایسا کوئی پروگرام نہیں بنایا۔“

”میں اور تمہارے دادا بھی اسی طرح سوچتے تھے لیکن بد قسمتی سے ہوتا یوں ہے کہ کسی اجنبی مرد یا عورت کی

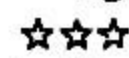
ہتھیاس سال کی خوب صورت عورت تھی جسے اس کا باپ اس کی حرکتوں کی وجہ سے اس قہرے میں چھوڑ گیا تھا لیکن وہ یہاں بھی باز نہ آئی اور اس کی وجہ سے پہلے ہی سال تین طلاقیں واقع ہوئیں۔ اس کی موت بھی آگ لگنے کی وجہ سے واقع ہوئی۔“

”اور اب آپ بھی اسی روایت پر عمل کر رہے ہیں کیونکہ نیلی کا کردار بھی کچھ ایسا ہی تھا۔“

”تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اس شخص کی وجہ سے لوگ کتنے پریشان تھے۔ شاید تم نے بھی ان مصحوم بچوں کے چہرے نہیں دیکھے جن کے والدین کے درمیان طلاق ہو جاتی ہے۔ اس نام نہاد شرابی آرٹسٹ کو ان باتوں کی پروا ہی نہیں تھی۔ میں نے بہت مبر سے کام لیا۔ اسے سمجھ رہی تھی لیکن اس نے یہ کہہ کر میرا مذاق اڑایا کہ میں اس سے حسد کرتا ہوں، یہ سن کر مجھے پاگل ہو جانا چاہیے تھا لیکن جانتا ہوں کہ اس جیسے لوگوں سے ایسی ہی توقع کرنی چاہیے۔“

”آپ نے اسے قتل کر دیا؟“  
 ”ہاں! اور مجھے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔“  
 ڈیڈی میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”ڈیڈی۔ آپ نے ابھی ابھی میرے سامنے ایک جرم کا اعتراف کیا ہے؟“ میں نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔  
 ”تمہیں مصحوم ہونا چاہیے کہ کس سے بات کر رہے ہو۔“ ڈیڈی نے ناگوار سے کہا۔ ”میں اس وقت بھی تھا جب تم ٹرائی سائیکل چلایا کرتے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ اس مرد کو کو جنم حاصل کر کے میں نے ایک نیک کام کیا ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ ایک جرم ہے۔ اب میں اس کا فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں۔“



”کیا بات ہے تم ناشتا کیوں نہیں کر رہے ہو؟“ ایکی نے میری خانی پلیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک نظر میز پر ڈالی۔ اندرے، توس، مارجرین اور جیلی، یہ سب چیزیں وزن بڑھانے والی تھیں جبکہ میں پچاس کی عمر کو پہنچنے سے پہلے دل کے دورے سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایکی کی بات کا جواب دیے بغیر گ میں کافی اندلی اور ہلکے ہلکے گھونٹ لینے لگا۔

”ڈیڈی! کھا کر تو دیکھیں۔ سب چیزیں بہت اچھی ہیں۔“ سٹڈی شوشی سے بولی۔

”اچھا۔ کوشش کرتا ہوں۔“ میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہا۔



### خدا کا شکر

ایک دفعہ صیب جالب نے ناصر کاظمی سے کہا۔  
 ”جب بھی آپ کی کوئی غزل کسی رسالے میں  
 دیکھتا ہوں تو دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش یہ  
 غزل میرے نام سے چھپتی۔“  
 ناصر کاظمی نے شکر یہ ادا کیا۔ کچھ دیر بعد صیب  
 جالب نے پوچھا۔  
 ”میری غزل دیکھ کر آپ کا رد عمل کیا ہوتا ہے؟“  
 ناصر کاظمی نے کہا۔ ”خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ  
 یہ غزل آپ ہی کے نام سے چھپی۔“  
 رسالہ۔ تفسیر عباس باہر، ادا کاڑھ

تھی لیکن یہ سن کر تمہارا رد عمل بالکل مختلف ہوتا۔ اسی لیے  
 میرے بارے میں فیصلہ کرنے میں کوئی جلدی نہ کرو۔“  
 ڈیڑی کی باتیں سن کر میں اس قدر طیش میں آچکا تھا  
 کہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ میرے  
 قریب آئے اور فون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے بولے۔  
 ”تمہیں کاؤنٹی کے وکیل کا نمبر معلوم ہے۔ اسے سب کچھ  
 بتا دو۔ یہ بھی کہ میں کہاں مل سکتا ہوں اور کسی کے لیے کوئی  
 مشکل پیدا نہیں کروں گا۔“  
 یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور مجھے پکڑا اور خود اپنی کرسی  
 پر بیٹھ گئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کب تک ریسیور ہاتھ میں  
 لیے بیٹھا رہا پھر میں نے ہاتھ رو م میں جا کر اپنا منہ دھویا اور  
 آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھا۔ ڈیڑی نے ایک آدی کو قتل  
 کروایا تھا جبکہ دادا، اس سے بھی زیادہ قتل کر چکے تھے اور  
 اب وہ چاہتے تھے کہ اگر ایسا کوئی واقعہ دوبارہ ہو تو میں بھی  
 اس روایت پر عمل کروں۔  
 میں جب اپنی سیٹ پر آیا تو وہ جا چکے تھے۔ اس سہ  
 پہر میں نے کئی کام نٹائے۔ وہ کافی دیر بعد واپس آئے اور  
 میری میز کے پاس کھڑے ہو کر کہنے لگے۔ ”تمہیں پولیس کو  
 اطلاع کر دینی چاہیے۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ مجھے  
 تمہیں اس معاملے میں ٹھہرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور نہ ہی یہ  
 کہنے کا کہ تم بھی وہی کرنا جو میں نے اور تمہارے دادا نے کیا  
 تھا۔ البتہ فون کرنے سے پہلے مجھے تھوڑا سا وقت ضرور دینا  
 تاکہ تمہاری ماں کو ذہنی طور پر تیار کر سکوں۔“

آمد سے قصبے کا ماحول خراب ہو جاتا ہے۔ وہ لوگوں کو اپنی  
 جانب متوجہ ہونے پر مجبور نہیں کرتے لیکن ان میں کچھ ایسی  
 کشش ہوتی ہے کہ یہاں کے لوگ ان کی جانب مائل ہوتا  
 شروع ہو جاتے ہیں، اگر یہ اجنبی یہاں نہ آتے تو انہیں یہ  
 موقع بھی نہ ملتا۔“  
 ”آپ نے ایک شخص کو قتل کر دیا۔“  
 ”میں اسے دوبارہ بھی قتل کرتا۔ وہ کم از کم  
 دو خاندانوں کو تباہ کرنے والا تھا۔“  
 ”آپ نے ایک شخص کو قتل کر دیا۔“ میں نے اپنی  
 بات پھر دہرائی۔  
 ”ٹھیک ہے۔ تم مجھے پولیس کے حوالے کر دو کیمر!“  
 وہ منہ میں پانسہ دباتے ہوئے بولے۔ ”فون اٹھاؤ۔“  
 دوپہر کا کھانا میں نے کسی دوسری جگہ کھایا کیونکہ ملی  
 کے ریستورنٹ میں ایک بار پھر ڈیڑی سے سامنا ہو سکتا تھا۔  
 واپس آیا تو میری میز پر ایک فائل رکھی تھی۔ میں نے اسے  
 کھول کر دیکھا۔ اس میں مقامی اخبار میں شائع ہونے  
 والے طلاق کے تین نوٹس لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے  
 دو خاندانوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ میرے ساتھ ہی باقی  
 اسکول میں پڑھتے تھے۔ میں فائل بند کرنے ہی لگا تھا کہ  
 ڈیڑی آگئے اور بولے۔  
 ”تم جانتے ہو کہ ان طلاقوں کے کیا اثرات مرتب  
 ہوں گے۔ تینوں خاندانوں کے نو بچے اپنے ماں باپ کو  
 چھوڑتا ہوا دیکھیں گے۔ ان میں سے ایک شخص ناکارہ شرابی  
 ہو گیا ہے۔ ایک عورت کا گزارہ نوڈ اسٹیپ پر ہے اور وہ  
 اپنے بچوں کا علاج نہیں کروا سکتی اور ایک ذہین طالب علم  
 ان حالات کی وجہ سے نوں جماعت میں ہی اسکول  
 چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا اور ان سب واقعات کا ذمہ  
 دار نیلی تھا۔“  
 ”اور آپ نے اسے قتل کر دیا؟“  
 ”ہاں، میں نے اسے قتل کیا کیونکہ یہ میرا قصبہ ہے  
 اور یہاں کے لوگوں کی دیکھ بھال میری ذمہ داری ہے اور  
 ان کی ہر ممکن مدد کرنا میرا فرض ہے۔ جو کچھ تم ماضی میں  
 کرتے رہے ہو۔ یہاں کے لوگوں نے اس حوالے سے  
 تمہیں معاف کر دیا ہے۔ اس لیے اب یہ تمہارا بھی فرض  
 ہے کہ اس روایت کو آگے بڑھاؤ۔ ایک بات اور“ ان کی  
 نیلی آنکھوں میں چمک ابھری ”جیسا کہ میں نے گزشتہ شب  
 کیا تھا۔ تم خوش قسمت ہو کہ ایسی بے ایمان نہیں ہے۔ کاش  
 میں تمہیں بتا سکتا کہ نیلی کی نظر اس پر بھی تھی گو کہ وہ ایسی نہیں



میں انہی سوچوں میں ممتا تھا کہ اچانک میری نگاہ ایسی پر پڑی۔ وہ سامنے والے دروازے سے آ رہی تھی اور ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے نہیں اچھینان ہوا۔ میں جلد از جلد گھر پہنچنا چاہ رہا تھا تاکہ ایسی اور شادی کے ساتھ بیٹھ کر نہیں جا سکوں۔ میں فرصت کے لمحات سے دل کھول کر لطف اندوز ہونا چاہ رہا تھا میرے ذہن میں ایک اچھا سا ڈراما اس کے بعد کوئی عمدہ فلم دیکھنے کا پروگرام بن چکا تھا۔

اچانک ہی ایک شخص تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے پیچھے آیا۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا جیسے اسے راکنا چاہ رہا ہو۔ وہ قہقہے لگا رہا تھا اور جواب میں ایسی بھی دکھنا مسکراہٹ سے اس کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ مجھے اس شخص کو بھانسنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ یہ وہی انگریزی کا نیا نیچر تھا جس پر ایسی کی شادی شدہ پہلی نظریں جمائے ہوئے تھی۔

وہ خاصا اسمارٹ اور پیٹنڈم واقع ہوا تھا۔ لمبا قد، مٹھکریا لے سیاہ بال، سفید قمیص، دی گلے کا سوئیٹر اور سیاہ پینٹ میں اس کی شخصیت کافی جاذب نظر لگ رہی تھی۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ اس میں عورتوں کو تسخیر کرنے کی زبردست صلاحیت ہے اور کنواری تو کیا شادی شدہ عورتیں بھی اس کے سحر سے محفوظ نہیں رہ سکتیں۔

ایسی اپنے کندھے پر اس کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے رک گئی۔ اس نے اپنی کتاب میں سے ایک کاغذ نکال کر ایسی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اپنی کتابوں کو سینے سے لگائے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ یہ ہمارے اسکول کے دنوں کا ایک جانا بچا ناظرہ تھا۔ اس فرق اتنا تھا کہ ماضی میں اس کی جگہ میں ہوا کرتا تھا۔ پھر ایسی نے اس سے کچھ کہا اور میری کار کی جانب چل دی۔

اس وقت مجھے ڈیڑی کا خیال آیا۔ انہوں نے کیسے کہہ دیا کہ میں اس درد سے "شائیں ہوں جس نے دوسرے کئی خاندانوں کو برباد کر دیا تھا۔ انہوں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ باہر سے آنے والے اجنبی ہری زندگی میں زہر مچھول دیتے ہیں۔ ان کا نہ آنا ہی بہتر ہے اور اگر وہ آجائیں تو کسی طوفان کے آنے سے پہلے ان سے نجات حاصل کر لینا چاہیے۔

مجھے مسٹر بروس پیٹرس پر گہری نظر رہنی ہے۔ صرف اپنے لیے نہیں بلکہ اس قہصے میں رہنے والے ہر سچے انسان کے لیے۔ کیونکہ یہی وہی روایت ہے۔

بچہ انہوں نے جھٹ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔ "بیٹے! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ تم نے اپنے آپ کو اچھا انسان بنانے کے لیے بڑی محنت کی ہے اور تم مجھ سے بھی بہتر نظر آتے ہو۔"

میرے والد نے بھی مجھ سے ہمدردی کے دونوں نہیں کہے تھے۔ وہ سپر ہی بات کرنے کے عادی تھے اور بھی کسی نے انہیں بزدل نہیں سمجھا اور نہ ہی وہ اس وقت بزدلی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

"میں آدھ گھنٹے میں گھر پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد تم مجھے فون کر سکتے ہو۔"

☆☆☆

اس سارے معاملے میں پڑ کر میں یہ بھول ہی گیا کہ مجھے ایسی کو اسکول سے لینا تھا۔ آلو یرون ہائی اسکول دس سال قبل قائم ہوا تھا جب تین چھوٹے اسکولوں کو ضم کر کے ایک کر دیا گیا تھا۔ ایسی وہاں چھ سال سے پڑھا رہی تھی۔ البتہ سٹری کی پیدائش کے بعد اس نے ایک سال گھر پر گزارا۔ لیکن میری محدود آمدنی کے پیش نظر اسے دوبارہ یہ ملازمت اختیار کرنی پڑی۔

اسکول کی دو منزلہ عمارت سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔ میں صدر دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ تقریباً سبھی اسٹوڈنٹس جا چکے تھے اور نیچر زد دو دو تین تین کی ٹولیوں میں باتیں کرتے ہوئے باہر آ رہے تھے۔ میری توجہ ان کی جانب نہیں تھی بلکہ میں اس وقت لمبی ڈیڑی اور طلاق کے ان کاغذات کے بارے میں سوچ رہا تھا جو مجھے دکھائے گئے تھے۔ ڈیڑی کا کہنا تھا کہ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے ان حالات سے واسطہ نہیں پڑا لیکن ان کے بارے میں سوچ کر اب مجھے اندازہ ہوا کہ ازدواجی زندگی میں دروازہ پڑ جائے تو کس طرح کے مسائل سامنے آتے ہیں۔ ماں باپ کی علیحدگی کی صورت میں سب سے زیادہ بچے متاثر ہوتے ہیں۔ وہ ڈرے سبے کونوں کھدروں میں دبے رہتے ہیں یا ماں باپ سے الٹا گم کر کے انہیں علیحدہ ہونے سے روکتے ہیں اور یہی جیسے لوگوں کی بدولت جن عورتوں کا گھر اجڑتا ہے۔ ان میں سے کچھ کی شادی ہو جاتی ہے اور کچھ خزاں رسیدہ بنوں کی طرح ادھر ادھر بھٹکتی رہتی ہیں۔ میرے ڈیڑی کا جرم یہی تھا کہ انہوں نے اپنے لوگوں کو اس درد سے نجات دلانے کی کوشش کی اور اپنے قہصے کو بچانے کے لیے کسی کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کیا کیونکہ ان کے نزدیک یہی ایک سزا سبب حل تھا۔





## بل اےنوان

شش ماہ جیل

دولت انسان کی بنیادی ضرورت سہی مگر... ہوس ایک ایسا زہر ہے جو اچھے بھلے جیون کو تباہ کر دیتا ہے... اس نشے نے وہ صرف اس کی چال بھی لڑکھڑادی تھی بلکہ چلن بھی مشکوک کر دیا اور اسی شک نے بالآخر سہاہ کو چور تک پہنچا دیا۔

www.paksociety.com سے درآ رہا ہے ایک رنگ و بھنگی کا دلچسپ اور مضمون دار ناول

روزانہ اسی وقت یہی منزل پر واقع پینک میں کام سے جاتی تھی۔ ہوستا ہے کہ وہ کبھی اسی بڈنگ میں کام کرتا ہو۔ وہ عام سے کم سے کا قعدا برآدی تھا لیکن اس کی بھون سیہ اور اس قدر مہنی تھی کہ چہرے پر انگریز تے ہی

جوالس 77 لائنڈ نے لٹ میں اس سٹھس کو پہلی مرتبہ مشک کی ایک بیٹی ہوئی کہ پروردہ تھا۔ شاید وہ اس لیے نمایاں تھا کہ صرف وہی دونوں برساتیوں کے نشے تھے۔ اسے تو برساتی کی اس لیے ضرورت نہیں تھی کہ وہ

پہلی ڈانچہ 2015 مارچ

COPIED FROM WEB



متلاشی بھی۔ ایک مرتبہ اس نے سوچا بھی کہ احتیاط کے طور پر وہ اپنے منجر مسٹر میلرز کو اطلاع کر دے لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش رہ گئی کہ کب تک وہ اسے بے وقوف قرار نہ دے دے یا اتنی دیر میں اطلاع دینے پر سرزنش نہ کرے۔ مسٹر میلرز طبیعت کے بڑے اکڑتے تھے۔

جو اس کو خیال آیا کہ اسے یہ سب کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کبھی نے اس کے لیے کون سی مہلائی کی ہے۔ وہ اتنی محنت اور جانفشانی سے سارا کام کرتی ہے لیکن اس کا صلہ یہ ہے کہ تین سال سے اس کی تنخواہ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا جبکہ کبھی کی آمدنی کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ وہ اسی شش و پنج میں تھی کہ ایک خیال نہ جانے کہاں سے اس کے ذہن کے درجوں میں گھس آیا۔

بالفرض ڈاکا پڑ جائے اور وہ شخص رقم لے کر فرار ہو جائے اور بالفرض یہ رقم کسی طرح جو اس آئرلینڈ کے پاس واپس آ جائے تو کیا مار ہے؟ کم از کم کبھی کو تو کوئی نقصان نہیں ہوگا کیونکہ انشورنس کمپنی سے اتنی ہی رقم مل جائے گی، چور کا بھی کوئی نقصان نہیں۔ نہ وہ رقم کا حق دار ہے اور نہ اسے ملے گی لیکن وہ یقیناً اتنی رقم کی حق دار ہے اور اگر اسے مل جائے تو..... اس رقم سے وہ کیا نہیں کر سکتی۔ دنیا دیکھ سکتی ہے، خوب صورت کپڑے خرید سکتی ہے اور گھومنے پھرنے جا سکتی ہے۔

اتوار کی شب وہ بڑے غور و خوض کے بعد اپنا منصوبہ ترتیب دے چکی تھی۔ جو اس آئرلینڈ..... وہ رقم حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

☆☆☆

وہ شخص پیر اور نکل کو اسے نظر نہیں آیا اور وہ سوچنے لگی کہ شاید یہ اس کا وہم تھا اور اس شخص نے اسے لوٹنے کا کوئی ارادہ نہیں کیا تھا۔ بدھ کو بھی وہ اسے نظر نہیں آیا حالانکہ اس نے کھانے کے وقت میں اسے ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش بھی کی کہ اگر وہ اسی بلڈنگ میں ہو تو نظر آ جائے۔ آہستہ آہستہ وہ سوچنے لگی تھی کہ یہ اس کا وہم تھا اور چھوٹی سی تیاری جو اس نے کی تھی، وہ اسے ختم کرنے کے متعلق سوچ رہی تھی۔

جمعرات کو پندرہ تاریخ تھی اور اسے معلوم تھا کہ پہلی اور پندرہ تاریخ کو اقساط کی رقم بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ڈھائی بجے کے قریب مسٹر میلرز اپنے کمرے سے باہر نکل آئے اور کیشیر سے پوچھا۔

”اس وقت تک کتنی رقم جمع ہو چکی ہے سو؟“

سو، کم عمر خوب صورت سی لڑکی تھی۔ جلدی جلدی اس

کسی بھیڑیے کا خیال آ جاتا تھا۔ دو روز بعد وہ دوبارہ اسے لفت میں ملا۔ اس کی عمر 35 سال سے زیادہ نظر نہیں آتی تھی اور اس نے شادی کی انگلی بھی نہیں پہن رہی تھی۔ 28 سال کی عمر میں جو اس ان چیزوں کا بغور جائزہ لے لیتی تھی۔

پچھلے سال اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ تنہا ایک چھوٹے سے بوسیدہ فلیٹ میں رہتی تھی۔ اس کی معمولی تنخواہ کسی اچھی جگہ کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ خود معمولی لڑکی تھی اور ابھی تک کسی مرد نے اس سے اپنی چاہت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جب تک اس کی ماں تھی وہ اس کی ذات میں گم تھی۔ اب اسے شدت سے تنہائی کا احساس ہو رہا تھا۔

جب تیسری مرتبہ اس شخص سے اس کی ملاقات ہوئی تو یہ خیال اس کے دماغ میں ضرور آیا کہ شاید وہ اسے چاہنے لگا ہے۔ شرمیلا محبوب جو ابھی تک اس سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا اور دفتر تک اس کا تعاقب کرتا تھا۔ وہ بہت جلد حسین خوابوں میں گم ہو گئی۔ یہ اس کا پہلا خیال تھا مگر فوراً ہی وہ کچھ اور بھی سوچنے لگی..... ممکن ہے وہ شخص اسے لوٹنے کے چکر میں ہو۔

جو اس ہر روز تین بجتے سے چند منٹ قبل ہی پہلی منزل پر واقع بینک جایا کرتی تھی۔ ہر روز اس کے ہاتھ میں ایک بڑا لفافہ ہوتا تھا جس میں سچ سے جمع کیے ہوئے چیک اور نقد رقم ہوتی تھی جسے وہ بینک میں جمع کروانے لے جاتی تھی۔ ورلڈ وائلڈ فنائس میں زیادہ تر نوگ اپنی اقساط کی ادائیگی نقد رقم میں کرتے تھے اور جو اس جمع کروانے کے لیے زیادہ تر نقد رقم لے جاتی تھی۔ یہ معمول ایک عرصے سے جاری تھا۔ جب اس نے کام شروع کیا تھا تو روزانہ جمع کروانے کے لیے چند سو ڈالرز سے زیادہ نہیں ہوتے تھے لیکن اب یہ رقم اکثر اوقات دس ہزار ڈالرز تک پہنچ جاتی تھی۔

آج جیسے کہ جب اس نے رقم جمع کر دئی تو وہ نو ہزار تین سو پچھن ڈالرز تھی۔ اس نے لفافے کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ رکھا تھا لیکن وہ شخص اگرچہ آج بھی اس کے ساتھ تھا لیکن اس نے کچھ نہیں کیا۔ شاید اس لیے بھی نہیں کہ لفت میں اس وقت ان دونوں کے علاوہ تین اشخاص اور موجود تھے۔ شاید وہ اس دن کا انتظار کر رہا تھا جب تنہا اس کے ساتھ ہوتا کہ لفافہ چھین کر بھاگ سکے۔

اگرچہ جیسے کہ کچھ بھی نہیں ہوا تھا لیکن وہ چھٹی کے دونوں دن اس شخص کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے اس بات کا تو پورا یقین ہو چلا تھا کہ وہ شخص چور تھا اور موقع کا



پرس اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے مضبوطی سے اسے پکڑ لیا۔

پھر جیسے ہی لوگوں نے اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے میں مدد کی وہ کہنے لگی۔ "وہ میری ساری لم لے گیا ہے۔" اس دوران کسی نے قریب ہی سے پولیس والے کو بلا لیا تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں، کوئی چوٹ تو نہیں لگی؟" اس نے پوچھا۔  
 "اس نے میرے منہ پر گھونسا مارا تھا لیکن میرے خیال میں حڑاٹو نا نہیں ہے۔"  
 "وہ شخص بھاگ گیا ہے لیکن ہم اسے گرفتار کر لیں گے۔ اس کی شکل کیسی تھی؟"

"قد آدھ، سیاہ مٹی جھوٹا، سیاہ بال، عمر تقریباً 35 سال۔"  
 "اسے پہلے بھی دیکھا ہے؟"  
 "نہیں۔" اس نے فوراً ہی جواب دیا۔ وہ یہ سب کچھ اپنی نوٹ بک میں لکھ رہا تھا۔  
 "کتنی رقم تھی؟"

"دس ہزار سے کچھ زیادہ..... مجھے صحیح رقم یاد نہیں رہی۔"  
 "میرے خیال میں ہم تمہارے آفس چلتے ہیں۔"  
 ☆☆☆

چوری کا سنتے ہی مسز میلو روز کی بری حالت ہو گئی تھی۔ انہوں نے یہ بھی پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ جو اس کی کسی تھی۔ وہ تو اسوں کو گراہے تھے کہ ان سے یہ کیسی غلطی ہوئی۔  
 "ہیڈ آفس میں وہ لوگ کیا کہیں گے، یہاں معاملات سنبھالنے کے قابل نہیں ہوں۔ وہ مجھ سے یہ پوچھیں گے کہ اتنی بڑی رقم میں نے اکیلی لڑکی کو جمع کرنے کے لیے کیوں دی۔ اب بتاؤ میں کیا کروں؟" وہ بے چینی سے ہاتھ مسل رہا تھا۔

"لیکن اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔ اس نے بڑی تیزی سے حمزہ کیا تھا۔" جو اس بڑ بڑائی۔ اس کا جیڑا سو جتے لگا تھا اور میلو روز کا رویہ دیکھ کر اس کے دل میں ذرا بھی رحم نہیں آ رہا تھا۔

پولیس کا آدمی نقصان کی صحیح رقم کے اعداد و شمار لے گیا تھا۔ اس کی سامھی سو، اسے دوسرے کمرے میں لے گئی اور اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب یہ سارا معاملہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا تو جو اس نے اپنا بڑا پرس کھول کر دیکھا اور اس میں دس ہزار دو سو پچھتر ڈالرز دیکھ کر اس کا دل کھل اٹھا۔ اصل بھورا لٹافہ جس میں رقم تھی اس کے پر کر میں حفاظت سے رکھا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی جس وقت چور کو پکڑ لیا گیا تھا اس نے جیڑے پر ہاتھ رکھا۔ سخت درد ہو رہا تھا۔

نے اپنا حساب لگایا اور جواب دیا۔ "تقریباً دس ہزار دو سو پچھتر ڈالرز، مسز میلو روز۔"

"جو اس! میرا خیال ہے تم فوراً ہی یہ ساری رقم چیک میں جمع کروادو۔ وقت تم ہونے والا ہے۔" مسز میلو روز نے جو اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

جو اس نے سر کے اشارے سے اثبات میں جواب دیا اور اپنا بڑا سا پرس اٹھالیا جو اس نے چند روز قبل ہی خریدا تھا۔ لڑکی نے جلدی جلدی چیک اور نقد رقم گن کر بھورے لٹافے میں رکھ دی اور جو اس کو لٹافہ چیک میں جمع کروانے سے لیے دے دیا۔

جو اس اپنا پرس اور لٹافہ لے کر آفس سے نکل کھڑی ہوئی۔ بڑے ہال میں سے گزرتے ہوئے وہ لفٹ تک آگئی۔ وہ اپنے معمولات میں اس شخص کو قطعاً بھول چکی تھی لیکن جیسے ہی وہ لفٹ میں قدم رکھ رہی تھی، نہ جانے کہاں سے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آیا اور اس کے ساتھ ہی سوار ہو گیا۔ جو اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ لفٹ میں اس کے علاوہ صرف ایک بوڑھی عورت اور وہی جو ظاہر ہے اس کی عزت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے لٹافے کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنے سینے کے قریب کر لیا۔

لفٹ تیزی سے نیچے اتر رہی تھی اور کسی جگہ بھی نہیں رکی۔ پہلی منزل پر لفٹ کے دروازے کھل گئے۔ باہر گیلری میں خاصی گہما گہما تھی۔ اس شخص نے مسکرا کر پہلے بوڑھی عورت کو جانے کا راستہ دے دیا۔ اس کے بعد جیسے ہی جو اس باہر نکلے لگی، اس نے تیزی سے بڑھ کر اس کے منہ پر گھونسا مارا۔

یہ واقعہ اتنی تیزی سے پیش آیا کہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ وہ چاروں شانے چت زمین پر پڑی ہوئی تھی اور اجنبی شخص وہ بھورا لٹافہ اس کے ہاتھوں سے برقی رفتار سے کھینچ کر دوڑ چکا تھا۔ بوڑھی عورت نے چیخا شروع کر دیا تھا اور کچھ ہاتھ اسے سہارا دے رہے تھے۔  
 "آپ کیسی ہیں؟" اسے لوگوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اس نے بونے کی کوشش کی لیکن اندھیرا اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شاید اس کا جیڑا نوٹ چکا ہے لیکن چند لمحوں بعد وہ بونے کے قابل ہو گئی۔

"میرا پیسا..... وہ میرا پیسا لے گیا ہے۔"  
 "آپ فکر نہ کریں، لوگ اسے پکڑیں گے۔"  
 اس نے جیڑے پر ہاتھ رکھا۔ سخت درد ہو رہا تھا۔



کے کوزے میں گے تو اس کی شکل دیکھنے کے قابل ہوگی۔

☆☆☆

جو اس نے وہ شام اپنے گھر پر ہی گزاری۔ اس کا جڑا دکھ ہاتھ گھر بیچتے ہی اس نے رقم کو گنا اور پھر پلاسٹک میں لپیٹ کر نوائلٹ ٹینک میں بڑی حفاظت سے چھپا دیا۔ یہ جگہ اسے سب سے زیادہ محفوظ نظر آئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جتنے زیادہ عرصے تک وہ رقم خرچ نہیں کرے گی، اتنا ہی بہتر ہے۔ یہ بات ضرور تھی کہ ممکن ہے چور پولیس کے ہتھے چڑھ جائے اور لفافے میں کاغذ کے ٹکڑوں کے بارے میں بتا دے لیکن اس کی بات پر کون یقین کرے گا۔ اسے پورا یقین تھا کہ کسی نے اسے ہال میں لفافہ تبدیل کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ روزانہ کوشش کرتے ہوئے اسے کافی مہارت ہو گئی تھی۔

پھر کو اس نے آفس نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ مسٹر میلرز کو اس نے ٹیلی فون کر دیا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے مگر اس کی طبیعت سنبھلنے سے بہتر تھی۔ جزیے کی سوجن کافی حد تک ختم ہو چکی تھی اور ابھی وہ باہر جانے کے متعلق سوچ ہی رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔

”کون؟“ اس نے اثر کام پر پوچھا۔

”پولیس، مس آئر لینڈ! ہمیں چند مزید سوالات پوچھنے تھے۔“

اس نے بزدل بنا کر صدر دروازے کا تالا کھول دیا۔ چند لمبے بعد اس کے دروازے پر دستک ہو رہی تھی، بغیر کسی پس و پیش کے اس نے دروازہ کھول دیا۔

اس نے تیزی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی لیکن گھنٹی بھوں والا شخص بہت ہوشیار تھا۔ اس نے اپنا ہاؤس دروازے میں پھنسا دیا۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی مین ایک ہاتھ نے بڑی سختی سے اس کا منہ بند کر دیا۔

”خاموش! ورنہ اس مرتبہ میں تمہارا جیڑا بالکل ہی توڑ دوں گا۔“ اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

اس نے خود کو چھڑانے کی بڑی جدوجہد کی۔ کئی جگہ اس کے ہاتھوں پر کات کھایا لیکن وہ تندرست و توانا تھا اس لیے کامیاب نہ ہو سکی۔

”مجھے وہ رقم چاہیے۔ میں وہ رقم حاصل کرنے آیا ہوں اور ہر قیمت پر حاصل کر کے جاؤں گا۔“ اس نے بڑی سختی سے جو اس کا ہاتھ مروڑ رکھا تھا۔ شدید تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

اس نے جو اس کو تیزی سے دھکا دیا اور وہ سیدھی

صوفے پر جا پڑی۔ اس سے ہاتھ میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ اجنبی کے ہاتھ میں اسے چاقو نظر آیا۔ جو اس کی چیخ اس کے حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

”میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا لیکن اگر تم اسی طرح ضد کرتی رہیں تو میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ کچھ حاصل کیے بغیر پولیس سے بھاگتا پھروں۔ تمہیں معلوم ہے کہ انا نے میں کوئی رقم نہیں تھی۔“

”حیرت ہے، لفافے میں رقم نہیں تھی لیکن لفافے میں رقم میں نہیں رکھتی۔ میرے ساتھ کام کرنے والی دوسری لڑکی رکھتی ہے۔“

”بے کار باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ وہ رقم تم نے کہاں چھپائی ہے؟“ چاقو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا لیکن لہجے میں عوزی نرمی پیدا ہو گئی تھی۔

”میں نے جھپٹے ہفتے بھی تمہیں لفٹ میں دیکھا تھا لیکن میں نے۔ بات پولیس کو نہیں بتائی۔“ جو اس نے کہا۔

”کیوں نہیں بتائی؟“

”پتا نہیں کیوں۔“

”اس لیے کہ تم ضرور تم جہانا چاہتی تھیں۔“

جو اس نے کہا۔ ”تم نے آخر مجھے ہی کیوں چنا؟“

”میں نے تمہیں ایک روز لفٹ میں دیکھا تھا لیکن اب یہ سب ختم کر دو اور یہ بتاؤ کہ رقم کہاں ہے؟“ اس نے ذرا سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے معلوم نہیں، ہو سکتا ہے دوسری لڑکی نے لفافہ بدل دیا ہو۔“

”کس لیے؟ کیا اس لیے کہ بینک میں کاغذ کے ٹکڑے جمع کروائے جائیں۔ فضول وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، جلد ہی بتاؤ کہ رقم کہاں ہے؟“

جو اس کو معلوم تھا کہ اس کے سامنے دھڑکتے ہیں۔ یا تو وہ رقم اسے دے کر اپنے خواہوں کو چھنا چور ہو جانے دے یا پھر قتل ہونے کا خطرہ مول لے کیونکہ وہ اسے اس طرح تو چھوڑ نہیں سکتا تھا اور اگر ایک مرتبہ اس نے رقم دے دی تو پھر وہ پولیس کو بھی کچھ بتانے کے قابل نہ رہ سکے گی

لیکن اچانک اس کے ذہن میں ایک تیسرا خیال بھی آیا۔

”اگر میں تمہیں اس رقم سے بھی زیادہ رقم فراہم کر دوں تو کیا تم مجھے یہ رقم رکھنے دو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”زیادہ... کیا مطلب؟“

”اگر میں زیادہ رقم بینک میں جمع کروانے کے لیے



”کوئی فکر نہیں، تم کہہ سکتی ہو کہ تم بیمار ہو یا کوئی اور  
بہانہ کر سکتی ہو۔“

جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ ٹھہرنا چاہتا ہے تو اس کی  
گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ نہ جانے وہ اس کے ساتھ کیا  
سلوک کرے یا اسے مار کر بھاگ جائے لیکن آہستہ آہستہ وہ  
اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے  
لیے شراب کا گلاس لے آئی اور پھر کمانے کے وقت دونوں  
نے مل کر کھانا کھایا۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنی کہانی  
سناتے رہے۔ اس کا نام ڈیوڈ تھا۔ کافی عرصہ فوج میں رہا تھا  
اور اب بہت دنوں سے اسی قسم کی چھوٹی موٹی چوریوں سے  
اپنا کام چلا رہا تھا۔ کئی مرتبہ جیل بھی جا چکا تھا۔ وہ اس سے  
اپنے متعلق بات کرتی رہی۔ اپنی اس کے متعلق اور اپنی  
تعمیراتی کے متعلق۔ اور یہ کہ اسے رقم کی ضرورت تھی اور وہ کیا  
کیا کرنا چاہتی تھی۔ رات زیادہ ہوئی تو وہ سونے کے لیے  
لیٹ گئے۔ جو اس کا خیال تھا کہ شاید وہ اس کے بستر پر  
سوئے گا لیکن وہ صوفے پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی  
نیند کی آغوش میں پہنچ چکی تھی۔

دوسری صبح وہ دونوں ایک دوسرے سے کافی حد تک  
مانوس ہو چکے تھے اور ہنسی مذاق اور چیمپڑ چھاڑ بھی شروع  
ہو چکی تھی۔ ”وہ شخص کو پسند کرنے لگی تھی۔“  
”جیہ کہ تمہیں رقم حاصل ہو جائے گی؟“ اس نے پوچھا۔  
”میرے خیال میں دس ہزار ڈالرز سے زیادہ ہی رقم  
ہوگی۔“

”میلرز کو کب پتا چلے گا کہ تم رقم لے کر جا چکی ہو؟“  
”میرے خیال میں سنگل کی بیج کو جیب میں کام پر  
نہیں جاؤں گی۔ پیر کو جب میں بینک میں رقم جمع کروانے  
جاؤں گی تو بجائے بینک جانے کے میں سیدھی یہاں  
آ جاؤں گی اور پھر پہلے کی رقم ملا کر ہم لوگوں کے پاس میں  
ہزار ڈالرز سے زیادہ ہو جائیں گے۔“  
”ہمارے پاس کیا مطلب؟ لیکن تم میرے ساتھ تو  
نہیں جا سکتیں۔“

”کیوں؟“  
”میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔“  
”میرے خیال میں پچھلے دنوں سے میں بھی کچھ اچھی  
نہیں رہی۔“ رات کو انہوں نے سارا پروگرام ترتیب دے لیا۔  
☆☆☆  
مسٹر میلرز نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ درادیر  
بعد ہی دفتر کی مصروفیات شروع ہو چکی تھیں۔

مارچ 2015ء

جاؤں اور پھر بھاگ کھڑی ہوں۔“  
”اور پولیس کو اپنے پیچھے لگا لوں۔“ اس نے طنزیہ  
لہجے میں کہا۔

”میرے پاس اس کے علاوہ چارہ کیا ہے؟ اگر میں  
تمہیں یہ رقم دے دوں تو میرے پاس کیا رہے گا؟“  
”تم بہت بے وقوف ہو، پولیس ذرا سی دیر میں تمہیں  
پکڑ لے گی۔“  
”میں تمہیں ایک پیشکش کر رہی ہوں، تم چاہو تو اسے  
قبول کر لو۔“

”بولو۔“  
”میں تمہیں اس سے بھی زیادہ رقم لا دوں گی مگر تم  
مجھے یہ رقم رکھنے دو گے۔“  
”کب؟“  
”اگلی صبح کو۔“

اس کی ہچکچاہٹ سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کچھ  
سوچ رہا ہے۔ ”نیند میں تم پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔“  
”میں کر سکتی ہوں، اگر میں پولیس کو کچھ بتاتی ہوں تو  
پیر اس میں شامل ہونا ضروری ہے اور رقم میرے پاس سے  
ہٹائی ہی جائے گی۔ وہ چاہے میں تمہیں دوں یا انہیں دوں،  
ایک ہی بات ہے۔“

”تم مجھے رقم دکھاؤ۔“ اس نے کہا۔  
”تم اسے لے لو گے۔“ اس نے کہا۔  
”اگر میں تم پر بھروسہ کر رہا ہوں تو تمہیں بھی مجھ پر  
بھروسہ کرنا چاہیے۔“ جو اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔  
اسے اس شخص پر بھروسہ کرنا ہی پڑے گا۔ اس نے سوچا۔  
”یاد رکھنا، میں اور بڑی رقم بھی حاصل کر سکتی  
ہوں۔ اگر تم مجھے دھوکا دے کر یہ رقم لے گئے تو بڑی رقم  
سے ہاتھ دھولو گے۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ جو اس نے اسے ٹیک میں  
چھپائی ہوئی رقم دکھا دی۔ وہ حیران رہ گیا۔ یہ جگہ اس کے  
وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

”میرا خیال ہے کہ میں اس رقم کی حفاظت کے لیے  
تمہارے ساتھ ہی ٹھہر جاتا ہوں۔“  
”نہیں، نہیں..... تم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔“

”کیوں نہیں ٹھہر سکتا؟ یہ سب سے محفوظ جگہ ہے۔“  
”کم پولیس والے مجھے دیکھنے یہاں ہرگز نہیں آئیں  
گے۔“ اس کی یہ بات تو بالکل ٹھیک تھی۔  
”لیکن اگر میرا کوئی ملنے والا آ گیا تو؟“

سپنس ڈائجسٹ

COPIED FROM WEB

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY



”اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ جو اس نے پوچھا۔  
”مجھے یہاں سے کافی دور ایک چھوٹے سے ہوٹل کا  
پتہ ہے جہاں ہم رات گزاریں گے۔“

”لیکن پولیس مجھے تلاش کر رہی ہوگی۔“  
”یقیناً۔“

”لیکن میں تمہارے ساتھ ہوں تو مجھے کسی چیز کی کوئی  
فکر نہیں۔“

وہ دونوں پانچ بجے ہوئے پہنچ گئے۔ ڈیوڈ نے رات  
تزارینے کے لیے ایک کمرہ ایک کمر لیا تھا۔ جو اس ہوا میں  
ازری تھی۔ یہ خوشی اسے پہلی مرتبہ ملی تھی۔ وہ ہوٹل میں  
چاروں طرف گھومتی پھری۔ کچھ دیر سوئٹنگ پول پر نگارہ  
رہتی رہی۔ وہ اس آئی تو ڈیوڈ ٹیلی فون رکھ رہا تھا۔

”تم اس سے بات کر رہے تھے؟“

”اسی سے نہیں، میں نے کچھ کھانے کے لیے  
منگوا یا ہے۔“

”اوہ۔“

آدھ گھنٹا بعد بھی جب کوئی کچھ نہیں لایا تو وہ دوبارہ  
فون کرنے کے لیے سوچنے لگی۔ بستر پر کھڑے لے کر وہ  
ڈیوڈ کے قریب ہو گئی۔

”ڈیوڈ!“

”ہوں.....؟“

”کوئی ابھی تک کچھ لے کر نہیں آیا۔ تم نے کتنی دیر  
پہلے ٹیلی فون کیا تھا؟“

”ہو سکتا ہے میرا بھول گیا ہو۔“

دروازے پر گھنٹی بجی۔ جو اس نے اٹھ کر دروازہ  
کھول دیا اور اچانک چیخے اس پر بجلی گر پڑی۔ سو سکر رہی  
تھی اور اس کے سامنے کھڑی تھی۔

شاید اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی یا پتا نہیں لیکن ڈیوڈ کا  
زبردست ٹھونسا اس کے منہ پر پڑا۔ وہ شاید پوری طرح  
ہوش نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس نے فوراً ان دونوں کو ایک  
دوسرے کی آغوش میں دیکھا تھا اور پھر ڈیوڈ اسے دو پیسٹ  
بھی دے رہا تھا۔ اس کے پوری طرح بے ہوش ہونے سے  
پہلے وہ جا چکے تھے۔

وہ جب ہوش میں آئی تو اس کا جہز پہلے سے بھی زیادہ  
بری طرح دکھ رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ پڑی رہی اور سوچنے  
کی کوشش کرتی رہی۔ بالآخر وہ اٹھی اور ٹیلی فون پر پولیس  
کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔



ڈھائی بجے کے قریب سو، نے جمع شدہ رقم کا حساب  
لگایا اور کہا۔ ”مسٹر میلوڈ! اس ہزار نو سو ترانوے ڈالر جمع  
ہو چکے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”جو اس! میں نے  
سوچا ہے کہ کم از کم چند روز تک میں تمہارے ساتھ بینک میں  
رقم جمع کروانے جایا کروں گا۔ تھوڑی بہت حفاظت بہت  
ضروری ہے۔“

”لیکن میرے خیال میں یہ ضروری نہیں۔“ اس نے بڑی  
مشکل سے کہا۔ ”آئی جلدی جو کا دوبارہ حملہ کرنا مشکل ہے۔“  
”ہاں، ٹھیک ہے لیکن کوئی چور موقع کی تلاش میں  
ہو سکتا ہے۔ خطرہ مول لینے سے کوئی فائدہ نہیں، میں  
تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔“

وہ دونوں خاموشی سے لفٹ کا انتظار کرنے لگے۔  
جو اس کا دماغ خیالوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ بڑی تیزی  
سے سوچ رہی تھی۔ ڈیوڈ کا لیے اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔  
جب وہ وقت پر نہیں پہنچے گی تو وہ سوچے گا کہ میں نے اسے  
دھوکا دیا ہے اور نہ مضموم وہ میرا کیا حشر کرے۔ وہ سوچ رہی  
تھی کہ مسٹر میلوڈ سے کسی طرح جان چھڑا کر بھاگنے  
در زندگی میں۔ سہری موقع پھر نہیں آئے گا۔

لفٹ خالی گئی۔ وہ دونوں خاموشی سے پہلی منزل تک  
سفر کرتے رہے۔ پہلی منزل پر لفٹ رگ گئی اور پھر جو اس  
کی نظر ”بی“ پر پڑی عام طور سے بڑی ہڈیوں میں ایک تہ  
خانہ ہوتا ہے جس کے ذریعے ہڈیوں سے باہر جاسکتے تہ۔  
جو اس کے دماغ میں تیزی سے خیال آیا اور جونکی مسٹر  
میلوڈ وقت سے باہر نکلے، جو اس نے ”بی“ ڈیوڈ دیا۔

”جو اس!“ مسٹر میلوڈ چلائے لیکن وہ نشت تیزی  
سے نیچے سفر کرتی چلی گئی۔ جو اس نے نیچے پہنچ کر تیزی سے  
دوڑتی چلی گئی۔ تہ خانہ خالی تھا اور چند لمحوں میں وہ اس جگہ  
پہنچ گئی جہاں ڈیوڈ کا انتظار کر رہا تھا۔

ڈیوڈ نے اس کو آتے ہوئے دیکھ کر کار کا دروازہ کھول دیا۔  
”مسٹر میلوڈ! بینک تک میرے ساتھ ہی آنے  
تھے۔ انہیں بڑی مشکل سے دھوکا دے کر آئی ہوں۔“ اس  
نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”پھر تو وہ عقل مند آدمی ہے۔“

”اب عقل مند ہو گیا ہے۔“

”کتنی رقم ہے؟“ ڈیوڈ نے پوچھا۔

”تقریباً گیارہ ہزار ڈالر۔“ اس نے دوسرا لفٹ  
سیٹ پر رکھے پہلے لفٹانے کے برابر رکھتے ہوئے کہا۔



# خواجہ باقی باللہؒ خیا تسنیم بگراہی

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا محض تاریکی اور تضادات کا مجموعہ ہے اور یہ چاند، سورج محض روشنی کے وہ استعارے ہیں جو انسان کو اپنے اندر کے اندھیرے دور کرنے پر اکساتے ہیں۔ آپ کا تعلق بھی ایسے ہی انسانوں سے تھا۔ جن کا پیغام اور تعلیمات کے اثرات ایسی ہی تاریکی دور کرنے پر متوجہ کرتے رہے۔ مخلوق خدا کو آپ سے فیض حاصل ہوتا رہا کہ یہی باری تعالیٰ کی منشا تھی۔

اللہ کے پیغام کے امین، روشنی کے مینار ایک

ولی کی روواد



سمرقند کے قاضی عبدالسلام خلی اپنے زمانے کے عالم باعمل اہل فضل و عطا اور صاحب وجد و وحی بزرگ تھے۔ یہ تلاش معاش میں اپنا وطن چھوڑ کر کابل پہنچے اور وہیں شادی کر لی۔ لیکن ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ قاضی عبدالسلام نے اپنے بیٹے کا نام سید رضی الدین محمد باقی رکھ دیا۔ یہ صحیح نسب حسینی سادات کا خاندان تھا۔ بیٹے کی پیدائش 971 برطانیہ 1563ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ سن ہجری کا یہ سال تاریخ میں یادگار ثابت ہوگا اور پیدا ہونے والا بچہ خواجہ باقی باللہ کے نام سے شہرت اور حضرت خواجہ مجدد الف ثانی کے پیر و مرشد ہونے کا شرف حاصل کرے گا۔

قاضی عبدالسلام اپنے بیٹے کی پیشانی پر بت غیب سے لکھتے تھے، انیسویں صدی میں یہاں نور دکھائی دیتا جس کی شعاعیں مشرق



جہت پر محیط تھیں اور جس کی زد میں امیر و فریب، عوام و خواص، راعی و رعایا، حاکم و محکوم اور خورد و کماں تھے۔ وہ اپنی بیوی سے کہتے رہتے۔ ”بیوی! معلوم نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے گویا میرے گھر میں ایک آفتاب اتر آیا ہے اور ”نکدہ اس کی توانائی اور روشنی سے ایک زمانہ مستفیض ہوگا۔“ بیوی اپنے شوہر کی ہاں میں ہاں ملاتی اور دل سے یہی دعا مانگتی کہ خدا شوہر کی زبان مبارک کرے۔ جب خواجہ محمد باقی پانچ سال کے ہو گئے تو باپ نے کابل کی مشہور درس گاہ خواجہ سعد کے کتب میں داخل کر دیا۔ یہاں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی ضروری مسائل بھی حفظ کرتے رہے۔ دس سال کی عمر میں عربی کی تعلیم شروع کی اور کتب سے فارغ ہو کر اپنے عہد کے مشہور عالم مولانا صادق حلوانی کی شاگردی اختیار کی۔ مولانا کی صحبت میں خواجہ محمد باقی کی صلاحیتیں اجاگر ہونے لگیں۔ استاد کو اپنے ہونہار اور غیر معمولی شاگرد میں معلوم نہیں کیا نظر آیا کہ وہ اس کو اپنے ساتھ لے کر ماوراء النہر چلے گئے وہاں بھی تحصیل علم کا عمل جاری رہا اور تیس سال کی عمر میں خواجہ محمد باقی کا شمار جید علماء میں ہونے لگا۔

اب خواجہ محمد باقی کا کسی ایک جگہ دل نہیں لگتا تھا۔ طبیعت تصوف و سلوک کی طرف مائل رہنے لگی اور اس عہد کے نامی گرامی اولیاء کی صحبتوں میں حاضر کیا دینے لگے۔ علم تو حاصل کیا ہی تھا اب کمالات باطنی کا آکساب بھی شروع ہو گیا۔ اس جہد و سعی میں انہوں نے شیخ، بدخششاں، ماوراء النہر کے دوسرے شہروں اور ہندوستان کے اکثر مقامات کا سفر کیا۔ خواجہ محمد باقی مراقبے میں چلے جاتے اور اللہ کی یاد میں دنیا و مافیہا کو بالکل بھلا دیتے۔

دوران سفر آپ لانا اور پہنچ گئے۔ بھائی کی تلاش میں یہ معلوم نہیں کیاں کہاں پہنچ جاتے۔ میدان، کوہستان، ویرانہ، قلعہ ستان کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں خواجہ باقی نہ جاتے ہوں۔ آپ کی ماں کابل میں تھیں اور بیٹے کی جدائی کے غم میں آنسو بہاتی رہتی تھیں۔ کسی نے انہیں اطلاع دی کہ ماں میں نے آپ کے بیٹے کو وہلی میں دیکھا تھا۔ کھویا کھویا کسی شے کی تلاش میں کم ادھر ادھر پھر رہا تھا۔ ماں کے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھ جاتے۔ ”اے اللہ العالین! میرے بیٹے پر رحم فرما اور جس شے کی تلاش میں وہ سرگرداں ہے اس کو نوازدے۔“

دوسری طرف لوگ خواجہ سے کہتے۔ ”جناب، آپ کی ماں آپ کے لیے بہت بے قرار رہتی ہے۔ آپ جلد از جلد اس سے باہر پہنچنے کی کوشش کیجیے۔“

خواجہ باقی جواب دیتے۔ ”ہاں جب میں اس کو پا جاؤں گا تو ضرور اپنے گھر جاؤں گا۔ ابھی تو اس کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔“ لوگ ان پر ہنسنے لگتے۔ جنہیں خواجہ باقی سے دلچسپی ہوئی تھی وہ ان کا ہنسا کرتے اور یہ دیکھ کر حیران اور پریشان ہو جاتے کہ ابھی تو خواجہ باقی آبادی میں ہیں اور کچھ دیر بعد ویرانے میں پہنچ گئے۔ ابھی تو انہیں جنگل میں دیکھا گیا تھا مگر کچھ ہی دیر بعد وہ قبرستان میں نظر آتے پھر دیکھنے میں آتا کہ کوئی شخص کوہستانی سلسلوں میں جو سفر ہے۔ جب پاس جا کر پہچاننے کی کوشش کی جاتی تو یہ خواجہ باقی نکلتے۔

کسی شخص نے ان کا راستہ روک لیا اور پوچھا۔ ”جناب! یہ چکر کیا ہے؟ کیا آپ کے پاؤں میں آبلے نہیں پڑ جاتے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”آبلے پڑ کیوں نہیں جاتے!“

اس شخص نے کہا۔ ”اگر آبلے پڑ جاتے ہیں تو آپ یہ صحرا انوروی ترک کیوں نہیں فرماتے؟“

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ ”جس کو تم صحرا انوروی کہتے ہو وہ کسی شے کی تلاش کا با مقصد سفر ہے اور اس تلاش میں چونکہ شوق کی آگ مشتعل ہے اس لیے تکلیفوں اور آزاروں کا خیال یا احساس تک نہیں ہوتا۔“

اس شخص نے پوچھا۔ ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کس چیز کی تلاش میں سرگرداں ہیں؟“

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ ”بالکل پوچھ سکتے ہو۔ میں اس کا جواب دوں گا۔“

اس شخص نے کہا۔ ”تو آپ سمجھ نہیں کہ میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ یہ کس شے کی طلب آپ کو آوارہ و سرگرداں کیے ہوئے ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”کسی ولی کمال کی تلاش۔ کسی مرد کمال کی جستجو۔ لیکن یہ کمال ہی نہیں رہا۔“

اس شخص نے کہا۔ ”جب وہ ابھی تک نہیں ملا تو آگے کیا امید کر وہل ہی جائے گا۔“

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ ”تو اس شوق کو کیا جانے۔ کوشش اور تلاش میرا فرض ہے اب وہ ملے یا نہ ملے یہ میری قسمت۔ اگر میری طلب صادق ہے تو میں اس کو پا کر رہوں گا۔“

اس شخص نے کہا۔ ”ایک بات میری بھی مانے۔ آپ اپنے گھر واپس جائیں جہاں آپ کی ماں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ جس



مرد کال کی آپ کو تلاش ہے وہ اگر مل بھی گیا تو اس سے آپ کو حاصل کیا ہوگا؟“  
آپ نے جواب دیا۔ ”ناسخ تو بہت مل جاتے ہیں لیکن تمت افزائی کرنے والا ایک بھی نہیں ملتا۔ تیری نصیحتوں کا شکر یہ میں تلاش اور جستجو جاری رکھوں گا۔“

اس شخص نے برا سامنہ بنایا اور ہنستا ہوا چلا گیا۔ ”غریب اس کی تلاش میں ہے جس کا وجود ہی نہیں۔ مرد کال، اس دنیا میں ایک چیز بھی کال نہیں پھر یہ مرد کال کہاں ملے گا۔ آپ پر اللہ اپنا رحم کرے۔“ خواجہ باقی کو اس شخص کے سوال جواب سے بڑی اذیت پہنچی مگر صبر سے کام لیا۔

اس طلب اور جستجو میں آپ کو کچھ دنوں اور دلدلوں سے بھی گزرنا پڑا مگر آپ باز نہ آئے۔  
ایک دن اسی صبح انوروی میں انہوں نے ایک تنگ دھڑنگ شخص کو برقانی علاقے میں سفر کرتے دیکھا، اس پر موسم کا کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ خواجہ باقی اس حیرت انگیز مشاہدے سے متاثر ہو کر اس فقیر کے پاس پہنچے اور عرض کیا۔ ”اے اللہ کے والی! میں کچھ مرے آپ کی محبت میں رہنا چاہتا ہوں۔“

درویش نے چونک کر خواجہ باقی کی طرف دیکھا اور کوئی جواب دے کر بغیر اپنی راہ لی۔ خواجہ باقی اس کے پیچھے چل پڑے۔  
درویش نے پلٹ کر خواجہ باقی کو دیکھا اور دوڑنا بھانگنا شروع کر دیا۔ گویا وہ ان سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں تھا۔ آپ نے اس کا پیچھا کیا اور خود بھی دوڑنے لگے۔ دونوں بھاگتے بھاگتے پریشان ہو گئے۔ اس کے بعد درویش ایک چنان پر کھڑا ہو گیا اور ایک ہتھرتان کر خواجہ کے پاس آنے کا اہتمام کرنے لگا۔

خواجہ باقی کو ڈر لگا کہ کہیں یہ تنگ دھڑنگ شخص انہیں زخمی نہ کر دے۔ انہوں نے دور ہی سے کہا۔ ”باا میں نے کیا خطا کی ہے جو ہتھرتان رکھا ہے؟“

درویش نے غصے میں کہا۔ ”تو میرا پیچھا کیوں کرتا ہے؟“  
خواجہ نے جواب دیا۔ ”میں نے آپ کا پیچھا نہیں کیا، میں تو آپ کی محبت میں رہنے کا تمہی ہوں۔“

درویش نے تنگ کر کہا۔ ”لیکن میں تیری محبت میں نہیں رہنا چاہتا۔“  
خواجہ باقی کو بڑا دکھ پہنچا۔ بولے۔ ”بابا! زبردستی کی بات نہیں ہے میں تو عاجزانہ درخواست کر رہا ہوں۔ اگر آپ محبت میں رہنے کی اجازت دیں گے تو آپ کے پاس رہ لوں گا اور نہ مجھ کو ہی ہے۔“

درویش نے کہا۔ ”میں تمہ کو اپنے پاس رہنے کی اجازت نہیں دوں گا۔“  
خواجہ باقی لا جواب ہو کر جہاں کھڑے تھے وہیں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد عرض کیا۔ ”اچھا جناب! میں آپ کے پاس نہیں آؤں گا لیکن دور دور رہ سکتا ہوں۔“

درویش نے پوچھا۔ ”وہ کیوں..... میں تو تیرے سائے تنگ سے نفور ہوں۔“  
خواجہ باقی نے عرض کیا ”میں نے ایک بات آپ کی مان لی ایک بات آپ میری مان لیجیے۔“

درویش نے سکوت اختیار کیا۔ آپ نے اسے درویش کی رضامندی سمجھا اور درویش سے دور دور رہنے لگے۔ اب درویش نے مستحلاً چلنا اختیار کیا۔ کبھی تیز اور کبھی آہستہ آہستہ۔ خواجہ باقی عاجز آگئے لیکن انہوں نے بھی اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو وہ اس درویش کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔

ایک دن درویش نے دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ برف پر ننگے پاؤں بھاگ رہا تھا۔ خواجہ باقی نے بھی اس کی اتباع میں بھاگنا شروع کر دیا لیکن سرد ہوا میں انہیں پریشان کر دی تھی۔ بھاگتے بھاگتے ایک جگہ گر گئے، درویش نے انہیں مڑ کر گرا ہوا جو دیکھا تو زور زور سے ہنسنے لگا اور بولا۔ ”میرا مقابلہ کرے گا۔ بڑا آیا مقابلہ کرنے والا۔ اب میں دیکھوں گا تو میرا کس طرح پیچھا کرتا ہے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں اس راہ میں اپنی جان تو دے سکتا ہوں مگر آپ کی محبت میں رہنا نہیں چھوڑوں گا۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ مجھے آپ کی زیارت کا شرف حاصل ہے۔“

درویش نے ہنس کر کہا۔ ”اٹھ اٹھ، میں آگے جا رہا ہوں۔ میرا پیچھا کر۔ یوں لیٹے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ شاباش جلدی سے کھڑا ہو جا۔“

خواجہ باقی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ درویش نے پھر بھاگنا شروع کر دیا۔ خواجہ باقی بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگے۔ کافی



دیر بعد درویش ایک درخت کے چنے کھڑا ہو گیا۔ وہاں ایک درخت کے سوا جو درخت تھے وہ چھوٹے چھوٹے تھے اور ان کے سائے میں کھڑا نہیں ہوا جاسکتا تھا۔ خواجہ باقی درویش سے کچھ فاصلے پر آسمان تلے کھڑے ہو گئے۔

درویش نے بڑی محبت سے انہیں اپنے پاس بلایا۔ ”وہاں کیوں کھڑے ہوئے میرے پاس درخت کے سائے میں آ جا۔“ خواجہ باقی نے درویش کو سوالیہ اور اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ درویش نے کہا۔ ”میری صورت کینا دیکھتا ہے میں نے کہہ جو دیا کہ میرے پاس آ جا۔“

خواجہ باقی ہمت کر کے درویش کے پاس چلے گئے اور اس کے شانے سے شانہ ملا کر کھڑے ہو گئے۔ درویش نے پہلے تو انہیں مسکرا کر دیکھا۔ اس کے بعد ایک زوردار ہنسر خواجہ باقی کے منہ پر رسید کر دیا۔ خواجہ باقی چکرا کر گر گئے۔ گرتے ہی درویش نے انہیں ٹھوکروں سے مارنا شروع کر دیا۔ خواجہ باقی نے بچنے کی کوشش نہیں کی کہہ۔ ”میں آپ کو پسند کرتا ہوں آپ مجھ کو جان سے مار دیں میں اس کو اپنے حق میں اعزاز سمجھوں گا۔“

درویش نے سر پر ایک ہاتھ اور رسید کر دیا اور کہا۔ ”اگر یہ تیرے حق میں کوئی اعزاز ہے تو میں اس اعزاز سے تجھ کو روزی نواز سکتا ہوں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں آپ کی مار کو بھی اعزاز ہی سمجھ سکتا ہوں۔“

درویش کو ہنسی آئی، کہا۔ ”بھائی تو تو حیرے کا انسان ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں کیا خاک مزے کا انسان ہوں۔“

درویش نے ان کی گلدی پر ایک ہاتھ رسید کر دیا اور پوچھا۔ ”کہو چنانچہ کسی رسی مزہ آیا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں آپ کی برصیبت برداشت کر لوں گا لیکن آپ کی رفاقت نہیں چھوڑوں گا۔“

درویش نے کہا۔ ”تو اپنا وقت برباد کر رہا ہے۔ اب بھی وقت بے جلا جا اور جو کرنا ہے اپنے طور پر کر۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں اپنا وقت اس وقت تک برباد کرتا رہوں گا جب تک آپ اپنا وقت برباد کرتے رہیں گے۔“

درویش نے پوچھا۔ ”اچھا بتا تو چاہتا کیا ہے؟“

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ ”بابا! مجھے درویش کا دل کی تلاش تھی سو وہ آپ کی شکل میں مل گیا۔ اب میں آپ کے ذریعے خدا کو تلاش کروں گا۔“

درویش زور زور سے ہنسنے لگا۔ ”خدا او..... کس خدا او.....؟ یہ کون ہے.....؟ میری تو اس سے ملاقات نہیں ہوئی اور نہ ہی میں اس سے واقف ہوں۔“

خواجہ درویش کی باتیں اچھی نہیں تھیں، بولے۔ ”تجیب ہے کہ آپ خدا کے بارے میں اسکی باتیں کر رہے ہیں۔“ درویش نے کہا۔ ”ہاں میں خدا کے بارے میں اسکی باتیں کر رہا ہوں۔ اگر وہ تمس موجود ہے تو اس سے ملاقات ہونا چاہیے تھی مگر میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا جو یہ کہتا کہ اس نے خدا کو دیکھا یا اس سے ملاقات کی ہے اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ نہیں ہے..... لاا۔۔۔“

خواجہ باقی کے دل پر چوٹ سی گئی کہ جس شخص کے پیچھے انہوں نے اتنا وقت برباد کیا وہ کسی کا فراندہ اور محمد اندہ باتیں کر رہا ہے۔ درویش نے کہا۔ ”اب تو تجھے میری حقیقت معلوم ہوئی۔ میرا اچھا چھوڑ دے۔“

خواجہ باقی نے یوں محسوس کیا گویا اندر سے کوئی انہیں سمجھ رہا ہے۔ خواجہ باقی درویش کی باتوں میں قسطنڈی نہ آتا۔ یہ فرقہ ملائی سے تعلق رکھتا ہے جو اسکی روش اختیار کرتے اور اسکی باتیں کرتے ہیں کہ دنیا ان سے دور دور ہے۔ یہ بھی تجھے بھاگنے کی خاطر اسکی باتیں کر رہا ہے۔ خواجہ باقی نے کہا۔ ”بابا! میں نے ایک بار جب یہ فیصلہ کر لیا کہ آپ کو نہیں چھوڑوں گا تو میری خوش قسمتی یا بد قسمتی کہ مجھے آپ سے کچھ ملتا ہے یا نہیں، میں بہر حال آپ ہی کے ساتھ رہوں گا۔“

درویش آگ بولنا ہو گیا۔ ”اوسگ دنیا، ناچھی انسان! تیری کچھ میں میری باتیں کیوں نہیں آرہی ہیں۔ کیا میں سمجھانے میں ناکام رہا ہوں؟“

آپ نے فرمایا۔ ”میں سب دنیا بھی ہوں اور دنیا بھی انسان بھی مگر میں رہوں گا آپ کے ساتھ ہی۔“

درویش نے چڑ کر کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میرے ساتھ چل، میں بھی تیری ہمت اور حوصلے کا اندازہ لگائے لیتا ہوں۔“



آپ نے فرمایا۔ "بسم اللہ، میں تیار ہوں۔"

درویش پہلے تو تیز تیز قدموں سے چلتا رہا۔ آپ نے بھی اسی کی طرح چن چن شروع کر دیا پھر درویش نے بھانٹنا شروع کر دیا آپ بھی اس کے ساتھ بھانٹنے لگے۔ درویش بھانٹتے بھانٹتے ایک مکان میں گھس گیا۔ خواجہ باقی نے بڑی ہمت کی کہ مکان میں داخل ہو جائیں لیکن ان کی ہمت نہیں بڑی اور دروازے پر بیٹھ کر درویش کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

بڑی دیر ہو گئی مگر درویش باہر نہیں نکلا۔ خواجہ باقی کو شہ گزرا کہ ہمیں یہ مکان درویش کے کسی رشتے دار کا تو نہیں کیونکہ اگر یہ کسی غیر کا گھر ہوتا تو درویش کو دھکے دے کر نکالا جانچا ہوتا۔ خواجہ باقی نے آہستہ آہستہ دروازے پر دستک دی لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ خواجہ باقی نے ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے ایک جوان مشتعل نمودار ہوا اور ٹھیکے۔ کچھ میں پوچھا۔ "کیا بات ہے، تمہیں کس سے مننا ہے؟"

خواجہ باقی نے جواب دیا۔ "تقریباً ایک گھنٹہ پہلے اس مکان میں ایک درویش داخل ہوا تھا۔ میں اس کے انتظار میں باہر کھڑا ہوں۔" جوان نے طنزاً کہا۔ "بھائی یہی کبھی کبھی ہاٹھی کر رہے ہو۔ یہاں تو کوئی درویش نہیں آیا اور پھر یہاں کیا لینے آئے گا۔ کہاں وہ درویش اور کہاں یہ میرا گھر۔ اس کا میرا گھر سے کیا تعلق۔"

خواجہ باقی کو بڑا دکھ ہوا کہ درویش انہیں دھوکا دے کر چلا گیا۔ اب وہ ہا یوس ہو کر وہاں سے چلے گئے۔ ابھی وہ تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ کسی نے پیچھے سے تہقہ لگا دیا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو وہی درویش کھڑا اُس رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "بس دیکھ لیا تیرا عشق، تیری طلب صادق، میں نے تو تیرا ساتھ چھوڑا نہیں اور تو بے کمرے بغیر واپس جا رہا ہے۔"

خواجہ باقی تیزی سے درویش کی طرف مزے اور فوری طور پر ہتھ کچھ میں نہ آیا کہ کیا کریں۔ انہیں دل کے اندر سے ایک آواز سنائی دی۔ "خواجہ باقی اور درویش کو بچانے کی کوشش کر، یہ تجھے آزمائش میں ڈال رہا ہے۔"

یہ درویش کے پاس گئے اور کہا۔ "بابا! مجھے پریشان نہ کیجئے میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔" درویش نے ٹالیا۔ دینا شروع کرویں۔" ہوں..... تو میرا ساتھ کیوں نہیں چھوڑے گا۔ میں ہتھ مار مار کر تیری جان لے لوں گا۔ آخر تو بھگتا کہتا ہے خود تو۔"

خواجہ باقی نے درویش کی ایک نہ سنی اور اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ درویش نے ہتھ مارا کھانا شروع کر دیے۔ خواجہ باقی کا سر اور جسم کے مختلف حصے لہو لہان ہو گئے۔ درویش انہیں زخمی کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ خواجہ باقی اس کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگے۔ درویش بھاگ کر ایک جمو پیزی میں گھس گیا۔ خواجہ باقی بھی اس کے ساتھ ہی اندر چلے گئے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ درویش جمو پیزی چوکی پر بیٹھا کھانا کھاتا۔ اس نے خواجہ باقی کو دیکھتے ہی کہا۔ "خواجہ بھائی آگے آؤ میرے قریب۔"

خواجہ باقی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا لیکن وہ درویش کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ درویش نے چوکی چھوڑ دی اور خواجہ باقی کو گھم دیا۔ "باقی بانند! چوں پر بیٹھ جاؤ۔"

خواجہ باقی نے پوچھا۔ "باقی بانند..... یہ کیا فرمایا آپ نے۔ باقی بانند کون؟" درویش نے جواب دیا۔ "تو ہے باقی بانند۔ میں نے تجھ کو خواجہ باقی بانند کر دیا۔"

خواجہ باقی کو درویش کی کئی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہا۔ "بابا! کہاں تو آپ مجھ سے بیزار تھے اور کہاں یہ عالم ہے کہ مجھے باقی بانند کا لقب مرحمت فرما رہے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟"

درویش نے کہا۔ "خواجہ باقی! جب تو میرے پاس آیا تھا میں نے تجھے پہچان لیا تھا لیکن میں تجھ کو پہنچ کرنا چاہتا تھا۔ تیرے ایمان اور تیرے یقین کو دیکھنا کہ کفرانہ باتوں سے پرہیزا چاہتا تھا۔ تیری طلب صادق کی آزمائش مقصود تھی پھر میں نے تجھے گالیاں دیں اور ہتھروں سے لہو لہان کر دیا اور اس طرح میں تیرے پائے ثبات کی استقامت دیکھ رہا تھا۔ تو سارے ہی امتحانات سے بخیر و خوبی گزر گیا اور اس کا مستحق ٹھہرا کہ میں تجھے باقی بانند کے لقب سے نوازا دوں۔"

خواجہ نے فوجیہ بات میں کہا۔ "میں آپ کا کس زبان سے شکر یہ ادا کروں۔" درویش نے کہا۔ "شکر یہ میرا نہیں اپنے رب کا ادا کر۔"

خواجہ باقی بانند درویش کے اصرار پر چوکی پر بیٹھ گئے۔ درویش نے دونوں ہاتھ دعا یہ انداز میں اٹھا کر خواجہ باقی بانند کو دعا میں دیں اور پھر جمو پیزی کے کسی گوشے سے منھائی لاکر خواجہ باقی کا منہ میٹھا کیا۔ اس کے بعد درویش نے انہیں اپنی صحبت میں



اٹھنے بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ خواجہ باقی کو چند دنوں میں ہی یہ محسوس ہونے لگا کہ درود میں کوئی معمولی شخص نہیں ہے اس نے ریاضت اور مجاہدے کی ایسی تربیت دی کہ خواجہ باقی کا ہاٹن منور ہو گیا۔ ایک دن درود میں نے ان سے کہہ دیا کہ ”باہا باقی باللہ! میری ذات سے تمہیں جو ایضاً حاصل ہو رہا ہے اس میں تمہاری اماں کی دعاؤں کا بڑا ہاتھ ہے۔“

خواجہ باقی نے پوچھا۔ ”میری ماں کی دعاؤں سے آپ کی کیا مراد ہے؟“  
 درود میں نے جواب دیا۔ ”باقی باللہ! تیری ماں تیرا انتظار کر رہی ہے اور دن رات تیرے حق میں یہ دعا کر رہی ہے کہ خدا تمہے کو تیرے مقصد کی حصولیابی میں جلد از جلد کامیاب کرے۔“ خواجہ باقی باللہ کو رونا آ گیا۔ انہیں اپنی ماں کی یاد آگئی تھی۔

☆☆☆

کچھ عرصے بعد درود میں نے آپ کو شہر جانے کی اجازت دے دی۔ آپ لاہور واپس پہنچے اور لوگوں میں کھل مل گئے۔ انہیں اپنی ذات میں نمایاں تغیر محسوس ہونے لگا تھا پھر یہ باتیں دوسرے بھی محسوس کرنے لگے۔

ایک مسجد میں آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے جو شخص نماز تھا اس نے ایسا محسوس کیا جیسے اس پر کسی کی نظریں پڑ رہی ہیں لیکن پھر یہ سوچ کر اس داہے کول سے نکال دیا کہ ان کے سامنے جو شخص بھی ہوگا اس کی پشت سامنے ہوئی لیکن کچھ ہی دیر بعد اس شخص نے پھر یہی کیفیت محسوس کی۔ بے اختیار اس کی نظریں اپنے سامنے کھڑے ہوئے خواجہ باقی باللہ پر پڑیں اور وہ یہ دیکھ کر لرز گیا کہ خواجہ باقی باللہ اس کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا منہ قبلہ رو تھا مگر پشت سے وہ کس طرح دیکھ رہے تھے۔ اس کیفیت کو اس نے دیکھ تو لیا مگر بیان نہیں کر سکتا تھا۔ یہ پکا قائل فہم بات اس کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی۔

نماز پڑھ چکنے کے بعد یہ شخص خواجہ باقی باللہ کے پاس پہنچا اور عرض کیا۔ ”حضرت! میں آپ سے اس حد تک واقف ہوں کہ آپ غیر کلی ہیں۔ کیا ہیں، کون ہیں میں نہیں جانتا مگر کچھ ایسی بات بھی ہے جو میرے لیے سمجھنے اور میں اگر چاہوں بھی تو اس کو پوچھنے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میرا نام خواجہ محمد باقی ہے، سرفرد میرا وطن ہے۔ میں خود کامل میں پیدا ہوا۔ تلاش حق میں سیاحت کر رہا ہوں۔ مرد کامل کی تلاش مجھے ادھر ادھر بھگانے پھر رہی ہے، اس کے علاوہ کیا جاننے کی خواہش ہے بیان کرو تا کہ اس کو بھی بیان کر دیا جائے۔“

اس شخص نے رک رک کر کہا۔ ”خواجہ محترم! جب آپ مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے میں آپ کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ میں نے وہاں جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا کچھ میں نہیں آتا کہ کس طرح پوچھوں، اپنا مفہوم کس طرح واضح کروں؟“  
 آپ نے نظریں نیچی کر لیں اور کہا۔ ”اے شخص! جو کچھ تو نے دیکھا اس کو اپنے منہ سے نکال کر رکھ۔ بڑے چا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے کیا پوچھنے والا ہے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”جب آپ کو یہ معلوم ہے کہ آپ سے میں کیا پوچھنے والا ہوں تو آپ اس کا تسلی بخش جواب دے کر میری پریشانی دور کر دیجیے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اے شخص! ریاضت اور مجاہدے کے بعد اگر خدا کی مہربانی شامل حال ہو جائے تو ایسا وقت آجاتا ہے کہ انسانی سینہ جوش انوار سے اٹھنے لگتا ہے اور یہ نور ہر نکتہ مو سے اٹھنے، چمکنے لگتا ہے جس سے دیکھنے والا بھی محسوس کرتا ہے کہ اس کو دیکھا جا رہا ہے۔“

وہ شخص خاموش ہو گیا۔ تمہر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ آپ نے اس شخص سے کہا۔ ”کیا تو نماز کے لیے مسجد چلے گا؟“  
 اس نے جواب دیا۔ ”ضرور چلوں گا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”پھر آ میرے ساتھ چل۔“ یہ دونوں ایک ساتھ مسجد میں داخل ہوئے۔ وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ آج وہ آپ کے برابر کھڑا ہوا تھا۔ نماز پڑھنے کے دوران اس شخص نے آپ کے سینے سے نکلتی ہوئی ایسی آواز سنی کہ کانپ گیا۔ دل دمل گیا، پہلے نماز ادا کی اور آپ سے پہلے ہی مسجد سے نکل گیا۔

جب آپ نماز پڑھ کر باہر نکلے تو اس شخص کو خنجر پایا۔ آپ نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، کس کا انتظار ہے؟“  
 اس نے جواب دیا۔ ”مجھے آپ ہی کا انتظار تھا۔ آج میں گل سے زیادہ پریشان ہوں۔“  
 آپ نے پوچھا۔ ”وہ کیوں، خیریت تو ہے، وجہ؟“



اس نے جواب دیا۔ ”محترم خواجہ! اکل تو میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ آپ پشت سے مجھے دیکھ رہے ہیں لیکن آج میں نے آپ کے اندر سے کچھ عجیب و غریب آوازیں سنی، ایسی آوازیں کہ میرا دل گھبرا گیا۔ آخر یہ کیا ہے..... آپ کیا ہیں اور یہ سب آپ ہی کے ساتھ کیوں پیش آ رہا ہے؟“

آپ نے سر جھکا لیا۔ کچھ دیر خاموش رہے اس کے بعد فرمایا۔ ”اے شخص، کیا میں نے یہ بات سنی ہی نہیں بتادی تھی کہ میرا سینہ جوش انوار سے ابل رہا ہے۔ یہ بال جو آواز پیدا کر رہا تھا۔ وہی تو نے سن لی اور اس سے بلاوجہ پریشان ہو رہا ہے۔“ وہ شخص آپ کے قدموں میں گر گیا اور رقت زدہ لہجے میں درخواست کی۔ ”محترم خواجہ! آپ مجھے شرفِ بیعت سے سرفراز فرمائیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ میں اس لائق نہیں ہوں۔“ اس شخص نے مزید اصرار کیا مگر آپ انکار ہی کرتے رہے اور بالآخر آپ نے لاہور کو چھوڑ دیا اور ماوراء النہر واپس چلے گئے۔ وہاں ماں بھی کامل سے پہنچ چکی تھیں۔ ماں نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور آپ ماں کے سینے سے لگے خوشی کے آنسو بہاتے رہے۔ آپ کو یہاں پہنچ کر یہ محسوس ہونے لگا کہ کسی بزرگ کے دستِ حق کی ظاہری بیعت بہت ضروری ہے اس کے بغیر منزل پانا مشکل ہے۔ آپ نے اس سلسلے میں بہت سارے بزرگوں کی باہت سوچا لیکن کسی طرف طبیعت نہیں راغب ہوئی۔ آخر اس عہد کے نامور ترین صوفی خواجہ ملکنس پر نظر اٹھایا۔ بڑی اور انہیں شدت سے ایسا لگا کہ خواجہ موصوف انہیں بلا رہے ہیں۔ آپ نے عالم تصور ہی میں جواب دیا۔ ”میرا مرشد! میں آیا۔ آپ میرا انتظار کیجیے۔“

ایک دن آپ علی الصباح اٹھے اور نماز فجر ادا کر کے خواجہ ملکنس کی خدمت میں روانہ ہو گئے۔ وہاں خواجہ ملکنس پہلے ہی سے آپ کے منتظر تھے۔ وہ اپنی خانقاہ سے باہر نکلے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آؤ خواجہ باقی باللہ۔ اب تک کہاں رہے؟“ خواجہ باقی باللہ نے جواب دیا۔ ”جب آپ یہ جانتے ہیں کہ میں باقی باللہ ہوں تو آپ یہ بھگو جانتے ہوں گے کہ میں ابھی تک کہاں تھا؟“

خواجہ ملکنس نے فرمایا۔ ”باقی باللہ! میں نے جو پوچھا ہے اس کو تیری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔“ خواجہ باقی باللہ نے اپنی پوری داستان انہیں سنادی اور کہا۔ ”ہنس اس درویش نے میری کاپا پلٹ دی اور اب میں جو کچھ ہوں اسی درویش کا نہیں ہے۔“

خواجہ ملکنس نے فرمایا۔ ”ہاں وہ شخص تیری تربیت کی خاطر ادھر بھیجا گیا تھا، اس نے اپنا فرض بہت اچھی طرح پورا کیا۔“ خواجہ باقی باللہ نے عرض کیا۔ ”وہ تو سب ٹھیک ہے مگر میں یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ مجھ کو کسی دستِ حق پرست کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر میں بیکار شخص ہوں۔“

خواجہ ملکنس نے فرمایا۔ ”خواجہ باقی باللہ! تو میری خانقاہ میں شب و روز رہ سکتا ہے۔ تو جو کچھ چاہتا ہے مجھ سے مل جائے گا انشاء اللہ۔“ خواجہ باقی باللہ اسی وقت خانقاہ میں داخل ہو گئے۔

خواجہ ملکنس نے خواجہ باقی باللہ کو اپنے مریدوں میں شامل کر لیا..... اب تو ان کی خوشی کی انتہائی نہ رہی۔ یہ شب و روز خواجہ ملکنس کے پاس رہتے رہے۔ آخر ایک دن خواجہ باقی باللہ نے پوچھا۔ ”میرا مرشد! میری کجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اب مجھے کہاں رہنا چاہیے؟“

خواجہ ملکنس نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر بعد جواب دیا۔ ”فرزندِ من! تو ہندوستان واپس جا، وہاں بڑی ضرورت ہے۔ خدا تیری مدد کرے گا۔“

خواجہ باقی باللہ نے پوچھا۔ ”مجھے کب روانہ ہو جانا چاہیے؟“ خواجہ ملکنس نے جواب دیا۔ ”میں تو کہتا ہوں تو اسی وقت ہندوستان چلا جاوے تیری مرضی، میں حکماً یا جبراً تجھے نہیں بھیج رہا ہوں۔“ خواجہ باقی باللہ یہاں سے رخصت ہو کر اپنے گھر میں داخل ہوئے تو ماں نے پوچھا۔ ”کہو بیٹا! کیا خبر لائے؟“ آپ نے جواب دیا۔ ”ماں! میں ہندوستان واپس جا رہا ہوں کیونکہ.....“

ماں نے بات کاٹ دی۔ پوچھا۔ ”میں پوچھ رہی ہوں کہ تو ہندوستان کیوں جا رہا ہے، وہاں تجھ کو کس نے بھیجا ہے؟“ آپ نے جواب دیا۔ ”ماں یہ میرے میرا مرشد کا حکم ہے، ماں میں سب کچھ ٹال سکتا ہوں لیکن اپنے میرا مرشد کا کہنا



نہیں ٹال سکتا۔

ماں رونے لگیں، بولیں۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں ایک بار پھر تجھ سے جدا ہو جاؤں گی۔ افسوس کہ میں تجھ کو روک بھی نہیں سکتی کیونکہ تجھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے نہیں میرے لیے مانگا ہے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”ماں، میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ آپ کی بات کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔“

ماں نے جواب دیا۔ ”بیٹے! میں نے خدا سے یہ دعا مانگ رکھی ہے کہ تو میرے بیٹے محمد باقی کے لیے وہی کر، جو اس کے حق میں بہتر ہو کیونکہ میں اس میں خوش ہوں، جو میرے بیٹے کے لیے بہتر ہو۔“

ماں کے پاس سے رخصت ہو کر خواجہ باقی باہند دوبارہ اپنے پیر و مرشد خواجہ امکنگلی کے پاس پہنچے اور عرض کیا۔ ”حضرت! میں نے اپنی ماں سے ہندوستان جانے کی اجازت حاصل کر لی ہے۔ لیکن اب جو میں نے خود کو ٹھوٹا تو میں نے اپنے آپ کو اس لائق نہیں پایا، اب میں اس پس و پیش میں ہوں کہ ہندوستان جاؤں یا نہ جاؤں۔“

خواجہ امکنگلی نے فرمایا ”یہ دوسرا شیطان ہے۔ تمہیں ہندوستان جانا ہے کیونکہ یہ حکم ربی ہے۔ تم اس سلسلے میں استغورہ دیکھ لو، خدا کی مرضی واضح ہو جائے گی۔“

خواجہ باقی باہند نے اپنے پیر کے مشورے پر استغورہ دیکھا۔ انہوں نے عالم رویا میں دیکھا ایک طوطا ان کے سامنے ایک درخت کی شاخ پر بیٹھ گیا ہے۔ انہوں نے اپنے دل میں سوچا اگر یہ طوطا شاخ سے اتر کر ان کے ہاتھ پر آ کر بیٹھ جائے گا تو میں اس کا یہ مفہوم لوں گا کہ ہندوستان کا سفر خدائی مشیت ہے۔ ابھی آپ کے دل میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ طوطا اُڑا اور آپ کے ہاتھ پر آ کر بیٹھ گیا۔ آپ نے اپنا لعاب دہن حوسے کی چوٹی میں ڈال دیا اور طوطے نے آپ کے منہ میں شکر ڈال دیا، یہ شکر وہاں سے اور کس طرح لایا تھا، کچھ بتانہ تھا۔

آپ کی آنکھ کھلی تو آپ نے اس کا یہ مطلب لیا کہ طوطا خالص ہندوستانی پرندہ ہے اور اس کا یہ مطلب ہے کہ میرا ہند جانا حکم ربی ہے بلعاب دہن کا یہ مطلب ہے کہ میں ہندیوں کو اپنی باتوں سے حق کی طرف لے آؤں گا اور طوطے کے شکر دینے کا یہ مطلب ہے ہندیوں کی طرف سے مجھ کو جو جواب ملے گا وہ بہت خوشوار ہوگا۔

خواجہ باقی باہند نے اپنا خواب خواجہ امکنگلی سے بیان کیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”عزیز من! طوطا خالص ہندی پرندہ ہے، ہند میں کوئی شخص تجھ سے مدد خدائی فیض حاصل کرے گا اور تو اس سے فیض یاب ہوگا۔“

آپ نے اسی وقت سفر کی تیاری شروع کر دی اور کچھ دنوں بعد آپ کا کل پہنچے یہ آپ کی جہاز۔ نئے مولد اور وطن تھا، کچھ دن کا کل میں رہ کر آپ نے ہندوستان کا رخ کیا اور لاہور میں قیام فرمایا۔ لاہور کے مغل اور نغزاء نے آپ کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے فیض حاصل کیا، آپ نے اس شہر میں ایک سال قیام فرمایا۔ اس کے بعد دہلی روانہ ہو گئے۔ اس دوران آپ نے اتنی شہرت حاصل کر لی تھی کہ آپ سے پہلے آپ کی شہرت دہلی پہنچ چکی تھی۔

آپ جس قافلے میں سفر کر رہے تھے اس میں ایک شخص پیدل چل رہا تھا۔ آپ کچھ دور تک گھوڑے پر سوار رہے لیکن پھر اس پر سے اتر پڑے اور اس شخص کو اپنا گھوڑا پیش کر دیا۔

اس نے کہا۔ ”میں اپنے آپ میں اتنی ہمت نہیں پاتا کہ گھوڑے پر تو میں بیٹھوں اور آپ پیدل چلیں۔ مجھے معاف رکھیے اور مجھ کو ہم کیجیے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”یہ حکم ربی ہے۔ تو اس پر بیٹھ جا۔۔۔ میں گھوڑے کے ساتھ پیدل چلوں گا۔“

اس شخص نے شہر کر عرض کیا۔ ”حضرت! میں یہ جرات کس طرح کروں، لوگ مٹنے اٹنے دے کر مجھ کو ہلاک کر دیں گے اور میں کسی کومت دھانے کے قابل نہ ہوں گا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے اس کا کل نکال لیا ہے تو میرے گھوڑے پر سوار ہو جا، میں اپنے چہرے پر چادر ڈال لوں گا اور تیرے گھوڑے کے ساتھ پیدل چلوں گا۔ اس طرح کوئی مجھ کو پہچان بھی نہ سکے گا۔“

آپ نے اس شخص کو اتنا مجبور کیا کہ وہ آپ کی بات ماننے پر آمادہ ہو گیا۔ آپ نے اس شخص کو اپنے گھوڑے پر بٹھار دیا اور اپنے منہ پر چادر ڈال کر خود پیدل چلنے لگے۔ جب منزل قریب آنے لگی تو آپ نے اس شخص کو گھوڑے سے اتار لیا اور اس پر خود سوار ہو گئے۔ منزل پر قیام کیا اور اس شخص سے کہا۔ ”ایسا میں نے اس لیے کیا ہے کہ قافلے کے لوگ یہ نہ جان سکیں کہ میں نے پیدل سفر کیا ہے۔“



منزل پر قیام کے بعد جب پھر قافلہ روانہ ہوا تو آپ نے وہی طریقہ اختیار کیا۔ یہاں تک کہ دلی میں داخل ہو گئے۔ یہاں آپ کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ قیام کہاں فرمائیں۔ آپ نے دریائے جمنا کے کنارے قلعہ فیروز آباد کی عظیم الشان مسجد کو اپنے لیے پسند فرمایا۔ بڑی پرفضا جدی۔

آپ کی شہرت پر دو کارانداز میں اس طرح پھیلی جیسے سورج کی کرنیں اس کے طلوع ہونے کے بعد چاروں طرف پھیل جاتی ہیں۔ یہ شہرت چھوٹی بستیوں سے بڑی بستیوں تک اور وہاں سے امراء اور شاہی محلات میں داخل ہو گئی۔ یہ دور اکبری کا واقعہ ہے۔ اکبری دور کا وہ حصہ جس میں فتح مبارک اور اس کے دنوں میں ایوان الفضل اور فیضی۔ مغل فرماں روا اکبرؒ یہ ہاؤس کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ بادشاہ خود اپنے عہد کا مجتہد ہے اور اس کو کسی سے فتویٰ لینے کی ضرورت نہیں۔ اکبرؒ نے طورانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ آپ نے اپنے معتقدوں، نیاز مندوں اور مریدوں کو شریعت کی پابندی اور سنت نبوی ﷺ پر عمل پیرا ہونے کی بار بار نصیحت فرمائی اور انہیں پر اثر تحریروں سے اسلامی ذمے واریوں کا احساس دلایا۔ آپ کے نیاز مندوں اور عقیدت مندوں میں جو لوگ شامل ہوئے تھے ان میں شیخ فرید بخاری، عبدالرحیم خان غاناں، مرزا قلیچ خان صدر جہان جیسے امرائے شاہی بھی شامل تھے۔

آپ اس عہد کے علماء اور دین دار متقی لوگوں کو سنت نبوی ﷺ اور شریعت معظومی ﷺ کی پابندی پر آمادہ اور مجبور کرتے رہتے تھے، اپنے مریدوں کو مرید ہونے سے پہلے شریعت کے احیا اور تبلیغ پر بہت زیادہ زور دیتے تھے اور کسی کسی کو تو بڑے سے امراء اور طویل آزمائش کے بعد مرید کرتے تھے۔

1008ھ بمطابق 1599ء میں خواجہ باقی کی خدمت میں سرہند سے ایک ایسا شخص دہلی آیا جس کے چہرے اور باتوں سے آوی مرعوب اور دم خود رہ جاتا تھا۔ یہ شخص "حج بیت اللہ" کے لیے اپنے گھر سے نکلا تھا۔ دہلی میں قیام کیا تو کسی نے اس شخص سے خواجہ باقی باندہ کا ذکر کیا اور بتایا کہ یہ بزرگ شریعت محمدی ﷺ اور سنت نبوی ﷺ کے زبردست دانش اور مبلغ ہیں، یہ صاحب اشتہاق ملاقات میں قلعہ فیروز آباد کی مسجد میں خواجہ باقی سے پاس پہنچ گئے اور اجازت لیے بغیر اندر چلے گئے۔ اس وقت خواجہ باقی باندہ بیٹھ پڑے تھے۔

آنے والا ایک طرف اطمینان سے بیٹھ گیا اور ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا کہ کچھ دیر بعد باقی باندہ نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا، پوچھا: "تو کہاں سے آتا ہوا؟"

اس شخص نے جواب دیا: "جناب! میں سرہند سے آیا ہوں اور "حج بیت اللہ" کو جا رہا ہوں، میں نے نوٹوں سے آپ کا ذکر سنا تھا۔ پھر معلوم نہیں کیا چیز تھی جو مجھے آپ کے پاس پہنچا لائی۔"

خواجہ باقی باندہ نے کہا: "بیٹھو، ہم آپ میں تباہی نہ خیال کیوں نہ کریں۔" یہ شخص آپ سے پاس بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد دونوں اتنے محل مل گئے کہ جیسے ازل سے ایک دوسرے سے واقف ہوں۔ سرہند سے آنے والا شخص آپ سے درخواست کر رہا تھا کہ "آپ مجھے بیعت فرمائیں۔"

خواجہ باقی باندہ نے فرمایا: "آپ شرط پر مرید بنوں گے۔" سرہند نے پوچھا: "کون سی شرط؟"

آپ نے جواب دیا: "میرے بعد تم میری اولاد کی تربیت کرو گے۔" سرہندی نے جواب دیا: "مجھے منظور ہے۔"

آپ نے فرمایا: "تب پھر جاؤ، بسم اللہ، دیر سے بات کی ہے۔"

آپ نے اس سرہندی کو اپنا مرید کر لیا بعد میں یہ سرہندی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ نے فرمایا: "میں نے استخارے میں جس سرہندی طوطے کو دیکھا تھا اور جس کی چونچ میں، میں نے لعاب دہن ڈالا تھا اور طوطے نے میرے منہ میں شکر ڈال دی تھی وہ شیخ احمد ہو۔ تم مجھ سے روحانی تربیت حاصل کرو گے اور میری اولاد تم سے روحانی فیض حاصل کرے گی۔"

اس کے بعد شیخ احمد سرہندی حج کرنے چلے گئے۔ وہ انوار کاسل جو سینے میں موجزن تھا اور برہنہ مو سے اپنے لگا تھا مگر عزم و آتھمیں میں ٹھہر گیا۔ آپ اپنی نظریں نیچی رکھتے اور کسی شے یا شخص کو بغور نہ دیکھتے کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ اگر آپ ایسا کریں گے تو وہ چیز یا شخص اس کا کس نہ ہو سکے گا۔

آپ کی خانقاہ میں آنے جانے والوں کا کچھ مرنے لگا لیکن ان میں ملاقات سہی سے ہوتی تھی۔



ایک دن ایک فوجی سردار آپ کے پاس آیا۔ دروازے پر آپ کا خادم کھڑا تھا۔ فوجی سردار نے خادم سے پوچھا۔ ”کیا خواجہ صاحب اندر موجود ہیں؟“

خادم نے جواب دیا۔ ”ہاں جناب موجود ہیں، جائیے۔ میں لے جاتا جا کر۔“  
 فوجی نے اپنے گھوڑے کی لگام خادم کو نہ دی اور خود اندر چلا گیا۔ خواجہ باقی اس وقت اندر موجود نہیں تھے۔ کسی ضرورت سے باہر گئے ہوئے تھے۔ فوجی اندر چلے کر آپ کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد آپ واپس آئے اور اپنے خادم کو اس حال میں کھڑا دیکھا کہ گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھ میں تھی اور گھوڑا بار بار دم ہلا ہلا کر پاؤں میں بیٹھ رہا تھا۔ آپ نے خادم سے پوچھا۔ ”یہ کس کا گھوڑا ہے؟“  
 خادم نے بے اختیار آپ کی طرف دیکھا آپ بھی اس سے پوری طرح متوجہ تھے۔ دونوں کی نظریں ملیں تو خادم تڑپ گیا، گھوڑے کی لگام چھوڑ دی۔ گریبان چاکر ڈالا اور لباس کو تار تار کر کے جسم سے دور کر دیا۔ آپ نے گھبرا کر پوچھا تو یہ کیا کر رہا ہے؟  
 ہوش میں آ۔“

خادم نے چیخا چلانا شروع کر دیا اور بار بار یہی رٹ لگائے رکھی۔ ”ہائے مار دیا۔ ہائے قتل کر دیا۔ ہائے میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟“  
 آپ نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ ”اے شخص ہوش میں آ، تجھ کو میری عدم موجودگی میں محتاط رہنا تھا، مجھ سے نظریں نہیں ملانا چاہیے تھیں۔“

خادم نے ناچنا شروع کر دیا۔ خانقاہ کے لوگوں نے اس میں بڑی دلچسپی لی اور اس کے آس پاس گھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد یہ شخص ایک طرف چلا گیا۔ آپ نے اس کی تلاش میں آدنی چھوڑے مگر اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ اس کی کئی دن تک تلاش جاری رہی مگر اس کا دور دور تک پتہ نہ تھا اور وہ ایسا لاپتا ہوا کہ پھر کہیں نظری نہ آیا اور ہمیشہ کے لیے ناپید ہو گیا۔ آپ کو اس کی گمشدگی کا دکھ ہوا۔  
 کئی روز بعد نئے کے دن آپ نماز کے لیے مسجد تشریف لے گئے۔ اس وقت بھی سبیل نو۔ آنکھوں میں مرکز تھا اور آپ قوت میں پہاڑ ہو چکے تھے۔ آہستہ آہستہ مسجد میں داخل ہوئے۔ اس وقت امام خطبہ شروع کر چکا تھا۔ آپ اگلی صف میں چلے گئے، امام نے خطبہ پڑھتے پڑھتے آپ کی طرف دیکھا، آپ نے بھی اسے دیکھا۔ امام کی حالت غیر ہو گئی وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گیا اور چیخنے چلانے لگا۔ کچھ دیر لوگوں نے انتظار کیا کہ امام ہوش میں آئے تو ہتھیہ خطبہ پورا کر کے مگر اس کو ہوش نہ آیا۔ آخر نماز یوں نے ایک دوسرا خطیب کھڑا کر دیا۔ اس نے خطبہ پڑھا اس کے بعد نماز ادا کی گئی۔

آپ رات کو تہجد کے لیے کھڑے ہو گئے۔ کئی گھنٹے بعد جب بستر پر آئے تو انہوں نے اپنے بستر پر ایک بلی کو سوائے ہوئے دیکھا۔ آپ نے یہ سوچ کر اس کو نہیں بیدار کیا کہ وہ آپ ہی بیدار ہو جائے تو بہتر ہے مگر کافی دیر تک انتظار کے بعد جب بلی اپنی جگہ سے اٹلی تک نہیں تو آپ بستر سے الٹ سردی میں کھڑے رہے۔ فجر کی اذان کے بعد بلی چلی گئی لیکن آپ بستر میں جانے کے بجائے مسجد میں تشریف لے گئے اور وہاں نماز فجر ادا کی۔ خواجہ باقی اپنی ذات سے جا تو رہا کہ کوا ذیت دینا پڑے نہیں کرتے تھے۔

☆☆☆

آپ اپنے معتقدین میں بیٹھے کسی مسئلے پر غور و خوس فرما رہے تھے کہ چند مہمان اندر داخل ہوئے۔ آپ ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے، یہ گرمی کے دن تھے۔ آپ نے مہمانوں کو خانقاہ میں ٹھہرایا۔ لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ مہمان بھوکے تھے آپ کچھ دیر تو مہمانوں سے باتیں کرتے رہے مگر پھر مہمانوں نے کھانے کی خواہش کی۔ آپ نے خادم سے پوچھا۔ ”بول، کھانے کا انتظام کس طرح کیا جائے؟ کہاں سے کیا جائے؟“

خادم نے عرض کیا۔ ”جناب والا! یہیں پڑوس میں ایک نانہالی رہتا ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے بات کروں؟“  
 آپ نے خادم کو اجازت دے دی۔ ”جا، چند دنیائیں اور نہاری لے آ جو معاوضہ مانگے گاؤ۔ بدیا جائے گا۔“  
 خادم فوراً بھاگا بھاگا نانہالی کے پاس پہنچا اور کہا۔ ”بھائی! ہمارے پیر و مرشد خواجہ باقی باللہ کے ہاں چند مہمان آگئے ہیں اس وقت گھر میں کچھ بھی نہیں ہے پیر و مرشد نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے کہ چند دنیائیں اور نہاری لے آؤں۔ تیری بڑی مہربانی ہوگی اگر نہاری اور دنیوں کا انتظام کروے گا۔“

نانہالی نے پوچھا۔ ”میں یہ چیزیں ضرور فراہم کیے دیتا ہوں لیکن یہ تو بتاؤ تمہارے پیر و مرشد کھانے کا معاوضہ کیا دیں گے؟“  
 خادم نے عرض کیا۔ ”جو مانگو گے، دے دیں گے۔“







کروں گا۔"

نانہائی بے حد خوش تھا، بولا۔ "مجھے آپ سے یہی امید تھی۔"

خواجہ باقی باللہ حجرے میں جاتے ہوئے بولے۔ "میرے پیچھے پیچھے آ جا۔"

نانہائی ان کے پیچھے پیچھے حجرے میں داخل ہو گیا۔ خادم اور مہمان دونوں کی نگرار اور بحث مباحثے کبڑے غور سے سنتے رہے تھے، اب وہ بید کچر ہے تھے کہ دیکھے ہوتا کیا ہے؟

کچھ دیر بعد حجرے کا دروازہ کھلا اور اس کے اندر سے دو خواجہ باقی باللہ نمودار ہوئے، شکل صورت، لباس، وضع قطع کسی بات میں سر مو فرق نہ تھا۔ ہاں بس چلنے میں فرق تھا۔ انداز میں فرق تھا۔ ایک تو ہوشیار تھا دوسرا ہوش اور بے خوف تھا۔ وہ پاؤں نہیں رکھتا مگر پڑتا نہیں تھا۔ دوسروں نے انہیں اس طرح پہچانا کہ جو ہوشیار تھا وہ خواجہ باقی باللہ تھے اور جو بے ہوش اور بے خود تھا وہ نانہائی تھا۔

نانہائی باہر آتے ہی ڈھیر ہو گیا۔ خواجہ باقی باللہ نے اس کے سر ہانے کھڑے ہو کر فرمایا۔ "اے غصے! کیا میں نے تجھ کو آگاہ نہیں کر دیا تھا کہ برتن میں اس کی سائی سے زیادہ بھر دیا جائے وہ چمک جاتا ہے یا برتن ٹوٹ جا ۲۔ ہے چنانچہ تو چمک بھی رہا ہے اور ٹوٹ جانے کا بھی احتمال ہے۔"

مہمانوں نے کہا۔ "خواجہ! اس کے لیے کچھ کیجیے۔"

آپ نے فرمایا۔ "اب میں کیا کر سکتا ہوں جو کچھ ہوتا تھا ہو چکا، اللہ اس پر رحم کرے۔"

نانہائی کی حالت سکروبے ہوشی تین دن قائم رہی۔ اس عجیب و غریب واقعے کی اتنی شہرت ہوئی کہ دیکھنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ تین دن بعد نانہائی محل بسا، برتن ٹوٹ گیا۔

☆☆☆

آپ نے دو شادیاں کیں، دونوں سے دوڑ کے اور دو بڑیاں پیدا ہوئیں۔ آپ نے بڑے لڑکے کا نام خواجہ عبید اللہ رکھا جو بعد میں خواجہ گلخان کہلائے، دوسرے کا نام خواجہ عبداللہ رکھا جو خواجہ خورد کے لقب سے مشہور ہوئے۔

آپ ہمیشہ اس بات کی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ اگر دل کو امینان، یک سوئی اور حضور قلب سے ہمکنار کرنا ہے تو بقدر ضرورت پائیزہ اور حلال کھانا چاہیے، فضول اور بیہودہ بات چیت سے بچ جائے اور دنیا کے طامیوں سے دوری اختیار کی جائے۔ کسی نے پوچھا۔ "اگر میں اپنی زندگی کا برنچو ذکر میں گزار دوں تو؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اگر تو ہزار سال ذکر کرتا رہے مگر تیرا کھانا حلال مال کا نہ ہو تو یاد رہے تیرا روحانی مقصد کبھی بھی حاصل نہ ہوگا۔"

طبیعت میں سادگی اتنی تھی کہ کتنا ہی ناپسندیدہ کھانا مسلسل کھلایا جاتا آپ کو کھانے میں ذرا بھی دل نہ ہوتا اور کھاتے رہتے۔ یہی حال لباس کا تھا۔ جیسا مل جاتا پہن لیتے۔ یہی بنیادی شرط یہ تھی کہ وہ صاف ستھرا اور پاکیزہ ہو۔

ایک دن آپ نے مریدوں اور ارادت مندوں کو جمع کر کے فرمایا۔ "کوئی عجیب بات ہے کہ میں نے مراقبے میں دیکھا کہ سلسلہ سنتہ۔ کا کوئی نامی گرامی شخص رحلت کر گیا ہے۔"

ایک مرید نے پوچھا۔ "یہ مراقبے میں آپ نے اس بزرگ کی صورت دیکھی ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے اس کی صورت بھی دیکھی ہے لیکن اس کو پہچان نہیں سکا۔"

سے 25 دن بعد ہی انہی 1012ھ کو عصر کے بعد کھلا فیروز شاہ میں آپ۔۔۔ بلند آواز میں اہم ذات کے ذکر میں مشغول ہو گئے۔ اور دو تین گھنٹی کے بعد آپ اسی عالم میں عالم قدس چلے گئے۔ آپ کا مزار قبرستان قدم شریف میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ اب یہ جگہ درگاہ خواجہ باقی باللہ کے نام سے مشہور ہے۔ آپ نے وفات سے پہلے ہی یہ وصیت کر دی تھی کہ آپ کے مزار پر چھت، منڈیا قبر نہ تعمیر جائے۔ چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی۔

آپ کی تاریخ وفات۔ "بحر معرفت بود" 1012ھ اور "تقشند وقت" 1012ھ سے نکلتی ہے۔

<p>سلفینتہ لاویا، شہزادہ داراشکوہ طبقات النوری علامہ شعرانی تذکرۃ لاویا، شیخ فرید</p> <p>الذین عطار انوار لاویا، رئیس احمد جعفری خزینۃ الاصلیہ مفتی غلام سرور لاہوری</p>	<p>ماخذات</p>
--	---------------





## ہمشایہ

ڈاکٹر عبد مجید

بزرگوں کا قول ہے کہ جہاں دیا نہیں جلتا وہاں ہلائیں بسیرا کرتی ہیں مگر یہاں تو گھبر کا چراغ جلتے ہی دامن میں ایسے آگ لگی کہ سارا جیون ہی سلگتی... راکہ بن کر رہ گیا... اچھے پڑوسی بے شک خدا کا تحفہ ہوتے ہیں لیکن اس کے برعکس صورت حال ہو تو حالات کے ساتھ ساتھ حیات کو بھی تباہ کر دیتے ہیں جیسا کہ یہاں ہوا۔

بد نظری کی تلاطم خیز چالوں کا افسوس ناک انجام

خاموش دیوار کو دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی تھی پھر وہ ایک دن بھمت پر گئی تھی۔ پڑوس کی دیوار اب بھی اس کا منہ چڑھا رہی تھی جو اس کے قدم سے کہیں اٹھتی تھی۔ اسے بھس ہو رہا تھا کہ وہ دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف جھانکے۔ دیکھے تو سہی جس گھر میں لوگ نہیں بستے وہ گھر کیسے کتے ہیں۔ اس نے

”پڑوس کا گھر آباد نہ ہو اس میں چراغ جلانے والا کوئی نہ ہو تو وہاں بلائیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔“  
نسیبہ جب سے بیاہ کر آئی تھی اس کی ماں کے کہے ہوئے یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونجتے رہتے تھے۔ اس کا پڑوس جانے کب سے غیر آباد تھا۔ وہ اس مکان کی

سپنس ڈائجسٹ 241 مارچ 2015ء

COPIED FROM WEB



گئی۔ اس نے یہ تک نہیں پوچھا کہ دروازے کے باہر کون ہے اور دروازہ کھول دیا۔  
 ”کیا بات ہے تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟“ افتخار نے اندر آتے ہوئے کہا۔  
 ”نہیں تو بس یونہی ڈر لگ رہا تھا۔“  
 ”ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ایسے ڈرنے لگیں تو وہ لیں اسکی۔“

”آپ اتنی دیر سے جو آئے ہیں۔“  
 ”بھئی دیر سو رہی تو ہو جاتی ہے۔ صرف ایک گھنٹا ہی تو لیٹ ہوا ہوں۔ پہلے بھی دیر ہوئی رہی ہے لیکن اس طرح خوفزدہ نظر نہیں آئیں جیسے آج نظر آ رہی ہو۔“  
 ”بس یونہی، آج کچھ زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔“  
 افتخار کے آجانے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے پڑوس کو بھول ہی گئی تھی لیکن جب وہ دونوں سونے کے لیے لیٹے تو اسے پڑوس کا خالی مکان یاد آ گیا۔  
 ”افتخار ایک بات پوچھو؟“  
 ”پوچھو۔“

”یہ جو ہمارا برابر والا مکان ہے کب سے خالی پڑا ہے؟“

”چھ مہینوں سے تو میں بھی دیکھ رہا ہوں اور تم بھی۔ اس سے پہلے کا مجھے پتا نہیں مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“  
 ”امی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر پڑوس کا گھر آباد نہ ہو اس میں چراغ جلانے والا کوئی نہ ہو تو وہاں بلائیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔“

”ہوا کریں، بلائیں نازل ہوں گی تو وہاں ہوں گی تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔“

”افتخار ایسا گھر منحوس ہوتا ہے اس کی نحوست کے اثرات ہم پر بھی پڑ سکتے ہیں۔“

”کیسی بچوں والی بارت کرتی ہو۔ تمہاری ماں نے ایک بات کہہ دی اور تم نے نہ عقیم کر لیا۔ مسلمانوں پر یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔“

”ہم یہ مکان چھوڑ کر نونایا مکان نہیں لے سکتے جس کا پڑوس آباد ہو۔“

”تم نے یہ کہا وہم پال لیا ہے کچھ دن اور گزار لو۔ میں تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دوں گا۔ بدل لوں گا مکان۔“ شادی کے نئے نئے دن تھے۔ وہ زیادہ بحث کر سکتی تھی نہ افتخار سے لڑ سکتی تھی اور پھر وہ خود کہہ رہا تھا کہ یہ خواہش بہت جلد پوری کر دے گا ہذا انیسہ نے چپ رہنے

ادھر ادھر دیکھا کہ شاید دیوار پر چڑھنے کے لیے کوئی سہارا مل جائے۔ اسے ایک اسٹول نظر آ گیا جس پر وہ بہ آسانی چڑھ سکتی تھی۔ پہلے اس نے اسٹول کو اچھی طرح ہلا جلا کر دیکھ لیا کہ یہ اس کا بوجھ اٹھا بھی سکتا ہے یا نہیں اور پھر اسے دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑا کر دیا اور کسی نہ کسی طرح اسٹول پر چڑھ گئی۔ منوں مٹی تھی جو ادھر ادھر بکھری ہوئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے ابھی کوئی آئے گا اور اس کا گلا دبا دے گا۔ وہ گھبرا کر اسٹول سے اتر گئی اور جلدی جلدی چھت سے نیچے اتر آئی۔

اسے بہت دیر تک ماں کا کہا یاد آتا رہا کہ جہاں چراغ جلانے والا کوئی نہ ہو وہاں بلائیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔ کہیں خالی گھر کی نحوست میرے گھر کا رخ نہ کر لے۔ یہ سوچ کر تو اس کا دم ہی نکل گیا تھا۔ دن کا وقت تھا لیکن وہ اس طرح ڈر رہی تھی جیسے رات ہو گئی ہو اور اس کا شوہر گھر نہ آیا ہو۔ اسے اپنے شوہر پر غصہ آ رہا تھا۔ شادی کے صرف چار مہینے بعد ہی اسے جانے کیا سوچنی تھی کہ وہ اپنے ماں باپ سے الگ ہو کر اسے یہاں لے آیا تھا۔ گھر بھی ایسا منتخب کیا تھا جس کا پڑوس خالی پڑا تھا۔ میں اس کے ماں باپ کے ساتھ رہ رہی تھی تو کم از کم تنہائی کا احساس تو نہ ہوتا تھا۔ پڑوس خالی بھی ہوتا تو کوئی مجھے سلی دینے والا تو ہوتا۔ اسے قرآن کی جتنی سورتیں زبانی یاد تھیں دل ہی دل میں انہیں پڑھتی رہی۔ دل کو کچھ قرار آیا تو وہ کمرے سے باہر نکل لیکن اس وقت تک فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ اپنے شوہر سے اس سلسلے میں بات ضرور کرے گی۔

اس کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ اب شام ہونے لگی تھی اور اس کا شوہر گھر نہیں لوٹا تھا۔ عام طور پر وہ شام ہونے سے پہلے گھر آ جاتا تھا۔ اب اس کا خوف تو دور ہو گیا تھا لیکن وہ پڑوس کے متعلق بات کرنے کے لیے...

بے صبری ہو رہی تھی۔ وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ ابھی شادی کو صرف چھ مہینے ہوئے ہیں اور اس نے اسے کس گھر میں لا کر ڈال دیا ہے۔ ایک خیال تو یہ بھی آیا کہ وہ گھر کو تالا لگائے اور اپنی ماں کی طرف چلی جائے لیکن شادی کو اتنے کم دن ہوئے تھے کہ وہ یہ قدم نہیں اٹھا سکتی تھی پھر اس نے ماتھا پیٹ لیا۔ موہا ل سرہانے پڑا تھا اس نے اب تک اسے فون کیوں نہیں کیا۔ بوکھلاہٹ میں اسے یاد ہی نہیں رہا تھا وہ محن سے کمرے میں آئی لیکن فون کرنے کی نوبت نہ آئی۔

دروازے پر لگی کال بیل نے شور مچا دیا۔ اس وقت افتخار کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی دروازے کی طرف



ہی میں عافیت جانی۔

اس کے دونوں طرف کے پڑوس آباد ہوں۔“

”اگر ہمارے شفٹ ہو جانے کے بعد کوئی پڑوس کا مکان خالی کر کے چلا گیا تو؟“

”کچھ دن خالی رہے، پھر اس میں کوئی کرایے دار آکر بس جائے گا۔ اس مکان کی طرح برسوں خالی نہیں پڑا رہے گا۔“

”اچھا بابا، میں تم سے نہیں جیت سکتا۔ میں کل ہی سے کوشش کرتا ہوں۔“

افتخار نے وعدہ تو کر لیا تھا لیکن اس کے ذہن و دل میں کئی بہانے ایک ساتھ جمل رہے تھے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ نسیہ کو جھٹلائے گا بھی نہیں اور مکان بدلنے کی کوشش بھی نہیں کرے گا۔ جتنا ہو سکے گا وہ اس معاملے کو تار تار ہے گا۔ سب سے بڑا بہانہ یہی تھا کہ کوئی ڈھنگ کا مکان مل ہی نہیں رہا۔ وہ ایک اسٹیٹ ایجنٹ سے ساز باز کر کے نسیہ کو کئی ایسے مکان دکھانے لے گیا جو نسیہ کو پسند نہ آئے۔

کئی مہینے گزر گئے تھے۔ نسیہ کی بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔ اب تو وہ یہ کہنے لگی تھی کہ مکان جیسا بھی ہو وہ اس میں گزارہ کر لے گی لیکن اب یہاں نہیں رہے گی۔ افتخار اب مشکل میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اب وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کوئی ڈھنگ کا مکان ہے گا تو لے گا۔ جھک ہار کر اس نے بھی سوچ لیا کہ نسیہ کی اگر یہی ضد ہے تو وہ یہ مکان چھوڑ دے گا۔ اس نے ایک اسٹیٹ ایجنٹ سے بات کر لی۔ مکانوں کی کیا کی، اسٹیٹ ایجنٹ نے کئی مکان بتا دیے اور ایک مکان اسے پسند بھی آ گیا۔ محجان علاقہ تھا۔ آس پاس کوئی بھی مکان ویران اور خالی نہ تھا۔ وہ اس خیال سے گھر پہنچا کہ نسیہ کو بھی دکھا دے گا۔

”جندی سے تیار ہو جو۔ مکان تمہارے مطلب کا مل گیا ہے دیکھنے چلنا ہے۔“

”کیا اس سے اچھا ہے جس میں ہم رہ رہے ہیں؟“

”اس سے تو اچھا نہیں ہے۔“

”پھر بدلنے کا کیا فائدہ۔“

”کیا مطلب؟“ افتخار نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم تو اب تک یہ کہتی رہی ہو کہ جیسا بھی گھر ہوگا گزارہ کر لوں گی اور اب یہ کہہ رہی ہو؟“

”میں خواہ مخواہ جذباتی ہو رہی تھی۔ اب جو غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ خدا تو ہر جگہ ہے۔“

”کمال ہے، مکان ڈھونڈتے ڈھونڈتے میرے جوتے گھس گئے اور اب کہہ رہی ہو یہی مکان ٹھیک ہے۔“

اس دن کے بعد اس نے افتخار کے سامنے اس خالی مکان کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن وہ ضرور سوچتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی اسٹول پر چڑھ کر جھانک بھی لیا کرتی تھی۔

جب ایک سال ہو گیا اور اس کی گود خالی رہی تو اس کے دل میں یہ بات جانے کہاں سے بیٹھ گئی کہ یہ پڑوس کے گھر کی نعمت ہے جو اس کے گھر تک آگئی ہے۔ اگر یہ گھر آباد نہ ہوتا تو وہ کبھی ماں نہ بن سکے گی۔ یہ خیال ہی اسے پیش میں لانے کے لیے کافی تھا کہ وہ ماں نہیں بن سکے گی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر افتخار کے سامنے اس مکان کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

”اس مکان میں کوئی تو ایسی بات ہوگی کہ اس کا مالک اسے بنا کر بھول گیا۔“

”تم اس مکان کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔ ہماری بلا سے کوئی اس میں آکر رہے یا اسے بنا کر بھول جائے تمہیں اس سے کیا۔“

”اس کی موتیں ہم پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔“

”ہمارے گھر میں کیا فاقے ہونے لگے ہیں۔ ابھی پچھلے مہینے میری ترقی ہوئی ہے۔“

”وہ باہر کی باتیں ہیں گھروں کی نعمت گھروں پر اثر انداز ہوتی ہے۔“

”وہی تو کہہ رہا ہوں گھر میں بھی تم نے کیا نعمت دیکھ لی؟“

”افتخار، کیا تمہیں یہ فکر نہیں کہ تم ابھی تک باپ نہیں بن سکے ہو؟“

”ہماری شادی کو کیا دس بیس سال گزر گئے ہیں۔“

”ایک سال بھی بہت ہوتا ہے۔ یہ گھر خالی پڑا ہوا تو دیکھنا دس بیس سال بھی گزر جائیں گے۔“

”اچھا بابا، اب اس بحث کو ختم کرو۔ میں کوشش کرتا ہوں گھر بدل لوں۔“

”آپ نے پہلے بھی مجھے دلاسا دیا تھا لیکن اب میں زیادہ صبر کرنے والی نہیں ہوں۔“

”کل ہی کسی اسٹیٹ ایجنٹ سے والے سے بات کرتا ہوں۔“

”افتخار، آپ کتنے اچھے ہیں۔“

”میں گھر بدل لوں گا لیکن تمہاری یہ ضد ہے

فصول۔“

”ایجنٹ سے والے سے کہہ دیجیے گا کہ جو مکان وہ دیکھے



لیکن اس کی ہم عمر تھی پھر ایک آدمی کمرے سے نکل کر صحن کی طرف آیا۔ وہ یقیناً اس کا شوہر تھا۔ معلوم نہیں کوئی اور بھی ان کے ساتھ آیا ہے یا نہیں، وہ سوچنے لگی۔ اس گھر میں کتنے آدمی ہیں، یہ تو جا کر ہی معلوم ہوگا۔ اس نے سوچا اور اسٹول سے اتر گئی۔

اس نے یہ خبر افتخار کو بھی پہنچادی اور یہ اجازت بھی لے لی کہ وہ کسی وقت پڑوس میں ہو آئے۔ ہمسایوں کی خبر گیری کرتے رہنا چاہیے کیا خبر نہیں کسی چیز کی ضرورت ہو۔

نسیہ نے ہلکا سا میک اپ کیا، کپڑے البتہ قیمتی مہین لیے تاکہ پڑوسیوں پر رعب پڑے۔ وہ گھر سے نکل اور برابر کے دروازے کی تفل بجا دی۔ اس کے جواب میں وہی آدمی دروازے پر آیا جسے وہ چھت سے دیکھ چکی تھی۔

”جی فرمائیے۔“  
”میں آپ کے پڑوس میں رہتی ہوں۔“  
”واہ، پڑوس تو ہمیں اچھا مل گیا۔“ اس آدمی نے بد تمیزی سے کہا۔ ”اب آپ یہ پوچھیں گی کہ آپ کی تنظیم گھر پر ہے؟“

”یقیناً۔“  
”یہی تو ہماری بد نصیبی ہے کہ وہ اس وقت گھر پر ہیں، آئیے اندر آئیے۔“

نسیہ اس آدمی کو دیکھ کر قہقہی تھی یا تو یہ صاحب بد نظر واقع ہوئے ہیں یا مجھے دیکھ کر شوخ بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو بھی ہیں ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ ان کے گھر آیا جایا جائے۔ اس نے سوچا واہس، چلی جائے لیکن یہ سوچ کر اندر چلی آئی کہ مجھے ان سے کیا لینا چھتے تو ان کی بیگم سے سروکار ہے۔ انہیں بھی دیکھ لوں وہ کس طبیعت کی ہیں۔

ان صاحب نے اندر جا رہی ہوئی کو اطلاع دی۔ وہ بھی دروازے پر آگئیں اور نسیہ کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئیں۔

”میرا نام نسیہ افتخار ہے۔ میں آپ کے پڑوس میں رہتی ہوں۔“

”اچھا یہ تو بڑی اچھی بات ہے میں دعا مانگ رہی تھی کہ پڑوس اچھا ہو۔ آپ کو دیکھ کر خوشی ہوئی ہے۔ آپ سے دل لگا رہے گا، میرا نام عنبرین ہے۔“

”آپ کے ساتھ اور کون ہے؟“  
”کوئی بھی نہیں بس میں اور میرے میاں ہیں۔ اولاد اللہ نے دی نہیں ہے۔“

”مجھے اس مکان سے نہیں پڑوس سے شکایت تھی جو اب دور ہوگئی۔“  
”وہ کیسے؟“

”برابر والے مکان کی صفائی ہو رہی ہے۔ اس کا مطلب ہے کوئی آنے والا ہے۔ آباد گھروں میں بلائیں نہیں اترتیں۔“

”شکر ہے خدا کا۔ میری فکرتو دور ہوئی میں ایک بڑی زحمت سے بچ گیا۔“

”دیکھا میں کتنی اچھی ہوں۔ آپ کو تکلیف میں دیکھ ہی نہیں سکتی۔“

”دعا کرو جو لوگ بھی آئیں اچھے ہوں۔ برے ہمسایے مصیبت بھی بن جاتے ہیں۔“

”ہم کون سا کسی کے گھر جا رہے ہیں۔ ہمیں آباد پڑوس سے مطلب تھا وہ پورا ہو گیا۔“

ابھی مکان کی صفائی ہو رہی تھی۔ نسیہ بے چینی سے انتظار کر رہی تھی کہ کب سامان آئے اور کب یہ گھر آباد ہو۔

وہ دن میں کئی مرتبہ دروازے پر جھانک آتی تھی۔ چھت پر جا کر دیوار کے اس طرف بھی جھانکا۔ مکان تو صاف ہو گیا تھا لیکن سامان کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس کے دل میں وہم نے سرا بھارا۔ ہمیں ایسا تو نہیں کہ صرف صفائی ہوئی ہو۔ کوئی

رہنے نہ آئے۔ گھر تو پھر اسی طرح خالی کا خالی رہے گا۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے افتخار کو بھی مکان ڈھونڈنے کے لیے منع کر دیا تھا۔ اب وہ کس منہ سے کہے گی کہ مکان ڈھونڈو۔ کہنا تو پڑے گا اور کچھ دن انتظار کریں۔

شاید کوئی۔۔۔

آئیے مینے کے طویل انتظار کے بعد اس نے دیکھا کہ برابر کے مکان کے دروازے پر سامان کا ٹرک کھڑا ہے۔ وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ سامان آ گیا۔ اس کا مطلب ہے شام تک اس گھر میں نئے کرایے دار بھی آ جائیں گے۔

محبت بھی دور ہوگی اور اگر لوگ اچھے ہوئے تو آنا جانا بھی لگا رہے گا۔ اس کے دوسرے بڑوس میں صرف وہ آدمی رہتے تھے۔ اس لیے وہ وہاں نہیں جا سکتی تھی۔ وہ دعا کرنے لگی کہ اس مکان میں آنے والے فیملی کے لوگ ہوں۔

دو تین دن بعد اسے محسوس ہوا کہ برابر کے مکان میں کوئی آ گیا ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی چھت پر گئی اور اسٹول رکھ کر دیوار پر چڑھ گئی۔ اس نے ایک عورت کو دیکھا جو صحن سے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ معمولی شکل و صورت کی تھی

۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔

۔۔۔



ہیں۔ اگر اعجاز صاحب افتخار کی موجودگی میں آئے ہوتے تو ان سے ملاقات ہو جاتی بہرحال آپ لوگ اندر آئیں۔“

”میں تو ان سے کہہ رہی تھی کہ افتخار صاحب کی موجودگی میں جانا چاہیے لیکن یہ مانے ہی نہیں۔ ان کی تو منطق ہی عجیب ہے، کہتے ہیں بڑی رشتے داروں کی طرح ہوتے ہیں ان کے گھر کسی وقت بھی جایا جاسکتا ہے۔“

نسیہ بھی یہ سوچ کر چپ ہو گئی کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ آئے ہیں، اکیلے تو نہیں آئے۔ اگر افتخار کو معلوم بھی ہو گیا تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی بلکہ میں خود انہیں بتا دوں گی کہ آپ کی غیر موجودگی میں ہمارے پڑوسی ہمارے گھر آئے تھے۔

ڈرائنگ روم میں آتے ہی اعجاز صاحب نے گفتگو میں پہل کی۔ ان کی بیوی منہ تک رہی تھیں اور وہ مسلسل بولے جا رہے تھے۔ نسیہ انہیں نظر انداز کر کے صبرین سے باتیں کرنے لگی اور وہ بار بار سے مخاطب کر لیتے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ایسے کھلے مذاق پر اتر آئے کہ مہذب دیور بھی اپنی بھابیوں سے نہیں کرتے۔ ہوں گے بلکہ انہوں نے تو اظہار بھی کر دیا۔

”میں نے افتخار صاحب کو دیکھا ہے۔ میں عمر میں ان سے دو چار سال بڑا ہی ہوں گا لیکن آپ مجھے اپنا دیور ہی سمجھیں۔ مجھے دیور بھائی کا رشتہ بہت اچھا لگتا ہے۔ میں آج سے اس طرح کے مذاق کیا کروں گا جیسا کہ دیور کرتے ہیں۔“

”آپ تو اجازت دے بغیر بھی وہی کچھ کر رہے ہیں حالانکہ مجھے یہ قطعی پسند نہیں اس لیے کہ میرا کوئی دیور نہیں لہذا میں اس کی عادی نہیں۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہوا۔ آپ کو بتانا یا دیور مل گیا۔“

”مجھے رشتے بنانے میں کوئی دلچسپی نہیں۔“

یہ نوک جھوک جانے تک جاری رہتی کہ صبرین اٹھ کھڑی ہوئی۔ غالباً اسے بھی اپنے میاں کی باتیں ناگوار لگ رہی تھیں۔

”اچھا بہن، اب ہمیں اجازت دو۔“

نسیہ تو کچھ نہیں بولی لیکن اعجاز صاحب بول پڑے۔

”ایسی بھی کیا جلدی ہے بیگم کچھ دیر تو اور بیٹھو۔“

صبرین ان سے زیادہ سمجھ دار تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ نسیہ تو روکنے کی کوشش بھی نہیں کر رہی ہے تو انہوں نے اسی میں حافیت سمجھی کہ وہ چلی ہی جائے تو اچھا ہے۔ مجبوراً اس کے شوہر کو بھی اٹھنا پڑا۔

ابھی یہ باتیں نہیں تک پہنچی تھیں کہ صبرین کے شوہر آگئے۔ ان کا یوں بے تکلف چلے آنا نسیہ کو ذرا بھی اچھا نہیں لگا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس طرح اسے گھور رہے تھے جیسے انہوں نے پہلی بار کسی عورت کو دیکھا ہو۔ بیٹھے بھی ایسی جگہ تھے کہ ان کی آنکھیں مسلسل نسیہ کو گھورتی رہیں۔

”صبرین، ان سے ہمارا تعارف بھی تو کروادو۔ آخر پڑوسن ہیں، ان پر ہمارا بھی تو کچھ حق ہے۔“

صبرین کو ان کا یہ انداز گفتگو یقیناً پسند نہیں ہو گا لیکن وہ انہیں یہاں سے اٹھنے کے لیے بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

”یہ میرے شوہر اعجاز ہیں۔“

”ان سے تو دروازے پر ہی ملاقات ہو گئی تھی۔“

”آپ جب بھی آئیں گی دروازہ میں ہی کھولوں گا۔“

”اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ پھر آؤں۔“

”کوئی بات نہیں ہمیں تو فرصت ہی فرصت ہے۔ ہم آجائیں گے۔ مطلب تو ملاقات سے ہے۔ ایسی خوب صورت پڑوسنی تو قسمت والوں کو ملتی ہیں۔“ اس نے یہ بات اتنی بے ہودگی سے کہی کہ وہ فوراً اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”اچھا صبرین، میں چلتی ہوں۔“

”کچھ دیر تو بیٹھو۔ میں نے تم سے چائے تک کے لیے نہیں پوچھا۔“

”نہیں، اب چلوں گی۔“

”اچھا ہم ذرا گھر سمیٹ لیں پھر میں کسی دن آؤں گی۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں شوق سے آؤ۔“

گھر پہنچ کر نسیہ نے بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ ایک مرتبہ تو چلی گئی، آئندہ نہیں جائے گی۔ اس گھر کا مرد نہایت بد نظریے میل ملاپ رکھا تو اس کی اور امت ہوگی۔

وہ مطمئن ہو گئی تھی کہ چلو پڑوس آباد تو ہو گیا، اب میں ان سے طوں نہ طوں۔

ابھی دو دن بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک دن دروازے پر تپل ہوئی۔ وہ دروازے پر گئی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ پہلے صبرین پر نظر پڑی اور پھر اس کے میاں پر۔ وہ خود تو صبرین کے گھر اکیلی گئی تھی لیکن صبرین اپنے شوہر کو بھی ساتھ لے آئی تھی اور وہ بھی اس وقت کہ افتخار گھر پر نہیں تھے۔

”ارے آپ لوگ، اس وقت تو افتخار گھر پر نہیں



”مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ ہر وقت گھر پر ہوتے ہیں۔ کوئی کام کاج نہیں کرتے؟“

”اپنا کاروبار بے نوکروں نے سنبھالا ہوا ہے۔ کبھی کبھی چلا بھی جاتا ہوں۔“

”اس اطلاع کا شکریہ۔“ نسیہ نے کہا اور دکان دار سے مخاطب ہو گئی۔ سو دالینے کے بعد بیٹی تو اعجاز صاحب اب بھی وہیں جھے کھڑے تھے۔

”میں کچھ دیر بعد چھت پر آ جاؤں گا آپ کو فرصت ہو تو آپ بھی آجائیے گا۔“ اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ یہ ایسی بے ہودگی تھی کہ اگر وہ وہاں سے چلا نہ گیا ہوتا تو وہ اس کا منہ نوح لیتی۔ کوئی لڑکا بالا ہوتا تو الگ بات تھی لیکن اس عمر کے آدمی پر یہ چھو رہنا بچپن نہیں تھا۔

یہ اور ایسی بہت سی حرکتیں اس کے بعد بھی جاری رہیں۔ اس سے پہلے کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے اس نے سوچا کہ وہ اعجاز کو اعجاز کی حرکتوں سے آگاہ کر دے پھر خود ہی اس خیال کو رو بھی کر دیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اعجاز اس سے جھگڑا کر بیٹھیں۔ میں اپنی جگہ مضبوط ہوں تو پھر کیوں کسی سے ڈروں۔ میں ترنوالہ تو ہوں نہیں کہ مجھے کھا جائیں گے۔ اعجاز کوچ میں کیوں ڈالوں خود ہی اس کا مقابلہ کرتی رہوں گی۔

چھوٹی چھوٹی حرکتیں تو ہوتی ہی رہتی تھیں ایک دن بہت بڑی بات ہو گئی۔ دوپہر کا وقت تھا وہ مکن میں معروف تھی کہ دروازے پر دھک ہوئی۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے، ایک عنبرین ہی ہے جو ایسے ناوقت آدھکتی ہے اس نے سوچا اور پوچھے بغیر ہی دروازہ کھول دیا۔ دیکھا تو اعجاز صاحب کاغذ کا ایک پنڈل ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔ وہ دوپٹے کے بغیر کھڑی تھی اور ۔ دکھلا کر دروازے سے ہٹا بھول گئی پھر ذرا ہوش آیا تو دروازے کی آڑ لے کر کھڑی ہو گئی۔

”کیا خیال ہے آ جاؤں اندر؟“

”اس وقت اعجاز گھر پر نہیں ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے، اسی لیے تو آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم اعجاز سے ڈرتی ہو۔“

”جب وہ ہوں اس وقت آئیے گا۔“

”اچھا تو یہ لے لو۔“ اس نے کاغذ کا پنڈل اس کی طرف بڑھایا۔ غیر ارادی طور پر اس نے وہ پنڈل ہاتھ میں پکڑ لی۔

”اس میں کیا ہے؟“

وہ پڑوس آباد ہونے کی دعائیں مانگا کرتی تھی، اب یہی پڑوس اس کے لیے عذاب بن گیا تھا۔ اب اس کے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ بد اخلاق بن جائے۔ اپنی پڑوسن کی اس طرح دل شکنی کرے کہ وہ خود اس کے گھر آنے کی زحمت کرے نہ اپنے میاں کو ساتھ لائے۔

اعجاز گھر آیا تو نسیہ نے یہ ذکر تک نہیں کیا کہ کون آیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ نہیں خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ اس سے ملنے نہ چلا جائے بلکہ اسے بھی ساتھ چلنے کو کہے۔ دوسرے دن اعجاز دفتر کے لیے نکلا ہی تھا کہ عنبرین آدھکتی۔ نسیہ نے بھی سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے بیٹھنے تک کو نہیں کہا۔

”معاف کرنا بہن، آپ غلط وقت پر آگئیں میں امی کی طرف جا رہی تھی۔“

”ارے چلی جانا، امی ہی کی طرف تو جانا ہے۔ کچھ دیر بعد چلی جانا کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کرنی جائیں۔“

”جی نہیں، میں ہر کام وقت پر کرنے کی عادی ہوں کسی کے لیے اپنا وقت خراب نہیں کرتی۔“

”چلو تمہیں اس وقت فرصت نہیں تو میں پھر آ جاؤں گی۔“ وہ چلی گئی اور نسیہ حڑے سے بستر پر لیٹ کر عنبرین کی بے بسی پر ہنسنے لگی۔

اس دن کے بعد سے نسیہ نے عنبرین کو منہ لگانا چھوڑ دیا لیکن وہ بھی جیب عورت تھی۔ اس نے نسیہ کے گھر آنا نہیں چھوڑا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتی اور چلی جاتی۔ نسیہ کسی بات کا جواب دیتی کسی کا نہ دیتی۔ عنبرین نے بھی اس کی بے رخی کی شکایت نہ کی بس اتنا ہوا کہ اس نے اپنے میاں کو ساتھ لانا بند کر دیا تھا۔

وہ اعجاز کو ساتھ نہیں لارہی تھی لیکن وہ پیچھا چھوڑنے والے کب تھے۔ اس کا دروازے پر کھڑا ہونا عذاب ہو گیا تھا۔ اعجاز تو دن بھر ہوتا ہی نہیں تھا گھر کے سووے سلف کے لیے نسیہ کو ہی گھر سے باہر لگانا پڑتا تھا۔ اعجاز اس کے پیچھے سائے کی طرح لگا ہوا تھا۔ ایک دن وہ دکان پر کھڑی تھی کہ اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے کھڑا ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو عنبرین کا شو ہرا اعجاز تھا۔

”بھائی کیا خریداری ہو رہی ہے؟“

”گھر میں کچھ چیزیں کم ہو گئی تھیں وہ لینے آئی تھی۔“

”ارے آواز دے کر مجھ سے کہہ دیا ہوتا۔ میں لا کر دے دیتا۔ اب ذرا ذرا سی چیز کے لیے آپ گھر سے لگیں گی۔“



کسی کے گھر جاتا ہے۔ میں یہ کہنے آئی ہوں کہ اپنے میاں کو سنبھال کر رکھو ورنہ اس محلے میں تمہارا رہنا دو بھر ہو جائے گا۔ ابھی بات مجھ تک ہے لیکن میرے میاں کو خبر ہوئی تو اچھا نہیں ہوگا۔“

”میرے میاں نے ایسا کیا کر دیا کہ انگاروں پر لوٹ رہی ہو؟“

”وہ میرا بیچھا کرتے ہیں۔ مجھ سے بے ہودہ مذاق کرتے ہیں۔ کل میرے لیے نفلے لے کر آئے تھے جیسے میں تھنوں کی بھوکی ہوں۔ ان سے کہنا اپنی حد میں رہیں۔ اگر میں یہ سب اپنے شوہر کو بتا دوں تو جانتی ہو کیا ہو۔“

”نسیہ! ایک بات کہوں۔“ عسبرین نے کہا۔ ”برا مت ماننا جب عورت کی طرف سے موقع دیا جاتا ہے تو مرد آگے بڑھتا ہے۔ تم نے موقع دیا ہوگا تو ہی ان کی ہمت ہوئی ہوگی۔ ویسے مجھے پھر بھی یقین نہیں ہے۔ وہ تو کسی کو آگے اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور تم بھتی ہو وہ تم پر مرنے لگے ہیں۔ تمہارا بیچھا کرتے ہیں۔ تمہیں تحفے لاکر دیتے ہیں اور تم رکھ لیتی ہو۔“

”جی نہیں، جو کچھ وہ لائے تھے میں نے ان کے منہ پر دے نارا تھا۔“

”یہ کہہ کر واپس کیا ہوگا کہ یہ کیا اٹھا کر لے آئے کوئی اچھا سا تحفہ لائے ہوتے۔“

”تم تو اس طرح مذاق اڑا رہی ہو جیسے میں جموٹ بول رہی ہوں۔“

”تو بہ تو بہ، تم جیسی بڑی عورت جموٹ کیسے بول سکتی ہے۔“

”اجاز آتے ہیں تو میں ان سے پوچھوں گی کہ ایسی پارسا عورت پر کیوں ڈورے ڈال رہے ہو۔“

”تم پوچھو نہ پوچھو میں تو تمہیں اطلاع دے رہی ہوں تاکہ کل کو تم یہ نہ کہہ سکو کہ مجھے تو بتانا ہوتا۔“

عسبرین نے ایسی بے رحمی دکھائی تھی کہ بیٹھے تک کو نہیں کہا تھا۔ اسے بھی جو کچھ بتانا تھا کہ سچی تھی۔ اب رکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس نے دل ہی دل میں عسبرین کے منہ پر تھوکا اور گھر سے نکلنے کے لیے قدم اٹھا دیے۔ ابھی دروازہ دور تھا کہ اجاز گھر میں داخل ہوا۔ اس نے بیوی کی موجودگی میں نسیہ کی موجودگی پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا لیکن نسیہ کو رکنا پڑا۔

”جانی کہاں ہو، اب یہ آگے جہاں ان کے سامنے ہی بات ہو جائے۔“ عسبرین نے نسیہ سے کہا اور پھر اجاز سے مخاطب ہوئی۔ ”یہ آئی ہیں، کتنی ہیں کہ تم انہیں حق دینے ان

”تمہارے لیے سوٹ میں لایا ہوں، اگر تم اسے قبول کر لو تو ایسے سوٹ میں روز آیا کریں گے۔“ نسیہ نے ایک نظر اپنے ہاتھ میں دبے بندل پر ڈالی اور دوسری نظر اجاز کے مکروہ چہرے پر اور بندل ان کے چہرے پر دے مارا۔ وہ کچھ سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ دروازہ بند ہونے کی آواز سے گلی کوچ گئی۔

نسیہ کا وجود فیصے کی بھی بتا ہوا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ اسے زیادہ غصہ اپنی حماقت پر آ رہا تھا۔ اگر پہلے دن ہی اس سلسلے کو روک دیا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ اب بھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ اس آدمی کی ہمت کو اندھے منہ نہیں گرایا تو اس کی ہمت بڑھتی جائے گی۔

اب وقت آ گیا ہے کہ میں افتخار کو سب کچھ بتا دوں۔۔۔ وہ بے چینی سے افتخار کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔ افتخار آیا تو وہ

چائے بنانے میں مشغول ہو گئی۔ اس نے سوچا تھا افتخار کے ساتھ چائے پینے بیٹھے کی تو ضرور بات کرے گی لیکن جب

چائے بنا چکی تو اس نے اپنا ارادہ ایک مرتبہ پھر بدل دیا۔ اس نے سوچا نہ جانے افتخار کا ردعمل کیا ہو پھر کیا کروں؟

اجاز صاحب کے حوصلے اس طرح بڑھنے دوں؟ اچانک ایک خیال نے اس کے ارادے کو قلم الہدٰی دے دیا۔ میں

عسبرین سے بات کر کے دیکھوں۔ اسے بھی تو معلوم ہو اس کا شوہر کیا حرکتیں کرتا پھر رہا ہے۔ کون بیوی ہوگی جو اپنے

شوہر کی ان حرکتوں کو برداشت کرے گی۔ وہ ضرور میری حوصلہ افزائی کرے گی۔ وہ اپنا غصہ چھپا کر افتخار کے ساتھ

چائے پینے بیٹھ گئی۔

اس نے وہ رات جیسے جیسے کائی اور صبح ہوتے ہی انتظار کرنے لگی کہ کب افتخار گھر سے نکلے اور عسبرین کے

گھر جائے۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اجاز صاحب گھر پر ہونے تو بھی وہ عسبرین سے ان کی شکایت ضرور کرے گی۔

اس سے کہے گی کہ اپنے میاں کو پانڈھ کر رکھے۔

افتخار کے دفتر جانے کے کچھ دیر بعد ہی وہ عسبرین کے گھر پہنچ گئی۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ اس وقت اجاز

صاحب گھر پر نہیں تھے۔ یہ اور بھی اچھی بات تھی۔

”آج کیسے آنا ہو گیا ضرور کوئی مطلب ہوگا اور نہ کون کسی کے گھر آتا ہے۔“ عسبرین نے بھی اس سے ....

بے رحمی سے بات کی جس طرح نسیہ اس سے کرنے لگی تھی۔ نسیہ نے محسوس تو کیا لیکن اظہار نہیں کیا۔ اس وقت واقعی اس کا مطلب تھا اسی لیے الجھنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔

”بہن تم نے ٹھیک کہا ہر کوئی اپنے مطلب سے ہی



میں، میں کو سہ جا رہا ہوں مستقبلاً قیام وہیں رہے گا۔“ نیسہ یہ سن کر دہلی سی گئی۔ کیا یہ لوگ گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ پڑوس پھر خالی ہو جائے گا۔ یا نہیں پھر نازل ہوتی رہیں گی۔ اس نے وضاحت ضروری سمجھی۔

”ٹھیک ہے مالک مکان خود آ کر رہے گا تو مکان کی دیکھ بھال اچھی طرح ہوگی۔“

”میں مکان نہیں چھوڑ رہا ہوں۔ عنبرین بیٹھی ہے، بھائی اس کے ساتھ آ کر رہے گا۔“ اعجاز نے کہا اور دروازے سے ہٹ گیا۔

وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اعجاز سے بات کرے لیکن اس نے سوچا کہ اب وہ دنخ ہو رہا ہے۔ اگر اس وقت بات بگڑ گئی تو نہ جانے جاتے جاتے کیا کر جائے۔ اس وقت اس کا فصرہ ٹھنڈا ہی رکھنا چاہیے۔ خوشی تو اس بات کی تھی کہ اس کا پڑوس اب اس کے لیے محفوظ ہو گیا تھا۔

دوسرے دن سبزی والی گلی میں آیا اور وہ سبزی لینے نکلی تو بے حد خوش تھی۔ اب اعجاز وہاں تھا ہی نہیں جو آ کر پوچھتا بھائی کیا خرید رہی ہیں۔

اسے یہ معلوم ہو رہا تھا جیسے قید سے رہائی ملی ہو۔ بس ایک کاٹا تھا جو کھٹکتا رہتا تھا۔ اعجاز ہمیشہ کے لیے نہیں گیا تھا۔ اسے کبھی نہ کبھی آنا ضرور تھا۔ بس ایک امید تھی کہ شاید آنے کے بعد سدھر جائے۔ پرانی حرفیں چھوڑ دے۔ وہ عنبرین کے پاس مصلحتاً نہیں آتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ راستہ کھل جائے۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ پڑوس آباد ہے۔

اس آزادی کے ساتھ شب دروز گزارتے ہوئے اسے ایک مہینا ہوا تھا کہ اسے وہ خوش خبری مل گئی جس کا انتظار کرتے ہوئے اسے دو سال ہو گئے تھے۔ اس نے یہ خبر سب سے پہلے افتخار کو سنائی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔

”آپ مجھے جھٹلاتے تھے لیکن پڑوس آباد ہونے کا نتیجہ دیکھ لیا۔ سب خوشیوں دور ہو گئیں۔ ڈاکٹروں تک نے کہہ دیا تھا کہ میں ماں نہیں بن سکتی۔“

”کیوں ایسی تو ہم پر تکی کی باتیں کرتی ہو۔ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے اس میں پڑوس کہاں سے آ گیا۔ یہ تو خدا کی مرضی ہے جب چاہے کسی کو اولاد دے دے۔“

”آپ کو پہلے میری کوئی بات ٹھیک لگی ہے جو یہ لگے گی۔ میں پھر بھی یہی کہوں گی کہ پڑوس آباد ہونے سے ہمارے گھر کی محنت تھی ہے۔ وہاں چراغ جلا ہے تو ہمارے گھر کا چراغ روشن ہوا ہے۔“

کے گھر گئے تھے۔ غضب خدا کا میرے لیے تسلی ہے اور دوسری عورتوں کو جھٹلے بانٹتے پھرتے ہو۔“

”عنبرین، ایک آدھ دفعہ ان سے ملاقات ضرور ہوئی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میں انہیں شریف عورت سمجھتا تھا لیکن یہ مجھ پر ایسا گھٹیا الزام لگائیں گی مجھے نہیں معلوم تھا۔ خدا جانے اس کے پیچھے ان کے کیا مقاصد ہیں۔“

”اعجاز صاحب، یہ گھٹیا الزام نہیں بلکہ یہ گھٹیا حرکت کل آپ کر چکے ہیں۔ میں تو آپ کی بیوی کو یہ بتانے آئی تھی کہ وہ آپ کو منح کریں، آئندہ ایسی حرکت نہ ہو۔“

”عنبرین اس عورت کو یہاں سے نکالو۔ یہ تو خطرناک عورت ہے۔ لڑائیاں کروادے گھروں میں۔ مجھے تو یہ سوچنا پڑے گا کہ یہ مکان لے کر میں نے غلطی تو نہیں کی۔ کمال ہے بھی حد ہو گئی۔ اب تو اس کے شوہر سے بات کرنی پڑے گی۔ وہ بھی اگر اس کے ساتھ ملا ہوا نہیں ہے تو ضرور سنے گا۔“

اب وہاں رکنے کا مطلب اپنی مزید بے عزتی کروانے کے مترادف تھا۔ اس نے ان دونوں پر لعنت بھیجی اور وہاں سے نکل آئی۔ گھر پہنچ کر اس کی بے بسی آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہنے لگی۔ اس بے بسی میں اب یہ خوف بھی شامل ہو گیا تھا کہ جانے وہ کس کس طرح افتخار کے کان بھرے۔ جو الزام میں نے اس پر لگائے ہیں وہی الزام وہ مجھ سے منسوب کر دے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا منہ کھولے، میں ہی افتخار کو سب کچھ کیوں نہ بتا دوں۔ اگر مجھے یہ ڈر ہے کہ دونوں مردوں کے درمیان جھگڑا نہ ہو تو میں اسے اپنی قسم دے دوں گی کہ وہ صرف سن لے اور اگر اعجاز کچھ کہے تو اس پر اعتبار نہ کرے۔

وہ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ افتخار کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی گئی اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے اعجاز صاحب کھڑے تھے۔

”آپ کس مٹی کے بنے ہوئے انسان ہیں۔ ابھی اتنی بے عزتی کر کے آئی ہوں اور پھر چلے آئے۔ اب کون سا حقدار لائے ہیں؟“

”مجھے شرمندہ مت کریں۔ میں تو یہ کہنے آیا تھا کہ اپنے شوہر سے کچھ نہ کہیے گا خواہ اول برے ہوں گے۔“

”آپ بھی ایسی حرفیں آئندہ نہ کیجیے گا۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں ویسے بھی کاروبار کے سلسلے



## نہلے کو دھلا

ایک دھوکے باز شخص نے مشہور کر دیا کہ جو شخص اسے سو روپے دے گا، وہ اسے جنت میں جانے کا ٹکٹ دے گا۔ جواب میں اس کے پاس بے تحاشا بے وقوف اور کمزور عقیدے کے لوگوں نے روپے بھیجے۔

ایک روز وہ اپنے کمرے میں نوٹوں کا ڈھیر سجائے اپنی دولت شمار کر رہا تھا کہ ایک شخص کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوا اور بولا۔

”خیردار۔ ساری دولت میرے حوالے کر دو ورنہ.....“

”بکومت۔“ دھوکے باز چلتا یا۔ ”اگر تم نے مجھے لوٹا تو پھر یقین جانو تم سیدھے جہنم میں جاؤ گے۔“

”ہائمن۔“ ڈاکو نے کہا۔ ”میں نے پہلے ہی تم سے جنت کا ایک ٹکٹ لے لیا ہے۔“

انتخاب۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

## کنزلیوں

پولیس۔ ”پارک میں ایسے کیوں بیٹھے ہو؟“

آدی۔ ”ہم دونوں شادی شدہ ہیں۔“

پولیس۔ ”تو گھر میں جا کر اس طرح بیٹھو۔“

آدی۔ ”اس کا خاوند اور میری بیوی برا مانتے ہیں۔“

☆☆☆

بیوی۔ ”اخبار میں خبر ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی موٹر سائیکل سے تبدیل کر لی۔ نہیں آپ تو ایسا نہیں کریں گے؟“

شوہر۔ ”میں اتنا بے وقوف تو ہوا ہی ہوں۔ میں کار سے کم میں بات نہیں کروں گا۔“

☆☆☆

اپنی بیوی کی پسند پر مت خسو کہ تم اس کی پسند ہو۔

اور اپنی پسند پر اتنا مت اتراؤ کہ تمہاری بیوی بھی تمہاری پسند ہے۔

مرسلہ۔ سید محمد الدین اشفاق۔ فتح پور، لہ

”چھا ہا ہا، تم ٹھیک کہتی ہو میری پر دوشن ہوئی ہے شاید اس کی وجہ بھی یہی ہو۔“

”اور نہیں تو کیا۔“

”اس بات پر ایک اچھی سی چائے ہو جائے۔“

”ابھی لاکٹی بنا کر شام کو امی کی طرف بھی جاتا ہے۔“

دن پر دن گزرتے رہے۔ اسے محسوس ہوتا رہتا تھا کہ ہفت پندرہ دن بعد اجازت گھر آتا رہتا ہے لیکن ان کی طرف سے شکایت یا کوئی موقع نہیں ملتا تھا۔ وہ مطمئن تھی کہ جان چھوٹی۔ میری ذرا سی سختی نے اسے سدھرنے پر مجبور کر دیا۔ اب آتے بھی ہیں تو خاموشی سے چلے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کو عزت اس نہیں آتی۔

☆☆☆

ڈیلیوری کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ گھر میں لیسہ کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی ماں دو چار دن کے لیے آجاتی تھی۔ ان کے جانے کے بعد گھر کے کام کاج پھر اسی کو کرنے پڑتے تھے۔ اس نے یہی سوچا کہ وہ افتخار کو لے کر اپنی ماں کے گھر چلی جائے لیکن وہ اس کے ساتھ اس کی ماں کے گھر رہنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اس کے بغیر جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کشمکش میں کچھ دن اور گزر گئے یہاں تک کہ ڈیلیوری کا وقت بالکل قریب آ گیا۔

”تم اسپتال جاؤ گی اس وقت بھی تو مجھے گھر پر اکیلا رہنا پڑے گا۔“

”وہ تو دو تین دن کی بات ہوگی۔“

”میں اس سے زیادہ بھی اکیلا رہ سکتا ہوں۔ دن بھر تو دفتر میں گزر جاتا ہے رات کا کھانا کھا کر آیا کروں گا۔ آکر سو جاؤں گا۔ تمہاری دیکھ بھال تو اچھی طرح ہو جائے گی۔ میری ماں تو تم اپنی ماں کے گھر چلی جاؤ۔“

وہ پھر بھی نہ مانتی تھی لیکن اس کی ماں نے کہا کہ ہمارے خاندان کے دستور کے مطابق پہلے بچے کی ولادت میکیے میں ہوتی ہے اور اگر کسی وجہ سے ایسا نہ ہو سکے تو بچے پر ہماری ہوتا ہے۔ وہ اس باتوں سے بہت ڈرتی تھی لہذا افتخار کے بغیر ہی میکیے جانے کو تیار ہو گئی۔ اب اسے بچے کی ولادت کے چالیس دن بعد میکیے سے واپس آنا تھا۔

☆☆☆

”افتخار صاحب، یہ بھی عجیب لطیفہ ہے۔ ہمیں اس محلے میں آئے اتنے دن ہو گئے ہیں اور آپ سے ملاقات آج ہو رہی ہے اور وہ بھی اتفاقاً۔ آپ اس گھر سے نکل رہے تھے تو مجھے یاد آیا کہ یہ تو میرے گھر کے برابر والا گھر ہے۔“

☆☆☆

سپنس ڈائجسٹ



”آپ لوگوں کو خواہواہ کی زنت ہوگی۔“  
 ”واہ اس میں زنت کی کیا بات ہے۔ ہم میاں بیوی  
 بھی اکیلے پڑے رہتے ہیں۔ آپ کے ساتھ اچھا وقت  
 کٹ جایا کرے گا۔ بس میں نے کہہ دیا ہے آپ انکار نہیں  
 کریں گے۔“

انتظار کو ان کی بات مانتی پڑی۔ جہاں روز کا آنا جانا  
 ہو وہاں تکلف ختم ہو جاتا ہے۔ عنبرین یوں بھی شوخ مزاج  
 واقع ہوئی تھی۔ جلد ہی دونوں میں فی مذاق شروع ہو گیا۔  
 انتظار سوچا کرتا تھا کہ نسیہ ٹھیک کتنی تھی آباد پڑوس  
 واقعی نعمت ہوتا ہے۔ اگر یہ پڑوسی نہ ہوتے تو نسیہ کے بغیر  
 دن کا عذاب مشکل ہو جاتے۔ کھانا تو خیر ہوٹل پر بھی کھا لیا  
 جاتا ہے لیکن گھر جیسا ماحول کہاں بسر آتا ہے۔  
 پڑوس کی گہما گہمی میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ  
 ہوا۔ اسے معلوم ہوا کہ نسیہ اسپتال میں داخل ہو گئی ہے۔  
 وہ اسپتال پہنچا تو یہ خوش خبری اس کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ  
 ایک نئی گا باپ بن چکا ہے۔ دونوں نے مل کر اس کا نام  
 لائبر رکھا۔

اب نسیہ کو چالیس دن مزید اپنی ماں کے گھر رہنا  
 تھا۔ یہ چالیس دن بھی پلنگ جھپکنے گزر گئے، انتظار اسے گھر  
 لے آیا۔ اعجاز صاحب اسی دن کے انتظار میں تھے اب  
 انہیں اپنے منصوبے پر عمل کرنا تھا۔

نسیہ کو آئے ہوئے ہفتہ بھر ہوا تھا کہ وہ عنبرین کے  
 ساتھ انتظار کے گھر پہنچ گیا۔ وہ ایسے ہی وقت کا انتظار کیا  
 کرتے تھے جب انتظار گھر پر نہ ہوں۔ اس وقت انتظار گھر  
 پر نہیں تھا لیکن وہ اکیلا نہیں تھا اس کی بیوی اس کے ساتھ تھی  
 اس لیے نسیہ نے انہیں اندر بلا لیا۔ اعجاز صاحب کی  
 آنکھیں اب پہلے سے بھی زیادہ بے قابو ہو رہی تھیں لیکن  
 نسیہ کو برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ عنبرین بھی پہلے سے زیادہ  
 اجنبیت سے مل رہی تھی۔ وہ نومولود بچی کے لیے پڑے اور  
 کھلونے لے کر آئی تھی۔ نسیہ اس موقع پر یہ کہے بغیر نہ رہ  
 سکی۔

”یہ سب کچھ آپ انتظار کی موجودگی میں لائی ہوئیں تو  
 زیادہ مناسب ہوتا۔“  
 ”ایک ہی بات ہے ملنا تو ہمیں تم سے تھا۔“ عنبرین  
 کے بجائے اعجاز صاحب نے کہا۔  
 ”اگر عنبرین اکیلی آئی ہوتیں تو بات دوسری تھی لیکن  
 آپ بھی آرہے تھے تو انتظار کی موجودگی میں آنا چاہیے تھا۔“  
 ”بہن تمہارا غصہ ابھی کم نہیں ہوا۔“ عنبرین نے

ہئے ہم دونوں ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔“  
 ”میں اسے اپنی نالائقی ہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ سے  
 کبھی ملاقات ہی نہ کر سکا۔“  
 ”مجھے اعجاز کہتے ہیں۔“  
 ”میرا نام انتظار ہے۔“

”اگر آپ کے پاس وقت ہے تو میرا گھر حاضر ہے۔  
 میری بیوی سے بھی مل لیجئے گا اور ایک ایک کپ چائے بھی  
 ہم دونوں کے ساتھ بیٹھ کر پی لیں گے۔ ایک دوسرے کو جاننے  
 کا بھی موقع ملے گا۔“

”اعجاز صاحب، پہل تو مجھے کرنی چاہیے تھی کیونکہ  
 آپ میرے دروازے کے سامنے کھڑے ہیں لیکن مسئلہ  
 یہ ہے کہ میرا گھر اکیلا ہے اور مجھے چائے بنانی نہیں آتی۔“  
 ”آپ اکیلے رہتے ہیں؟“

”ارے نہیں، میری ایک عدد بیوی بھی ہے لیکن وہ  
 آج کل اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔“  
 ”پھر تو میرا حق پکا ہے۔ آئیے آپ کو چائے پلاتے  
 ہیں۔ میری بیوی میکے نہیں گئی ہے۔“  
 ”پھر کبھی حاضر ہو جاؤں گا۔“

”اب میں کوئی بہانہ سننے والا نہیں۔ اب تو آپ  
 رات کا کھانا میرے گھر کھا لیں گے۔ آپ یقیناً ہوٹل کا  
 کھانا کھا رہے ہوں گے لیکن اب نہیں، پڑوسیوں کا بڑا حق  
 ہوتا ہے۔“

انتظار ان کے بے پناہ غلوں کے سامنے بے بس  
 ہو گیا۔ وہ سوچ کر رہی گیا تھا کہ چائے پی کر اٹھ آئے گا لیکن  
 عنبرین نے اس کی جس طرح پڑیرائی کی اور جس بے تکلفی  
 سے ملی اس کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اٹھ جاتا۔ باتوں  
 باتوں میں پتا ہی نہیں چلا اور کھانے کا وقت ہو گیا۔ اسے  
 کھانا بھی وہاں کھانا پڑا۔ کھانے کے بعد ایک مرتبہ پھر  
 باتوں کا بازار چل گیا۔ اسے کہیں دور تو جانا نہیں تھا کہ جلدی  
 ہوتی خوب جی بھر کر باتیں ہوئیں، جب وہ اٹھنے لگا تو  
 عنبرین سامنے آگئی۔

”آپ کو ہم ایک شرط پر جانے دیں گے۔ جب تک  
 نسیہ واپس نہیں آجالی آپ دفتر سے سیدھے ہمارے گھر  
 آئیں گے اور رات کا کھانا کھا کر واپس جائیں گے۔“  
 ”نسیہ کوئی ایک دو روز میں واپس نہیں آجائے  
 گی۔ وہ ماں بننے والی ہے اور ڈیلیوری کے لیے اپنی ماں  
 کے گھر گئی ہے ابھی تو اسے آنے میں وقت لگے گا۔“  
 ”وہ جب بھی آئے آپ کھانا نہیں کھائیں گے۔“



چاہیے۔ تم مانو نہ مانو مجھے تو ایک اچھا دوست مل گیا ہے اور میں اس کی دعوت کر رہا ہوں۔ تیاری کرنا تمہارا فرض ہے، ان کی بیگم بھی ساتھ ہوں گی اس لیے تمہیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔“

یہ موقع تھا کہ اعجاز صاحب کے کروت وہ افتخار کے سامنے بیان کر دیتی لیکن اس نے یہ موقع بھی گنوا دیا۔  
افتخار کا حکم تھا لہذا اس نے تیاری شروع کر دی۔ شام سے پہلے پہلے کھانا بھی تیار کر لیا اور بے دلی سے تیار ہو کر بیٹھ بھی گئی۔ اسے اگر اطمینان تھا تو یہ کہ اعجاز صاحب، افتخار کی موجودگی میں آرہے تھے۔ اسے امید تھی کہ ایسی دیکھی کوئی بات نہیں کریں گے۔

دروازے پر دستک ہوئی افتخار دروازے پر گیا اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ قبیلوں کی آوازیں آئیں تو اسے بھی محن میں آتا پڑا۔ منبرین نے اسے دیکھتے ہی ہانپیں پھیلا دیں اور اس طرح گلے ملی جیسے برسوں کی بچھری ہوئی ہو۔ اعجاز صاحب کی آنکھیں بدستور نسیہ پر تکی ہوئی تھیں۔  
”یار افتخار، ایک گستاخی کروں۔“ اعجاز نے کہا۔  
”یہ کون سی نئی بات ہوگی۔“

”میں تمہاری بیوی کو پہلی بار قریب سے دیکھ رہا ہوں اور یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تمہیں بیوی نہایت خوب صورت ملی ہے۔“

”پرانی بیوی سب کو خوب صورت لگتی ہے۔“  
”میں عمر میں تم سے بڑا ہوں لیکن دیور بننے کو جی چاہتا ہے۔ مذاق کرنے میں۔ را آسانی ہوتی ہے۔ میں تو انہیں بھائی کہا کروں گا۔“ کیا بات وہ ایک پار نسیہ کے سامنے بھی کہہ چکا تھا اب گویا اسے اجازت مل گئی تھی۔ اسی انہی خوشی کے ماحول میں وہ ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔

”بھابی، یہ ایک چغہ ہے جو میں آپ کے لیے لایا ہوں۔“

نسیہ کو وہ وقت یاد آیا جب وہ ایسا ہی ایک بیگٹ اس کے لیے لایا تھا اور اس نے بیگٹ کو اس کے منہ پر دے مارا تھا۔ اب وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے شوہر کے سامنے اسے یہ بیگٹ قبول کرنا پڑا۔ اعجاز صاحب کی شیطانی مسکراہٹ اس سے کہہ رہی تھی کہ کہو نسیہ بیگم جیت کس کی ہوگی؟

اس نے یہ بیگٹ نہ صرف قبول کیا بلکہ مجبوراً شکر یہ بھی ادا کرنا پڑا۔ بات صرف چغہ کی نہیں تھی اسے تو شرمندگی یہ

کہا۔ ”پڑوسیوں کا بڑا حق ہوتا ہے، کسی وقت بھی آسکتے ہیں۔ تمہاری بات بھی رکھ میں گے افتخار صاحب کی موجودگی میں بھی آجائیں گے۔ کون سے دور رہتے ہیں۔“

”اور تم سے تو بہت ہی قریب ہیں۔“ اعجاز صاحب نے پھر بہ تیزی دکھائی۔ نسیہ کو خون کے گھونٹ پی کر خاموش رہنا پڑا۔ نہ صرف خاموش رہنا پڑا بلکہ ان کے لیے اٹھ کر چائے بنانی اور ان کے ساتھ بیٹھ کر بیٹنی بھی پڑی۔

ان کے چلے جانے کے بعد اس نے سکون کا سانس لیا اور یہ سوچنے بیٹھ گئی کہ ان آفتوں سے کیسے بچھا چھڑایا جائے۔ افتخار گھر پہنچا تو اسے یہ بتانا پڑا کہ برابر والی آئی تھیں اور لائبریری کو یہ کپڑے اور کھلونے دے گئی ہیں۔ اس نے جان بوجھ کر یہ نہیں بتایا کہ ان کے شوہر بھی ساتھ آئے تھے۔

”تم بھی کسی وقت چلی جانا۔ اچھے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ پڑوسیوں کا اتنا خیال کون رکھتا ہے۔“ افتخار نے کہا تو نسیہ نے سن لیا۔ ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ جیسے طوفان نے گھر دیکھ لیا۔

”ہمارے نئے پڑوسی ہیں اعجاز صاحب! میں نے انہیں کھانے پر بلا لیا ہے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ کھانے میں کیا ہونا چاہیے؟“  
”آپ نے انہیں کیوں بلایا؟“

”کیوں بلایا کا کیا مطلب ہے بھئی پڑوسی ہیں ہمارے۔ غلط بھی ایسے کہ اب ایسے لوگ ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔ ہزاری بیگی کے لیے کپڑے لے کر آئے تھے۔ تم نہیں تھیں تو انہوں نے میرا خیال بھی بہت رکھا۔ ایک وقت کے کھانے پر بلالوں گا تو قیامت نہیں آجائے۔“  
”میں نے کہہ دیا ہے میں ان کے سامنے نہیں آؤں گی۔“

”عمر میں مجھ سے بھی بڑے ہیں۔ میرے بڑے بھائی کی طرح ہیں اور تم کہہ رہی ہو کہ سامنے نہیں آؤ گی۔ سبزی والے سے پردہ نہیں کرتی ہو اور ان کے سامنے نہیں آؤ گی۔ مل کر تو دیکھو ایسے باغ و بہار آوی ہیں کہ ان کے پاس سے اٹھنے کوئی نہیں چاہے گا۔“

”مجھے معلوم ہے کتنے باغ و بہار ہیں۔“  
”بھئی تم ان کے گھر گئی ہوگی اور انہوں نے تم سے بات نہیں کی ہوگی۔ ایک غیر عورت سے وہ کیا بات کرتے۔ اب وہ آئیں گے تو دیکھنا کتنی باتیں کرتے ہیں۔ ہمارے بڑے ہیں، وقت بے وقت کام آسکتے ہیں ان سے تعلق رکھنا



### پیاری باتیں

☆ اگر بولنے والا لاشعور سے خالی ہو تو سننے والا تاثیر سے محروم رہتا ہے۔  
 ☆ کسی کے بُرا کہنے سے نہ ہم بُرے ہو جاتے ہیں اور نہ وہ اچھا۔  
 ☆ اپنی زبان سے ہر شخص اپنا طرف دکھاتا ہے دوسرے کا عکس نہیں۔  
 ☆ دنیا میں کوئی بھی نقص جاہل نہیں۔ کسی نہ کسی سے کچھ نہ کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔  
 ☆ سوچ گہری ہو تو پہلے کمزور پڑ جاتے ہیں۔  
 ☆ انسان کا کردار ایسی بالائے، اگر گروہ عمل جائے تو تمام موتی بکھر جائیں۔  
 ☆ کوئی آئینہ انسان کی اتنی حقیقی تصویر پیش نہیں کر سکتا جتنی کہ اس کا تنگلو۔  
 ☆ تمہارا راز تمہارا قیدی ہے لیکن افشا ہونے کے بعد تم اس کے قیدی بن جاؤ گے۔  
 ☆ کچھ لوگ نگاہ کی طرح ہوتے ہیں جو اندھیرے میں بھی راستہ دکھاتے ہیں۔  
 ☆ دنیا میں خوشی حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب تک ہم دوسروں کو خوش نہ کریں۔

مرسلہ: ناصر خان، کوئٹہ

### کیک

ایک فقیر نے ایک بڑی کوشی کے باہر بھیک کے لیے آواز لگائی۔ "اللہ کے نام پر روٹی سالن دے دو۔"  
 کچھ دیر کے بعد گیٹ کھلا اور ایک آٹھ سالہ لڑکا باہر آیا اور فقیر سے بولا۔ "بابا! تمہیں روٹی نہیں ملتی؟"  
 بیٹا۔ "روٹی کے لیے ہی تو در در بھیک مانگ رہا ہوں۔" فقیر نے جواب دیا۔  
 لڑکا بولا۔ "بابا اگر روٹی نہیں ملتی تو کیک کھا لیا کرو۔"

مرسلہ: ریاض بیٹ، احسن ابدال

تھی کہ وہ غمگین کے سامنے اس قحطی کا ذکر کر چکی تھی اور اس کے شوہر کو کھری کھری سنا چکی تھی اور اب وہی قحط قبول کر رہی تھی۔ اسے یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ اعجاز صاحب اس جرم میں اکیلے نہیں ہیں، غمگین بھی ان کے ساتھ تھی ہوئی ہے، ورنہ اتنی شکایتوں کے بعد وہ اس کے گھر قدم بھی نہ رکھتی پھر اس نے یہ بھی سوچا کہ جس طرح میں اپنے شوہر سے مجبور ہوں وہ بھی میری خاطر اپنے شوہر سے کیوں بگاڑے۔ کم از کم اتنا تو کر سکتی ہے کہ اپنے رویے سے ظاہر کر دے کہ اسے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ وہ تو اس طرح خوش ہے جیسے اپنے شوہر کی سچ کا جشن منا رہی ہو۔  
 افتخار سے بھی نہایت بے باک مذاق کر رہی ہے۔ کہیں میرا شوہر ہی میرے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ یہ سوچ کر اس کا موڈ بالکل ہی آف ہو گیا۔ میں کیوں اس کھیل کا حصہ بنوں۔  
 افتخار سے اس کی یہ کیفیت بھی نہیں رہ سکی تھی، ان لوگوں کے جاتے ہی افتخار نے اس کے رویے کی شکایت کی۔ "یہ تمہیں کیا ہو گیا تھا ان کے آتے ہی؟"  
 "کچھ بھی نہیں مجھے کیا ہونا تھا۔"

"ذرا اپنے رویے پر غور کرو، اپنے مہمانوں سے کوئی ایسا سلوک کرتا ہے۔"  
 "میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے کیا بد سلوکی کی ان کے ساتھ۔ ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ ان کا دیا ہوا قحط قبول کیا اور کیا کرتی؟"  
 "میں تمہارے رویے کی بات کر رہا ہوں۔ تم سب کچھ کر رہی تھیں مگر بدولی کے ساتھ۔ تمہارا رویہ نہایت سرد تھا۔"

"وہ لوگ پہلی مرتبہ آئے تھے مجھ سے ایک ملاقات میں کسی سے بے تکلف نہیں ہوا جاتا۔"  
 "اوہ تو یہ بات ہے اب تو آنا جانا لگا ہی رہے گا۔ دیکھتا ہوں کتنی بے تکلف ہوتی ہو۔" اس وقت تو بات ٹل گئی لیکن دو دن نہیں گزرے تھے کہ افتخار نے ان کے گھر چلنے کو کہا۔  
 "کیا خیال ہے اعجاز صاحب کی طرف نہ چلا جائے۔"  
 "کیا ضرورت ہے چھوڑیں بھی۔"  
 "آج چھٹی تھی پڑے پڑے پور ہو گیا ہوں کچھ دل ہی بہل جائے گا۔"  
 "دل ہی بہلانا ہے تو کہیں اور چلتے ہیں۔"  
 "کیوں، اعجاز صاحب کی طرف چلنے میں تمہیں کیا



دے۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ اب وقت گزر چکا۔

"افتخار، آپ بہت پوچھتے ہیں کہ اعجاز صاحب کے سامنے میرا رویہ سرد کیوں ہو جاتا ہے یا میں ان کے گھر جانے سے گریز کیوں کرتی ہوں تو اس کی وجہ میں اب آپ کو بتاتی ہوں کیونکہ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ جو آپ کے دوست ہیں ان کی نظر ٹھیک نہیں ہے۔ ان سے جب بھی سامنا ہوتا ہے ان کی آنکھیں میرے جسم کا طواف کرتی رہتی ہیں۔"

"تم ہوش میں تو ہو۔ تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہی ہو۔ وہ میرے بڑے بھائی سے بھی عمر میں بڑے ہیں اور تم ان کے بارے میں ایسے خیالات رکھتی ہو۔"

"تمہارے بڑے بھائی مجھ سے ایسا گستاخانہ نہیں کرتے جیسا وہ کرتے ہیں۔"

"ذائقہ کرنا ان کی عادت ہے۔ اس میں کسی بری نیت کا دخل نہیں ہوتا ہوگا۔"

"افوہ اب میں آپ کو کیسے بتاؤں۔ ان کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ ہمارے گھر ان کا آنا ٹھیک نہیں۔"

"وہ میرے دوست ہیں، میں ان کو منع نہیں کر سکتا۔"

"وہ آئیں شوق سے آئیں لیکن میں ان کے سامنے نہیں آؤں گی۔"

"کیا ہے یا تم تو اس بزرگ آدمی کے پیچھے ہی پڑ گئی ہو۔ ذائقہ تو ان کی بیوی کے ساتھ میں بھی کر لیتا ہوں۔ اس کا یہ مطلب ہو گیا کہ میں....."

"آپ صرف ذائقہ کرتے ہیں آپ کی آنکھوں میں ہوس نہیں ہوتی۔"

"اگر قبول تمہارے ان کی آنکھوں میں ہوس ہے تو ہوا کرے۔ تمہاری نیت تو صاف ہے نا۔ تم کوئی ہتھی نہیں ہو کہ وہ تمہیں بھاگا کر لے جائیں گے۔ وہ آئیں گے بھی اور تمہیں ان کے سامنے آنا بھی پڑے گا۔"

"جو باتیں میرے دل میں تھیں میں نے کہہ دیں۔ آپ کہتے ہیں تو سامنے آ جاؤ گا۔"

اب اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ ان کے سامنے ضرور آئے لیکن کوئی ایسی کمزوری نہ دکھائے جس سے اعجاز کی حوصلہ افزائی ہو۔

افتخار پر ایسا نشہ چڑھا تھا کہ وہ اعجاز صاحب کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ جب آتے تھے، ان کے جانے کے بعد وہ اس کی شکایت کرتی لیکن افتخار اسے

اعتراض ہے؟"

"میں نے آپ کو تو منع نہیں کیا آپ چلے جائیں۔"

"کسی کے گھر اکیلا جانا اچھا لگوں گا۔ تم ساتھ ہوگی تو اور بات ہوگی۔"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، آپ ہو آئیں۔"

"ٹھیک ہے پھر میں ہی چلا جاتا ہوں۔"

وہ تیار ہونے لگا تو نسیہ کو اپنا فیصلہ غلط نظر آنے لگا۔ افتخار کو وہاں اکیلا نہیں جانا چاہیے وہاں نمبرین بھی ہوگی۔ وہ بھی کوئی صحیح عورت نہیں، کبھی نہ کبھی مجھے جانا ہی پڑے گا۔ میں ہمیشہ تو بہانے نہیں کر سکوں گی۔ جب جانا ہے تو آج کیوں نہیں۔ وہ بھی تیار ہوئی اور افتخار کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ اعجاز صاحب کی توجیہ جیسے مراد بر آئی۔ اس وقت تو اپنے گھر میں تھے ویسے بھی شیر بنے ہوئے تھے۔ بڑی ڈھٹائی سے نسیہ کے برابر ہی بیٹھ گئے اور ہنسی مذاق شروع کر دیا۔ اس وقت وہ انہیں کوئی سخت جواب نہیں دے سکتی تھی۔ افتخار کو دکھانے کے لیے ہر مذاق پر ہنسا بھی ضروری تھا۔ اسے تو یہ تک نظر انداز کرنا پڑا کہ اس نے افتخار کی نظر بچا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ بس اتنا کر سکی کہ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

وہ جب تک وہاں رہی اپنے آپ کو کسی بھیڑیے سے بچانے کے لیے سرگرم رہی۔ گھر پہنچی تو افتخار کی زبان پر اعجاز صاحب اور نمبرین کے قصیدوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"تم ٹھیک کہتی تھیں۔ آباؤ پڑوس کی بات ہی اور ہوتی ہے کیا لوگ ملے ہیں ہیں۔"

افتخار کو ان لوگوں نے ایسا شیشے میں اتارا تھا کہ اب ہر شام اس کی وہیں گزرتی تھی۔ مجبوراً نسیہ کو بھی جانا پڑتا تھا۔ کبھی وہ آجاتے تھے۔ نمبرین کو ضرور ساتھ لاتے تھے تاکہ نسیہ کو بھی شریک محفل ہونا پڑے۔ وہ افتخار سے ہنسی مذاق کرتی رہتی تھی اور اعجاز صاحب نسیہ پر ڈورے ڈالنے میں مشغول رہتے تھے۔ اب انہوں نے زبان درازی کے ساتھ ساتھ دست درازی بھی شروع کر دی تھی۔ ذرا موقع ملتا تو وہ نسیہ کا ہاتھ تھام لیتے۔ نسیہ نے کئی مرتبہ سرزنش کی لیکن وہ ماننے والے کب تھے اتنا دھمکیوں پر اترا آتے۔

"نسیہ، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ چپ چاپ میری بات مانو ورنہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ میں کچھ بھی کر بیٹھوں گا۔"

نسیہ کے لیے اب خاموش رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ اب ضروری ہو گیا تھا کہ وہ افتخار پر ان کی حقیقت بھول

سپنس ڈائجسٹ مارچ 2015

COPIED FROM WEB



## Oh my God

ڈاکٹر جاسن اور آپور گولڈ اسمتھ انگریزی ادب کے نہایت مشہور ادیب اور ہم عصر گزرے ہیں۔ ان کے زمانے میں یورپ میں ٹھکانہ نیالات کا زور بہت ہو گیا تھا۔ یہ دونوں تردید الخاد کے متعلق ایک بلند پایہ اور معرکہ الآرا کتاب کی تصنیف میں مصروف تھے کہ ان دنوں ایک ٹھ (خدا کے وجود کا سگر) وہاں آ گیا اور تردید الخاد کی تصنیف کا ذکر سن کر ان کی حماقت پر ہنس۔ ڈاکٹر جاسن ایک غیر معمولی قاسم، اور گرائڈیل جوان تھے۔ ناراض ہو کر بوٹ سے اس کے گھنٹے پر ٹھوکر لگائی تو اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے۔ (oh my God) ڈاکٹر نے کہا۔ یہ ہے وہ خدا جس کا تم انکار کرتے ہو۔

مرسلہ۔ عاطف شاہین 18، اڈہ ارونی

لائب بے خبر سو رہی تھی۔ وہ اس کے برابر لیٹ گئی پھر اس خیال سے کانپ گئی کہ اعجاز صاحب کہیں بیڈروم میں نہ آجائیں۔ اس نے سوچا وہ ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ جائے وہ کھا تھوڑی جائیں گے۔ اگر افتخار آگئے تو وہ اسے میری بد تمیزی سمجھیں گے کہ میں ان کے دوست کو بٹھا کر خود سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اس نے جلدی جلدی بالوں میں کنگھی پھیری اور ڈرائنگ روم میں پہلی گئی۔

”آپ کی بیٹی سو گئی؟“

”جی ہاں۔“

”آپ ہیں بڑی ہوشیار۔ بیٹی کو سلا کر آئی ہیں تاکہ ہمیں مکمل تنہائی مل سکے۔“

”اعجاز صاحب، آپ ابھی خاصی عمر کے آدمی ہیں۔ آپ پر یہ باتیں اور ایسی حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔ پلیز آپ یہاں آیا کریں تو شرافت سے آیا کریں۔“

”آپ کہیں تو بالکل ہی نہ آیا کروں۔“

”یہ اور بھی اچھا ہوگا۔“

”آپ یہ اخبار افحادیں اور خود اپنے بیڈروم میں جائیں۔ افتخار آئے گا تو میں اس سے بات کر لوں گا۔“

نسیب نے سوچا چلو تم روٹھے ہم چھوٹے۔ وہ اٹھی اور اخبار ان کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے اخبار کے بھانے اس کی کلائی پکڑی اور اس زور کا بھٹکا دیا کہ وہ ان کی گود میں جا گری۔ خوف سے اس کی آنکھیں پٹی ہوئی تھیں پھر

جھلا تار پتا تھا۔ اس کی اچھی بھلی زندگی میں زہر کھل گیا تھا۔ روز اس کے اور افتخار کے درمیان جھگڑا ہوتا تھا۔ ٹنگ آکر اس نے وہ بات بھی کہہ دی جو اب تک اس کی زبان پر نہیں آئی تھی۔

”آپ جسے اتنا پارسا سمجھ رہے ہیں وہ صرف مذاق نہیں کرتا، آپ کی بیوی سے دست درازی بھی کرتا ہے۔ آپ کو میں یہ بھی بتا دوں کہ اس نے پہلے مجھے تھم دینے کی بھی کوشش کی تھی جو میں نے اس کے منہ پر دے مارا تھا پھر اس نے آپ سے دوستی کاغھی تاکہ گھر میں ٹھس سکے۔ وہ اس میں کامیاب ہو گیا اور آپ آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔“

”ابھی بات اونچی رکھنے کے لیے اس شریف آدمی پر کوئی اور الزام ہوتا وہ بھی لگا دو۔ اگر تم بھی نہیں تو اسی وقت بتاتیں جب یہ معاملات ہو رہے تھے۔ اب ان کے لیے اٹھ کر نہیں چائے بنانی پڑتی ہے تو یہ کہانیاں ٹھن لیں۔“

”افتخار یہ کہانیاں نہیں ہیں میرا یقین کرو۔“

”میں نے یقین کیا میرے باپ دادا نے یقین کیا۔ میں انہیں منع کروں گا اب وہ یہاں نہیں آئیں گے۔“

اس نے منع کیا یا نہیں بہر حال اتنا ضرور ہوا کہ دوسرے ہی دن اعجاز صاحب آدھکے۔ وہ اس وقت لائبہ کو سلانے کے لیے لیٹی تھی اور خود اس کی بھی آنکھ لگ گئی تھی کہ دروازے پر تیل ہوئی۔ افتخار کے آنے کا وقت ہو گیا تھا لہذا وہ سمجھی کہ افتخار آ گیا۔ نیند میں چلتے ہوئے دروازے پر گئی اور یہ پوچھے بغیر کہ دروازے پر کون ہے دروازہ کھول دیا اور اگلے قدموں واپس ہو گئی۔ تقریباً گھنٹہ تک آگئی تھی کہ لاشعوری طور پر پلٹ کر دیکھا اور اس کے ہوش اڑ گئے۔ یہ افتخار نہیں اعجاز صاحب تھے جو اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔

”معاف کیجئے گا میں نے دیکھے بغیر دروازہ کھول دیا اور نہ ضرور یہ کہتی کہ ابھی افتخار نہیں آئے ہیں۔ جب وہ آجائیں تو آئیے گا۔“ نسیب نے کہا۔

”ارے ہم اب غیر تو تھوڑی رہے ہیں۔ افتخار بھی آجائیں گے۔ اس وقت تک ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“

”میں اس وقت لائبہ کو سلانے کے لیے لیٹی تھی۔“

”کوئی بات نہیں۔ وہ سو جائے گی تو اور بھی اچھا ہے آپ جلدی سے اسے سلا کر ڈرائنگ روم میں آجائے۔“

اعجاز صاحب نے اس کے جواب کا افتخار بھی نہیں کیا اور ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ نسیب بیڈروم میں آگئی۔



اس نے انہی پہنی آنکھوں سے دیکھا کہ افتخار ڈرانگ روم میں داخل ہوا۔ اعجاز صاحب کی گرفت بھی ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ بڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”دیکھ لیجئے اپنے دوست کے کرتوت! اس نے مجھ پر مجرمانہ حملہ کیا ہے۔“

اس وقت اعجاز صاحب بھی دہاڑے۔ ”اس نے گلی سے مجھے آواز دے کر بلایا۔ میں سمجھا کہ تم گھر پر ہو میں آ گیا پھر اس شاطر عورت نے میری ساوگی سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ تم مجھ ہی کو مجرم سمجھو گے بدنام تو مروی ہوتا ہے۔“

”پلیز آپ اس وقت چلے جائیں۔“

اعجاز صاحب سر جھکا کر ڈرانگ روم سے نکل گئے اور افتخار ریڈ روم میں چلا آیا۔ نسیم بھی اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔

”میں نے آپ سے پہلے ہی نہیں کہہ دیا تھا کہ آپ کے یہ دوست اچھے کردار کے حامل نہیں۔“

”بالکل کہا تھا اور اسی لیے کہا تھا کہ اگر کبھی پکڑی جاؤ تو الزام انہی پر آئے۔ منبرین نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ تم اس کے شوہر پر ڈورے ڈال رہی ہو مگر مجھے تم پر اعتماد تھا۔ تم نے آج وہ اعتماد بھی ختم کر دیا۔“

”افتخار، تمہیں اس عورت پر یقین ہے مجھ پر نہیں۔“

”سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی تم پر یقین کر لوں۔ وہ دیوار پھانہ کر اندر نہیں آئے ہوں گے۔ تم نے دروازہ کھولا ہوگا تو وہ آئے تم اتنی جلدی میں تھیں کہ دروازہ بند کرنا بھی بھول گئیں پھر بھی کہتی ہو یقین کر لوں۔ وہ تو خیر غیر جہاں ان سے کیا شکوہ تم تو میری امانت تھیں اور پھر جب دسترخوان کی طرح خود بچھ نہیں تو کسی کا کیا تصور۔“

”آپ میرا یقین کریں۔ میں بھی تمہی آپ آئے ہیں۔ میں نے دروازہ کھول دیا اور وہ اندر چلے آئے۔“

”بس اب بکو اس بند کرو۔ اب میں سمجھا کہ تمہیں پڑوس آباد ہونے کی اتنی فکر کیوں تھی۔ تمہیں یہ کھیل کھیلتا تھا۔“

”میں تمہاری بیٹی کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔“

”یہ میری بیٹی نہیں ہے۔ دو سال تک تمہاری اولاد نہیں ہوئی اور پڑوس آباد ہوتے ہی اولاد ہو گئی۔ کیا مطلب ہے اس کا۔“

”بس افتخار، اب ایک لفظ بھی آگے کہا تو منہ نوج لوں گی تمہارا۔ تمہاری بیوی کی عزت پر کسی نے ہاتھ ڈالا

ہے اور تم اس کی حمایت کر رہے ہو۔“

”کس منہ سے خود کو میری بیوی کہتی ہو، چالاک عورت۔“ افتخار نے نسیم سے منہ پر اتنی زور کا پھینکا مارا کہ وہ بیڈ پر گر گئی۔

اتنا شور و غل ہوا تو لاہ پناٹھ گئی، نسیم نے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھالیا۔

”افتخار اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میری غلطی ہے تو بھی مجھے معاف کر دیں۔ اس معصوم ادا اسطے مجھے معاف کر دیں۔“

”میں تم دونوں کا دُخو اپنے گھر میں نہیں دیکھ سکتا۔ جیسی ماں، بیٹی بھی ویسی ہی ہوگی۔ اسے اٹھاؤ اور میری بلا سے جہاں چاہو چلی جاؤ۔“

”جب آپ کو مجھ پر اعتماد ہی نہیں تو یہاں رہنے کا فائدہ بھی کیا۔ میں امی کے مہر جا رہی ہوں، اب تم خود لینے آؤ گے تو آؤں گی۔“

افتخار اتنے غصے میں تھا کہ اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ جھجلا کر کمرے سے نکلا اور ڈرانگ روم میں جا کر بیٹھ گیا۔ نسیم نے اپنے کپڑے اپنی میز پر رکھے تھوڑا بہت جو زیور تھا وہ ساتھ لیا اور افتخار کو بتائے بغیر گھر سے نکل گئی۔

”ماں، تم نے تو کہا تھا کہ جو پڑوس آباد نہیں ہوتے وہاں بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ مجھ پر تو پڑوس آباد ہونے پر بلائیں نازل ہو گئیں۔“

اس نے ماں کو پوری بات بتائی۔ ماں کا اصرار تھا کہ وہ اس کے ساتھ چلے۔ وہ افتخار کی غلطی دور کرنے کی کوشش کرے گی لیکن وہ اتنے غصے میں تھی کہ خود بھی نہیں گئی اور ماں کو بھی روک لیا۔

اس کا خیال تھا کہ جب افتخار کا حصہ اترے گا اور اپنی غلطی کا احساس ہوگا تو وہ خود اسے لینے آئے گا لیکن ایسا ہوا نہیں۔

دن پر دن گزرنے لگے پھر ایک دن وہ اپنی ماں کے ساتھ اس کے گھر پہنچ گیا۔ وہ خوش ہو گئی کہ شاید وہ اسے لینے آیا ہوگا لیکن معاملہ سمجھ اور تھا۔ ایک مرتبہ پھر پچھلی باتیں دہرائی گئیں۔ افتخار کی ماں نے صاف کہہ دیا کہ وہ ایسی بد کردار بیوی کو اپنے بچے کے ساتھ نہیں رہنے دیں گی۔ نسیم کی ماں نے بہت خونخوار کی، بڑے ہاتھ جوڑے لیکن افتخار نے اسے طلاق دے دی۔

”طلاق کے باقاعدہ کاغذات تمہیں چند روز میں مل



”ہیں سے اتر کر بھی اچھا خاصا پیدل چلنا پڑتا ہے  
تھک مٹی ہوگی۔“ نسیم نے اس کا جھوٹ مزید پکا کرنے  
کے لیے کہا۔  
”اور نہیں تو کیا۔“

”میری تربیت ایسی تو نہیں ہے کہ تم مجھ سے  
جھوٹ یونو۔“

”اس میں جھوٹ کیا ہے امی۔“ لائبہ اپنا دفاع  
کر رہی تھی لیکن اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔  
”وہ لڑکا کون ہے جو تمہیں اپنی کار میں یہاں تک  
چھوڑ کر گیا ہے؟“

”تو آپ نے اسے دیکھ لیا؟“  
”ہاں اور یہ بھی دیکھ لیا کہ تم نے مجھ سے جھوٹ  
یولا۔“

”وہ میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔“  
”وہاں اور لڑکے بھی پڑھتے ہوں گے۔ وہ سب  
تمہیں چھوڑنے کیوں نہیں آتے؟“

”فرحان سے میری دوستی ہے سب سے نہیں۔“  
”سب سے کیوں نہیں؟“

جائیں گے۔ لائبہ میری بیٹی نہیں لیکن پھر بھی رحم کھا کر کچھ نہ  
کچھ اس کے لیے تمہیں دیتا ہوں گا۔“

”مجھے تمہارے چند کپڑوں کی ضرورت نہیں۔ اپنی  
پتی کو میں خود پال لوں گی۔ اب آپ یہاں سے  
تشریف لے جاسکتے ہیں۔“ افتخار کی سنگدلی نے اس  
کی آنکھوں میں آئے آنسو بھی نہ دیکھے اور اپنی ماں کو  
لے کر چلا گیا۔

وہ تو مطمئن تھی لیکن خاندان والوں کو چین کہاں۔  
الزام اسی پر آیا۔ ہر زبان بھی کبھی نظر آ رہی تھی کہ کوئی  
ایسی بات ہوگی کہ میاں نے چھوڑ دیا۔ بیٹی تک کی پروا  
نہیں کی۔ قریبی رشتے داروں تک نے اس سے ملنا  
چھوڑ دیا پھر معلوم ہوا افتخار بیرون ملک چلا گیا ہے۔ بیٹی  
کے نام پر جو چند پیسوں کا آسرا ہو سکتا تھا وہ بھی نہ رہا۔  
اس نے ایک اسکول میں نوکری کر لی اور اپنی بیٹی کی  
پرورش میں لگن ہو گئی۔

☆☆☆

وہ کسی کام سے دروازے پر گئی تھی کہ اس نے سرخ  
رنگ کی ایک کار دیکھی جو اس کے ۱۰۰۰ روپے سے کچھ فاصلے  
پر آ کر رکی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کی نظریں اس گاڑی پر  
تک گئیں اور پھر دیکھنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ اس کی گاڑی سے  
اس کی بیٹی لائبہ اترتی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلا اور  
ایک لڑکا باہر آیا۔ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر لڑکا  
گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔ نسیم نے دروازہ  
بند کیا اور دروازے سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر میں  
دروازے پر لگی تھل بکنی ..... اس نے آگے بڑھ کر  
دروازہ کھول دیا۔

لائبہ کتابیں پھینک کر غسل خانے میں ٹمس گئی۔ نسیم  
نے کھانا لگا دیا۔ لائبہ یونیورسٹی سے آتے ہی کھانا مانگتی تھی۔  
نسیم خیال رکھتی تھی کہ کھانے میں دیر نہ ہو۔ کھانے کے بعد  
بہت لائبہ آرام کے لیے بستر پر لیٹی تو نسیم اس کے پاس  
”کر بیٹھ گئی۔“

”بیٹی، آج کچھ دیر نہیں ہو گئی تھی؟“  
”امی آپ کو چاہے ہوں میں کتنا رش ہوتا ہے۔  
پانڈان پر کھڑی ہو کر آئی ہوں پھر بھی دیر ہو گئی۔“ نسیم  
کے آنسو دل میں اترنے لگے۔ لائبہ نے جھوٹ کا سہارا لیا  
تھا۔ آدمی جھوٹ اسی وقت بولتا ہے جب اس نے کسی ایسے  
راتے کا انتخاب کیا ہوتا ہے جسے وہ خود سمجھتا ہو کہ مناسب  
نہیں ہے۔

علی سفیان آفاقی مزونم کی آخری تحریر

# فلمی الفیلمہ

قسط 237

سرگزشت شمارہ مارچ 2015ء میں ملاحظہ کریں  
اسے یقیناً آپ محفوظ رکھنا پسند کریں گے



”اس لیے کہ فرحان کو میں پسند کرتی ہوں۔“

”اور وہ؟“

”ظاہر ہے وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے۔“

”اس سے کہتا اپنے والدین کو میرے پاس بھیجے۔“

”وہ کس لیے امی؟“

”احتیاط کا تقاضا ہے کہ میں یہ بات اس کے والدین تک پہنچاؤں۔ میں نے تمہارے باپ کے مرنے کے بعد تمہاری پرورش بڑی احتیاط سے کی ہے۔ جن بچوں کے سروں پر باپ کا سایہ نہیں ہوتا ان پر الزام لگتے دیر نہیں لگتی۔ لوگ اندھے نہیں ہیں جو تمہیں اس کے ساتھ آتے ہوئے نہ دیکھتے ہوں۔ اگر وہ تمہیں پسند کرتا ہے تو اس کے والدین کی پسندیدگی بھی ضروری ہے۔“

”امی آپ بھی کس زمانے کی بات کر رہی ہیں۔ یونیورسٹیوں میں دوستیاں ہوتی ہیں والدین سے پوچھ کر نہیں ہوتیں۔“

”اگر یہ محض دوستی ہے تو تم کل سے یونیورسٹی نہیں جاؤ گی۔“

”امی ابھی تو وہ پڑھ رہا ہے۔“

”یہ سب باتیں اس کے والدین سے ہوں گی۔ اس سے کہتا اپنے والدین کو میرے پاس بھیجے۔ میں صرف ایک ہفتہ دے رہی ہوں اس کے بعد کچھ نہیں۔“

”امی آپ تو.....“

”جو میں نے کہا ہے اس پر عمل کرو۔“

لائبہ نے اپنا ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے یہ باتیں ناگوار لگی ہیں۔

نسیہ کو دکھ تو ضرور ہوا تھا کہ اس نے لائبہ کو اداس کر دیا لیکن..... فصاحت کے لیے یہ ضروری تھا۔ اسے یقین تھا کہ یونیورسٹی کی دوستیاں کھیل ہوتی ہیں۔ وہ اپنے والدین کو نہیں لاسکے گا۔ میری بات بھی رہ جائے گی اور لائبہ کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ لائبہ پر اس بڑے کی حقیقت کھل جائے گی۔

”مجھے توقع نہیں تھی کہ اس کے والدین آئیں گے۔“ ایک دن لائبہ یونیورسٹی سے آئی تو بہت خوش تھی۔ اس نے آتے ہی خوش خبری اپنی ماں کو بھی سنادی۔ ”فرحان کے والدین کل ہمارے گھر آ رہے ہیں۔“

”بہت اچھی بات ہے لیکن ایک بات ابھی سے بتادوں کہ انکار کروں یا اقرار دے میرا اختیار ہوگا۔“

”میں آپ کے حکم سے باہر نہیں ہوں۔ جو آپ کہیں

گی وہی ہوگا۔“

اس نے کہنے کو کہہ تو دیا لیکن دل ہی دل میں سوچا وہ اپنی بیٹی کی خوشی ضرور پوری کرے گی۔ وہ لوگ جیسے بھی ہوئے لڑکا تو اچھا ہے وہ انکار نہیں کرے گی۔

دوسرے دن وقت مقررہ پر گاڑی کے پارن نے اسے چونکا دیا۔ لائبہ کا دروازے پر جانا مناسب نہیں لگا۔

وہ خود دروازے پر گئی۔ سرخ رنگ کی وہی گاڑی دروازے پر کھڑی تھی جو وہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ ایک لڑکا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ یہ وہی لڑکا تھا جو لائبہ کو چھوڑنے آیا تھا۔ جو مرد گاڑی سے باہر آیا وہ بوڑھا ہو چکا تھا لیکن وہ

اسے ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ اعجاز صاحب تھے جن کی وجہ سے وہ اس حال کو پہنچی تھی۔ منبرین کو پہچاننے میں

بھی اسے کوئی خاص وقت نہیں ہوئی۔ اس کے جی میں آئی تھی کہ وہ انہیں دروازے سے ہی واپس لوٹا دے بلکہ اسی طرح ذلیل کر کے لوٹائے جیسے وہ اپنے گھر سے نکالی گئی تھی

لیکن اسے لائبہ کی خوشی کا خیال آ گیا۔ اعجاز صاحب گاڑی سے اتر کر دروازے تک آ چکے تھے اور غالباً نظر کمزور

ہونے کی وجہ سے پہچان نہیں سکے تھے۔ منبرین بھی اسے غور سے دیکھ ضرور رہی تھی لیکن پوری طرح پہچان نہیں سکی تھی۔ فرحان انہیں چھوڑ کر جا چکا تھا۔ اسے ان لوگوں کو لے

کر ڈرائیونگ روم آنا پڑا۔

”اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو تم نسیہ ہو؟“ منبرین نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اعجاز صاحب نے اپنا چہرہ

صاف کیا۔

”میں تمہیں کیسے بول سکتا ہوں، پہلے نظر میں تمہیں پہچان گیا تھا۔ اس لیے ظاہر نہیں کیا کہ کہیں تم ہمیں

دروازے سے ہی نہ لوٹا دو۔“

”جو مزہ گھر میں بلا کر نکالنے میں ہے دروازے سے

نوتانے میں کہاں۔“

”نسیہ، تمہاری ناراضی بجا ہے بعض غلط فیصلوں نے تمہارا گھر خراب کر دیا۔ تم ہمیں جو سزا چاہے دے لو۔“

اعجاز صاحب کی جگہ منبرین نے جواب دیا۔

”سزا... میں کیا دے سکتی ہوں بس اتنی گزارش ہے کہ یہ سزا دے کر یہاں سے باہر چلی جاؤ کہ تمہیں لائبہ پسند نہیں آئی۔“

”ایسا نہ کہو، لائبہ میری نہیں میرے بیٹے کی پسند ہے۔“

”تو پھر یہ سمجھ لو میری طرف سے انکار ہے۔“



ہوں۔ میں تمہیں سوچنے کے لیے وقت دے رہی ہوں۔  
 ہو سکتا ہے تمہارا انکار، اقرار میں بدل جائے۔“  
 ”میں نے اپنا فیصلہ بدل لیا ہے۔ مجھے یہ رشتہ قبول  
 ہے۔ لائبہ کے امتحان ہو جائیں تو پھر ہم بیچہ کر تاریخ طے  
 کر لیں گے۔“ عنبرین کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو الفاظ اس  
 نے سنے ہیں، نسیہ ہی کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ اعجاز  
 صاحب بھی ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔  
 ”میں یہ سمجھوں گا کہ تم نے میرے سابقہ گناہ  
 معاف کر دیے ہیں۔“

”اعجاز صاحب، میں وہ منظر کبھی نہیں بھول سکتی جب  
 آپ کی وجہ سے میرا شو ہر جگہ سے چھین گیا تھا۔ میری موت  
 ہی شاید یہ منظر مجھ سے چھین سکے۔ میں آپ کو معاف کرتی  
 ہوں محض اس لیے کہ اب میری بیٹی کی زندگی آپ کے بیٹے  
 سے وابستہ ہے۔“

اعجاز صاحب کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اس  
 طرح کمرے سے نکلے جیسے اقرار نہیں انکار ہوا ہو۔

لائبہ کے امتحان ہونے والے تھے۔ امتحانوں  
 کے بعد اس کی شادی تھی۔ تہ ریاں تو ابھی سے کرنی  
 تھیں۔ نسیہ کو یہ دکھ گھن کی طرح چالنے جا رہا تھا کہ  
 اعجاز صاحب سے اس کی رشتے داری ہونے والی ہے۔  
 اس نے سوچ لیا تھا کہ اس نے اس کا دیا ہوا تحفہ قبول  
 ضرور کر لیا ہے لیکن ایک دن وہ اس تحفے کو ان کے منہ پر  
 ضرور مارے گی۔

وقت گزرتا رہا اور شادی کا دن آ گیا، اس دوران  
 کئی مرتبہ اعجاز صاحب سے اس کا سامنا ہوا تھا اور ہر  
 مرتبہ اسے یوں لگا تھا جیسے غصے کے پیچھے چھپی آنکھیں  
 اب بھی بغاوت پر تکی بیٹھی ہیں۔ ان کے ہاتھ اب بھی  
 کوئی تحفہ دینے کے لیے بے تاب ہیں۔ لائبہ کی شادی کو  
 صرف ایک ہفتہ ہوا تھا کہ محلہ والوں کے لیے ڈریسے  
 اسے یہ اطلاع ملی کہ اس کی ماں نے خودکشی کر لی۔ اعجاز  
 صاحب اس وقت گھر پر ہی تھے۔ انہوں نے عنبرین  
 اور لائبہ کو ساتھ لیا اور نسیہ کے گھر پہنچ گئے۔ لاش کے  
 سر ہانے ایک پرچہ رکھا تھا جس میں لکھا تھا۔  
 ”اس گھر میں آباد نہ ہونا جن کے پڑوس آباد  
 ہوں۔“

اعجاز صاحب کے سوا اس تحریر کا ملبوم کوئی بھی نہیں  
 سمجھ سکا تھا۔

✱

”میں یہ بھی سنتا نہیں چاہوں گی۔“ عنبرین اپنی جگہ  
 سے اٹھی اور اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ”ایک قطعی ہم سے  
 ہوئی تھی دوسری تم کر رہی ہو۔ یہ ہزاری نہیں ہمارے بچوں  
 کی زندگی کا سوال ہے۔“

”میری غیرت کا بھی سوال ہے۔ مجھے یہ کہنے دو  
 عنبرین کہ تمہارے شوہر نے میرا شوہر چھین لیا۔ اب  
 میں کس منہ سے کہوں گی کہ وہی شخص میری بیٹی کے شوہر کا  
 باپ ہے۔“

”نسیہ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے۔ نہ ہم اپنی زبان پر  
 لائیں گے۔ یہ وعدہ بھی کرتے ہیں کہ یہ شادی کروا اعجاز حتی  
 الامکان کوشش کریں گے کہ تمہارے سامنے نہ آئیں۔“

”یہ کبھی میرے سامنے نہ آئیں لیکن ان کی  
 آنکھیں بیس سال سے میرا پیچھا کر رہی ہیں۔ آئندہ بھی  
 کرتی رہیں گی۔ میں یہ بھی نہیں چاہوں گی کہ یہ آنکھیں  
 میری بیٹی کو دیکھیں۔ میری طرف سے انکار ہے۔ آپ  
 لوگ جا سکتے ہیں۔“

”نسیہ دیکھ لو، تم اپنی بیٹی کی خوشیوں کو قتل کر رہی  
 ہو۔“

”مجھے دکھ ہے لیکن میں اس کے سوا اور کر بھی کیا  
 سکتی ہوں۔“

باتیں اور بھی ہو سکتی تھیں لیکن اسی وقت لائبہ ناشتا  
 لے کر آئی اور عنبرین کے اصرار پر اسے وہاں بیٹھنا بھی  
 پڑا۔ نسیہ اس سے بھی یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ ناشتا اٹھا کر  
 لے جاؤ۔

نسیہ نے گردن جھکائے بیٹھی لائبہ کی طرف دیکھا۔  
 کیا میں اتنی مفلس ہو گئی ہوں کہ اپنی بیٹی کو اس کی پسند کا تحفہ  
 بھی نہ دے سکوں۔ میں نے اسے زندگی میں کیا دیا ہے  
 اب اسے یہ تحفہ دینے سے بھی انکار کر رہی ہوں۔ اعجاز  
 صاحب کا دیا ہوا تحفہ میں نے ان کے منہ پر دے مارا تھا  
 لیکن وہی تحفہ مجبوراً قبول بھی تو کرنا پڑا تھا۔ اس وقت بھی  
 مجبوری ہے۔ عنبرین ٹھیک ہتی ہے کہ مجھے لائبہ کی خوشی کا  
 خیال رکھنا چاہیے۔ میں اب نوعمر لڑکی نہیں ہوں۔ اعجاز  
 صاحب بھی بڑھاپے کی منزل میں ہیں۔ میں اگر ماضی کو دفن  
 کر دوں تو لائبہ کی خوشی خرید سکتی ہوں۔

لائبہ کمرے سے اٹھ کر جا چکی تھی۔ عنبرین اور  
 اعجاز صاحب انکار سن چکے تھے اب ان کا وہاں بیٹھنا  
 فضول تھا۔

”اچھا بہن، ہمیں اجازت دو میں نا امید نہیں ہوتی



# سفر

منظرِ امان

جسم متحرک رہے یا ساکت... زندگی کا سفر جاری رہتا ہے کیونکہ خواہشوں کا انبار ہو یا خوابوں کی رنگینیاں انسان کو مسلسل سفر پر مجبور کر دیتی ہیں لیکن... یہاں عجیب صورت حال تھی، نہ خواہشوں کی زنجیر تھی نہ خوابوں کی کشش... اس کے باوجود قدم کسی پڑاؤ پر ٹھہر نہیں پاتے تھے... تھکن غالب آتی تھی نہ بے زاری قید کرتی تھی۔ ہر اک موڑ پر منزل کا گمان ہوتا رہا لیکن اس کا تعین کرنا ان بے خبر مسافروں کے بس کی بات نہ تھی، بے شک کوئی بھی سفر علم، تجربات و مشاہدات اور سوچ کو گہرائی دیتے ہیں اس کے باوجود وہ کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھے۔ جب دل کسی کے ساتھ کا متمنی ہو جائے تو ہر تمنا اسی کی خوشیوں سے منسوب ہو جاتی ہے۔ اس کے دل کی بھی ہر دمڑکن بس اپنے محبوب کا ساتھ چاہتی تھی مگر تقدیر کی بے حسی کہ اسے کسی اور ہی جہاں میں لے جا کر بسا دیا۔ ایسے میں دل لہو نہ برسائے تو کیا کرے... اتنی طویل مسافت کے بعد جب مسافر کو خالی ہاتھ لوٹنا پڑے تو کیسے کوئی اس کے درد کی شدتوں کو محسوس کر سکتا ہے۔ وہ بھی محبوب کے دہار سے نارسائی کا غم لے لوٹا اور اپنی ہی ذات کی بھول بھلیوں میں کہیں گم ہو گیا کہ شاید مقدر کو یہی منظور تھا۔

دشٹیوں کے حصار میں تو ایک صحرا نور کی دلہ روزِ داستان

سوائے بادلوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سورج کی کرنیں ان بادلوں کو چاندی جیسا روپ دے رہی تھیں۔ میں کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا۔ مجھے طیارے کے اندر کے ماحول سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

کیونکہ خود میرے اندر یادوں کا ایک سفر بہت تیزی سے طے کر رہا تھا۔ مہربان یادیں۔ بے رحم یادیں..... میرے پاس اب یادیں ہی تو رہ گئی تھیں۔ میں نے اپنے آپ کو فراموش کرنے اور غزالہ کی یادوں کی پرچھائیوں سے نجات کے لیے اتنی دور کا سفر اختیار کیا تھا۔ غزالہ میری محبت تھی۔ میری بیوی تھی۔ ہم نے ایک ساتھ زندگی کے کئی مراحل طے کیے تھے۔ کالج جاتے رہے۔ ایک ساتھ ڈاکٹر ہوئے، ایک ساتھ ہاؤس جاب کی پھر ایک ساتھ ایک بڑے ہاسپٹل میں جاب بھی کر لی۔

زندگی اور خدا کی بے شمار مہربانیاں ہمارے ساتھ

سپنس ڈائجسٹ 260 مارچ 2015ء

COPIED FROM WEB





COPIED FROM WEB





"صنڈر تم جانتے ہو کہ میں اب کہیں آتا جاتا نہیں ہوں۔"  
 میں نے کہا۔ "میرے لیے دنیا میں ایسا کچھ نہیں رہ گیا۔"  
 "بے وقوفی کی باتیں مت کیا کرو۔ کسی کے جانے  
 سے دنیا ختم نہیں ہوتی۔"

"غزالہ کسی میں سے نہیں تھی۔ وہ صرف غزالہ تھی۔"  
 "جانتا ہوں۔ اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ تم  
 نے بھائی کی موت کے بعد خود اندازہ اختیار کیا ہے، وہ سراسر  
 غلط ہے۔ باگل پن ہے۔ تم کسی ایک کی یاد کے لیے نہ جانے  
 کتنوں کو دکھ دے رہے ہو۔"

"اچھا بھائی۔ کیا چہ چتے ہو تم؟" میں نے اس کی  
 باتوں سے استا کر پوچھا۔

"چلو میرے ساتھ۔" اس نے کہا۔  
 پھر میں نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہا  
 ہے۔ وہ مجھے ایک شاندار سے دفتر میں لے آیا تھا جہاں  
 ادویٹر عمر کا ایک باوقار آدمی وجود تھا۔ جس کا نام اوبا ٹا تھا۔  
 اس کا نام افریقی جیسا تھا لیکن وہ کسی صورت بھی  
 افریقی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ اپنی ہی طرف کا بندہ معلوم  
 ہوتا تھا۔

ہم اس کے دفتر کے خوبصورت کمرے میں بیٹھے  
 تھے۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مسٹر احمر!  
 سب سے پہلے تو میں آپ کی وہ حیرت دور کروں جو میرا  
 نام سن کر ہوئی ہوگی۔"

"جی ہاں جناب۔" میں نے اعتراف کیا۔ "مجھے  
 واقعی حیرت ہوئی ہے۔"

"اوبا ٹا میرا سر تیم ہے۔" اس نے بتایا۔ "ویسے  
 میرا نام عبدالکریم ہے۔ پورا نام بتا ہے عبدالکریم اوبا ٹا۔  
 میرے دادا کسی زمانے میں ساؤتھ افریقہ چلے گئے  
 تھے۔ وہیں انہوں نے تجورت کی بہت کامیاب ہوئے پھر  
 وہیں وہ اوبا ٹا ہو گئے۔ کیا طرح ہوئے، یہ میں نہیں جانتا۔  
 اس کے بعد میرے والد بھی اوبا ٹا ہو گئے اور اب میں بھی  
 اوبا ٹا ہوں۔"

"بات سمجھ میں آگئی۔"

"ویسے ہمارا تعلق اکابر زمین سے ہے۔" اس نے بتایا۔  
 اس دوران چائے آگئی تھی۔ چائے کے دوران ہم  
 ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر اصل بات شروع ہو گئی۔  
 "مسٹر احمر! اوبا ٹا نے مجھے مخاطب کیا۔" میں یہ چاہتا ہوں  
 کہ آپ ہمارا ساتھ دیں۔"

"آپ کا ساتھ دوں..... وہ کس طرح؟"

تھیں پھر ہزاری شادی ہو گئی۔ یہ ایک چار بھری اور شاندار  
 شادی تھی۔ ہم دونوں کا تعلق کھاتے پیتے گھرانوں سے تھا۔  
 اس لیے خوب شاندار انداز میں شادی ہوئی تھی۔

ہم تو ویسے بھی ایک دوسرے کے ساتھ تھے اور اب  
 یہ ساتھ اور زیادہ مستحکم ہو گیا تھا۔ اسی دوران میں غزالہ چار  
 ہوئی۔ یہ شادی کے ایک سال بعد کی بات ہے۔ میں اس  
 کہانی میں غزالہ کی یادوں کا مختصر زیادہ شامل نہیں کر رہا۔ یہ  
 کہانی تو اس عظیم ایسے کے بعد شروع ہوتی ہے جو ایسے  
 میرے ساتھ پیش آیا اور جس نے مجھے برباد کر کے رکھ دیا۔  
 وہ ایسے تھا غزالہ کی موت۔

کسی عجیب بات ہے کہ ہم جس سے بے پناہ محبت  
 کرتے ہیں جس کو ایک پل کے لیے بھی لگا ہوں سے اوچھل  
 نہیں ہونے دیتے، بے رحم وقت کے ہاتھ اسے ہمیشہ کے  
 لیے چھین لے جاتا ہے اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

غزالہ کی موت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا وہ بڑے  
 آرام اور سکون کے ساتھ اس دنیا کو خیر باد کہہ گئی تھی۔ خدا  
 نے بس اتنے ہی دنوں کے لیے اسے میرا شریک سفر بنایا  
 تھا۔ جانے اس میں خدا کی ایسی کون سی مصلحت ہوگی۔

اس کی موت کے بعد میں بکھر کر رہ گیا تھا۔ کچھ بھی تو  
 نہیں تھا میرے پاس۔ ہم جیسے انسانوں کی زندگی کے  
 اٹانے ہی کیا ہوتے ہیں اور جو ہوتے ہیں وہ اس طرح چھن  
 جاتے ہیں۔

میں نے اپنی جاب چھوڑ دی تھی۔ کسی کام میں دل  
 نہیں لگتا تھا۔ گھر والے بھی سمجھایا کرتے تھے لیکن غزالہ کو  
 بھلا دینا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

ایک دن میرے ایک دوست صنڈر کا فون آ گیا۔  
 "احمر! تم اس وقت کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں، میں کیا کر سکتا ہوں۔" میں نے  
 افسردگی سے کہا۔ "میں گھر میں ہوں۔"

"تم ایسا کرو میرے پاس آ جاؤ۔ تمہیں کہیں لے  
 کر جانا ہے۔"

"نہیں بھائی، میرا کہیں آنے جانے کا دل نہیں چاہتا۔"  
 "بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ آ جاؤ تمہاری ضرورت  
 ہے۔" اس نے کہا۔

میں انکار کرتا رہا لیکن اس نے اپنا اصرار جاری  
 رکھا۔ بہر حال میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ "ہاں بتاؤ۔ ایسا کون  
 سا ضروری کام ہے؟"

"میں میرے ساتھ کہیں چلنا ہوگا۔" اس نے بتایا۔



تھے لیکن وہ ابھی تک اعلیٰ عہدوں والے لوگ تھے۔  
لاڈلج سے باہر نکلا تو ایک آدمی میرے نام کا کارڈ  
لیے کھڑا تھا۔ وہ سیاہ قام ہی تھا لیکن بہت اسٹارٹ تھا اور  
نیلے رنگ کے یونیفارم میں بہت چھا لگ رہا تھا۔ میں نے  
اس کے پاس جا کر اپنا تعارف کروایا۔ اس نے بڑی گرم  
جوش سے مصافحہ کیا۔ ہم دونوں کے درمیان انگریزی  
میں گفتگو ہو رہی تھی۔

”میرا نام گانا دانو ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”آپ جس  
این جی او کے ذریعے یہاں تک آئے ہیں میں ساؤتھ  
افریقا میں اس این جی او کا ٹرانسفر کیا گیا ہوں۔“  
”آپ سے مل کر خوشی ہوئی گانا دانو۔“

ہم ایک بڑی گاڑی میں روانہ ہو گئے۔ گاڑی گانا  
دانو ہی چلا رہا تھا۔ صاف ستھری سڑک اور خوبصورت عمارت  
کے سلسلے دور تک چلے گئے تھے۔

”اس انرپورٹ کو گابو انٹرنیشنل انرپورٹ کہتے ہیں  
مسز امر۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ سینٹری پری ٹوریا سے اٹھارہ  
کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہم کچھ ہی دیر میں اپنی منزل تک  
پہنچ جائیں گے۔“

”اور یہ منزل کیا ہے مسز گانا دانو۔“

فی الحال تو نیلسن ہوٹل ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”یہاں  
نیلسن کے نام پر بہت کچھ بنا دیا گیا ہے۔ نیلسن پارک نیلسن  
میوزیم نیلسن ہوٹل، نیلسن شاپنگ مال اور نہ جانے کیا کیا۔ بس  
ایک ہوا چل نگی ہے۔ اب دیکھیں سلسلہ کہاں تک جاتا ہے۔“  
ہوٹل بہت خوبصورت تھا۔ ہر قسم کی سہولیات موجود  
تھیں۔ وہاں این جی او کے کپتان اور لوگ بھی تھے۔ کچھ  
مقامی حکام اور ڈاکٹرز بھی تھے۔

رسی گفتگو اور تعارف کے بعد مجھے تیسری منزل کے  
ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ مجھے ایک بختی تک اسی  
کمرے میں رہنا تھا۔ اس کے بعد آگے سفر کرنا تھا۔

جو کرا مجھے دیا گیا تھا وہ بھی بہت خوبصورت اور آرام  
دہ تھا۔ اس کی ایک کھڑکی ہوٹل کے سونٹنگ پول کی طرف  
کھلتی تھی جہاں مرد اور عورتیں سونٹنگ میں مصروف تھے۔  
جنوبی افریقا کی کہانی میں بھی بہت نشیب و فراز ہیں۔  
اس سرزمین نے بہت سی جنگیں دیکھی ہیں۔ اس کے اصل  
بانی زدلو تھے۔ افریقہ کی ایک بنسنگو اور بہادر قوم۔ یہ  
لوگ اپنی روایات اور اپنے پھر کے ساتھ زندگی گزار رہے  
تھے کہ ڈیج لوگوں کی آمد شروع ہوئی۔

زدلو پہلے بوڈوں سے لڑتے رہے پھر انگریزوں کی آمد

”اپنی خدمات پیش کر کے۔“ اس نے بتایا۔ ”آپ  
ساؤتھ افریقا چلے جائیں۔“

”ساؤتھ افریقا وہ کیوں؟“

پھر اس نے تفصیل سے بتایا کہ اس کی ایک این جی او  
ہے جو افریقہ کے دور دراز علاقوں میں جا کر بچوں اور عورتوں  
کی فلاح کا کام کرتی ہے۔ اس این جی او میں بے شمار  
ڈاکٹرز بھی ہیں جو افریقہ کے بس ماندہ اور غریب بچوں کا  
علاج کرتے ہیں۔ اس این جی او کے ذریعے جانے والوں کو  
حکومت کی طرف سے آسانیاں بھی فراہم کی جاتی ہیں۔ اتنا  
ہی نہیں بلکہ معمولی معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ اس نے کچھ دیر  
رک کر کہا۔ ”آپ کے لیے وہاں جانا بہت ضروری ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”آپ کے بارے میں صفحہ صاحب نے سب کچھ  
بتا دیا ہے۔ آپ وہاں جا کر مصروف ہو جائیں گے۔ آپ  
پرانی یادوں کو اپنے ذہن سے جھٹک تو نہیں سکتے لیکن اتنا  
ضرور ہوگا کہ آپ کا دل بہل جائے گا۔ کچھ دنوں کے لیے  
آپ یادوں کی پر جھانسیوں سے الگ ہو سکیں گے۔“  
”ہاں امر۔“ صفحہ نے بھی کہا۔ ”تمہارے لیے یہ  
بہت ضروری ہے۔“

”آخر کیوں ضروری ہے؟“

”ایک تو تم ڈاکٹر ہو۔ یاد ہے تم مجھ سے کہا کرتے  
تھے کہ تمہیں افریقا کے قبائل سے بہت دلچسپی ہے۔ تم ان  
کے بارے میں جانتا چاہتے ہو۔“  
”ہاں، یاد ہے مجھے۔“

”تو تمہیں یہ چانس مل رہا ہے۔“ صفحہ نے کہا۔  
”نیکس میں جاتا ہوں کہ تم بچوں سے بھی بہت پیار کرتے ہو۔ تم  
ڈاکٹرز بھی ہو تم ان کے علاج میں ضرور دلچسپی لو گے اور دوسری  
طرف کچھ عرصے کے لیے مصروفیت تمہیں اداس نہیں ہونے  
دے گی۔“

بہر حال کئی دنوں کے بحث مباحثے کے بعد میں نے  
رضامندی ظاہر کر دی۔ ساری تیاریاں ایک بختی میں مکمل  
ہو گئیں اور میں ساؤتھ افریقا کے لیے روانہ ہو گیا۔

ابھی طیارہ پری ٹوریا کے گابو... انٹرنیشنل  
انرپورٹ پر اترنے والا تھا۔ یہ ایک طویل فلائٹ تھی۔  
طیارے کے مسافروں کی بھی منزل آچکی تھی۔

یہ ایک بہت بڑا انرپورٹ تھا۔ ہر قسم کی جدید سہولیات  
موجود تھیں۔ ہر طرف چمکتے دیکتے ہوئے چہرے۔ عام طور پر  
کام کرنے والے اور مزدور وغیرہ سیاہ قام تھے۔ سفید قام بھی



مہبت ہو کر دیکھ رہا تھا۔ میری محویت کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ مصالغے کے لیے میری طرف بڑھا دیا۔ ”میرا نام تماچی ہے۔“ اس نے بتایا۔

اب مجھے جیسے ہوش آ گیا تھا۔ ”اور میں احمد ہوں۔“  
 ”ڈاکٹر احمد! آپ کا نام مجھے بتا دیا گیا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”بہر حال یہاں میں آپ لپکا گاڑ ہوں اور جنگل میں بھی آپ کے ساتھ رہوں گی۔ ہم کئی نہیں ہیں جو مختلف علاقوں کی طرف روانہ ہو رہی ہیں۔ آپ کی ٹیم میں چار آدمی ہیں۔ ایک میں، ایک ڈاکٹر برنارڈ۔ چونکے نہیں۔ ڈاکٹر برنارڈ کوئی اور ہیں۔ ایک مقامی مزدور اور ایک آپ۔“  
 ”بہت شکر یہ تماچی کہ تم نے ذرا سی دیر میں بہت کچھ بتا دیا۔“

”آپ کے پاس ایک ہتھیار ہے مسٹر احمد اگر آپ کہیں تو میں آپ کو پری ٹوریا کی سیر کرادوں۔“  
 ”ضرور۔“ میں نے اپنی گردن ہلا دی۔ ”یہ تو بہت اچھا ہوگا۔“

”ہاں، ہر شام کو ہمارے ماہرین لیکچرز دیا کریں گے۔ وہ اس لیے کہ ہم جن لوگوں کے درمیان جا رہے ہیں، ان کے بارے میں معلومات ہو جائے۔“  
 ”یہ اور بھی اچھی بات ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن یہ بتاؤ کہ ہمارے اور ان کے درمیان گفتگو کیسے ہوا کرے گی۔ میرا مطلب ہے کہ ہم ان کی باتیں کیسے سمجھ سکیں گے؟“

”آپ اس کی فکر نہ کریں۔ ہمیں زولوؤوں کی زبان کی ٹریننگ دے دی گئی ہے۔ اس میں کچھ کچھ بولتی اور سمجھتی ہوں۔“

”گڈ..... یہ اور بھی اچھا ہے۔“  
 ”اس وقت آپ آرام کریں۔ میں کل سے آپ کے گاڑے کے فرائض انجام دوس گی۔ اس وقت تو تعارف کے لیے آگئی تھی۔“

تماچی کے جانے کے بعد میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ بہت ہی مہذب لڑکی تھی۔ اس کے ساتھ اس نے حسن بھی بہت مختلف پایا تھا۔ اس میں خود اعتمادی بھی تھی اور اس کی انگریزی بھی بہت اچھی تھی۔ ویسے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ ساؤتھ افریقا میں عام طور پر دو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ایک انگریزی دوسری افریقین۔

افریقین زبان ڈچ وگوں کا تعلق ہے وہ جب یہاں

شروع ہوئی۔ انگریز جہاں جاتے وہاں اپنی ایک کالونی بنانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

زولو لوگوں کے لیے شا کا۔۔ کا عہد بہت اہمیت کا حامل ہے وہ 1828-1816 تک حکومت کرتا رہا۔ اس کے دور میں زولوؤوں کو بہت عروج حاصل ہوا۔

پھر انگریزوں نے آ کر ان کو اپنا غلام بنانا شروع کر دیا۔ انگریزوں سے ان کی جنگوں کی داستان بہت طویل ہے۔ انگریزوں سے ان کا آخری معرکہ 1906 میں چیف بام ہاتھا کی سربراہی میں ہوا تھا اس کے بعد زولو مغلوب ہوتے چلے گئے۔

ساؤتھ افریقا پر انگریزوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ پھر وہی ہوا جو آقا اپنے غلام کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ کالوں کے ساتھ بہت برا برتاؤ ہوتا رہا۔

ہوٹوں اور پارکوں وغیرہ میں کتوں کا داخلہ تو شاید ممنوع نہ ہو لیکن کالوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ بہر حال آزادی کے متوالے لوگوں نے ایک طویل جنگ لڑی۔ نلسن منڈیلا کا نام قابل ذکر ہے پھر انگریزوں نے اس سرزمین کو آزاد کر دیا۔

اب زولوؤوں پر ساؤتھ افریقا کے حکمران ہی حکومت کرتے ہیں۔ بہت سے زولو شہر آ کر آباد ہو گئے۔ انہوں نے انگریزوں کی لائی ہوئی ٹی تنزیہ قبول کر لی لیکن آج بھی وہ اپنی روایات اور اپنے پھر ہی سے وابستہ ہیں۔ شہروں میں رہنے والے زولو Kwazulu اور Nguni کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی بولتے ہیں۔

واضح ہو کہ یہ ساری معلومات مجھے ہوٹل میں آتے ہی معلوم نہیں ہو گئی تھیں بلکہ آہستہ آہستہ معلوم ہوتی رہی تھیں لیکن میں نے کہانی کے بیان کو قائم رکھنے کے لیے کچھ ابتدائی باتیں بتا دی ہیں۔

بہر حال میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے چونکا دیا۔ میں نے آواز لگائی۔  
 ”اندرا جاؤ۔“

آنے والی ایک لڑکی تھی جس کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اکیس بائیس سے زیادہ کی نہیں ہوگی۔ بہت خوبصورت لیکن اس کے نقوش کچھ مختلف تھے۔ ان میں ایک خاص طرح کا اسرار تھا جس کو صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بیان نہیں کر سکتے۔ اس نے مکمل سفید لبادا سا پہن رکھا تھا جس نے اس کی شخصیت کو اور بھی دل آویز بنا دیا تھا۔

غزالہ کے بعد وہ پہلی لڑکی تھی جس کو میں اس طرح



کیا۔" یہ میوزیم ہے اس کا نام افریقن ونڈرکھا گیا ہے۔"  
"بہت خوب۔" میں نے میوزیم کی صاف ستھری  
عمارت کی طرف دیکھا۔

"یہاں دیکھنے کو بہت کچھ ہے۔" اس نے بتایا۔  
میرا دل چاہا کہ اس سے یہ کہہ دوں کہ پورے جنوبی  
افریقا میں دیکھنے کے لائق صرف ایک چیز ہے اور وہ تم ہو  
لیکن میں اس سے یہ نہیں کہہ سکا۔

جانے کیوں اس قسم کے جذبات میرے سینے میں  
پھٹنے لگے تھے جبکہ غزالہ کی موت کے بعد میں تھمہ ہو کر رہ گیا  
تھا لیکن تمہاری نے جیسے مرجھائے ہوئے جذبوں کو شاداب کر  
دیا تھا۔

"یہاں بہت سے شاپنگ، لازہیں۔" تمہاری بتا رہی  
تھی۔ "خیر تم یہ بتاؤ کیا تم کچھ خریداری کرنا پسند کرو گے؟  
میرا مطلب ہے اپنے گھر لے جانے کے لیے۔"

"گھر میں ہے کون جس کے لیے شاپنگ کروں؟"  
میں اداس ہو کر بولا۔ "سوائے ایک بوڑھے ملازم کے۔"

"کیوں کیا تمہاری شادی نہیں ہوئی؟" اس نے پوچھا۔  
"ہوئی تھی لیکن وہ مجھ سے بہت دور چلی گئی۔" میں نے  
بتایا پھر میں نے اسے غزالہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

"اوہ سوہی۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "جانے  
کیوں کبھی کبھی محبت کرنے والے بہت جلدی ایک دوسرے  
سے بچھڑ جاتے ہیں۔"

ہم نے سچ ایک خوبصورت ہوٹل میں کیا۔ اس کے  
بعد ہم واپس آ گئے۔ تمہاری اجازت لے کر اپنے گھر چلی گئی  
اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

اس رات ہوٹل میں افریقن گلوکاروں کا ایک  
میوزیکل کنسرٹ تھا۔ میں بھی اس میں مدعو کیا گیا تھا۔  
افریقن موسیقی بھی زبردست ہوا کرنا ہے۔

میں نے بہت الجوائے کہ اس لیے نہیں کہ میں  
میوزک سن رہا تھا بلکہ اس لیے کہ اس دوران تمہاری میرے  
ساتھ رہی تھی۔ وہ مجھے بتاتی رہی تھی کہ فلاں جینڈ کون سا  
ہے اور فلاں گلوکار کا کیا مقام ہے وغیرہ وغیرہ۔

میں نے ایک بات پہلے بھی محسوس کی تھی اور اس  
رات بھی محسوس ہو رہی تھی اور وہ تھی تمہاری کے جسم سے اٹھنے  
والی ایک عجیب خوشبو۔ اس خوشبو میں ایک سحر سا تھا۔ میرا  
خیال تھا کہ یہ کسی قسم کے پرفیوم کی خوشبو نہیں ہے بلکہ یہ کچھ  
اور ہے۔ اس رات میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ "تمہاری تم  
کون سا پرفیوم استعمال کرتی ہو؟"

آئے تھے تو انہوں نے ایک دوسرے کو بگھنے کے لیے  
افریقن زبان اور اپنی زبان کا ایک مٹھوہ تیار کر لیا۔ اس کو  
آج افریقن کہا جاتا ہے۔

دوسری صبح میں نے کمرے ہی میں ناشتا کیا تھا۔  
ناشتے سے فارغ ہو کر میں لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا۔ ہر طرف  
خوبصورت دیکھے ہوئے چہرے۔ ہر ملک اور ہر طرح کے  
لوگ کچھ دیر بعد گانا دانو بھی آ گیا۔ یہ آدی بھی مجھے پسند آیا  
تھا۔ اس میں ایک بے تکلفی سی تھی جو بہت کم لوگوں میں ہوا  
کرتی ہے۔

"ہیلو مسز احمر۔" وہ میرے سامنے والی سیٹ پر آ کر  
بیٹھ گیا۔ "اپنی گانڈ سے ملاقات کر لی۔" اس نے پوچھا۔  
"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "اچھی لڑکی ہے۔"

"تمہاری ایک پراسرار لڑکی ہے مسز احمر۔" اس نے  
کچھ سوچے ہوئے بتایا۔ "وہ ان معنوں میں پراسرار نہیں  
ہے کہ اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی ہے یا وہ بھوت بن  
کر قائب ہو جاتی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"تو پھر تم اسے پراسرار کیوں کہہ رہے ہو؟"  
"یہی تو کسی کو نہیں معلوم کہ اسے پراسرار کیوں سمجھتے  
ہیں۔" اس نے کہا۔ "کچھ نہ کچھ سے ضرور۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو اور یہ کچھ نہ کچھ خود میں نے  
بھی محسوس کیا ہے۔"  
"اس کے باوجود وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔" اس نے

بتایا۔ "بہت مہذب، بہت ذہین۔"  
اس دوران گانا دانو کے اشارے پر کافی آگئی۔ ہم  
کافی پیچھے اور سیاست پر باتیں کرتے رہے۔ گانا دانو کی  
مالی سیاست پر بھی گہری نگاہیں تھیں۔

کچھ دیر میں تمہاری آگئی۔ اس نے مجھے اور گانا دانو کو  
لاؤنج میں بیٹھا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اس نے بھی ایک کپ کافی  
پنی پھر ہم دونوں ہوٹل سے روانہ ہو گئے۔ گانا دانو وہیں رہ  
گیا تھا۔

ہمارے لیے ایک گاڑی کا بندوبست کر دیا گیا تھا  
جسے خود تمہاری ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ میں اگلی سیٹ پر اس کے  
برابر بیٹھ گیا۔

اس نے پری ٹور یا کے بارے میں بتانا شروع کر دیا  
کہ کب آباد ہوا اور پہلے یہ شہر کیسا تھا اور یہ کیسا ہو گیا ہے  
وغیرہ وغیرہ۔ اس نے ساؤتھ افریقا کے بارے میں بتایا کہ  
اس کے لو صوبے ہیں۔ اس کی باتوں کا انداز بہت دلکش تھا۔  
اس نے ایک جگہ گاڑی روک کر ایک عمارت کی طرف اشارہ



”تعمین کرو کہ میں کئی بار تمہیں خواب میں دیکھ چکی ہوں۔“  
 ”کیا؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”مجھے خواب میں دیکھ چکی ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے آہستہ آہستہ کہا۔ ”کئی بار۔  
 یہ اور بات ہے کہ سب کچھ بہت دھندلا دھندلا تھا۔ جیسے  
 چاروں طرف دھواں ہی دھواں ہو۔ ہم ایک جنگل کے  
 درمیان سے گزر رہے تھے۔ اونچے اونچے درخت اور ان  
 کے درمیان گونجتی ہوئی بھیانک آوازیں۔ جانے کون لوگ  
 ہمارے تعاقب میں ہوتے ہیں اور ہم اپنی جانیں بچانے  
 کے لیے دوڑتے پلے جا رہے ہیں۔“

”ہم سے کیا مراد ہے تمہاری؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”میں اور تم۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ اور بات ہے کہ  
 تمہارا چہرہ دھندلا دھندلا سا تھا۔ میں تمہیں ٹھیک سے دیکھ  
 نہیں پا رہی تھی لیکن یہ احساس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ تم ہی ہو۔“  
 ”عجیب بات ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”ایک بات بتاؤ۔ کیا مجھے دیکھ کر تمہیں کوئی احساس  
 نہیں ہوا تھا؟ اس نے پوچھا۔

”تمہاری! یہ بہت عجیب سی بات ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”اپنی بھئی کی موت کے بعد میرے لیے زندگی تو ختم ہی ہو کر رہ  
 گئی تھی لیکن تم کو دیکھ کر جانے کیوں ایک بار پھر زندہ رہنے کا  
 حوصلہ ہو گیا ہے۔ میں بہت دیر تک تمہارے بارے میں  
 سوچتا رہا تھا۔ اس رات مجھے نیند نہیں آ سکی تھی۔ جانے کون  
 سی گرہ میرے ذہن میں انگ گئی تھی۔ شاید وہ تمہاری ذات  
 کے حوالے سے ایسا ہی اسرار ہو جیسا تم نے کہا ہے۔“

”بہت عجیب بات ہے۔“ وہ دیر سے سے بولی۔  
 ”شاید کچھ بھی نہ ہو یا شاید بہت کچھ ہو۔“

چار دنوں کے بعد ہماری روانگی تھی۔ روانگی سے دو  
 دن پہلے تمہاری نے مجھ سے کہا۔ ”ڈاکٹر احمد! کل شام کو تمہیں  
 میرے پاس آنا ہے۔“

”خبریت؟“  
 ”کل میری برقعہ : سے ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”وہی  
 دن جب وہ پر اسرار لوگ میرے پاس آیا کرتے ہیں۔“  
 ”اوہ..... پھر تو میں ضرور آؤں گا۔“ میں نے کہا۔  
 ”میں ان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”کل شام میرے پاس آنا۔ پھر منٹ آ جانا پھر وہاں سے کہیں  
 اور چلیں گے۔ بلکہ ایسا کرتے ہیں کل کا سارا دن ہم کروگر  
 سفاری پارک میں گزاریں گے۔“  
 ”اور اس دوران وہ لوگ آگئے تو؟“

”کیا تمہیں احساس ہو رہا ہے؟ اس نے خوش ہو کر پوچھا۔  
 ”ہاں، بہت زیادہ۔ بہت کشش ہے اس میں۔“  
 ”احمر! کیوں نہ ہم کیسے میرا میں چل کر بیٹھ  
 جائیں۔“ اس نے کہا۔ ”اگر تمہارا دل کسرٹ سننے کا ہو رہا  
 ہے تو پھر اور بات ہے۔“  
 ”نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو خود اٹھنا چاہ  
 رہا تھا۔“

ہم کیسے میرا میں آ کر بیٹھ گئے۔  
 ”احمر!“ اس نے کافی کا آرڈر دینے کے بعد کہا۔  
 ”اور بھی کئی لوگ مجھ سے اس پر ٹیوم کے بارے میں پوچھ  
 چکے ہیں لیکن میرا جواب ہوتا ہے کہ میں نہیں جانتی کہ یہ کیا  
 چیز ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔  
 ”ہاں۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”بہت پر اسرار سی  
 بات ہے۔ ہر سال ایک خاص تاریخ کو کچھ لوگ میرے پاس  
 آتے ہیں اور مجھے یہ ٹیوم دے کر پلے جاتے ہیں۔“  
 ”کس تاریخ کو آتے ہیں؟“

”میری برقعہ ڈسے پر۔“ اس نے بتایا۔ ”ڈاکٹر  
 احمد! میں نہیں جانتی کہ وہ کون لوگ ہیں اور میرے ساتھ کیا  
 بھید پوشیدہ ہے۔ وہ بہت احترام سے میرے سامنے آ کر  
 جھک جاتے ہیں اور یہ خوشبو کا ٹیوم دے کر پلے جاتے  
 ہیں۔ میں ان سے پوچھتی رہتی ہوں کہ وہ کون ہیں، کہاں  
 سے آتے ہیں۔ یہ ٹیوم کیوں دیتے ہیں لیکن وہ جو کچھ بھی  
 بتاتے ہیں، وہ میری کبھی نہیں آتا کیونکہ وہ زولوؤں کی  
 زبان بولتے ہیں کو زولوؤں میں نہیں جانتی کیونکہ میں انگریزی یا  
 افریقین جانتی ہوں۔“

”تو تمہیں ان کے زولوؤں نے کا اندازہ کیا ہوتا ہے۔“  
 ”ان کے لباس، ان کے چلنے کے طریقوں اور ان  
 کے انداز سے۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ کچھ مختلف لوگ ہوتے  
 ہیں۔ جانے میرے ساتھ یہ کیا بھید ہے۔ اس کے علاوہ  
 اور بھی کئی پر اسرار واقعات میرے ساتھ پیش آتے ہیں۔“  
 تمہاری کہانی میں اب دلچسپی کا عنصر پیدا ہو چلا تھا۔  
 اس لیے میں نے اس سے پوچھا۔ ”اور کیسے واقعات..... کیا  
 تم مجھے بتانا پسند کرو گی؟“

”ڈاکٹر احمد! میں صرف تم ہی کو بتانا پسند کروں گی۔“ اس  
 نے کہا۔ ”کیونکہ جانے کیوں مجھے یہ سوس ہو رہا ہے کہ میرے  
 ساتھ جو کچھ بھی ہوتا ہے، اس میں تمہارا بھی کردار ہے۔“  
 ”میرا کردار؟“ میں چونک پڑا۔



تھوڑے پھر رہے تھے۔ ایک وسیع و عریض جنگل کا ماحول تھا۔ ہم ایک سفاری ریسٹوران میں آ کر بیٹھ گئے۔ بانسوں سے بنا ہوا یہ ریسٹوران اپنی مثال آپ تھا۔  
 ”ڈاکٹر! کیا ایسا نہیں لگتا کہ ہم کئی صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں؟“ تمہاجی نے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”ایسا ہی لگ رہا ہے۔“  
 ”اب تمہیں کچھ اور بھی دیکھنے کو ملے گا۔“ اس نے بتایا۔ ”جو تمہیں حیران کر دے گا جب کہ میں اس کی عادی ہو چکی ہوں۔“

”اور وہ کیا ہے؟“

”تم خود ہی دیکھ لینا۔“

ہم لوگ اس ریسٹوران میں وقت گزار کر جب باہر نکلے تو واقعی ایک حیرت ہمارا اظہار کر رہی تھی۔ کم از کم میں تو حیران ہی رہ گیا تھا۔ وہ چار آدی تھے جو کسی طرف سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئے تھے۔ وہ بہت احترام کے ساتھ تمہاجی کے سامنے جھک گئے تھے۔ وہ قد آور مضبوط جسموں والے لوگ تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تمہاجی کے بعد انہوں نے مجھے بھی دیکھا اور میرے سامنے بھی اسی طرح جھک گئے جس طرح تمہاجی کے سامنے بٹکے تھے۔ انہوں نے میری تعظیم بھی کی تھی۔ پھر ان میں سے ایک نے اپنے چوڑے کے تھیلے سے دو شیشیاں نکال کر ہمارے حوالے کر دیں۔ ایک تمہاجی کو دی اور دوسری میری طرف بڑھادی۔

میں نے کچھ لیا تو کہ یہ وہی خوشبو ہے جس کے بارے میں تمہاجی بتا چکی تھی۔ وہ کچھ دیر تک جانے کیا کیا بولتے رہے پھر اٹنے قدموں چلتے ہوئے نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو گئے۔

میں حیران اور پریشان سا کھڑا رہ گیا۔

”دیکھ لیا تم نے۔“ تمہاجی نے مجھے مخاطب کیا۔ ”یہ ہے وہ حیرت جس کے بارے میں تمہیں بتا رہی تھی۔ یہ وہی لوگ ہیں اور میں چاہے جہاں بھی ہوں، یہ میرے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ جانے انہیں کیسے معنوم ہو جاتا ہے کہ میں اپنی برتھ ڈے کے دن کہاں پر ہوں۔“

”اور وہ تمہارا تحفہ لے کر وہیں پہنچ جاتے ہیں۔“

”ہاں، ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور ایک دوسری حیرت یہ ہے کہ انہیں یہ کیسے معنوم تھا کہ اس وقت تم میرے ساتھ ہو۔ یہ تمہارے لیے بھی خوشبو کا تحفہ لے کر آ گئے۔“

”واقعی بہت حیرت کی بات ہے۔“ میں نے کہا۔

ہم بہت دیر تک ان ہی کے بارے میں باتیں

”میں یہی تو تمہیں دکھانا چاہتی ہوں۔“ اس نے کہا۔  
 ”ایسا کرو میں خود تمہیں لینے آ جاؤں گی۔“  
 ”ٹھیک ہے میں تیار ہوں لیکن تم مجھے کسی شاپنگ سینٹر لے چلو۔“

”وہ کیوں؟“

”یوں ہی۔“

”میں سمجھ گئی۔“ وہ مسکادی۔ ”چلو وڈ لینڈ بلورڈ کی طرف چلتے ہیں۔“

”اب تو میں یہاں کے لیے اجنبی ہوں۔ تم چاہے جہاں بھی لے جاؤ۔“

وہ مجھے ایک بہت خوبصورت شاپنگ مال میں لے آئی۔ بہت بڑا شاپنگ سینٹر تھا۔ میں اس کی برتھ ڈے کے لیے کچھ خریدنا چاہتا تھا۔ ایک دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم دونوں ہی ایک شوکیس کے سامنے رک گئے۔ اس دکان میں آرٹیفشل جیولری بڑا لگتی تھی۔ ہم دونوں کی نگاہ ایک ٹیکس پر گئی جو عجیب انداز کا تھا۔ کئی دھاتوں کو سانپ کی طرح مل دے کر وہ ٹیکس بنایا گیا تھا۔ اس کی بناوٹ ہی تھی جس نے ہمیں متوجہ کیا تھا۔

”کیا تمہیں اچھا لگ رہا ہے؟“ میں نے ٹیکس کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں، بہت ہی منفرد ہے۔“ اس نے اپنی گردن ہلا دی۔

”آؤ لے لیتے ہیں۔“

”کس کے لیے؟“ اس نے پوچھا۔

”قاہر ہے تمہارے لیے۔“ میں نے کہا۔ ”تمہاری برتھ ڈے کے لیے۔“

”ڈاکٹر! تم۔“ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

لیکن میں اس کا ہاتھ تمام کر اسے اندر لے آیا۔ دکاندار نے مسکرا کر استقبال کیا۔ میں نے اس ٹیکس کی طرف اشارہ کر دیا۔ ”ہمیں یہ ٹیکس پسند آیا ہے۔“

”بہت اچھی پسند ہے آپ کی۔“ اس نے کہا۔ ”پرانے زولوؤں کی دیویاں اس جیسا ٹیکس پہنا کرتی تھیں۔ یہ اس کی نقل ہے۔“

”یہ ایک اور اسرار تھا۔“

زولو قبائل کی دیویوں کے حوالے نے ہم دونوں کو چونکا دیا تھا۔ بہر حال ہم نے وہ ٹیکس لے لیا اور قیمت ادا کر دی۔

میں نے وہ ٹیکس اسی وقت تمہاجی کے حوالے کر دیا۔ وہ بہت دیر تک میرا شکریہ ادا کرتی رہی۔ دوسرے دن ہم کروگر سفاری پارک کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ میلوں تک پھیلا ہوا پارک تھا۔ جہاں دنیا بھر کے جانور آزادانہ طور پر



کرتے رہے پھر شام کے وقت واپس آ گئے۔ تمہاری جگہ پر جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

میرا ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا۔ پھر اس رات ایک عجیب واقعہ ہوا۔۔۔۔۔ اس وقت رات کا ایک بجھا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، دروازے پر کسی نے دستک دی تھی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی ہو۔ چونکہ کسی قسم کے خطرے کا کوئی امکان نہیں تھا اسی لیے میں نے بلا جھجک دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر ایک ایسا آدمی کھڑا تھا جس کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک قوی ویکل انسان تھا۔ اس کے چہرے پر زخم کا نشان تھا۔ اس نے صرف ایک کاچھا سا باندھ رکھا تھا۔ اس کے گلے میں موٹے موٹے دانوں کا ایک ہار پڑا ہوا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں بڑا سا خنجر تھا۔

میں اسے دیکھ کر خوفزدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے مجھے بھری آواز میں کہا۔ ”تم جنگل کی طرف نہیں جاؤ گے۔ نہیں جاؤ گے۔“ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس کی اس بات کا کیا جواب دوں۔ اس نے پھر اپنی بات دہرائی۔ ”تم مفید روج کے ساتھ جنگل کی طرف نہیں جاؤ گے۔“ میں کچھ دیر کے لیے تو پریشان اور خوفزدہ ہو گیا تھا پھر میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے؟“

اس نے اچانک اپنے خنجر والے ہاتھ سے مجھ پر حملہ کر دیا۔ مجھے یہ اندازہ تھا کہ وہ کچھ اسی قسم کی حرکت کرنے والا ہے۔ اسی لیے میں بھی ہوشیار ہو چکا تھا۔ اس نے حملہ کیا اور میں نے دائیں طرف جبک کر اس کا وار خالی دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر گھونسا بھی رسید کر دیا۔ میں نے چونکہ یہ گھونسا اپنی جان بچانے کے لیے پوری قوت سے مارا تھا اس لیے وہ لاکھڑا کر ایک طرف جا کر لیکن اس نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ ایک لمحے میں اٹھ کر دوڑتا چلا گیا۔

کورڈور میں لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شاید اس لیے وہ خوفزدہ ہو کر فرار ہو گیا تھا۔ پورے ہوٹل میں ایک شور مچا ہوا گیا تھا۔ این جی او والے اور ہوٹل کے گمران بھی طے آئے تھے۔ مجھ پر ہونے والا حملہ ہر ایک کے لیے پریشان کن تھا۔

پولیس بھی بلائی گئی تھی جو میرا بیان اور اس خنجر کو اپنے ساتھ لے کر واپس چلی گئی تھی۔ ان سب مصروفیات میں تین دن

چلے تھے۔ اس لیے دوسرے دن میں بہت دیر تک سوتا رہا۔ جب آکھ کھلی تو دن کے دو بج رہے تھے۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر لاؤنج میں پہنچا تو تمہاری میرے انتظار میں تھی۔

وہ بڑی بے تابی سے مجھے دیکھ کر میرے پاس آ گئی۔ ”احمر! تم ٹھیک تو ہونا؟ تمہیں کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟“ اس کی یہ گھر مند ہی مجھے اچھی لگی تھی۔ کوئی تو ہے جو میرے لیے اتنا فکر مند ہو رہا تھا۔

ہم صوفوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ ”آخر کیوں..... وہ آدمی کیوں چاہتا تھا کہ تم جنگل کی طرف نہ جاؤ؟“ اس نے کہا۔ ”وہ تمہیں کیسے جانتا ہے؟ وہ تمہیں روکنے کی کوشش کیوں کر رہا تھا؟“

”جانے کیوں لیکن اس کی اس حرکت نے میرے ارادوں کو مضبوط کر دیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں یہی دیکھتا چاہتا ہوں کہ آخر اس نے مجھے کیوں روکا تھا۔“

”زیونس دیوی کی مہربانی ہے کہ تم کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔“ ”زیونس دیوی؟“ میں نے چونکہ اس کی طرف دیکھا۔ ”معاف کرنا۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”میں جانے کیوں یہ کہہ گئی۔“

”تمہاری! تم تو کرہین ہونا؟“ ”ہاں۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں کرہین ہی ہوں۔ اس کے باوجود میرے اندر کچھ اور ہے۔ جانے کیوں کرہین ہی سے ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی اور ہوں، کسی اور دیس کی رہنے والی۔ میرے وجود میں کوئی اور ہے۔ اب یہی دیکھ لو جو لوگ میرے لیے ہر سال خوشبو کا تحفہ لے کر آتے ہیں، کیا وہ پراسرار نہیں ہیں؟ کیا ان کا میرے پاس آنا پراسرار نہیں ہے؟“

”ہاں یہ تو ہے۔“ ”اسی طرح مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کہیں باہر سے لا کر اس سوسائٹی میں شامل.... کر دی گئی ہوں۔“ ”عجیب سی بات ہے۔“

”اس کے علاوہ ایک بات اور ہے اور وہ یہ کہ تم سے ملنے کے بعد ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے اور تمہارے درمیان صدیوں کا رشتہ ہے، ایسا کیوں ہے؟ یہ تو میں نہیں جانتی لیکن ایسا ہے۔“

☆☆☆

ہمارا سفر شروع ہو گیا تھا۔ پری نوریہ سے آگے تک کاسزکنی گاڑیوں میں ہوا



سفر در سفر

دلچسپ مشغلہ ہے۔ وہ الاؤ کے گرد بیٹھے کر جنگل کی کہانیاں سنایا کرتے ہیں اور اس سٹائل میں اپنا خون گرم رکھتے ہیں۔ جانے کس وقت مجھے نیند آگئی۔

جنگل کی صبح اتنی خوبصورت ہوا کرتی ہے، اس کا اندازہ مجھے پہلے بھی نہیں تھا۔ ہر طرف پرندوں کی آوازیں اور پتوں پر چلی ہوئی ٹھنڈی ہوا کی آواز تازہ ہوا تھی۔ دل خوش ہو گیا تھا لیکن اس وقت واگو نے ایک بات کہہ کر پریشان ہی کر دیا۔ ”آپ لوگ صبح کی اس خوبصورتی پر نہ جائیں کیونکہ ایسی بد ہوش گرد چنے والی خوبصورتی کے پیچھے بہت خطرے ہوتے ہیں۔“

”وہ خطرے کیا ہوتے ہیں واگو؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”ڈشمنوں کے۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ دشمن اپنے زہریلے تیروں کے ساتھ رات بھر درختوں کے پیچھے چھپ کر ہماری نگرانی کرتے رہتے ہیں اور صبح ہوتے ہی حملہ کر دیتے ہیں۔ اس لیے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔“  
 ”کیا تم کسی کی موجودگی محسوس کر رہے ہو؟“ تمہاری نے پوچھا۔

”نہیں اس وقت تو نہیں۔“ واگو نے چاروں طرف جیسے ہوا کو سونگھتے ہوئے جواب دیا۔ پھر اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ”آپ کو تو میرا یہ عمل بھی بہت عجیب لگ رہا ہو گا لیکن جب ہم شہر میں ہوتے ہیں تو اپنی صلاحیتوں کو سلا دیتے ہیں اور جب جنگل میں ہوتے ہیں تو ہماری یہ صلاحیتیں جاگ جاتی ہیں۔“

ہمارے ساتھ آنے والے مزدور نے اتنی دیر میں چائے اور ناشا وغیرہ تیار کر لیا تھا۔ ہم یہ سارا سامان اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔

ابتداء میں یہ بتایا گیا تھا کہ میرے قافلے میں دو ڈاکٹر ہوں گے، ایک میں اور دوسرے ڈاکٹر برنارڈ لیکن برنارڈ کو چونکہ کسی اور طرف بھیج دیا گیا تھا اس لیے صرف میں ہی جا رہا تھا جبکہ تمہاری کوزس یا مساندوں کے فرائض انجام دینے تھے۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔

بہت ہی دشوار گزار سفر تھا۔ قدم قدم پر کانٹے دار جھاڑیاں تھیں جن کے درمیان ہم راستہ بناتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ایسے اونچے اونچے اور جسم درخت تھے کہ میں نے بھی نہیں دیکھے تھے۔ ابھی تک کوئی جنگلی جانور سامنے نہیں آیا تھا سوائے سانپوں کے جو درختوں کی ٹہنیوں سے لپٹے دکھائی دیے یا بہت تیزی کے ساتھ سرسراتے

تھا۔ وہ ایک عام مسافر تھا جیسا گاڑیوں کا سفر ہوا کرتا ہے۔ ہمارے قافلے میں پانچ آدمی تھے۔ ایک ڈاکٹر یعنی میں۔ دوسری میری مساندوں تمہاری، دو مزدور جو سامان لے کر چل رہے تھے۔ اس سامان میں ڈھیر ساری دوائیں تھیں اور ایک جنگل کا گائڈ واگو۔

واگو کا تعلق سوتمو قبیلے سے تھا (سوتموز ولو کی ایک شاخ ہے) وہ ایک دراز قامت خاموش طبیعت سیاہ قام تھا جو جنگل کے راستے کو اپنے ہاتھوں کی لکیروں کی طرح جانتا تھا۔ ہم سوتمو قبیلے ہی کی طرف جا رہے تھے۔

سنایا گیا تھا کہ اس قبیلے میں بچوں کی اموات زیادہ ہوا کرتی ہیں۔ ان اموات کی وجہ ایک مسمی ہوا کرتی ہے۔ انتہائی زہریلی پھمروں کی طرح۔ ڈنک مارنے والی جو اپنے ہتکار کو بری طرح مار دیتی ہے۔ ان علاقوں میں اور کئی بیماریاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہم نے ان امراض کی بہت سی دوائیں اپنے ساتھ رکھ لی تھیں۔ ہماری گاڑیاں ایک مقام پر آ کر رک گئی تھیں۔ اب یہاں سے آگے ہمیں پیدل سفر کرنا تھا۔ میرا جنگل میں سفر کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا اور ایک جوش کی کیفیت بھی تھی۔ یہ احساس بھی میرے لیے بالکل نیا تھا۔

اپنی محبت کے کھوجانے کے بعد مجھے زندگی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن جب سے تمہاری ملی تھی، میں اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے بہت احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔ تمہاری میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ راستہ بتانے والا گاؤں واگو آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے دونوں مزدور تھے۔ اس وقت احساس ہو رہا تھا کہ جنگل کا سفر کیسا ہے۔ کتنا پرکشش اور کتنا بھیانک۔ ہر قدم ایک نیا خوف، ایک نئی سنگ، ایک نیا ولولہ۔

جنگل میں رات کا سفر بہت خطرناک ہوتا ہے۔ ذرا بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ اگلا قدم کہاں لے جائے گا۔ اگلے موڑ پر کیا ہے۔ اس لیے ہم نے واگو کے کہنے پر ایک جگہ پڑاؤ ڈال دیا۔ مزدور اپنے ساتھ خیمے وغیرہ لے کر آئے تھے۔ ذرا سی دیر میں الاؤ روشن کر کے خیمے لگا دیے گئے۔

مجھ پر اس ماحول کی ہیبت سوار تھی جبکہ تمہاری بھی خاموش تھی۔ واگو اور دونوں مزدور الاؤ کے گرد بیٹھے گئے۔ واگو نے بلند آواز میں کچھ بولنا شروع کر دیا۔ ظاہر ہے میں اس کی زبان کہاں سمجھ سکتا تھا۔ تمہاری بتا رہی تھی کہ واگو اپنے قبیلے کی کسی جنگ کا حال بتا رہا ہے جس میں خود اس نے بھی شرکت کی تھی۔ تمہاری نے بتایا کہ زولو لوگوں کا یہ ایک بہت



بلند آواز میں کوئی گیت گانا شروع کر دیا۔ وہ شاید اپنے مرنے والوں کی روحوں کو خوش کرنے کے لیے کوئی مذہبی گیت گارہے تھے۔ ہم شام تک میدان میں چلتے رہے۔ شام ہونے کے بعد ہم پھر جنگل کے سلسلوں میں داخل ہو چکے تھے اور ہمیں ہمارے اس سفر کا ایک مرحلہ ختم ہوتے ہی دوسرے بھیانک سلسلے کا آغاز ہو گیا۔

☆☆☆

اس رات ہمیں گھیر لیا گیا تھا۔ ہم نے جنگل میں ایک جگہ پڑاؤ کر لیا تھا۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو چکے تھے کہ الاؤ روشن کر دیا گیا۔ بھر اچانک ہم پر نیڑوں کی بارش ہو نے لگی۔

یہ تیر چاروں طرف سے آرہے تھے۔ واگو نے بلند آواز میں ہمیں مخاطب کیا۔ ”صاحب! یہ تیر ہمیں خبردار کرنے کے لیے ہیں۔ یہ ہمیں نقصان نہیں پہنچائیں گے بس جہاں ہیں اسی حالت میں کھڑے رہیں۔ اور ادر چلنے کی کوشش نہ کریں ورنہ چھلنی کر دیے جائیں گے۔“

ہم سب سبے ہوئے ایک جگہ کھڑے رہے۔ جنگل کا حقیقی اور بھیانک روپ ہمارے سامنے آیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ تماچی اور دوسرے ان آفتوں سے واقف ہوں لیکن میرے لیے تو یہ نیا اور بھیانک تجربہ تھا۔

واگو کی ہدایت کے مطابق ہم سب خاموش کھڑے رہے۔ کچھ دیر بعد درختوں نے بیسے جنگلیوں کو اگلنا شروع کر دیا۔ وہ ہر طرف سے نکل نکل کر ہماری طرف آرہے تھے۔ الاؤ کی بھڑکی ہوئی روشنی میں وہ بہت بھیانک دکھائی دے رہے تھے۔ بالکل ایسا ہی تھا جیسے انگریزی فلم کا کوئی منظر دیکھ رہے ہوں۔ یہ چھوٹے، لہلہہ کے گھسے ہوئے جسموں والے لوگ تھے۔ ان کی طرز نہیں تھے جن کو میں تماچی کے لیے خوشبو کا حقد لے کر آتے ہوئے دیکھ چکا تھا کیونکہ وہ بلند قامت تھے۔

”یہ مسائی massai لوگ ہیں۔“ واگو نے بتایا۔  
”بہت خطرناک ہوتے ہیں۔“

اتنی دیر میں ان لوگوں نے ہمیں پوری طرح گھیر لیا تھا۔ کمانوں اور تیروں سے سج ان لوگوں کے چہروں پر وحشت اور ناراضگی تھی۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کچھ بولنا شروع کر دیا۔

واگو اس کی باتوں کا جواب دے رہا تھا۔ پھر وہی شخص آگے بڑھا، اس نے بہت غور سے ہمیں دیکھنا شروع کر دیا جیسے ہمارا جائزہ لے رہا ہو۔ تماچی کے پاس آ کر وہ

ہوئے ہمارے سامنے سے گزر جاتے۔ درختوں کا ایک طویل سلسلے کو عبور کر کے ہم ایک میدان میں آگئے۔ یہ ایک لمبا چوڑا میدان تھا جس پر سوائے ریت کے اور کچھ نہیں تھا۔ بالکل ایسا ہی محسوس ہوا جیسے ہم اچانک کسی ریگستان میں آئے ہوں۔

وسیع و عریض جنگل کے درمیان اس ریگستان کی موجودگی حیران کرنے والی تھی۔

واگو نے اس ریگستان کے بارے میں بتایا۔  
”جہاں سے ہماری ہستی صرف ایک دن کی مسافت پر ہے۔ ہم اس ریگستان کو بھرتوں کا ریگستان کہتے ہیں۔“

”کیوں، کیا یہاں بھوت ہوتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔  
”جی صاحب۔ بھوت ہوتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”ہمارے مرنے والوں کی روہیں اس ریگستان میں آ جاتی ہیں۔“  
صرف افریق ہی نہیں بلکہ اس قسم کی روایات پوری دنیا میں ہو کرتی ہیں۔ ہمارے یہاں بھی اس قسم کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔

بہر حال ہم آگے بڑھتے رہے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ میدان اتنا لمبا چوڑا تھا کہ اسے عبور کرنے میں ایک دن تو ضرور لگ جاتا۔ ابھی ہم نے اس میدان میں تھوڑا ہی سفر کیا تھا کہ ایک عجیب بات ہوئی۔ ایسا لگا جیسے ہزاروں گھوڑے ہماری طرف دوڑتے چلے آرہے ہوں۔ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اتنا گرد و غبار تھا کہ پورا میدان لگا ہوں سے اوجھل ہو کر رہ گیا تھا۔ ہم سب خوفزدہ ہو کر ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے۔

دونوں مزدور اور خود واگو نے اپنی زبان میں زور سے چلانا شروع کر دیا تھا۔ شاید وہ کسی قسم کی دعا میں مانگ رہے تھے۔ میں نے تماچی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ بے پناہ گرد و غبار کی وجہ سے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر آہستہ آہستہ جب گرد چٹھنے لگی تو صورت حال سمجھ میں آگئی۔

وہ ایک لشکر تھا۔ سیکڑوں زہیروں کا۔ وہ زہیرے جانے کس وجہ سے کس طرف سے بھڑک کر دوڑتے ہوئے اس میدان کی طرف آئے تھے اور ان کی یہ دوڑ اس میدان میں بھی جاری تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں ایک ساتھ بھی اتنے زہیرے نہیں دیکھے ہوں گے۔ یہ ایک عجیب نظارہ تھا۔

واگو نے بتایا۔ ”یہ زہیرے نہیں تھے صاحب۔ یہ ہمارے مرنے والوں کے بھوت تھے جو روپ بدل بدل کر اس میدان میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔“ ہمارا وہ سفر جو کچھ دیر کے لیے رک گیا تھا پھر شروع ہو گیا۔ دونوں مزدوروں نے

سپنس ڈائجسٹ



سفر در سفر

ایک جگہ تماچی لڑکھڑا کر مرنے والی تھی، میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ وہ جنگلی اچانک میری طرف اس طرح چھپنے جیسے مجھ پر حملہ کرنے والے ہوں۔ اس وقت واگو نے نہ جانے کیا کیا بول کر انہیں خاموش کر دیا پھر واگو نے میرا طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔ ”صاحب! یہ لوگ نہیں چاہتے کہ آپ سفید روح کو چھونے کی کوشش کریں۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ میں غصے سے بولا۔ ”ان اندھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ تمہاری مرنے والی تھی۔“

”ان کا کہنا ہے کہ سفید روح اگر گر بھی جاتی تو بھی اس کا کچھ نہیں ہوتا کیونکہ اس میں بہت روحانی طاقت ہے۔“

”میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ ہم لوگ ان کے ساتھ چل کر پھنس گئے ہیں۔“ تماچی نے کہا۔ ”اب بھی موقع ہے، ہم راستے سے فرار ہونے کی کوشش کر سکتے ہیں۔“

”ایسا تم سوچے گا میں م۔“ واگو جلدی سے بولا۔

”آپ کو تو یہ لوگ کچھ نہیں کہیں گے لیکن غصے میں ہم سب کو مار ڈالیں گے۔“

”واگو! پھر میں کیا کرنا چاہیے۔“ میں نے پوچھا۔

”ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں کچھ کوئی راستہ نکل آئے جہاں یہ لوگ ہمیں لے جا رہے ہیں۔ ہم خاموش ہو گئے۔

ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔ ہمارے ساتھ چلنے والے جنگلی ذرا سی دیر کے لیے ہم سے غافل نہیں ہوتے تھے۔ ہم نے رات کے وقت ایک جگہ پڑاؤ بھی کیا۔

سب کچھ پہلے کی طرح تھا یعنی جب ہم نے پہلی بار پڑاؤ کیا تھا اور ہمارے لیے شہے لگائے تھے۔ کھانے تیار ہوئے تھے۔ الاؤ روشن تھا لیکن فرق یہ تھا کہ اس وقت ہم آزاد تھے۔ اپنی مرضی سے مالک تھے لیکن اس بار گرفتار ہو کر جا رہے تھے ہم قیدی۔ تھے اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میری وہ رات بہت بے چین گزری تھی۔

رات گئے تک وہ جنگلی نہ جانے کیا کیا گاتے رہے۔ بہت دیر کے بعد جب خاموشی ہوئی تو پھر مجھے بھی نیند آ گئی۔ جب میں صبح بیدار ہوا تو ایک نئی چیز میرا انتظار کر رہی تھی۔ واگو نے میرے پاس آ کر بتایا کہ تماچی کا پتہ نہیں چل رہا ہے۔ وہ کہیں غائب ہو گئی ہے۔ یہ بہت پریشان کر دینے والی خبر تھی۔ میں بوکھلا کر غصے سے باہر آ گیا۔ جنگلی موجود تھے،

رک گیا تھا۔ اس نے بہت احترام کے ساتھ تماچی کا ہاتھ تھاما اور اسے بوسہ دے کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اس نے واگو سے کچھ کہا۔ واگو نے اس کا جواب دیا۔ پھر اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

”جناب یہ لوگ اس بات پر بہت ناراض ہیں کہ ہم ان کے علاقے میں کیوں آئے لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے سفید روح کو پہچان لیا ہے اور اس کے احترام میں انہوں نے اپنی کمائیں جھکا دی ہیں لیکن اب ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“ تماچی نے پوچھا۔

”یہ لوگ سفید روح یعنی آپ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں جبکہ دوسروں کو جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔“

”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔“ تماچی نے کہا۔ ”ان لوگوں سے کہو کہ سفید روح کا یہ کہنا ہے کہ یہ سب اس کے سامنے ہیں اور وہ اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جائے گی۔“

واگو نے تماچی کی یہ بات اس آدمی کے سامنے دہرا دی جس پر اس آدمی نے پھر کچھ کہا۔ اس پر واگو نے اس کا ترجمہ کر کے بتایا۔ ”یہ شخص کہہ رہا ہے کہ وہ سب کو اپنے ساتھ لے کر جائے گا اور جو سردار کا فیصلہ ہو اس پر عمل کیا جائے گا۔“

”اگر۔“ تماچی نے سرگوشی کی۔ ”ایسا کرو تم ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر چلے جاؤ۔ یہ لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ ورنہ اگر ان لوگوں کے ساتھ گئے تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”نہیں تماچی، میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”ہاں تم واگو اور دوسرے مزدوروں کو بھیج سکتی ہو۔“

تماچی کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ شاید اسے مجھ سے اسی قسم کے جواب کی توقع تھی۔

تماچی نے واگو کو بتا دیا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

واگو نے اس آدمی سے کچھ کہا پھر ہمارا ایک انجامنا سفر شروع ہو گیا۔ جانے کس منزل کی طرف۔ واگو اور دونوں مزدور بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ شاید انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کا یہ سفر آسان نہیں ہوگا۔ میری اور تماچی کی یہ کوشش تھی کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہیں لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے ان جنگلیوں کو ہمارا ساتھ رہنا پسند نہیں ہے۔ وہ تماچی سے تو کچھ نہیں کہہ پا رہے تھے لیکن مجھ کو بہت کڑی اور غصے بھری نگاہوں سے دیکھے جا رہے تھے۔

ایک موقع پر ان کی ناراضگی کا اظہار بھی ہو گیا۔



داگو نے جب میری بات دہرائی تو وہ سب سر جوڑ کر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے میننگ کے بعد فیصلہ بنا دیا۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔

اس کے بعد ہم نے ایک اور دن کا سفر طے کیا۔ اس دوران تماچہ میری قدم پر یاد آتی رہی۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ میں اس کی طرف سے پریشان تو تھا لیکن ماہوس نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ عارضی جدائی ہے۔ وہ مجھ سے ضرور ملے گی۔ ہم دونوں کو جب ایک دوسرے کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے موت آ جائے اور میں زندہ رہ جاؤں۔

دوسری دوپہر کو جنگل کا سلسلہ ختم ہوا۔ اب کھیٹ دکھائی دے رہے تھے جن میں کئی کئی فصل تیار ہو چکی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں اور بھی چیزوں کی کاشت کاری ہوتی ہو لیکن مجھے تو ہر طرف کئی ہی دکھائی دے رہی تھی۔ میں یہ سب قلموں میں دیکھا کرتا تھا۔ کتابوں میں پڑھا کرتا تھا۔ لیکن یہاں تو سب کچھ ٹکا ہوں کے سامنے ہو رہا تھا بلکہ میں تو خود اس منظر نامے کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ ہم کھیٹوں کے درمیان سے گزرتے رہے۔ اب جمو نیڑیاں دکھائی دے رہی تھیں جن کو مقامی زبان میں عام طور پر کرا ل کہا جاتا ہے۔

ہانسون اور پودوں وغیرہ کی مدد سے بنائی ہوئی بڑی بڑی جمو نیڑیاں جن کے باہر کھڑے مرد اور عورتیں ہمیں بہت حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ یہ لوگ عریاں نہیں تھے بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو چوں اور کھالوں وغیرہ سے ڈھانپ رکھا تھا۔

ہم سب چلتے رہے۔ پتلے چلتے میری حالت غیر ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں بھی اتنا پیدل سفر نہیں کیا ہوگا لیکن میرے ساتھیوں پر اس طویل سفر کا شاید کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔

شام کے وقت ہم ایک بہت بڑی بستی میں داخل ہو گئے۔ یہی بستی ان لوگوں کا مرکزی مقام تھا اور ایک بہت بڑا خالی میدان تھا۔ جس کے ارد گرد جمو نیڑیاں بنائی گئی تھیں۔ ایک طرف ایک بہت بڑی جمو نیڑی تھی جس کے اوپر ایک جھنڈا لہرا رہا تھا۔ بتایا گیا۔ یہی ان کے بادشاہ ماگاسی کا محل ہے۔

کوئی اور وقت ہوتا یا میں کوئی اسی قسم کی کوئی کتاب پڑھ رہا ہوتا تو شاید اس صورت حال سے بہت لطف اندوز ہوتا لیکن یہاں تو اپنی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ تماچہ کی کم شدگی نے بھی اس اور پریشان کر دیا تھا۔

داگو بھی تھا۔ دوسرے مزدور بھی تھے، صرف تماچہ غائب ہو گئی تھی۔ اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔

جنگلی حیرت انگیز طور پر بالکل خاموش تھے۔ داگو نے بتایا کہ یہ جنگلی تماچہ کو ہر طرف تلاش کر کے واپس آئے ہیں اور ان کا یہ خیال ہے کہ سفید روح کو کوئی جانور اٹھا کر لے گیا ہوگا یا ماگاسی کی روح اپنے ساتھ لے گئی ہو۔

”یہ ماگاسی کی روح کیا بلا ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”ان کے بادشاہ کو ماگاسی کہا جاتا ہے۔“ داگو نے بتایا۔ ”سب سے پہلے بادشاہ کی ستر بیویاں تھیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ بیویاں رکھنے کا شوقین تھا اور موجودہ ماگاسی بیسواں ہے۔ اس کے پاس پندرہ بیویاں ہیں۔“

”کیا بکواس ہے یہ سب؟ ان سے پوچھو کہ ماگاسی کی روح کیوں لے گئی ہے اس کو؟“

”میں نے پوچھا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ پہلے ماگاسی کو تپتی بیویاں جمع کرنے کا شوق تھا اسی لیے وہ سفید روح کو بھی اٹھا کر لے گیا ہے۔“

”کیا بکواس ہے۔“ میں غصے اور رنج سے بے حال ہو رہا تھا۔ ”ان ہی کم بختوں نے اسے غائب کر دیا ہوگا۔ اسی لیے یہ اتنے اطمینان کے ساتھ یہاں کھڑے ہیں۔“

داگو میری اس بات پر کیا کہہ سکتا تھا۔ تماچہ کے غائب ہونے سے وہ بھی اداس اور پریشان ہو گیا تھا جبکہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میری فریاد ایک بار پھر مجھ سے جدا کر دی گئی ہو۔ اتنے دنوں میں تماچہ سے مجھے محبت ہو گئی تھی۔

داگو نے بتایا۔ ”یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں سفر شروع کر دینا چاہیے۔“

”ان کم بختوں سے کہو کہ سفید روح ہی غائب ہو چکی ہے تو ہم لوگ وہاں جا کر کیا کریں گے۔“

داگو نے میرے کہنے پر جب بات کی تو انہوں نے بہت خوشی سے اجازت دے دی۔ ان کا کہنا تھا کہ شیک ہی تو ہے۔ جب سفید روح ہی نہیں رہی تو پھر تم لوگ جا کر کیا کرو گے اور اسی وقت میرے ذہن میں ایک کلکا سا ہو گیا۔ آخر کیوں..... یہ لوگ مجھے اتنی آسانی سے جانے کی اجازت کیوں دے رہے تھے؟ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔

میں نے داگو سے کہا۔ ”داگو! ان سے کہو کہ ہم واپس جانا نہیں چاہتے۔ ہم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ ہم ان کے ساتھ جا کر ان کا گاؤں دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کے بیمار بچوں کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔“



دل کو ایک امید سی تھی کہ شاید تہاچی اسی بستی میں دکھائی دے جائے۔ کاش وہ لوگ اسے اٹھا کر اپنے ہی لے آئے ہوں۔ مجھے اور واگو کو ایک جمونپڑی میں ٹھہرایا گیا تھا جبکہ ہمارے ساتھ آنے والے دونوں مزدوروں کو دوسری جگہ دے دی گئی تھی۔

رات کے وقت گھاس پھوس کی بنی ہوئی مشعل روشن کر دی گئی تھی جس کی زرد روشنی بہت اداس اور بے چین کر دینے والی تھی۔ رات کے وقت دو لڑکیاں ہمارے لیے کھانا لے آئی تھیں۔ بھوک نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے کچھ ضرور کھاتے رہنا تھا۔ اپنی توانائی برقرار رکھنے کے لیے۔ میں اپنے گھر، اپنے شہر اور اپنے وطن سے ہزاروں میل دور جنگل میں ایک بھیانک رات گزارنے کے لیے مجبور ہو گیا تھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ اس قسم کے واقعات بھی پیش آسکتے ہیں۔ میں نے خود کو بہلانے کے لیے واگو سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ ایک دہی میرے لیے مانوس تھا۔ وہ بے چارہ خود بھی اس صورت حال سے پریشان ہو رہا تھا۔

اچانک باہر سے رونے اور گیت وغیرہ گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی کئی عدد ششوں کی روشنیاں چاروں طرف بچھکتی ہوئی دکھائی دیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے واگو؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔  
”شاید یہ کسی قسم کی رسم ادا کر رہے ہیں۔“ واگو نے کہا۔  
”صاحب! آپ ہمیں رہیں۔ میں معلوم کر کے آتا ہوں۔“

واگو جمونپڑی سے باہر چلا گیا۔ اس کی واپسی بہت دیر کے بعد ہوئی۔ میں اس دوران ہزار قسم کے اندیشوں میں مبتلا رہا۔ واگس آ کر واگو نے بتایا۔ ”صاحب! یہاں کے ایک وزیر کو مزاد دی جا رہی ہے۔“  
”کس بات کی مزاد؟“

”یہی کہ وہ اپنی بیویوں کو جنسی طور پر مطمئن کرنے کے قابل نہیں رہا۔“ واگو نے بتایا۔ ”یہ یہاں کی بہت قدیم روایت ہے صاحب۔ میں نے بھی اس کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔“  
”بتاؤ مجھے یہ کیسی روایت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ رسم یہاں کی نہیں ہے صاحب۔ ایک قبیلہ ہے نشوڑ اسی مناسبت سے اس علاقے کو بھی نشوڑ کہا جاتا ہے۔ وہاں بادشاہوں کے ساتھ یہ ہوا کرتا تھا اگر کوئی بادشاہ جنسی طور پر کمزور ہو جائے تو اس کو ایک جمونپڑی میں اس کی بیوی کے ساتھ قید کر دیا جاتا ہے، جس بیوی نے کمزوری کی

شکایت کی ہو پھر اس جمونپڑی کو آگ لگا کر دونوں کو مار دیا جاتا ہے۔“

”میرے خدا! یہ تو بہت بھیانک رسم ہے۔ اس کا مطلب ہوا کہ بادشاہ کو جلا یا جا رہا ہے؟“  
”نہیں۔“ واگو مسکرایا۔ ”یہاں تک آتے آتے اس

رسم میں اتنی تبدیلی آ چکی ہے کہ بادشاہ کے علاوہ سب کو مزا دی جاسکتی ہے۔ آج یہاں کے ایک وزیر کو مزاد دی جا رہی ہے۔ ان دونوں کو جمونپڑی میں اس طرح باندھ کر رکھا جاتا ہے کہ آدی کاسر اس کی بیوی کے زانو پر ہوتا ہے اور اسی عالم میں جمونپڑی کو آگ لگا دی جاتی ہے اور دونوں جل کر مر جاتے ہیں۔“

”یہ تو بہت ظالمانہ رسمیں ہیں واگو۔“  
”ہاں۔“ واگو نے اعتراف کیا۔ ”ہماری آج کی حکومتوں کی کوششوں کے باوجود یہ رسمیں آج تک جاری ہیں۔ شروع شروع میں یہ رسمیں کئی کوششیں بھی کی گئیں پھر ان قوانینوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ حکومت اب ان کے اس طرح کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتی۔“

میں صرف سوچتا ہی رہ گیا۔ اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا تھا۔ بہر حال وہ رات انکی ہی تھی، کچھ سوتی کچھ جاگتی ہوئی رات۔ خوفزدہ رتی ہوئی رات۔ صبح کے وقت واگو نے بتایا کہ ہمیں کچھ دیر کے بعد بادشاہ یعنی ماگاسی کے سامنے پہنچنا ہے کیونکہ بادشاہ کو تم سے کام ہے۔

”مجھے سے کیا کام ہو سکتا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔  
”بادشاہ کو بتا دیا گیا ہے کہ تم علاج کرنے والے ہو۔“  
واگو نے کہا۔ ”بادشاہ کا ایک بیٹا بہت بیمار ہے۔ بادشاہ اس بچے سے بہت محبت کرتا ہے۔ اور بادشاہ نے اس کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ لیکن اس کی بیماری نے بادشاہ کو غمزدہ کر رکھا ہے۔ اب تم اس کا علاج کرو گے۔“

”میں تو خیر آیا تو اسی لیے ہوں۔“ میں نے کہا۔  
”لیکن عام طور پر جب یہاں لوگ بیمار ہوتے ہیں تو پھر کیا کرتے ہیں؟“

”مقامی وچ ڈاکٹر جزی بوٹیوں سے علاج کرتے ہیں۔“ واگو نے بتایا۔ ”لیکن اس بچے کا علاج کوئی نہیں کر سکتا اس لیے بادشاہ کی خواہش ہے کہ تم اس کا علاج کرو۔“  
میرے لیے یہ ایک طرح کا امتحان بھی تھا۔

ان جنگلیوں کے حراج کا کیا بھروسہ تھا، اگر میرے علاج سے بچہ ٹھیک ہو گیا تو خیر... ورنہ یہ مجھے میں آ کر کچھ بھی کر سکتے تھے۔ جہاں جنسی کمزوری پر کسی کو جلا دیا جاتا



ہے وہاں کیا نہیں ہو سکتا تھا۔  
 آکھوں کے سامنے آئی جاتا ہے۔ اب دیکھیں ہماری  
 آکھوں کے سامنے کیا آتا ہے۔"

☆ ☆ ☆

وہ خاص تقریب میدان میں ہو رہی تھی۔ مجھے بھی اسی  
 میدان میں پہنچا دیا گیا تھا۔ ہر طرف مشعلیں روشن تھیں جن  
 کی وجہ سے پورے میدان میں روشنی ہو رہی تھی۔ کچھ لوگ  
 مذہبی گیت گا رہے تھے۔

بادشاہ کی جمونپڑی کے سامنے ایک بڑا سالا ڈروشن  
 تھا۔ وقفے وقفے سے اس الاڈ میں کوئی چیز ڈال دی جاتی۔  
 الاڈ اور تیزی سے بھڑکنے لگتا۔ ناگوار قسم کی ایک تیز  
 بو پورے میدان میں پھیل جاتی۔ جانے وہ کیا چیز ڈال رہے  
 تھے۔ پھر رقص کا سلسلہ شروع ہوا۔ قبیلے کی عورتوں اور  
 لڑکیوں نے رقص کرنا شروع کر دیا۔ ڈورم نما کوئی چیز ایک  
 خاص آہنگ اور ترتیب کے ساتھ بھائی جا رہی تھیں جس کی  
 لے پر لڑکیاں تھری رہی تھیں۔ ان کا رقص بہت وحشیانہ اور  
 بہت تیز تھا پھر بادشاہ کی جمونپڑی سے کچھ لوگ باہر آئے۔  
 میرے ساتھ بیٹھا ہوا ادا گو بتاتا رہا کہ یہ لوگ مذہبی پروہت  
 وغیرہ ہیں اور شادی کی رسومات ادا کریں گے۔ آخر میں  
 بادشاہ اپنی جمونپڑی سے باہر آیا۔ وہ ایک دیویدیکل انسان  
 تھا جس نے صرف ایک کاچھا سا باز رہ رکھا تھا۔

اس کے گلے میں بڑے بڑے سفید موتیوں کا ہار پڑا  
 ہوا تھا۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ میں نیزہ تھام رکھا تھا۔ اس  
 کے ساتھ بہت سی عورتیں بھی اس جمونپڑی سے باہر آئی تھیں۔  
 ادا گو نے ان عورتوں کے بارے میں بتایا کہ یہ سب  
 بادشاہ کی بیویاں ہیں اور وہ کم بخت مزید بیویوں کو اپنے حرم  
 میں شامل کرنے جا رہا ہے۔

بادشاہ نے تخت پر بیٹھ کر پلونا شروع کر دیا۔ اس وقت  
 پورے میدان میں خاموشی تھی۔ رقص کرنے والیاں رک گئی  
 تھیں اور گیت گانے والے خاموش تھے۔ صرف بادشاہ کی  
 گرجتی ہوئی آواز پورے میدان میں گونج رہی تھی۔  
 ادا گو نے میرے لیے بادشاہ کی تقریر کا ترجمہ شروع  
 کر دیا۔ بادشاہ کہہ رہا تھا۔ "آج کی رات اس کے لیے  
 بہت مہارک اور مقدس ہے کیونکہ آج کی رات وہ صرف  
 تین لڑکیوں کو اپنی دلہن بنا رہا ہے۔ ان میں سے ایک ایسی  
 ہے جس کو دیوتاؤں نے آسمانوں سے اس کے لیے بھیجا  
 ہے۔ اس کی خوبصورتی بے مثال ہے۔ اس کی ادا گئی ہرنی  
 کی طرح ہیں۔ اس کے بال بادلوں کی طرح ہیں اور اس کا  
 رنگ ایسا ہے جیسے دیوتاؤں نے آسمانوں میں رنگ کھیر

بہر حال میں نے ادا گو سے کہا کہ میں بادشاہ کے بچے  
 کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ کچھ دیر کے بعد مجھے ایک  
 جمونپڑی میں پہنچا دیا گیا۔ کفرش پر کھائیں بھی ہوئی تھی۔  
 ان کھالوں پر بچے کو لٹا دیا گیا تھا۔ اندازے کے مطابق اس  
 کی عمر دس بارہ برس ہے زیادہ نہیں تھی۔  
 ہو سکتا ہے کہ وہ بھی تو اتنا بھی رہا ہو لیکن اس وقت وہ  
 ہڈیوں کا ڈھانچا ہو رہا تھا۔ میں بہت دیر تک اس کا معائنہ  
 کرتا رہا۔ میں اپنا بیگ اپنے ساتھ لے گیا تھا جس میں ہر  
 طرح کی دوائیں بھری ہوئی تھیں۔ میرے اندازے اور  
 تجربے کی رو سے اس بچے کا خیر یا بگڑ گیا تھا اور یہ کوئی خاص  
 بات نہیں تھی۔ میں نے فوری طور پر اس کی دیکھ بھال اور  
 اس کا علاج شروع کر دیا۔ دوائیں میرے پاس موجود تھیں  
 اس جمونپڑی میں دو عورتیں بھی تھیں جو بہت حیرت سے  
 میری کارروائیاں دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اس بچے کو انجکشن  
 بھی لگا دیا تھا۔ میں بہت دیر تک بیمار بچے کے پاس بیٹھا رہا  
 پھر ادا گو جمونپڑی میں داخل ہوا۔ میں نے اس کو بتایا کہ جا کر  
 بادشاہ سے کہہ دو کہ دو چار دنوں میں بچہ ٹھیک ہو جائے  
 گا۔ پھر میں نے ادا گو سے ذریعے وہاں موجود عورتوں کو  
 دوائیں بھی دے دیں تاکہ بچے کو استعمال کرائی رہیں پھر  
 مجھے میری جمونپڑی میں پہنچا دیا گیا۔

شام کے وقت ادا گو نے آکر بتایا کہ بادشاہ مجھ سے  
 بہت خوش ہے کیونکہ بچے کی طبیعت بہت تسخیل چکی ہے اور  
 اسی خوشی میں بادشاہ نے آج رات ہونے والی خاص  
 تقریب میں مجھے مدعو بھی کیا ہے۔

"یہ کس قسم کی تقریب ہے ادا گو؟"  
 "یہ میں نہیں جانتا۔" ادا گو نے بتایا۔ "لیکن ایک دو  
 آدمیوں سے پتا چلا ہے کہ بادشاہ کی شادی ہونے والی  
 ہے۔" میرا دل دھڑک اٹھا۔ بادشاہ شادی کرنے والا تھا لیکن  
 کس سے؟ کیا وہ تمہاری تو نہیں تھی جو ہر اسرار طور پر غائب  
 ہو گئی تھی بہت ممکن ہے کہ بادشاہ اسی سے شادی کر رہا ہو۔  
 "ادا گو! کیا بادشاہ کی شادی نہیں ہوئی؟" میں نے پوچھا۔  
 "ہو چکی ہے صاحب۔" ادا گو نے بتایا۔ "لیکن بادشاہ  
 ہر سال شادیاں کرتا ہے اور کم از کم چار پانچ عورتوں سے۔"  
 "ادا گو! کہیں ایسا تو نہیں کہ آج وہ تمہاری کو بھی اپنی  
 دلہن بنا رہا ہو؟"

"ہو سکتا ہے صاحب اور نہیں بھی ہو سکتا۔" ادا گو نے  
 کہا۔ "ہمارے یہاں ایک کہاوت ہے کہ جو ہوتا ہے وہ



دے ہوں اور اسے سفید روح کہا جاتا ہے۔“  
 میں نے واگو کا ہاتھ تمام لیا۔ ”واگو! یہ کم بخت شاید  
 تمہاری بات کر رہا ہے۔“  
 ”جی ہاں جناب۔ مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔“ واگو  
 نے کہا۔

”واگو! خدا کے لیے کچھ کرو۔“

اس کے ساتھ ہی اندر سے تینوں دلہنیں باہر آگئیں  
 اور ان میں سے ایک تمہاری بھی تھی۔ اسے خاص طور پر سنوارا  
 گیا تھا۔ اس کے بالوں میں کنول کے پھول لگے ہوئے  
 تھے۔ اس بھیا تک اور ناقابل یقین ماحول کے باوجود اس  
 کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت تھی۔ وہ ذرا بھی خوفزدہ  
 دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ کسی پُر فرور ملکہ کی شان سے  
 چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

پھر اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس نے میری طرف  
 دیکھ کر اپنا ہاتھ ہلا دیا۔ یہ دیکھ کر بادشاہ غضب ناک ہو کر  
 اس کی طرف بڑھا اور اسی وقت اس میدان میں قیامت برپا  
 ہو گئی۔ بادشاہ اچھل کر ایک طرف جا گیا تھا۔ اس کے سینے  
 میں ایک تیر بھوست تھا۔ اوروں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا  
 اندھیرا زہر پلے تیرا گل رہا تھا اور لوگ مرتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایک ساتھ اتنی لاشیں  
 نہیں دیکھی ہوں گی جتنی اس رات میری آنکھوں کے سامنے  
 تھیں۔ چھوٹے بچوں میں آگ لگ گئی تھی لوگ مر رہے تھے۔  
 عورتیں چیختی پھر رہی تھیں۔ جانے کتنے لوگ..... آگ  
 میں جل رہے تھے۔

ایک قیامت نازل ہو گئی تھی۔ اس دوران تمہاری  
 میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ واگو بھی میرے قریب  
 ہی تھا۔ ہم بری طرح سبے ہوئے تھے۔ جانے کب موت  
 برساتے ہوئے تیر ہماری طرف رخ کر لیں۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کے برعکس کچھ اور ہوا۔ ایک  
 حیرت زدہ کرنے والا واقعہ۔ جانے کس طرف سے کچھ لوگ  
 اندھیرے کی دیوار میں سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئے۔

یہ مختلف لوگ تھے۔ دراز قامت۔ میں نے ان کو  
 پہچان لیا تھا۔ یہ وہی تھے جو تمہاری کے لیے خوشبو کا تھکا لایا  
 کرتے تھے۔

انہوں نے بڑے احترام سے تمہاری کے سامنے اپنی  
 گردن جھکا دی۔ وہ عاجزانہ طور پر کچھ بتا رہے تھے۔ شاید  
 اپنی صفائیاں پیش کر رہے تھے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ یہ

بعد میں پتا چلا کہ وہ لوگ تمہاری یعنی سفید روح سے اس بات  
 کی معافی مانگ رہے تھے کہ انہیں وہاں تک کھینچنے میں دیر  
 لگ گئی اور وہ ناپاک کالا ہاتھی تمہاری کو اپنی بیوی بنانے کی  
 تیاریاں کرنے لگا۔

انہوں نے بتایا کہ ایک بیٹا میرے خبر دی تھی کہ سفید  
 روح کو اغوا کر کے سوختو قبیلے میں لے جایا گیا ہے۔ یہ سنتے ہی  
 ایک لشکر روانہ کر دیا گیا تھا اور یہ لوگ ٹھیک اس وقت پہنچے  
 جب شادی کی رسم ادا کی جا رہی تھی۔

ان لوگوں کے لیے شاید ایسی تبدیلی میں کوئی بھلائی  
 ہو لیکن میرے لیے ایک جھکی بات تھی۔ یہ تھی ان سے مختلف  
 تو نہیں ہو سکتے تھے جو ہمیں یہاں تک لے آئے تھے۔  
 اطمینان کی بات یہ تھی کہ تمہارا ہمارے ساتھ تھی اور ہم میں  
 سے کسی کو خراش تک نہیں آئی تھی اور تمہاری ان آنے والوں  
 کے درمیان کسی ملکہ کی طرح شان سے کھڑی ہوئی تھی۔ بستی  
 اجڑ چکی تھی۔ وہاں کی عورتیں مرد اور بچے بھاگ نکلے  
 تھے۔ ہمیں ایک بار پھر سڑکنا پڑ گیا۔ اس سفر میں بھی واگو  
 اور دونوں مزدور ہمارے ساتھ تھے۔ میرے لیے تو کچھ بھی  
 نہیں بدلاتا تھا، سب کچھ پہلے سڑکی طرح تھا۔ البتہ تمہاری بہت  
 مطمئن اور پرسکون دکھائی دے رہی تھی اور اس کے اطمینان  
 کو دیکھ کر خود مجھے بھی اطمینان ہو رہا تھا۔

اس بار بھی یہ سفر پیدل ہو رہا تھا۔ بہت سے لوگ  
 ساتھ چل رہے تھے۔ نئے جنگلوں کے درمیان۔ گیت  
 گاتے اور رقص کرتے ہوئے جیسے انہیں ڈھیروں خوشیاں مل  
 گئی ہوں اور وہ اپنی خوشیوں اپنے ساتھ لے کر چل رہے  
 ہوں۔ میں اور تمہاری ایک ساتھ ہی تھے۔ ایک دوسرے کا  
 ہاتھ تھامے ہوئے۔ جھپٹے سفر میں یہ تھا کہ جب میں تمہاری  
 کے قریب آنے کی کوشش کرتا تو وہ جھنگلی مجھ سے ناراض ہو  
 جاتے تھے لیکن ان لوگوں کے رویے برعکس تھے۔ انہوں  
 نے ایک بار بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔

”واگو! آخر یہ لوگ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟“  
 میں نے پوچھا۔

”اپنی بستی۔“ واگو نے جواب دیا۔

”لیکن کیوں..... یہ ہمیں چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“

”صاحب! آپ کے اس سوال کا میرے پاس  
 جواب نہیں ہے۔“ واگو نے کہا۔ ”میں نہیں جانتا کہ ہمارا کیا  
 حشر ہونے والا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ لوگ پہلے والوں  
 سے بہت بہتر ہیں۔“

جانے منزل کتنی دیر تھی، بس ہم چلتے جا رہے تھے۔ میں



ہستیاں اسنے فاصلوں پر کھولتی ہیں اور یہ جنگل خدا جانے کتنی دور تک پھیلا چلا گیا تھا۔

دوسری دو پہر کو ان لوگوں میں سے ایک نے ہمارے پاس آ کر واگو سے کچھ کہا۔ واگو کچھ دیر ان سے باتیں کرتا رہا پھر اس نے ہماری طرف دیکھا۔ ”یہ آدمی کہہ رہا ہے کہ ہم ہاتھیوں کے قبرستان کے پاس سے گزر رہے ہیں۔ اگر ہم یہ نظارہ دیکھنا چاہیں تو اس کا اذکار کیا جاسکتا ہے۔“

”ہاتھیوں کا قبرستان کیا چیز ہے واگو؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”بہت عجیب جگہ ہے ڈاکٹر صاحب۔“ واگو نے بتایا۔ ”اس عظیم الشان جنگلوں میں بے شمار ہاتھی ہیں اور وہ ہاتھی جب مرنے لگتے ہیں تو جانے انہیں کیسے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ مرنے والے ہیں۔ وہ اپنی جگہ سے سفر کرتے ہوئے اپنے قبرستان میں آ جاتے ہیں جو میلوں تک پھیلا ہوا ہے اور یہاں پہنچ کر ان کی موت ہو جاتی ہے۔“

”بہت زبردست پھر تو وہاں ہاتھی دانت بھی ہوں گے۔“  
 ”کرڈوں ڈالرز کا خزانہ ہے وہاں۔“ واگو نے بتایا۔  
 ”ہاتھی کے دانتوں کا اتنا بڑا ذخیرہ بری دنیا میں نہیں ہوگا۔“

”کیا وہ دانت کوئی افغانا نہیں ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”نہیں صاحب! اس نا بہت خطرناک اور حیرت انگیز داستان سے۔“ واگو نے کہا۔ ”جانے کتنے لوگوں نے اس خزانے کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہوگی لیکن سب کے سب ہاتھیوں کے ذریعے مارے گئے۔ بعض کو انہی ہاتھیوں نے مار ڈالا۔ ایک ڈیج کے ساتھ تو یہ ہوا تھا صاحب کہ وہ یہاں سے بہت سے ہاتھی دانت نکال لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن ہالینڈ پہنچ کر جب وہ ایک سرکس دیکھنے گیا تو سرکس کے ہاتھی نے اسے کھل کر مار ڈالا۔“

”میں وہ جگہ دیکھنا چاہتی ہوں۔“ تمہاری نے کہا۔  
 اگرچہ میری ایسی کوئی خواہش نہیں تھی لیکن تمہاری کے کہنے پر میں مجبور ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر سفر شروع ہو گیا لیکن اس سفر کی ڈائریکشن ذرا تبدیل ہو گئی تھی کیونکہ ہم ہاتھیوں کے قبرستان کی طرف جا رہے تھے۔ رات کے وقت قافلے نے پھر ایک جگہ پڑاؤ کر لیا۔ خدا جانے یہ سارے قافلے کتنے تھے کہ سینے کا نام نہیں لیتے تھے۔

اس رات جب ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو تمہاری میرے ٹینٹ میں آ کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کے چہرے پر بلا کا غمراہ تھا۔

اس کا چہرہ جیسے کسی اندرونی جذبے سے چمک رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر امر!

نے ایک خاص بات یہ نوٹ کی کہ تمہاری بہت پُر سکون تھی جیسے یہ سفر اس کی مرضی کا سفر ہو اور وہ یہ جانتی ہو کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ہم نے ایک جگہ پڑاؤ بھی کیا۔

وہ جنگل غلاموں کی طرح ہماری خدمت میں مصروف ہو گئے تھے۔ ہمارے لیے خیمے نصب کیے گئے۔ انہیں اس پر بھی اعتراض نہیں تھا کہ تمہاری نے اپنا ٹینٹ میرے ٹینٹ کے سامنے لگوایا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد میں نے تمہاری سے کہا۔  
 ”تمہاری امیری کچھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آخر یہ سب کیا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟ میں تو یہاں ایک این جی او کے کہنے پر آیا تھا۔ میرا کام بچوں کا علاج کرنا تھا پھر یہ کیسی کہانی شروع ہو گئی؟“

”اور بھی تو بہت کچھ ہوا ہے امر۔“ تمہاری دھیرے سے بولی۔ ”تمہیں اس پر بھی حیرت کرنی چاہیے۔ جیسے ہم دونوں کا ایک دوسرے سے ملنا۔ ایک عجیب سے احساس کے ساتھ جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ کچھ حیرت انگیز لوگوں کا تمہارے لیے بھی خوشبو کا تھنڈے لے کر آنا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ پھر ان جنگلیوں کے رویے جیسے یہ سب ہمارے غلام ہوں۔ آخر یہ کیا اشارے ہیں۔“

”کاش میں تمہارے کسی سوال کا جواب دے سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”میں تو اس بات پر بھی حیران ہوں کہ تم بالکل پُر سکون دکھائی دے رہی ہو۔“

”ہاں، یہ بھی ان واقعات کا ایک تسلسل ہے ڈاکٹر امر۔“ تمہاری نے ایک گہری سانس لی۔ ”ایسا لگتا ہے جیسے قدرت ہمیں ایک خاص منصوبے کے تحت ان لوگوں کے ساتھ کسی طرف لے جا رہی ہے اور جیسے میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ہمارا نقصان نہیں ہوگا۔ ان اجنبی حالات کے باوجود ہم زندہ رہیں گے۔“

دوسری صبح پھر سفر شروع ہو گیا۔ واگو کے ذریعے مطوم ہوا کہ گزشتہ رات ہمارے قافلے کے تین افراد سانپوں کے ڈسنے سے مر گئے ہیں جنہیں راتوں رات دفن کر دیا گیا تھا۔

”صاحب! ان لوگوں کے لیے زندگی اور موت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔“ واگو بتا رہا تھا۔ ”آپ خود دیکھ لیں۔ تین آدمی مر چکے ہیں لیکن قافلے پر کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔“

”ہاں واگو سب کچھ پہلے کی طرح چل رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ سفر اس دن بھی جاری رہا۔ جانے ان لوگوں کی



”جو بھی ہوسنا شروع کرے۔“

☆☆☆

”ہماری مقدس کہانی اور ہمارے بزرگ سینہ بہ سینہ روایات سے یوں بیان کرتے ہیں اور جو کچھ وہ بیان کرتے تھے وہی برسوں کے بعد میں یہاں سنا رہا ہوں۔“

ناگانا نے انتہائی فصیح و بلیغ انداز میں اپنی کہانی سنانی شروع کر دی

”اب سے ہزاروں سال پہلے ہمارا دیوتا اتیس (Attis) تھا جو آج تک کئی شکل میں ہمارے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ اتیس سنہری موت اور زندگی کے بعد موت اور اس کے بعد کی زندگی کا دیوتا تھا۔ وہ پہلا انسان تھا پھر اس کو دیوتا کا درجہ حاصل ہو گیا۔ وہ چرواہا تھا لیکن محبت نے اس کو امر کر کے دیوتا کا درجہ دے دیا۔“

”اس کی محبوبہ سائی تیل دیوتاؤں کی ماں تھی۔ جو بادام یا انار سونگھنے سے حاملہ ہونے لگی۔ اتیس کو موت کے بعد دیوتا کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اتیس نے منبر کے درخت کے نیچے اپنے آپ کو ختم کر لیا تھا۔“

”رومیوں نے 204 ق م میں دیوتاؤں کی ماں کی پرستش شروع کی۔ روم نے اپنا سفیر مقدس شہر passinus روانہ کیا جہاں کی حکومت نے سفیر کو کالے رنگ کا بسمہ تحفے میں دیا۔ جس کو اتیس اور سائی تیل کا بچہ خیال کیا جاتا تھا۔“

”روم والوں نے اس مجسمے کا زبردست استقبال کیا اور اس مجسمے کو بیلاٹین کی پہاڑی بدو اقع و کٹری ٹیمپل میں نصب کر دیا گیا۔ پھر ان تینوں کی پوجا شروع کر دی گئی۔ یعنی اتیس، سائی تیل اور وہ بچہ اس کے بعد نہ جانے کس طرح یہ تینوں دیوتا افریقا کے قبائل تک پہنچ گئے اور یہاں بھی ان کی پوجا شروع ہو گئی۔ پھر یہ ہوا کہ اتیس تو اپنا کوئی نمائندہ نہیں بنا سکا لیکن اس کی محبوبہ سائی تیل کئی شکلوں میں سامنے آتی رہی۔ اب بھی یہی ہوا کرتا ہے کہ سائی تیل کی علامات جس لڑکی میں دکھائی دیتی ہیں ہم لوگ اس لڑکی کو اٹھا کر اپنے یہاں لے آتے ہیں جب کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ سائی تیل اور اتیس دونوں ہمارے درمیان موجود ہوں۔“

وہ ذرا سی ویر کے لیے رکا تھا کہ میں نے پوچھا۔ ”تمہاری اس کہانی کا ہم دونوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”ابھی میری کہانی ختم نہیں ہوئی جناب۔“ وہ دھیرے سے بولا۔ ”اس بچے کے کالے رنگ کا بسمہ تو ہمیشہ قبائل کے ساتھ رہا جو ان دونوں کا نمائندہ تھا لیکن وہ دونوں

اب یہاں سے ہمارا اصل سفر شروع ہونے والا ہے۔“

”کیا بچہ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔“ ہم ابھی تک سفر ہی تو کر رہے ہیں۔ اب اصل سفر اور کیا ہوگا؟“

”یہ میں نہیں جانتی لیکن جانے کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ اصل مرحلہ اب شروع ہونے والا ہے۔ ابھی ہیں... بہت کچھ دیکھنا ہے۔“

”تمہاری امیرا تو خیال ہے کہ ہم کسی طرح یہاں سے نکل لیں اور پری ٹور یا پہنچ جائیں۔ جہاں سے ہم چلے تھے اور وہاں سے نئی زندگی کا آغاز کریں۔“

”نہیں امیرا! شاید ایسا ممکن نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اب ہم بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔“ اس نے کچھ توقف کیا۔

”اپنی منزل کے۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

”لیکن منزل کے بارے میں کچھ مت پوچھنا۔ کیونکہ ابھی مجھے خود کچھ نہیں معلوم بس ایک دھندلا سا احساس ہو رہا ہے۔“

تمہاری نے ابھی اپنی بات ختم کی ہی تھی کہ واگو کے ساتھ ایک دراز قامت شخص ہمارے ٹینٹ میں داخل ہو گیا۔

الاد کی بھڑکتی ہوئی روشنی میں وہ کچھ عجیب سا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ بہت احرام کے ساتھ پہلے تمہاری کے سامنے پھر میرے سامنے جھکا۔ میں اور تمہاری حیران ہو کر اس کو دیکھے جا رہے تھے۔

”صاحب۔“ واگو نے گھٹکا کر اپنا گلا صاف کیا۔

”یہ شخص ناگانا ہے۔ یہ اس قبیلے کا سب سے بڑا پرہیز ہے جہاں ہم کو لے جایا جا رہا ہے۔ یہ شخص ایک عرصہ مہذب دنیا میں گزار چکا ہے۔ اس لیے انگریزی بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ یہ آپ دونوں کو کوئی کہانی سنانا چاہتا ہے۔“

”یہ کیا حماقت ہے۔“ مجھے غصہ آ گیا۔ ”کیا ہم اتنی دور صرف اس کی کہانی سننے کے لیے آئے ہیں؟“

”جی ہاں جناب۔“ وہ شخص بول پڑا۔ جس کا نام ناگانا بتایا گیا تھا۔ ”آپ دونوں کے لیے یہ کہانی بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق آپ دونوں کی گزشتہ اور آئندہ زندگی سے ہے۔“

میرے پر گھس تمہاری بہت توجہ اور دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے اس شخص سے کہا۔ ”ٹھیک ہے سناؤ کیا ہے تمہاری کہانی۔“

”میری نہیں، آپ دونوں کی کہانی بلکہ ہم سب کی کہانی ہے۔“ وہ دھیرے سے بولا۔



ہوں۔ ایک خدا کی عبادت کرتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ  
اتیس کون ہے اور سائی تیل کس ہلا کا نام ہے۔“

ناگانا بہت قہقہے کے ساتھ میری باتیں سن رہا۔ میرے  
خاموش ہو جانے کے بعد اس نے کہا۔ ”ہم جانتے ہیں کہ  
آپ ابھی تک اپنے اسی جنم کی یادوں اور تجربات کے ساتھ  
ہیں۔ آپ کو پچھلے دور کی باتیں یاد نہیں آ رہی ہیں اسی لیے  
آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ اپنی جگہ بالکل درست ہے۔  
آپ کی ناراضگی بھی بالکل برحق ہے لیکن جب آپ کو پچھلے  
باتیں یاد آئیں گی تو آپ خود کو اتیس ہی محسوس کریں گے۔“

میں برا سامنے بنا کر رہ گیا۔ ظاہر ہے میں ان حماقت  
بھری باتوں پر کیا کہہ سکتا تھا۔ حالات نے کہاں لاکر پھنسیا  
تھا۔ کیسے واقعات میرے سامنے پیش آتے جا رہے تھے کہ  
جیسے کوئی دلچسپ کہانی پڑھتے پڑھتے میں خود اس کہانی کا  
ایک کردار بن گیا ہوں۔

”تم یہ بتاؤ کہ اس قبیلے سے تمہاری صلح کیسے ہوئی؟“  
تماچی نے پوچھا۔

”صلح اس طرح ہوئی۔ اس قبیلے نے بھی خواب میں  
دونوں کی زیارت کی۔ جو یہ کہہ رہے تھے کہ ہم نے تلاش کا  
کام ہمارے قبیلے کے سپرد کر دیا ہے۔ اسی لیے اس قبیلے سے  
جنگ ختم کر دی جائے اور جب ہم دونوں مل جائیں تو پھر  
ہمیں ہمارے بیچ کے پاس بچھا دیا جائے۔“

”اور وہ بچہ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”اس قبیلے کے پاس جہاں آپ دونوں کو جانا ہے۔“

ناگانا نے بتایا۔ ”آپ کا اصل نژاد اسی قبیلے کے لیے ہے۔“  
”اب برداشت کی حد ہو گئی ہے تماچی۔“ میں نے  
کہا۔ ”ہم کیا کھلونے بن کر ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے میں  
جاتے رہیں گے؟ کیا ہماری اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے؟“

”حیثیت تو ہے مقدس دیوتا۔“ ناگانا بول پڑا۔  
”آپ اتیس دیتا ہیں۔ دونوں قبیلوں پر آپ کا حق ہے۔  
آپ کا حکم چلے گا۔ آپ چاہیں جس کی گردن اڑا دیں، آپ  
سے کوئی نہیں پوچھے گا۔ آپ چاہیں تو دونوں قبیلوں کی ہر  
عورت سے شادی کر لیں۔“

”لاحول ولا قوۃ۔ تماچی آخر تم کیوں خاموش ہو کر یہ  
من رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ میں یہ جانتی ہوں کہ یہی ہمارا مقدر  
ہے۔“ تماچی نے کہا۔ ”میں اس سفر کے لیے برسوں سے  
خواب دیکھتی چلی آ رہی ہوں۔ مجھے بار بار بتایا جا رہا تھا۔“

”تماچی! میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔“ میں غصے سے  
کہا۔

”تم نے پوچھا۔“ میں نے پوچھا۔  
”اس لیے کہ میں یہ جانتی ہوں کہ یہی ہمارا مقدر  
ہے۔“ تماچی نے کہا۔ ”میں اس سفر کے لیے برسوں سے  
خواب دیکھتی چلی آ رہی ہوں۔ مجھے بار بار بتایا جا رہا تھا۔“

”تماچی! میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔“ میں غصے سے  
کہا۔

”تم نے پوچھا۔“ میں نے پوچھا۔  
”اس لیے کہ میں یہ جانتی ہوں کہ یہی ہمارا مقدر  
ہے۔“ تماچی نے کہا۔ ”میں اس سفر کے لیے برسوں سے  
خواب دیکھتی چلی آ رہی ہوں۔ مجھے بار بار بتایا جا رہا تھا۔“

غائب ہوتے رہے پھر برسوں کے بعد واپس آتے رہے کبھی  
اتیس اور کبھی سائی تیل۔“

”کیا وہ دونوں ایک ساتھ کبھی نہیں ملے؟“ تماچی  
نے پوچھا۔

”نہیں، کبھی نہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”پھر یہ ہوا کہ  
ہمارے قبیلے اور اس قبیلے کے درمیان جنگیں شروع ہو گئیں  
جو اتیس اور سائی تیل کی پوجا کرتا تھا۔“

”کیا مطلب؟“ تماچی نے چونک کر اس کی طرف  
دیکھا۔ ”کیا تم لوگ پوجا نہیں کرتے؟“

”نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”وہی تو میں بتانے جا رہا  
ہوں پھر یہ ہوا کہ صدیوں کے بعد ہمارے درمیان صلح کی  
ایک صورت نکل آئی اور وہ یہ تھی کہ دونوں یعنی اتیس اور  
سائی تیل نے ہمارے معزز لوگوں کے خوراکیوں میں آ کر یہ  
بتانا شروع کر دیا کہ ہم بہت جلد ایک ساتھ واپس  
آ رہے ہیں اور سائی تیل کو شہر جا کر تلاش کیا جائے لیکن اس  
کے ساتھ زبردستی نہ کی جائے۔ حالات ایسے پیدا ہو جائیں  
گے کہ وہ خود ہی سفر کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ جائیں گے۔“

میرا دل دھڑک اٹھا۔ شاید یہاں سے اس کی اصل  
کہانی سامنے آنے والی تھی۔ اب تک اس نے جو کچھ کہا تھا،  
اس کا اطلاق ہم سے نہیں تھا لیکن اب.....

”پھر یہ ہوا جناب کہ چونکہ ان دونوں نے تلاش  
کرنے کی ذمہ داری ہمارے قبیلے کو سونپ دی تھی اس لیے  
ہمارے آدمی شہر جا کر تلاش کرنے لگے اور دیوی کو تلاش  
کرنے میں کامیاب ہو گئے۔“

”کون ہے وہ دیوی؟“ تماچی نے بہت ٹھہرے  
ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”ظاہر ہے، آپ کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔“  
ناگانا نے کہا۔

”کیا تم کو اس ہے یہ؟“ میں بھڑک اٹھا۔ ”تماچی  
تمہاری دیوی کیسے ہو سکتی ہے؟“

”دیوی کی علامتوں نے ہمیں اس کی طرف بھیجا تھا  
صاحب۔“ اس نے کہا۔ ”اسی لیے ہم ان کے لیے خوشبو کا  
تھلہ بھیجا کرتے تھے۔“

”اور میں..... میں کون ہوں؟“

”ظاہر ہے کہ آپ اتیس ہیں۔“ اس نے کہا۔  
”خدا کے لیے میرا چچا چھوڑ دو۔“ میں نے اپنے  
ہاتھ جوڑ لیے۔ ”میں ایک عام سا انسان ہوں۔ میرا کوئی  
مطلق تمہارے دیوی دیوتاؤں سے نہیں، میں مسلمان

ہوں۔“

”تم نے پوچھا۔“ میں نے پوچھا۔  
”اس لیے کہ میں یہ جانتی ہوں کہ یہی ہمارا مقدر  
ہے۔“ تماچی نے کہا۔ ”میں اس سفر کے لیے برسوں سے  
خواب دیکھتی چلی آ رہی ہوں۔ مجھے بار بار بتایا جا رہا تھا۔“

”تماچی! میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔“ میں غصے سے  
کہا۔

”تم نے پوچھا۔“ میں نے پوچھا۔  
”اس لیے کہ میں یہ جانتی ہوں کہ یہی ہمارا مقدر  
ہے۔“ تماچی نے کہا۔ ”میں اس سفر کے لیے برسوں سے  
خواب دیکھتی چلی آ رہی ہوں۔ مجھے بار بار بتایا جا رہا تھا۔“

”تماچی! میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔“ میں غصے سے  
کہا۔

”تم نے پوچھا۔“ میں نے پوچھا۔  
”اس لیے کہ میں یہ جانتی ہوں کہ یہی ہمارا مقدر  
ہے۔“ تماچی نے کہا۔ ”میں اس سفر کے لیے برسوں سے  
خواب دیکھتی چلی آ رہی ہوں۔ مجھے بار بار بتایا جا رہا تھا۔“

”تماچی! میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔“ میں غصے سے  
کہا۔



یولا۔ "تم یہ کوشش کرو کہ میں کسی طرح یہاں سے چلا جاؤں۔"  
 "نہیں آقا۔" میری بات سن کر ناگانا بول اٹھا۔  
 "ایسا سوچو گا بھی نہیں۔ اس لیے نہیں کہ ہم آپ کا راستہ  
 روکیں گے یا آپ کو جانے نہیں دیں گے۔ ہم میں اتنی  
 حرأت کہاں کہ آپ کا راستہ روک سکیں لیکن اتنا ضرور ہوگا  
 کہ ہم میں سے کوئی آپ کے ساتھ نہیں جائے گا۔ آپ  
 جنگلوں میں بھٹکتے رہیں گے پھر آپ کو معلوم ہے کہ یہاں  
 بہت سے قبائل ایسے بھی ہیں جو آتش دیوتا اور سائی تل  
 دیوی کی پوجا نہیں کرتے اور ان کے تیرز ہر میں بچھے ہوئے  
 ہوتے ہیں۔"

میں کانپ کر رہ گیا۔ اس کم بخت نے کوئی دھمکی تو نہیں  
 دی تھی لیکن جو کچھ کہہ گیا تھا وہ دھمکی سے کم بھی نہیں تھا۔  
 "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" میں نے اپنے آپ پر قابو  
 پاتے ہوئے پوچھا۔

"آقا! آپ کو ہمارے قبیلے کا ساتھ چھوڑ کر اپنے  
 لوگوں میں جانا ہے۔" اس نے کہا۔ "یعنی ان کے درمیان  
 جو آپ دونوں کی پوجا کرتے ہیں۔"  
 "اور اگر ہم نہ جانا چاہیں تو؟" تمنا پی جلدی سے بولی۔  
 "نہیں دیوی۔ آپ مذاق کر رہی ہیں۔" ناگانا نے  
 کہا۔ "آپ کو تو وہاں جانا ہی ہے کیونکہ آپ نے اتنی دور کا  
 سفر ایسے لیے تو کیا ہے۔"

☆☆☆

پھر ایک سفر۔

اب تک کا ہر سفر پر اسرار تھا لیکن اتنا نہیں، جتنا یہ سفر  
 ثابت ہو رہا تھا۔ ناگانا کے قبیلے والوں نے ہمیں ایک جگہ  
 لاکر چھوڑ دیا تھا۔ یہ ایک ریگستان تھا۔ "آقا اور دیوی۔"  
 ناگانا نے ہمیں مخاطب کیا۔ "اب یہاں سے ہم آپ سے  
 رخصت ہو رہے ہیں۔ آپ کا یہ واگو بھی ہمارے ساتھ  
 واپس جائے گا۔"

"کیا مذاق ہے؟ ہم یہاں سے کیسے جائیں گے؟  
 کہاں جائیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"آقا! اس کے لیے آپ کو پریشان ہونے کی  
 ضرورت نہیں ہے۔" ناگانا نے کہا۔ "وہ لوگ خود آ کر آپ  
 کو اپنے ساتھ لے جائیں گے کیونکہ انہیں معلوم ہو چکا ہے  
 کہ ان کے مہمان آچکے ہیں اور وہ آپ کے استقبال کے  
 لیے اپنے گھروں سے نکل پڑے ہیں۔"

"اور وہ لوگ رہتے کہاں ہیں؟"  
 "اس ریت کے دریا کے اس پار۔" ناگانا نے کہا۔

"وہ بہت جلد اپنے ان شیطانی جانوروں کے ساتھ آ جائیں  
 گے جن کی ٹانگیں اور گردنیں بہت لانی لانی ہیں۔ جو اپنی  
 پشت پر آدمیوں کو بٹھا کر ریت کے دریا میں بغیر ٹھکے ہوئے  
 ٹھنٹوں دوڑتے رہتے ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ اونٹوں کی طرف ہو سکتا  
 ہے لیکن یہ حیرت کی بات تھی کہ ان قبیلوں میں اونٹ کہاں  
 سے آئے تھے۔ یہ تو عرب کے ریگستان جانور تھے۔

"کم از کم اس وقت تو رک جاؤ جب تک وہ لوگ نہ  
 آ جائیں۔" تمنا پی نے کہا۔

"ہاں دیوی، یہ تو ہمارا فرض ہے۔" ناگانا سر جھکا کر  
 بولا۔ "ہم آپ دونوں کو اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتے۔" ہم نے  
 اس رات پھر پڑاؤ کیا۔ صحرا کی رات بہت ٹھنڈی ہو گئی تھی  
 لیکن یہ لوگ الاؤ روشن کرنے کے لیے ڈھیر ساری لکڑیاں  
 اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ الاؤ روشن کر دیے گئے۔ واگو  
 واگو بہت ادا کی ہو رہا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ پھر آپ دونوں  
 سے ملاقات ہوگی یا نہیں۔"

"واگو! ہم نے بہت بڑی فطلی کی۔" میں نے کہا۔  
 "ہمیں یہ نعمتی سفر کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"لیکن مقدر بھی تو کوئی تیز ہے صاحب! وہ تو ہر حال  
 میں اسی راستے پر لے جاتا ہے جو راستہ ہمارے لیے  
 آسانوں پر لکھ دیا گیا ہے۔"

"واگو! تم تو واپس چلے جاؤ گے اپنے لوگوں کے  
 درمیان لیکن خدا جانے ہمارا کب حشر ہوگا۔"

تمنا پی جو اب تک پر جوش دکھ رہی تھی وہ بھی اس وقت  
 خاموش تھی۔ شاید اس پر اسرار ماحول اور آئندہ کے انجامے  
 سفر کے تصور نے اسے اداں کر دیا تھا۔

ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے یعنی میں تمنا پی اور  
 واگو۔ شہروں کی باتیں، وہاں کی زندگی اور مصروفیت کی باتیں۔

ہم نے کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو جیسے فراموش کر دیا تھا۔  
 پھر ہمیں نیند آ گئی۔

بہت سویرے میری آنکھ کھلی۔ تمنا پی ابھی تک سو  
 رہی تھی۔ میں اپنے ٹینٹ سے باہر آ گیا۔ صبح کے آسمان  
 نمایاں ہونے لگے تھے اور صحرا میں دور دور تک ہلکی ہلکی روشنی  
 پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں جو کچھ مجھے دکھائی دیا، وہ بہت  
 حیرت انگیز تھا۔ تقریباً چار پانچ سو گز کے فاصلے پر اونٹوں کی  
 پوری قطار کھڑی ہوئی تھی اور ہر اونٹ کی پشت پر ایک سوار  
 اپنے ہاتھ میں ایک نیزہ لیے موجود تھا۔

میں حیرت سے انہیں دیکھتا رہا۔ یہ وہی لوگ تھے جن



گئے۔ وہ اب تک ملنے والے جنگلیوں سے بہت مختلف تھے۔ ان سب نے سفید پادے پہن رکھے تھے۔ ان کے رنگ بھی سیاہ نہیں تھے بلکہ گندمی تھے۔ وہ طویل قامت اور کھڑے نقش و نگار رکھنے والے لوگ تھے۔ شاید ان میں عربی خون کی آمیزش تھی۔ ان میں سے ایک اپنے ساتھیوں سے چار پانچ قدم آگے آیا۔ اپنا تیزہ بلند کیا اور پوری فصاحت سے گونج اٹھی۔

بعد میں پتا چلا کہ وہ ہمیں سلام پیش کر رہے تھے۔ شاہی سلام۔ یہ لوگ دوسرے جنگلیوں کی طرح بے ترتیب نہیں تھے بلکہ ان میں ایک نظم تھا۔ ڈسپلن تھا۔ پھر وہی آدی آگے بڑھا اور اس نے اپنا تیزہ تہاچی کے قدموں میں رکھ دیا پھر سجدے کے انداز میں ہو کر سیدھا کھڑا ہو کر بولا۔ ”خوش آمدید۔ خوش آمدید۔ اے مقدس دیوی اور اے مقدس دیوتا۔ برسوں کے بعد تم خوشحالی کی خبر بن کر اپنے لوگوں میں واپس آئے ہو۔ ہم تمہارا استقبال کرتے ہیں۔ تمہارے جانے کے بعد ہم بے سہارا ہو کر رہ گئے تھے۔ ہمارے مرد کامل اور ہماری عورتیں بچر ہوتی جا رہی تھیں۔ تمہارا بچہ تمہارے انتقال میں اداس ہو رہا تھا لیکن اب تم واپس آ گئے ہو۔ اب ہمارے پاس سب کچھ ہوگا۔ ہم پہلے سے زیادہ خوش حال اور طاقتمند ہو جائیں گے۔“

اس نے یہ ساری باتیں انگریزی میں کی تھیں۔ یہ بھی ایک حیرت کی بات تھی کہ ان لوگوں نے یہ زبان کہاں سے سیکھ لی تھی۔ اس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ”اب تم دونوں ہمارے ساتھ اپنے شہر کی طرف چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ہم نے تمہاری سواریوں کے لیے سب سے شاندار اونٹوں کا بندوبست کر دیا ہے۔ اس سفر میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی کیونکہ ہم تم دونوں پر جان دینے والے تمہارے ساتھ ہیں۔“

کاش۔ اس وقت بھی کوئی راستہ ہوتا۔ کوئی تدبیر نکلتی تو میں تہاچی کو لے کر وہاں سے فرار ہو جاتا۔ پری ٹور یا سے نکلتے ہی بھیا تک خوابوں کا ایسا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے پا تھا۔ ایسے واقعات عام زندگی میں کہاں پیش آتے ہیں لیکن پیش آ رہے تھے اور ہمیں ان مراحل سے گزرنا بھی تھا۔

اس آدی نے پھر ہماری طرف دیکھا۔ ”تمہارا یہ خادم تمہارے شہر کا حاکم کہلاتا ہے اور اس کا نام البارا ہے۔ البارا صرف نام کا حاکم ہوگا جبکہ اصل حاکیت تم دونوں کی ہوگی۔“

کے ساتھ ہمیں ایک اجنبی سفر پر جانا تھا۔ اس دوران واگو، ناگانا، تہاچی اور دوسرے لوگ بھی ہمارے پاس آن کھڑے ہوئے تھے۔ اونٹ سوار محسوس کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ یہ ایک مرحوب کرنے اور پریشان کر دینے والا منظر تھا۔

”آقا۔“ ناگانا نے ہمیں مخاطب کیا۔ ”تمہیں لینے والے آپہنچے ہیں۔ اب تمہیں اپنا اگلا سفر ان کے ساتھ کرنا ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ تم دونوں کی رحمتیں ہمارے ساتھ رہیں گی۔ ہمارے کھیت سرسبز رہیں گے اور ہماری عورتوں کی کوکھ بہادروں کو حتم دیا کریں گی۔“

واگو ہمارے پاس آ گیا۔ وہ بہت افسردہ ہو رہا تھا۔ میں نے اسے اپنا لیا۔ اس وقت ہم سب غم زدہ تھے اور اپنی اگلی یا شاید آخری منزل کی طرف جا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ اس فیصلے کے افراد ہم دونوں کے سامنے آ کر ہمیں تعظیم دیتے ہوئے اپنے قدموں واپس ہوتے رہے اور پھر وہ سب نگاہوں سے اوجھل ہوتے گئے۔ اب صحرا میں ہم دونوں رہ گئے تھے یا پھر وہ لوگ تھے جو اب تک اپنے اونٹوں پر سوار تھے۔ ان کے اونٹ اپنی جگہ کھڑے ہوئے تھے۔

اس وقت تہاچی نے میرا ہاتھ تمام لیا۔ شروع سے اب تک وہ پر جوش، طاقت، قدیم اور حوصلہ مند رہی تھی لیکن اس وقت وہ پریشان ہو رہی تھی۔ ”اگر۔“ اس نے سرگوشی کی۔ ”میں پہلی بار خوف محسوس کر رہی ہوں، ورنہ اب تک جو کچھ ہو رہا تھا، وہ شاید میرے لیے کسی ایسے دھچکے کی طرح تھا۔“

”ہاں تہاچی۔“ میں نے بھی اعتراف کیا۔ ”اس لشکر کی یہ خاموشی ہمیں بے چین کر رہی ہے۔“

اچانک اونٹوں کی قطار میں ایک الجھل سی بریا ہوئی۔ سواروں نے اپنے اپنے اونٹ کو مہینز کیا اور اونٹوں کی ایک دوڑی شروع ہو گئی۔ وہ اونٹ اس طرح ہماری طرف بڑھ رہے تھے جیسے ہمیں جھل کر رکھ دیں گے۔

ہم دونوں پتھر بہنے ہوئے دیکھتے رہ گئے۔ خوف کا ایسا عالم تھا کہ بیان سے باہر تھا۔ ہم بھاگنا بھی چاہتے تو بھاگ نہیں سکتے تھے۔ کم از کم میں تو یہی محسوس کر رہا تھا کہ میرے پاؤں اچانک وزن ہونے لگے۔

اونٹ ہماری طرف دوڑے آ رہے تھے اور اس سے پہلے کہ وہ ہمیں جھل کر رکھ دیتے، وہ ہم سے کچھ فاصلے پر آ کر اس طرح رک گئے جیسے گاڑیوں کو بربیک لگا دیا گیا ہو۔

یہ ایک حیرت زدہ کرنے والا منظر تھا۔ پھر وہ سب اپنے اپنے اونٹوں کو بٹھا کر ان پر سے نیچے اتر آئے اور ہم سے کچھ فاصلے پر آ کر کھڑے ہو



”اس ریگستان میں تم سے کون دشمنی کرنے آئے گا؟“  
 ”کئی دشمن ہیں آقا۔“ اس نے کہا۔ ”سورج کی تیز  
 دھوپ، بے پناہ گرمی دور تک پھیلا ہوا ریت کا دریا اور  
 ریگستان سے آئی ہوئی پاگل ہوا میں۔ یہ سب دشمن ہیں اور  
 ہمیں ان سے بچ کر نکلنا ہے۔“

”الہا! ہمارا یہ سفر کتنی دیر کا ہو گا؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”اگر ہم معمول کے مطابق چلتے رہے تو پرسوں شام  
 تک اپنے شہر پہنچ جائیں گے۔“ اس نے بتایا۔  
 میں کراہ کر رہ گیا۔ ایک اور موذی سفر میں درپیش تھا۔  
 میرے اندازے کے مطابق کم از کم سواونٹ سوار تو  
 ضرور ہوں گے یعنی ہمارے استقبال کے لیے سوجرانوں کو  
 اس ریگستان کی طرف بھیجا گیا تھا۔

میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ افریقا کو تاریک براعظم اسی  
 لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے بے شمار بھیرا بھی تک نگاہوں سے  
 لوجھل ہیں۔ مہذب دنیا ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ کسی  
 کو نہیں معلوم کہ کتنے قبائل ہوں گے اور ان کے عقائد کیا ہیں۔  
 وہ کن دیوبی دیوتاؤں کی عبادتیں کیا کرتے ہیں۔

ہم بہت دیر تک سفر کرتے رہے۔  
 مجھے خود سے زیادہ تھائی کی گھڑی۔ جانے وہ اونٹ کا  
 یہ تکلیف دہ سفر کس طرح برداشت کر رہی تھی۔ جن لوگوں کو  
 ریگستان کے سفر کا تجربہ ہو چکا ہے، وہ یہ جانتے ہوں گے کہ  
 یہ کتنا تکلیف دہ ہوا کرتا ہے۔

میں اس کھل سفر کی روداد نہیں لکھ رہا ہوں۔ راستے  
 میں بہت کچھ ہوتا رہا۔ جیسے گرد و خراب کا طوفان۔ بے پناہ  
 گرمی، دو چار آدمیوں کی موت وغیرہ۔

میں ان سب کو نظر انداز کر کے اب وہاں سے اپنا حال  
 شروع کرتا ہوں جب ہمارا یہ قافلہ اس شہر میں داخل ہوا جس کے  
 بارے میں الہا نے بتایا تھا کہ اس کا نام مادن ہے۔  
 ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ مادن عینہ سے لیا گیا ہو جس کا  
 مطلب بستی ہوا کرتا ہے اور مدنیات اسی میں سے نکلا ہے۔  
 یعنی شہری علوم۔ ممکن ہے کہ مادن کا نام پہلے کچھ اور ہو لیکن  
 اب یہ مادن کہلایا کرتا تھا۔

☆ ☆ ☆  
 یہ ایک عقیم الشان شہر تھا۔

میرے اندازے کے مطابق اس کی آبادی دس بارہ  
 لاکھ سے کسی طرح کم نہیں ہوگی اور یہ باقاعدہ شہر تھا۔ افریقی  
 لوگوں کے شہروں کی طرح صرف جموں پڑیاں نہیں بنتی ہوتی  
 تھیں بلکہ باقاعدہ مکانات تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی

اس کے نام نے بھی حیران کر دیا تھا۔ ال۔ عام طور  
 پر عربی زبان میں لاحقہ کے طور پر لگایا جاتا ہے۔ اس خیال  
 کی تصدیق ہوتی جا رہی تھی کہ ان لوگوں کے آباؤ اجداد عربی  
 النسل ضرور ہوں گے۔ اب تمہاجی نے اپنی صاف اور شیریں  
 آواز میں یوں شروع کیا۔ چونکہ اس آدمی نے انگریزی میں  
 تقریر کی تھی، اس لیے تمہاجی بھی انگریزی میں بول رہی تھی۔  
 ”میرے اپنے لوگو۔ ہاں ہم بہت دور کے سفر کے  
 بعد تمہارے پاس پہنچے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ ہمیں ہر دور میں  
 ہر طرح کے روپ میں رہنا پڑتا ہے کیونکہ آسمانوں کی بھی  
 مرضی ہوتی ہے اسی لیے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ پچھنے دور  
 میں ہمارے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ہم کن لوگوں کے درمیان تھے  
 اور کبھی زندگی گزار رہے تھے۔“

”ہم جانتے ہیں دیوبی۔“ الہا نے کہا۔ ”ہم جانتے  
 ہیں کہ تم خود کو اجنبی محسوس کرو گی اسی لیے ہم نے تمہارے  
 لیے اور تمہارے دیوتا شوہراتیں کے لیے وہ زبان سیکھی جو  
 ہم میں سے کوئی نہیں جانتا صرف اس لیے کہ تم دونوں کو کوئی  
 پریشانی نہ ہو۔“

میں نے اس وقت دل ہی دل میں تمہاجی کی ذہانت کو  
 سراہا تھا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے یہ بتا دیا کہ ہم ان کے  
 دیوبی اور دیوتا تو ہیں لیکن ہم بھول چکے ہیں کہ ہمیں کرنا کیا  
 ہوتا ہے۔

لیکن سوال یہی تھا کہ آخر کیوں؟ ان لوگوں سے ہمارا  
 واسطہ کیا تھا؟ ہمیں ان کے ساتھ کیوں رہنا تھا؟ ہم نے تو یہ  
 سفر کسی اور مقصد سے کیا تھا۔ پھر ہم اس پکر میں کیوں پھنس  
 گئے تھے؟ لیکن بات بھر دی تھی۔ تقدیر جس سے فرار  
 انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

دونوں اونٹ ہمارے سامنے لا کر بٹھا دیے گئے۔  
 واقعی بہت شاندار اونٹ تھے اور ہمارے آرام کے لیے ان  
 پر نرم گدیاں وغیرہ بچھا دی گئی تھیں۔ دوسرا بان بھی اونٹوں  
 کے ساتھ تھے۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو رہی تھی کہ یہ سفر  
 طویل بھی ہو سکتا ہے ورنہ اتنے انتظامات کی ضرورت بھی  
 نہیں تھی۔ ایک اونٹ پر مجھے بٹھایا گیا تھا، دوسرے پر تمہاجی  
 تھی جبکہ الہا کا اونٹ ہمارے ساتھ ساتھ چسل رہا تھا۔ وہ  
 ایک مہذب آدمی ثابت ہو رہا تھا۔

”آقا۔ معاف کرنا ہمیں اونٹوں کی رفتار تیز رکھنی ہو  
 گی۔“ اس نے کہا۔ ”تا کہ ہم اپنے دشمنوں سے بچتے ہوئے  
 جلد از جلد اپنے شہر تک پہنچ جائیں۔“  
 ”دشمنوں سے کیا مراد ہے تمہاری؟“ میں نے پوچھا۔







دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

# گھر بسٹھ

رسالے حاصل کیجئے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسٹنس ڈائجسٹ  
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ  
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد  
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے  
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر  
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیلوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویٹرن یونین یا منی گرام کے  
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر  
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شرمشا (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 11 سینٹر ڈیفنس ایونج تھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

لگ رہا تھا جیسے ابھی مجسمہ بول پڑے گا اور پورے کمرے  
میں تھاپی کی آواز گونج جائے گی۔

البارا بھی میرے ساتھ ہی اس کمرے میں آیا تھا۔  
اس نے اس جیسے میں میری محبت محسوس کر لی تھی۔ ”دیوتا!  
کیا تم دیوی کو دیکھ کر حیران ہو رہے ہو؟“

”ہاں البارا۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”یہ  
تھاپی کے علاوہ اور کسی کا مجسمہ نہیں ہو سکتا۔“

”یہی تو بات ہے آقا۔“ اس نے کہا۔ ”اب تو تمہیں  
یقین آ گیا تا کہ تم دونوں ہی اتیں اور سائی تکل ہو۔“  
”لیکن تمہارا اتیں تو مجھ سے نہیں ملتا۔“

”ملا ہے آقا! تم ذرا غور سے دیکھو۔ اس کے نقش و نگار  
تمہارے جیسے ہیں یہ اور بات ہے کہ صدیوں کی مسافت نے  
تمہارے جیسے کو گرد آلود کر دیا ہے لیکن یہ مجسمہ تمہارے علاوہ  
کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ تم اور سائی تکل ازل سے ایک دوسرے  
کے ساتھی ہو اور ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھی رہو گے۔“

کچھ کینیزیں کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ میرے  
لیے نیا لباس لے کر آئی تھیں۔ کمرے سے ملحقہ غسل خانہ تھا  
جہاں پتھروں کے شب میں پانی بھرا ہوا تھا۔

کینیزیں یہ چاہتی تھیں کہ میں ان کے سامنے بے لباس  
ہو کر نہانا شروع کر دوں لیکن میں نے انہیں کمرے سے باہر کر  
دیا تھا جس پر وہ سخت غورزدہ ہو گئی تھیں۔ شاید ان کا یہ خیال تھا  
کہ میں کسی بات پر ان سے ناراض ہو گیا ہوں۔

میرے لیے کھانے کا انتظام بھی بہت شاندار تھا۔  
اگرچہ گوشت بھی تھا لیکن میں نے اونچی کے دودھ اور  
سبز یوں پر اکتفا کیا تھا۔ میں گوشت اس لیے نہیں کھا سکتا تھا  
کہ کچھ نہیں معلوم تھا کہ یہ لوگ کس طرح جانوروں کو ذبح  
کرتے ہوں گے۔ کھانے سے قارغ ہو اتو البارا نے کہا۔  
”آقا! اگر کہو تو دل بہلانے کے لیے کسی کو تمہارے پاس  
بھیج دیا جائے کیونکہ میں تو جا رہا ہوں۔“

”البارا! تم کہاں جا رہے ہو؟“ میں نے پریشان ہو  
کر پوچھا کیونکہ اب میں البارا سے مانوس ہو چلا تھا۔

”گھبراؤ نہیں آقا۔ میں تم سے زیادہ قافلے پر نہیں  
رہوں گا۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن میں مادون کے دیگر  
معاملات دیکھنے جا رہا ہوں تم جلتے ہو کہ جب ذتے داری آتی  
ہے تو انسان اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتا اور میں تو  
دیے بھی اپنے عوام اور اپنی رعایا کا خادم ہوں۔“

میں اس شخص کی باتیں سن کر حیران رہ گیا تھا۔ مہذب  
دنیا سے ہزاروں میل دور ایک جنگلی قبیلے کے حکمران کا اپنے



میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں کوئی میری زبان جاننے والا بھی مل جائے گا۔ خوشی کے ساتھ اس بات کی حیرت ہے کہ تم نے ہماری زبان کہاں سے سیکھی۔“

”ہندوستان میں سیکھی ہے۔“ برہام نے بتایا۔ ”آقا! یہ ایک بہت طویل داستان ہے۔ میں آہستہ آہستہ آپ کو سب بتا دوں گا۔ اس وقت تو آپ کہہ یہ اطمینان دلانے آیا ہوں کہ یہاں آپ آرام سے رہ سکتے ہیں۔ یہاں آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ آپ کی حیثیت ایک دیوتا جیسی ہے۔“

”برہام! میرے بزرگ۔ میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں عذاب میں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں زبردستی دیوتا بنا دیا گیا ہوں جب کہ میرا کسی باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”میں یہ بھی جانتا ہوں آقا بس آپ خاموش رہیں اور اپنی شادی کا اہتمام کریں۔ دیوی سائی تیل بھی بہت آرام سے ہیں۔“

”برہام! میرے بزرگ! تم نے مہذب دنیا دیکھی ہے۔ تم کئی زبانوں سے واقف ہو، کیا تم اسکی باتوں پر یقین رکھتے ہو؟“

”میری بات نہ کریں آقا۔ ان بوڑھی آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے۔“ اس نے کہا۔

”اچھا چلو کم از کم یہ بتا دو کہ کیا ہم یہاں سے جا سکیں گے؟“ میں نے پوچھا۔ ”میں اپنے لوگوں میں واپس جانا چاہتا ہوں۔“

”آقا! اس بارے میں بھی کچھ نہیں بتا سکتا۔“ اس نے کہا۔ ”یہاں کے معاملات ایسے ہیں کہ آپ کسی کی طرح کڑے کے جال میں پھنس گئے ہیں۔ آپ دیوتا ہیں اور صدیوں کے بعد واپس آئے ہیں۔ صدیوں کے اس مسافر کو اب کون یہاں سے جانے دے گا۔“

”تو کیا میں ساری زندگی یہاں گزار دوں گا؟“

”میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ اس وقت آپ اپنے آپ پر بوجھ نہ لیں اور آسمان کے ستاروں کو دیکھتے رہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ستارے کچھ اور کہہ رہے ہوں اور وہ ہو جائے جو آپ چاہتے ہیں۔“

”برہام! تم یہ تو کہہ رہے ہو کہ تمہاری میری شادی کس طرح ہوگی؟“ میں نے مبخوض بدلتے ہوئے پوچھا۔

”بہت ہی خاص قسم کی رسومات ادا کی جائیں گی۔“ اس نے بتایا۔ ”آپ دونوں بہت محرز ہیں۔ آسمانوں سے اتر کر ہمارے پاس آئے ہیں۔“

”برہام! میں یہاں کے ماحول میں پاگل ہوتا جا رہا

بارے میں یہ خیال تھا جبکہ ہمارے حکمران خود کو جانے کیا سمجھا کرتے تھے۔ ان لوگوں کو تو اس جنگل سے سبق لینا چاہیے تھا۔ ویسے بھی البارا مجھے پہلی نظر میں اچھا لگا تھا۔ اس کا صاف چہرہ اس کے اندر کا حال بتا رہا تھا۔

”آقا! میں تمہارے پاس ایک ایسے آدمی کو بھیج رہا ہوں جس کی عقل کی مثال نہیں دی جا سکتی۔ اس کی عمر اسی سال کے قریب ہے لیکن اس کے پاس تجربہ آٹھ سو برسوں کا ہے۔ وہ جسے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔ وہ دنیا کی کئی زبانیں جانتا ہے۔“

”ٹھیک ہے البارا کل صبح اس آدمی کو میرے پاس بھیج دیتا۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ آج تو میں تھک چکا ہوں اور اس کی صحبت سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتوں گا۔“

البارا کے جانے کے بعد میں ہزاروں خدشات اور اندیشوں کے ساتھ تخت پر بیٹھ گیا اور یہ محاورہ سچ ہو گیا کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔

مجھے بھی نیند آگئی تھی۔ ایک گہری اور بے خود کر دینے والی نیند۔

میری آنکھ کسی کے آواز دینے پر کھلی۔ کوئی مجھے پکار رہا تھا۔ ”آقا! اٹھ جاؤ، آپ بہت دیر تک سوتے رہے ہیں۔“ اور اٹھانے والے نے مجھے انگریزی یا انگریزی زبان میں مخاطب نہیں کیا تھا بلکہ وہ اردو بول رہا تھا۔ خالص اردو دہلی ہوئی اردو۔

☆☆☆

اس نے اپنا نام برہام بتایا تھا۔ وہ ایک بوڑھا انسان تھا۔ اس کی عمر اسی اور پچاس کے درمیان ہوگی لیکن اس کے قوی مضبوط تھے۔ اس کے جسم پر بھی سفید لہاؤں تھے۔ اس کے شکن آلود ماتھے کی ہر لکیر یہ بتا رہی تھی کہ وہ کتنے سخت ترین تجربات کا خزانہ رکھتا ہے۔

جب میں نے اس ماحول میں اپنی زبان اردو سنی تو میں اچھل پڑا۔ البارا نے بتا دیا تھا کہ وہ بوڑھا کئی زبانیں جانتا ہے لیکن یہ گمان نہیں تھا کہ وہ اردو بھی بول سکتا ہوگا۔

مجھے حیران دیکھ کر اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”آقا! اتنے حیران کیوں ہو رہے ہیں؟“ اس نے کہا۔ ”جبکہ آقا یہ جانتے ہیں کہ دیوی سائی تیل نے آپ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے کہ اس جنم میں آپ کا نام کیا ہے۔ آپ کی زبان کیا ہے اور آپ کہاں سے آئے ہیں۔“

”برہام! مجھے تم سے مل کر بے پناہ خوشی ہو رہی ہے۔“



اس کو سجدہ کر رہے تھے۔ میں نے انہیں منع کرنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھا دیا۔ اسی وقت میری نگاہ برہام پر پڑی جو اس کمرے کے ایک کونے میں کھڑا ہوا اشارے سے مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا اشارہ کچھ دیر بعد سمجھ میں آ سکا تھا۔ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے میں اسے ہونے دوں ورنہ یہ لوگ بھڑک اٹھیں گے۔

کچھ دیر بعد وہ لوگ باہر چلے گئے، میرے لیے ناشتا لایا گیا۔ اس وقت صرف برہام میرے پاس تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”برہام! تم نے مجھے اشارہ کیوں کیا تھا؟“

”آقا! میں نے آپ کے تیرے اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ کو ان لوگوں کا سجدہ کرنا ناگوار گزر رہا ہے۔“

”ہاں میرے بزرگ۔ میں ایک مسلمان ہوں جیسا کہ تم کو معلوم ہو گیا ہوگا اور ہمارا معبود صرف ایک ہے۔ ہم صرف اسی کے آگے سجدہ کرتے ہیں۔ نہ خود کسی اور کے آگے سجدہ کرتے ہیں اور نہ یہ پسند کرتے ہیں کہ کوئی اور ہمیں سجدہ کرے۔“

”یہ بات میں جانتا ہوں آقا۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن آپ یہاں جو کچھ بھی کر رہے ہیں، وہ اپنی مرضی سے نہیں کر رہے ہیں۔ ایک جبر کے تحت کر رہے ہیں۔ آپ کی مرضی شامل نہیں ہے۔ اسی لیے اس عمل سے آپ کا خدا آپ سے ناراض نہیں ہوگا۔“

”پتا نہیں میرے محترم بزرگ۔ میرا تو یہ حال ہے کہ میں خود کو انتہائی ناگوار محسوس کر رہا ہوں۔“

”اطمینان رکھیں میرے آقا..... جو کچھ ہو رہا ہے اس کے لیے آپ اپنے خدا کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”بس یہاں خود پر قابو رکھیے صرف آنکھیں بند جائیں، صرف آنکھیں..... اور جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ دیکھتے رہیں۔“

ناشتے کے بعد الہارا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے تسلیم دیتے ہوئے بتایا۔ ”آقا! آج سے آپ اپنے دیوتا والے منصب پر بحال ہو چکے ہیں لیکن اس کے لیے آپ کو اپنے ہاتھوں سے ایک رسم ادا کرنی ہوگی۔ اس کے بعد آپ پوری شان و شوکت کے ساتھ دیوتا میں جاگیر لگے۔“

”اچھا ذرا رسم کیا ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت چھوٹی سی رسم ہے آقا۔“ اس نے بتایا۔ ”اور آپ جب بھی نیا جنم لیتے ہیں، آپ کو یہ رسم ادا کرنی پڑتی ہے۔“ میں نے پھر کچھ.. نہیں کہا۔

”میں نے کہا۔“ دم گھٹ رہا ہے میرا۔“

”اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھتے رہیں آقا۔“ اس نے کہا۔ ”اگرچہ آپ کی حیثیت دیوتا کی سی ہے لیکن بہت سے راستے خود آپ کو بھی نہیں معلوم ہوں گے۔ ہم سب ان مسافروں کی طرح ہیں جن کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر کسی راستے پر ڈال دیا گیا ہے۔ کون جانے یہ راستہ ہمیں کہاں لے کر جا رہا ہے۔“

”برہام! میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ رہو۔“ میں نے کہا۔ ”تم سے مل کر بہت حوصلہ ملا ہے مجھے۔“

”میرے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی کہ آقا مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں اور ایک عثمانی ہوئے چراغ کی روشنی میں اپنا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں میں آپ کے ساتھ ہی ہوں آقا۔“

دوسرے دن صبح سے ہماری شادی کی تقریبات کا آغاز ہو گیا۔

جانے یہ کیسی شادی ہو رہی تھی۔ یہ درست ہے کہ اسے دیکھتے ہی میں اس کا اسیر ہو گیا تھا۔ وہ سیدھی میرے دل میں اتر گئی تھی۔ میں نے اسے حاصل کرنے اور اسے اپنا بنانے کے خواب دیکھے تھے لیکن اس انداز سے ملاپ بہم نہیں ہو رہا تھا۔ میں اسکی شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا اور میرا خیال ہے کہ خود تمنا ہی کا بھی یہی حال ہوگا۔ اس کی بھی سچی سوچ ہوگی۔

☆☆☆

بہت ہی ابھی ہونی اور حیران کر دینے والی رسومات کا آغاز ہو گیا تھا۔

مجھے یہ اعتراف کرنا پڑا تھا کہ ان لوگوں کی خوشبو یا ت بے مثال ہوتی تھیں۔ جانے وہ کون سی جڑی بوٹیوں سے کشید کیا کرتے تھے اور کیا کھنک ہوئی تھی۔

لیکن یہ جو کچھ بھی بتاتے، وہ شاید نہیں اور نہیں جتنا ہو گا۔ پاگل اور مدہوش کر دینے والی پراسرار خوشبو تھی۔

نہلانے کے بعد مجھے سفید لبادہ پہنا دیا گیا۔ میرے سر پر ایک تاج بھی رکھ دیا گیا۔ یہ تاج سونے کا تھا۔ اس میں کئی قیمتی پتھر بھی تھے۔ اس نے لہاس میں جب میں بڑے کمرے میں پہنچا تو وہاں موجود لوگ اتنی دیوتا کا نعرہ لگاتے ہوئے سجدے میں چلے گئے تھے۔

میں کانپ کر رہ گیا۔ خدا کی پناہ یہ لوگ مجھے سجدہ کر رہے تھے۔ ایک حقیر انسان کو جس کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ جو کسی پتھر کی طرح لڑھکا پھر رہا تھا۔ یہ جاہل لوگ



اس عمل کا ایک بڑے کمرے میں انتظام کیا گیا تھا۔ کمرے میں آئیں اور سائی تیل کے بڑے بڑے جیسے تھے۔ ان دیو پیکل جسموں کے قدموں کے پاس ایک لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر بیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔

بہت خوبصورت لڑکی تھی اور اس کا اوپری جسم عریاں تھا جب کہ کمر سے نیچے اس نے سفید سا کوئی لباس پہن رکھا تھا۔ اس ہال میں بہت سے لوگ تھے۔ الہارا آگے بڑھا۔ اس نے میرے ہاتھ میں ایک نیزہ چھوا دیا۔ "آقا تم کو یہ نیزہ اس طرح اس لڑکی کے سینے میں اتارنا ہے کہ ایک ہی وار میں آ رہا ہو جائے۔"

"کیا؟" میں کانپ کر رہ گیا۔ "الہارا یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" "یہ بہت ضروری رسم ہے آقا۔" اس نے کہا۔ "تم شاید بھول رہے ہو، پچھلے جنم میں تم بھی کیا کرتے تھے۔ اس لڑکی کے خون سے تمہارے جسمے کو تسل دیا جائے گا اس رسم کے بعد تم امر ہو جاؤ گے..... لوتیزہ۔"

مجھ پر ہیکلی بار اتنا کڑا وقت آیا تھا۔ وہ بے گناہ معصوم لڑکی جب اندازے سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دنیا بھر کا کرب تھا۔ وہ رونا چاہتی ہوگی لیکن اس کے آنسو خوف سے خشک ہو گئے ہوں گے۔ وہ بھاگنا چاہتی ہوگی لیکن بھاگ نہیں سکتی تھی۔ نیزہ میرے ہاتھ میں تھا لیکن اس نیزے پر میری گرفت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ میں یہ مکر وہ اور ظالمانہ رسم انجام نہیں دے سکتا تھا۔

برہام نے میری یہ کیفیت محسوس کر لی۔ وہ جلدی سے میرے پاس آ گیا۔ "آقا آپ کو یہ کرنا ہوگا ورنہ یہ لوگ آپ کو سائی تیل اور لڑکی کو مار دیں گے۔ کیونکہ پھر یہ خیال کریں گے کہ آپ معصومی دیوتا ہیں۔"

برہام نے یہ بات اردو میں کہی تھی۔ میں نے بھی اردو میں جواب دیا۔ "محترم برہام! تم ہی بتاؤ میں اس... بے گناہ کی جان کیسے لے لوں۔ اور ان سے کہہ دو کہ ہمیں جانے دیں یہاں سے..... ہم دیوتا نہیں ہیں۔"

"قیامت آ جائے گی آقا۔" برہام نے کہا۔ "یہ لوگ برداشت نہیں کر سکیں گے۔" "تو پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟" "آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ یہ رسم دن میں نہیں بلکہ رات کے اندھیرے میں انجام دیں گے کیونکہ پہلے ہی آپ نے

ایسا ہی کیا تھا۔" "اس کے بعد کیا ہوگا؟" "اسی وقت دیکھا جائے گا۔" برہام نے کہا۔ "اس وقت تو اپنی جان چھڑا لیں۔"

میں نے ایسا ہی کیا۔ نیزہ اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے میں نے الہارا اور دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا اور انگریزی میں بولنا شروع کر دیا۔ "اے مقدس شہر کے مقدس باسیو! کیا تم یہ بھول گئے کہ تمہارے دیوتا کی روایات کیا رہی ہیں؟ ہاں مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں یہ سب کچھ ضرور کیا کرتا تھا لیکن رات کے اندھیرے میں تاکہ شیطانی قوتیں ہمیں نہ دیکھ پا لیں اور تم اس روایت کے لیے مجھے دن کے اچالے میں یہاں لے کر آ گئے ہو؟ جاؤ اس لڑکی کو ابھی لے جاؤ یہاں سے اور رات کے اندھیرے میں لے کر آنا۔ تاکہ یہ موت کے دیوتا کو اپنی طرف آتا ہوا نہ دیکھ سکے۔" میرے اس خطاب کا ترجمہ الہارا نے کر دیا تھا۔ پہلی بار چونکہ میں دیوتا کی شان اور اندازے سے بول رہا تھا اس لیے وہ سب بہت خوش تھے۔ خود الہارا بھی اس بات پر پشیمان ہو رہا تھا کہ ان لوگوں کو اس رسم کا وقت یاد کیوں نہیں رہا۔

معاہدہ رات تک کے لیے ٹل گیا تھا لیکن پھر رات کے بعد کیا ہوتا۔



اس شام اور پھر اس رات کئی واقعات پیش آئے۔ جیسے خوابوں کے تسلسل میں شدت آگئی ہو۔ مناظر بہت جلدی جلدی تبدیل ہونے لگے تھے۔ مجھے میرے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ مجھے برہام کا انتظار تھا۔ اس سے یہ پوچھنا تھا کہ رات میں کیا ہوا۔ جو کچھ اس وقت ہونے والا تھا وہ تو رات کو بھی ہو جاتا پھر اتنی مہلت کیوں لی گئی تھی؟

برہام اندھیرا ہونے کے بعد میرے پاس آیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "آقا آپ یہ رسم رات دیر سے ہوئی لیکن اس سے پہلے کچھ اور بھی ہونا ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "آپ کو اور سائی تیل کو یہاں سے نکل جانا ہے۔" اس نے بتایا۔ "کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ آپ کے ہاتھ کسی بے گناہ کے خون سے رنگین ہوں۔ ہمارا مذہب ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتا۔"

"کس مذہب کی بات کر رہے ہو محترم بزرگ؟" "آقا! وہی مذہب جو تمہارا ہے۔" اس نے کہا۔



”کیا!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔  
 ”براہم ایہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“  
 ”ہاں آقا ہندوستان میں رہ کر میں نے نہ صرف اردو سیکھی بلکہ اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔“ اس نے اکتشاف کیا۔  
 ”اسی لیے میرا نام براہم یعنی ابراہیم ہے۔“  
 ”اودھاء میرے بزرگ۔“ میں نے فرط جذبات سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”یہ کیسے ہو گیا؟“  
 ”یہ بہت طویل کہانی ہے میرے آقا۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن میں مختصر کر کے آپ کو سنارہا ہوں۔“  
 ”میرے محترم بزرگ۔ تمہاری عزت میرے دل میں اب اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بتاؤ مجھے۔“  
 ”مجھے ایک بار پری نور یا جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے۔“ براہم نے بتایا۔ ”میں وہاں اپنے قہیلے سے اپنی جان بچا کر گیا تھا۔ یہ لوگ کسی بات پر دشمن ہو گئے تھے۔ یہ سمجھ لو کہ قہیلے کا بادشاہ جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا وہ لڑکی میری محبت تھی اور میں نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ یہ اب سے چالیس پچاس سال پہلے کی بات ہے۔ میں اس زمانے میں جوان ہوا کرتا تھا اور ولولوں سے بھرپور تھا۔“  
 ”پری نور یا میں اس زمانے میں گورے ہی سب کچھ تھے اور وہ ہمیں بہت حقارت بھری نگاہوں سے دیکھا کرتے۔ میں نے وہاں مزدوری کی اور اپنی گزر بسر کرتا رہا پھر یہ ہوا کہ ایک ہندو کاروباری شخص نے مجھے اپنا ملازم رکھ لیا۔ دو چار برسوں کے بعد وہ مجھے ہندوستان لے گیا جہاں میں نے کئی زبانیں سیکھیں۔ ان میں ایک اردو بھی تھی اور وہیں جامع مسجد دہلی کے امام صاحب کے ہاتھوں مسلمان بھی ہو گیا۔“  
 ”مسلمان ہو جانے کے بعد تو میری دنیا ہی بدل گئی تھی۔ اب سارے دیوبند دیوتا اور اپنے رسوم و رواج مجھے احمقانہ کھائی دینے لگے اور میں نے ایک نئی زندگی شروع کر دی۔ میرا نام پہلے کچھ اور تھا اور پھر میں نے اپنا نام براہم رکھ لیا۔“  
 ”محترم ایہ بتاؤ کہ تم دوبارہ یہاں کیسے آ گئے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”میرا مقدر مجھے یہاں لے آیا۔“ اس نے کہا۔ ”یا شاید اسی دن کے لیے خدا نے مجھے یہاں بلا یا تھا تاکہ تمہاری اور اس لڑکی کی مدد کروں جس کی یہ لوگ دیوبند بھجھ کر پوجا کر رہے ہیں۔“

”بے شک یہی بات ہو سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”مجھے ایک بار پھر کسی کام سے افریقا آنا پڑ گیا تھا۔“  
 اس نے آگے بتایا۔ ”یہاں آنے کے بعد پتا چلا کہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ ہر قبیلے میں بہت تبدیلیاں آئی تھیں۔ میری واپسی بھی پچیس تیس سال بعد ہوئی تھی۔ تم جانو آقا کہ وطن کی محبت کیا ہوتی ہے۔ انسان جہاں پیدا ہوتا ہے اس جگہ کی محبت ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے اور جن لوگوں کے درمیان اس نے بچپن گزارا ہوتا ہے ان کی محبت اسے بائندہ کر رکھ دیتی ہے۔ بس میں اپنی ٹی ٹی کی زیارت کرنے اپنے قہیلے میں آ گیا۔ یہاں بھی تبدیلی آ چکی ہے۔ میرے دشمن بادشاہ کا انتقال ہو چکا تھا اور جو نیا بادشاہ تھا اس نے میری بہت عزت کی۔ مجھے حکومت میں ایک اہم مقام دے دیا گیا کیونکہ میں ان کے خیال میں اپنے ساتھ ڈھیر ساظم لے کر واپس آیا تھا۔ اس وقت سے اب تک میں یہیں ہوں۔ تو یہ ہے میری کہانی۔“

”میرے بزرگ! تم یہ بتاؤ تم نے کس طرح اپنا مذہب چھپایا ہوگا؟“  
 ”بہت مشکلوں سے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں یہاں چھپ چھپ کر نمازیں پڑھتا ہوں۔ میں نے اسی خوف سے شادی بھی نہیں کی کہ کہیں یہ راز فاش نہ ہو جائے۔“  
 ”تم واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟“ میں نے کہا۔  
 ”میرا مطلب ہے جنوبی افریقا میں تو بہت سے مسلمان ہیں۔ تم ان کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟“  
 ”آقا! تم اسے میرا پاگل پن کہہ لو کہ میں اپنے وطن کی مٹی کو چھوڑ نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس لڑکی کی قبر بھی یہیں ہے جس سے میں نے محبت کی تھی۔“ اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

”ہاں، میں نے اس کے رے میں تپا رہا ہی نہیں، اس کا کیا ہوا تھا؟“  
 ”اس نے اپنی جان دے دی تھی آقا۔“ براہم نے بتایا۔ ”وہ اس بادشاہ کی دلہن نہیں بنی تھی۔ شادی کی رات اس نے اپنے سینے میں نیزہ اتار کر اپنی محبت کا ثبوت دے دیا تھا۔ خیر ہم پھر بھی ہاتھ کر سکتے ہیں، اس وقت تو یہاں سے چلنے کی تمہاری کرو۔“  
 ”مجھے کیا تیاری کرنی ہے؟“ میں نے کہا۔ ”لیکن ہم یہاں سے نکلیں گے کیسے؟“  
 ”البارا! میں پہنچانے گا۔“ براہم نے بتایا۔  
 ”البارا۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



”ڈاکٹر احمد! شاید میرے نصیب میں بھی تھا۔ اسی لیے شروع ہی سے مجھے اس قسم کے خواب دکھائی دیتے تھے۔ میں شروع ہی سے اپنے ماحول سے اکثری اکثری رہی ہوں لیکن یہاں مجھے سب کچھ اپنے اپنا سا لگ رہا ہے۔ جانے انسان کیا ہے، اس کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔“

”تو میں یہاں سے مایوس چلا جاؤں؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”نہیں، مایوس نہیں، میری یادیں اپنے ساتھ لے کر۔“ اس نے کہا۔ ”یادیں ہی تو سہارا ہوتی ہیں۔ تم جب آواز دو گے میں تمہاری یادوں میں آ جایا کروں گی۔“  
 ”یہ الیار امیر اتنا ہمدرد کیسے ہو گیا ہے کہ مجھے واپس پہنچانا چاہتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میری وجہ سے۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے اس سے سو سے باڑی کی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ تم اس کو جانے دو۔ تمہاری دیوی سائی تل تل تمہارے ساتھ رہے گی۔ اس پر وہ رضامند ہو گیا۔“

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خود سائی تل بھی اداں تھی لیکن وہ مجبور تھی۔ اس کی تقدیر نے اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی تھیں۔ اس کا سفر تمام ہو چکا تھا لیکن مجھے ابھی کہیں اور جانا تھا۔ میری منزل کہیں اور تھی۔

☆☆☆

اس کے بعد بیان کرنے کے لیے رہ گیا جاتا ہے۔ برہام اور الیار نے مجھے مہذب دنیا تک پہنچا دیا۔ میرا این جی او والا مشن احوال ہی رہ گیا تھا۔ میں کچھ بھی نہیں کر پایا تھا۔

میری واپسی پر بہت ہلچل مچ گئی تھی۔ جنوبی افریقا کے اخبارات اور ٹی وی چینلز نے میرے انٹرویوز لیے تھے۔ میں نے بہت کچھ بتایا بھی اور بہت کچھ چھپا بھی لیا تھا۔

میں نے یہاں تک بتایا تھا کہ تمہاری ہمارے ساتھ کئی تھی اور ایک دن جنگی اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے لیکن انہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ ایک دیوی بن کر ایک قہقہے پر سکرانی کر رہی ہے اور یہ بھی نہیں بتایا کہ میں اس کی محبت کی یادیں اپنے ساتھ لے کر اپنے وطن واپس جا رہا ہوں۔

میں اب پاکستان واپس آ چکا ہوں اور میرے پاس سوائے یادوں کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ یادیں آنکھوں میں آنسو بھی لے آتی ہیں اور بھی بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی آ جاتی ہے۔

”برہام! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ الیار! ہمیں کیوں پہنچائے گا؟“  
 ”میرے آقا! اب تو یہ کہانی کچھ اور ہو گئی ہے۔“  
 برہام نے کہا۔ ”ایسا کرو میں سائی تل سے تمہاری ملاقات کا بندوبست کروا دیتا ہوں۔ وہ تمہیں سب کچھ بتا دے گی۔“  
 برہام مجھے الجھن میں مبتلا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ آخر الیار اہارا ساتھ دینے کے لیے کیوں رضامند ہو گیا تھا جبکہ وہ تو ہمیں بڑی مشکلوں سے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔

میں انتظار کرتا رہا۔ سائی تل یعنی تمہاری آنے والی تھی۔ وہ لڑکی جس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ جس نے مجھے یہ احساس دلایا تھا کہ دنیا ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ابھی اتنی زندگی شروع کرتی ہے۔ کچھ دیر بعد قدموں کی آہٹ ہوئی اور تمہاری میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور گھمسی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر واقعی کسی دیوی جیسا تقدس پیدا ہو گیا تھا۔  
 ”ڈاکٹر احمد۔“ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”سفر مبارک ہو۔ تم واپس جا رہے ہو۔ برہام نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔“

”صرف میں نہیں تمہاری! تم بھی میرے ساتھ چل رہی ہو۔“

”نہیں ڈاکٹر احمد۔ میں یہاں سے نہیں جا سکتی گی۔“ اس نے کہا۔ ”میری منزل تو یہی تھی اور اند میرے راستوں نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا ہے۔“

”تمہاری! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔“ میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ ”تم مہذب دنیا کو چھوڑ کر ان لوگوں کے درمیان رہو گی؟“

”ہاں ڈاکٹر احمد کیونکہ یہ لوگ مجھے دیوی سمجھتے ہیں۔“  
 ”لیکن تم دیوی تو نہیں ہو۔“

”میں جانتی ہوں کہ میں دیوی نہیں ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن ان لوگوں کے لیے خوشی نام کی کوئی چیز ان کی زندگی میں نہیں ہے۔ یہ بہت اداں اور مرہمائے ہوئے لوگ تھے لیکن تم خود دیکھو ہمارے آنے کے بعد ان میں کیسی ترنگ آ گئی ہے۔ یہ کتنے خوش دکھائی دینے لگے ہیں۔ یہ مجھے اپنی ماں سمجھتے ہیں ڈاکٹر احمد اور ایک ماں اپنے بچوں کو چھوڑ کر کہاں جا سکتی ہے..... کیسے جا سکتی ہے۔“

میں اس کی باتیں سن کر دنگ رہ گیا تھا۔ کیسی تھی وہ۔ کیسا تھا اس کا دل، کتنا مہربان، کتنا محبت کرنے والا۔ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ان لوگوں کو چھوڑنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھی۔ اس نے کہا۔